خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ
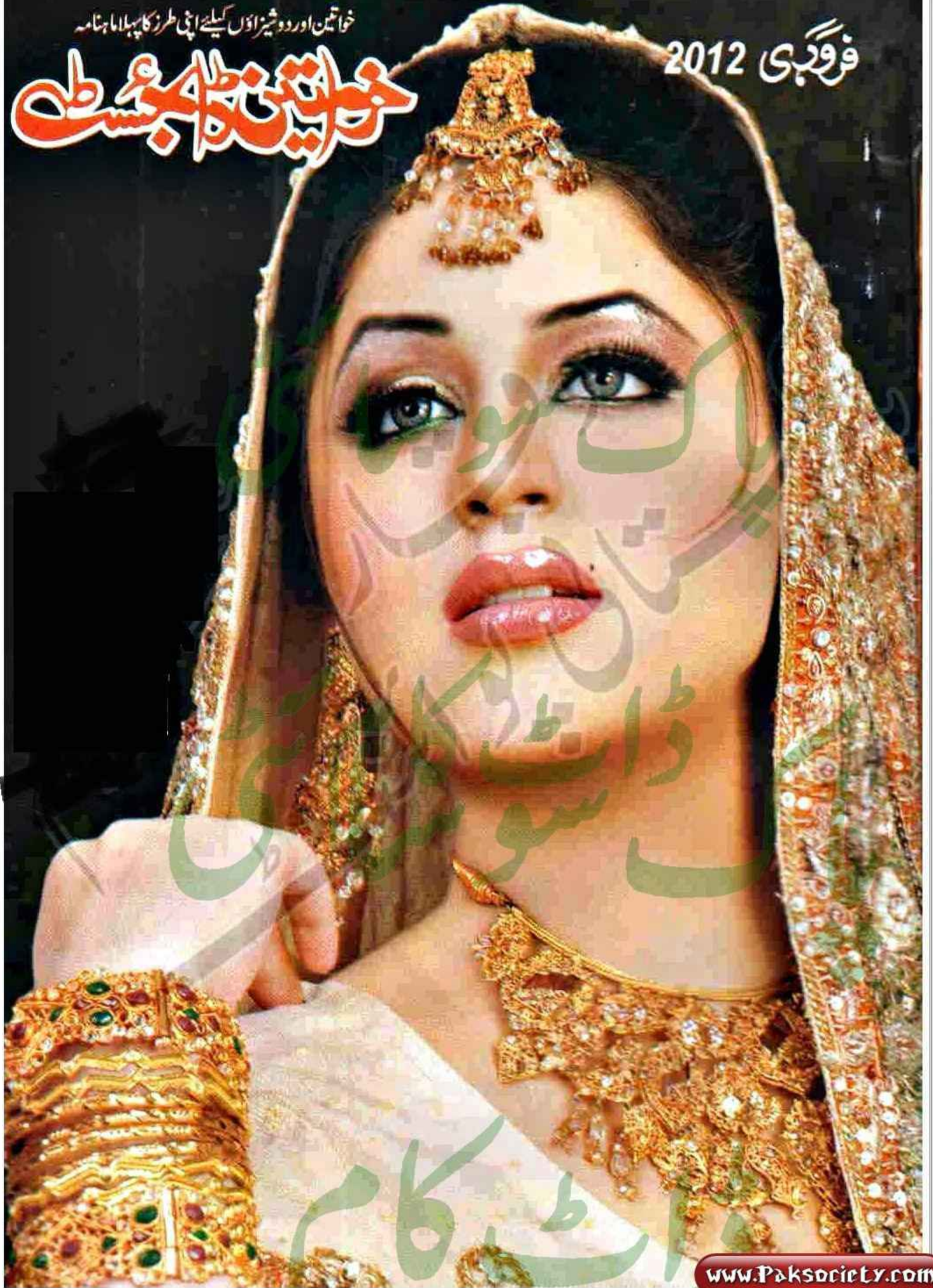
فروری 2012

فروری 2012
جلد 39 شمارہ 10
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: khawateendigest@hotmail.com , info@khawateendigest.com

مدیر

کہی سنی

خواتین ڈائجسٹ کا فروری کا شمارہ پیش خدمت ہے۔

ربیع الاول کے مہینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ وہ بابرکت اور رحمتوں والا مہینہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی محبوب انسانیت کا کامل نمونہ، اس عظیم ہستی نے دنیا کو رونق بخشی جس کی مثال پوری تاریخ انسانی پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ اس نے بنی نوع انسان کو گمراہی سے بچانے اور اس کی بہتری اور فلاح کے لیے دنیا میں انبیاء علیہ السلام مبعوث فرمائے۔ ان انبیاء کی تعلیمات اور زندگی کے بہت سے پہلو تاریخ کے صفحات پر نظر نہیں آتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء کی تاریخ کی واحد ہستی ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک گوشہ تاریخ کے صفحات پر پوری آب و تاب سے جگمگا رہا ہے۔ جن کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ تعلیم اور ہر عمل تاریخ میں محفوظ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا ہر عمل، ہر لمحہ روشن نظر آتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو الہامی کتاب لے کر آئے، آج چودہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر جانے کے باوجود اس میں ایک حرف کی بھی تحریف نہ کی جا سکی۔ قرآن پاک وہ واحد کتاب ہے جس کا ایک ایک لفظ کروڑوں سینوں میں محفوظ ہے۔ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کسی خاص قوم یا زمانے کے لیے نہیں ہیں۔ آپ جو شریعت لے کر آئے اس کا پیغام ابدی اور قیامت تک کے لیے ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے اس جہان کے لیے ہی نہیں اگلے جہان کے لیے بھی رحمت اللعالمین بنا کر بھیجا ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق، وابستگی اور محبت ایک مسلمان کے ایمان کا حصہ ہے لیکن یہ کسی خاص دن، خاص مہینے یا جشن منانے تک محدود نہیں ہونا چاہیے۔ اس محبت کی اصل روح اور تقاضا یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایات، احکامات اور عمل کو پورے دل سے تسلیم کر کے معاملات اور زندگی کے ہر عمل میں اختیار کرنے کی کوشش کی جائے۔

اسی میں ہماری نجات اور کامیابی ہے۔

اس شمارے میں،

صوفیہ بشیر نے کافی عرصہ پہلے ایک طویل ناول لکھا اور پھر خاموشی اختیار کر لی۔ اب طویل وقفے کے بعد وہ ایک مکمل ناول لے کر آئی ہیں۔ بہت حساس موضوع پر لکھا یہ ناول خاص توجہ کا متقاضی ہے۔ آپ پڑھ کر بتائیں صوفیہ بشیر کس حد تک اس موضوع سے انصاف کر پائی ہیں۔

- فرحت اشتیاق کا ناول "سنگ سمیٹ لو"،
- زہرہ ممتاز کا ناول "ایک ادھوری بات"،
- راحت جبیں کا ناولٹ "ساری بھول ہماری تھی"،
- ثمرہ بخاری، عائشہ فیاض، عظمیٰ افتخار، عفیفہ محمد بیگ اور صبیحہ اقبال کے افسانے،
- رفعت ناہید سجاد اور نگہت عبداللہ کے ناول،
- مشہور صحافی، اینکر، تجزیہ کار اور مصنف سہیل وڑائچ سے ملاقات،
- باتیں انوشے عباسی سے،
- کرن کرن روشنی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے شامل ہیں۔

یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ ہمیں خط ضرور لکھیے گا۔ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے۔ اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری، صحیح مسلم، سنن ابوداؤد، سنن نسائی، جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں، وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے علاوہ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

ماں کا احترام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا۔

عرض کیا گیا "اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں کس سے نیکی کروں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اپنی ماں سے۔"

پوچھنے والے نے کہا۔ "اس کے بعد کس سے؟"

فرمایا۔ "اپنی ماں سے۔"

اس نے کہا۔ "اس کے بعد کس سے؟"

فرمایا "اپنے باپ سے۔"

اس نے کہا۔ "اس کے بعد کس سے؟"

فرمایا "جو زیادہ قریبی (تعلق رکھتا) ہو، پھر جو (اس کے بعد) زیادہ قریبی ہو۔"

فوائد و مسائل:

1۔ والدین حسن سلوک کے سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ جب اولاد کمزور ہوتی ہے تو والدین اس کی ہر ضرورت پوری کرتے ہیں، اسی طرح جب والدین بڑھاپے کی وجہ سے کمزور ہو جائیں تو اولاد کا فرض بنتا ہے کہ ان کی خدمت کرے اور ان کی ہر ضرورت پوری کرے۔

2۔ والد کی نسبت والدہ حسن سلوک کی زیادہ مستحق ہے کیونکہ اس نے بچے کی پرورش میں زیادہ مشقت برداشت کی ہوتی ہے اور وہ نرم دل ہونے کی وجہ سے اولاد سے اپنا مطالبہ زور دے کر تسلیم نہیں کرا سکتی، اس لیے اس کی ضروریات بلا مطالبہ پوری ہونی چاہئیں۔

3۔ بعض لوگ نقد رقم دے کر سمجھ لیتے ہیں کہ والدین کا حق ادا ہو گیا ہے۔ یہ درست نہیں، اگر رہائش ان سے دور ہے تب بھی خط و کتابت فون کے ذریعے ان سے رابطہ رکھنا، ان کی خیریت دریافت کرتے رہنا، ان سے ملاقات کے لیے جانا، ان کے ساتھ کچھ وقت گزارنا، اپنے معاملات میں ان سے

مشورہ لینا' انہیں خوش رکھنے کی کوشش کرنا اور اس طرح کے دوسرے معاملات ضروری ہیں۔ یہ والدین کی جذباتی اور نفسیاتی ضروریات ہیں جن کا پورا کرنا جسمانی ضروریات پوری کرنے سے بھی زیادہ اہم ہے۔

4۔ جتنا زیادہ قریبی تعلق ہو' اتنا اس کا حق زیادہ ہوتا ہے' مثلاً "سگے بہن بھائیوں کا حق' چچازاد اور ماموں زاد وغیرہ سے زیادہ ہے۔

باپ کا حق

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"بیٹا اپنے باپ کا حق ادا نہیں کر سکتا مگر صرف اس صورت میں (ادا کر سکتا ہے) کہ اسے غلام پائے تو اسے خرید کر آزاد کردے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ والدین کی خدمت زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

2۔ غلام یا لونڈی کو آزاد کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔

3۔ آزاد مرد کو اپنی لونڈی سے جو اولاد حاصل ہوتی ہے' وہ آزاد ہوتی ہے جب کہ اس کی ماں لونڈی ہی رہتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ماں باپ اور اولاد سب مملوک ہوں۔ پھر آقا بیٹے کو آزاد کردے اور اس کے ماں باپ غلام ہی رہیں۔ اس طرح کی کسی صورت میں اولاد والدین کو خرید سکتی ہے اور اولاد کی ملکیت میں آتے ہی والدین کو قانوناً "آزاد قرار دے دیا جائے گا۔

اولاد کی دعا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہہ سے روایت ہے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"قنطار بارہ ہزار اوقیے کے برابر ہے۔ ہر اوقیہ زمین و آسمان کے درمیان کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔"

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"جنت میں آدمی کا درجہ بلند کیا جاتا ہے۔"

وہ کہتا ہے "یہ کس وجہ سے ہوا۔"

اسے کہا جاتا ہے۔ "تیری اولاد کے تیرے لیے دعائے مغفرت کرنے کی وجہ سے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ فوت شدہ افراد کے لیے دعائے مغفرت ایک نیکی اور ان پر احسان ہے۔

2۔ اولاد کو والدین کے لیے ہمیشہ دعائے مغفرت کرتے رہنا چاہیے۔

3۔ دعا کا فائدہ زندہ افراد کو بھی ہوتا ہے اور فوت شدہ افراد کو بھی۔

وصیت

حضرت مقدام بن معدی کرب رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں تمہاری ماؤں کے بارے میں (حسن سلوک کی) وصیت کرتا ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات تین بار فرمائی۔ پھر فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے باپوں کے بارے میں وصیت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں زیادہ قریبی' پھر (اس کے بعد زیادہ) قریبی رشتہ داروں کے بارے میں وصیت فرماتا ہے۔"

جنت اور جہنم

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک آدمی نے کہا۔

"اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اولاد پر والدین کا کیا حق ہے؟" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"وہ تیری جنت اور تیری جہنم ہیں۔"

دروازہ

حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا' آپ فرما رہے تھے۔

"باپ جنت کا درمیانی دروازہ ہے' چاہے اس دروازے کو ضائع کرلو' چاہے محفوظ کرلو۔"

فوائد و مسائل :

1۔ والد کی خدمت جنت میں داخل ہونے کا اہم ذریعہ ہے۔

2۔ ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر والد کو ناراض کرو گے تو تمہارے لیے جنت کا دروازہ نہیں کھلے گا' اس طرح تم جنت کا دروازہ کھو بیٹھو گے۔

3۔ محفوظ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ والد کو خوش کرو گے تو جنت کا دروازہ تمہارے لیے ضرور کھل جائے گا۔

4۔ اگر والد کسی ایسے کام کا حکم دے جس میں اللہ کی ناراضی ہے تو والد کی اطاعت کرنا جائز نہیں' البتہ اس صورت میں بھی والد کی خدمت اور احترام ضروری ہے۔

والد کے قرابت داروں سے صلہ رحمی

حضرت ابو اسید مالک بن ربیعہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا' ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے کہ قبیلہ بنو سلمہ کا ایک آدمی آیا اور عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! کیا میرے والدین سے حسن سلوک کی کوئی صورت باقی ہے جس کے ذریعے سے' ان کی وفات کے بعد میں ان سے نیکی کرسکوں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ہاں' ان کے لیے دعا کرنا' ان کے لیے (اللہ سے) بخشش کی درخواست کرنا' ان کی وفات کے بعد ان کے وعدے پورے کرنا (جو وہ زندگی میں پورے نہ کر سکے ہوں) ان کے دوستوں کا احترام کرنا اور ان رشتہ داروں سے صلہ رحمی کرنا' جن سے تعلق صرف ان کے واسطے سے ہے۔"

بیٹیوں سے حسن سلوک کا بیان

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے' انہوں نے فرمایا کچھ اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے کہا۔

"کیا تم لوگ اپنے بچوں کو چومتے ہو؟"

صحابہ رضی اللہ عنہ نے کہا۔ "ہاں!"

انہوں نے کہا "لیکن قسم ہے اللہ کی! ہم تو (اپنے بچوں کو) نہیں چومتے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "یہ میرے اختیار کی بات تو نہیں جب اللہ نے تمہارے اندر سے رحم کا جذبہ سلب کرلیا ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اپنے بچوں سے پیار کرنا شفقت و محبت کی علامت ہے۔

2۔ دل اللہ کے قبضے میں ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم وعظ و نصیحت کرتے تھے اور حق کو واضح کرکے بیان فرماتے تھے۔ ہدایت دینا اللہ کا کام ہے۔

اولاد کی محبت

حضرت یعلیٰ (بن مرہ) عامری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے کہا "حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہا دوڑے دوڑے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سینے سے لگالیا اور فرمایا۔

"اولاد بخل اور بزدلی کا باعث ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اپنے بچوں سے پیار اور شفقت کا اظہار ان کے دل میں بزرگوں سے محبت کا باعث ہے۔

2۔ جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا موقع ہو تو انسان بعض اوقات سوچتا ہے کہ یہ پیسے بچا لیے جائیں اولاد کے کام آئیں گے۔ اس جذبے پر قابو پانا مشکل ہے، تاہم کوشش کرنی چاہیے کہ اولاد سے محبت کا یہ جذبہ ایک حد تک رہے تاکہ انسان بخیل نہ بن جائے۔
3۔ جب اللہ کی راہ میں جہاد کا موقع ہو تو خیال آتا ہے کہ اگر میں شہید ہو گیا تو بچوں کا کیا بنے گا؟ اس طرح دل میں بزدلی پیدا ہو جاتی ہے۔
4۔ اولاد سے محبت کے جذبات کو شریعت کے احکام کے ماتحت رکھنا چاہیے۔

افضل صدقہ

حضرت سراقہ بن مالک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"کیا میں تمہیں سب سے افضل صدقہ نہ بتاؤں؟ تیری بیٹی جو (بیوہ ہو کر یا طلاق ہو جانے کی وجہ سے) تیرے پاس واپس آجائے اور تیرے سوا اس کا کوئی کمانے والا نہ ہو۔ (اس کے اخراجات برداشت کرنا افضل صدقہ ہے۔" یہ روایت محققین کے مطابق ضعیف ہے تاہم حدیث میں بیان کردہ مسئلہ کی دیگر روایات سے تائید ہوتی ہے۔

فوائد و مسائل :

1۔ بنابریں بیٹی کی شادی کرنے کے بعد اس کے اخراجات والدین کے ذمے نہیں۔
2۔ بیوہ یا مطلقہ بیٹی کا اگر کسی وجہ سے دوسرا نکاح نہ ہو سکے تو اس کے اخراجات والد کے ذمے ہیں۔
3۔ بیٹی اور اس کے کم سن بچوں پر خرچ کرنا بہت ثواب کا باعث ہے۔
4۔ بہن، بھانجی اور بھتیجی پر خرچ کرنا بھی اسی طرح ثواب کا کام ہے۔
5۔ بیوہ اگر رشتے دار نہ بھی ہو تو نادار ہونے کی صورت میں اس کا اور اس کے یتیم بچوں کا خیال رکھنا بڑی نیکی ہے۔

جنت میں داخل

حضرت احنف بن قیس بن معاویہ رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت صعصعہ بن معاویہ تیمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ایک عورت آئی۔ اس کے ساتھ اس کی دو بیٹیاں تھیں۔
ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اسے تین کھجوریں دیں۔ (اس وقت وہی میسر تھیں) اس نے دونوں بیٹیوں کو ایک ایک کھجور دی۔ پھر بچی ہوئی (تیسری کھجور) بھی دو ٹکڑے کر کے ان (بچیوں) کو دے دی۔ (بعد میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ام المومنین رضی اللہ عنہا نے یہ واقعہ عرض کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"تعجب کیوں کرتی ہو؟ وہ عورت اس عمل کی وجہ سے جنت میں داخل ہو گئی ہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ اولاد سے محبت فطری چیز ہے اور قابل تعریف بھی۔
2۔ بچیوں سے حسن سلوک کا ثواب جنت ہے۔
3۔ اگر زیادہ صدقہ کرنے کی طاقت نہ ہو تو تھوڑا صدقہ کرنے سے جھجکنا نہیں چاہیے۔

تین بیٹیاں

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس کی تین بیٹیاں ہوں، وہ ان پر صبر کرے، جو کچھ میسر ہو اس میں سے انہیں کھلائے، پلائے اور پہنائے، قیامت کے دن وہ اس کے لیے جہنم سے رکاوٹ بن جائیں گی۔"

فوائد و مسائل :

بہنوں یا دوسری رشتے دار بچیوں کی پرورش کا بھی یہی ثواب ہے۔

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

دو بیٹیاں

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس شخص کی دو بیٹیاں جوان ہو جائیں اور وہ ان سے اس وقت تک اچھا سلوک کرتا رہے جب تک وہ اس کے ساتھ رہیں، یا جب تک وہ ان کے ساتھ رہے، وہ اسے جنت میں ضرور داخل کر دیں گی۔"

فوائد و مسائل :

جب تک وہ اس کے ساتھ رہیں۔" کا مطلب یہ ہے کہ ان کا نکاح ہو جانے تک، یا نکاح سے پہلے فوت ہو جانے تک ان سے اچھا سلوک کرے، ان کی اچھی تربیت کرے، ان کی جائز ضروریات پوری کرے۔
جب تک وہ ان کے ساتھ رہے۔" کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کا نکاح کرنے سے پہلے فوت ہو جائے اور اپنی وفات تک ان سے اچھا سلوک کرتا رہے تو جنت میں داخل ہو جائے گا۔
حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اپنی اولاد کی عزت نفس کا خیال رکھو اور انہیں اچھے آداب و اخلاق سکھاؤ۔"

ہمسائیگی کا حق

حضرت ابو شریح خزاعی رضی اللہ عنہا سے روایت ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جو شخص اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی سے اچھا سلوک کرے۔ جو شخص اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ جو شخص اللہ پر اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔"

فوائد و مسائل :

1۔ نیک اعمال انجام دینا ایمان کا تقاضا ہے۔
2۔ پڑوسی کے ساتھ عام طور پر واسطہ پڑنے کی وجہ سے اختلاف پیدا ہونے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں، لہٰذا اس کے ساتھ حسن سلوک کا زیادہ اہتمام ہونا چاہیے تاکہ لڑائی جھگڑا نہ ہو۔
3۔ کاروبار میں شراکت رکھنے والا، بازار میں قریب کا دکاندار، تعلیمی ادارے میں ہم مکتب یا ہم جماعت، ہوسٹل میں ہم کمرہ یا اس عمارت میں رہائش پذیر طالب علم، ایک ہی کارخانے میں کام کرنے والے کارکن اور اس قسم کے دوسرے افراد بھی پڑوسی کے حکم میں ہیں۔
4۔ مہمان کی عزت کا مطلب اس کے لیے معمول سے بہتر کھانا تیار کرنا، اس کے آرام و راحت کا خیال رکھنا، اس کی آمد پر ناگواری کا اظہار نہ کرنا اور اس قسم کے دوسرے امور ہیں۔
5۔ بے سوچے سمجھے بات کرنے سے گناہ کی بات منہ سے نکل جاتی ہے یا ایسی بات کہی جاتی ہے جس سے انسان بعد میں شرمندہ ہوتا ہے، اس لیے غیر ضروری گپ شپ سے اجتناب کرنا چاہیے۔
6۔ زبان کی حفاظت کے نتیجے میں ذکر و تلاوت کی طرف زیادہ توجہ ہوتی ہے اور نیکیاں زیادہ ہوتی ہیں۔

☼

نسخہ کتے کے کاٹے سے بچنے کا

انشاجی

ایک اخبار میں بھونکتے کتے سے بچنے کا نسخہ شائع ہوا ہے، لکھا ہے۔

"اگر آدمی ساکت کھڑا ہو جائے۔ بازو اور ہاتھ نیچے کی طرف سیدھے کرلے اور دوسری طرف دیکھنے لگے تو بھونکتا ہوا کتا کچھ دیر کے بعد خاموش ہو جائے گا اور پھر وہاں سے چلا جائے گا۔"

اخبار نے یہ نہیں لکھا کہ یہ نسخہ کہاں سے لیا گیا ہے۔ اور فقط "جدید طبی تحقیق" کا عنوان دیا گیا ہے۔ یہ بھی مذکور نہیں آیا، کتوں کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے کہ ان پر اس ضابطہ اخلاق کی پابندی ضروری ہے۔ یہ اعتراض بھی کچھ لوگ کریں گے کہ اگر انسان حسب ہدایت بھیگی بلی بن کر منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو جائے اور کتا اس کی ٹانگ لے لے تو ایڈیٹر اخبار ہذا کس حد تک ذمہ دار ہو گا۔ ہمارے نزدیک تو یہ اعتراض بے محل اور ناواجب ہے۔ بھونکنا الگ فعل ہے اور کاٹنا الگ۔ کتا کاٹ لے تو سیدھا سیدھا اسپتال جا کر چودہ انجکشن پیٹ میں لگوائیے اور مزے کیجیے۔ اصل کوفت تو کتے کی عف عف سے ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ نسخہ مجرب ہے۔

☆☆☆

ان امور میں اصل مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کتے کو معلوم نہ ہو کہ اسے اخبار میں چھپی ہوئی ہدایت کی پابندی کرنی ہے یعنی کوئی شخص بازو لٹکا کر دوسری طرف منہ کرلے تو اسے دُم دبا کر کھسک جانا چاہیے کیونکہ بعض کتے ناخواندہ ہوتے ہیں۔ یا اخبار نہیں پڑھتے یا جان بوجھ کر بات ٹال جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک مشہور ہوٹل کے لاؤنج میں ایک کتے کو استراحت کرتے پایا گیا۔ منیجر صاحب بہت خفا ہوئے۔ اسے کان سے پکڑ کر دروازے پر لے گئے جہاں موٹے موٹے لفظوں میں صاف لکھا ہوا تھا کہ...

"جن کتوں کے ساتھ ان کا مالک نہ ہو ان کا ہوٹل میں آنا منع ہے۔"

بہ نظر احتیاط ہم لوگوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس اخبار کا شمارہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں۔ جس میں یہ ترکیب درج ہے۔ اگر کوئی کتا بھونکنے سے باز نہ آئے

بلکہ کاٹنے پر اتر آئے تو جدید طبی تحقیق والا صفحہ اس کے سامنے کردیں پھر بھی باز نہ آئے تو ڈنڈے سے اس کی خبر لیں۔

یہ ڈنڈے سے خبر لینے کی ہدایت ہماری طرف سے ہے۔ احباب مذکورہ کی ذمہ داری نہیں۔ ہماری طبی تحقیق اتنی جدید نہ سہی تاہم مجرب ضرور ہے۔ ڈنڈا بڑی کار آمد چیز ہے اور بہت سے نسخوں میں پڑتا ہے۔ پرانے زمانے میں اسے تنبیہہ الغافلین کہتے تھے اور شاگرد اس کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ کچھ عرصہ ہوا ہم نے ایک کارٹون دیکھا کہ ایک استاد اپنے شاگرد رشید کو ایک موٹی سی کتاب سے دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے۔ کتاب کا نام بھی نظر آ رہا تھا۔ "دی چائلڈ سائیکالوجی"..... یعنی بچوں کی نفسیات۔

ایک زمانے میں اخباروں سے صرف خبروں کا کام لیا جاتا تھا یا پھر لوگ سیاسی رہنمائی کے لیے انہیں پڑھتے تھے آج تو اخبار زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ سیٹھ اس میں منڈیوں کے بھاؤ پڑھتا ہے۔ بڑے میاں ضرورت رشتہ کے اشتہارات ملاحظہ کرتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں۔ عزیز طالب علم فلم کے صفحات پر نظر ٹکاتا ہے اور علم کی دولت نایاب پاتا ہے۔ بی بی اس میں ہنڈیا بھوننے کے نسخے ڈھونڈتی ہے اور بعض لوگوں نے تو اخباری نسخے دیکھ دیکھ کر مطب کھول لیے ہیں۔

پچھلے دنوں عورتوں کے ایک اخبار میں ایک بی بی نے لکھ دیا تھا کہ پریشر ککر تو مہنگا ہوتا ہے اسے خریدنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کام بخوبی ڈالڈا کے خالی ڈبے سے لیا جا سکتا ہے۔ کفایت شعار بی بیوں نے یہ نسخہ آزمایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کئی زخمی ہوئیں اور ایک آدھ بی بی تو مرتے مرتے بچی۔ ایسے نسخوں پر عمل کرتے ہوئے وہ حکایت نہ بھولنی چاہیے کہ ایک صاحب کی بھینس کو اپھارہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک جہاں دیدہ بزرگ کے پاس دوڑے دوڑے گئے کہ...

"پارسال آپ کی بھینس کو بھی تو اپھارہ ہوا تھا۔ آپ نے کیا دوا دی تھی۔"

ان بزرگ نے کہا۔ "سیر بھر سوڈا کاسٹک پانی میں گھول کر پلا دیا تھا۔"

وہ شخص گیا اور یہ نسخہ آزمایا۔ بھینس اسے نوش جان کرتے ہی مر گئی۔ وہ شخص پھر ان بزرگ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ "حضور میری بھینس تو یہ نسخہ استعمال کرتے ہی مر گئی۔"

"بھئی مر تو میری بھینس بھی گئی تھی۔" ان بزرگ نے نہایت حلم اور متانت سے فرمایا۔

☆☆☆

ہم دس بارہ روز فلو میں مبتلا رہے اور بستر سے نہ اٹھ سکے۔ اس میں بھی کچھ دخل جدید طبی تحقیق کو ہے۔

ایک صاحب روحانی اور نفسیاتی علاج کرتے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کی کہ اپنے دل میں یہ سمجھ لو کہ تمہیں فلو ولو کچھ بھی نہیں ہے۔ سب وہم ہے۔ ہم نے اس نسخے پر عمل کیا۔ بلکہ اگر کوئی کہتا تھا "میاں دوا کرو، تمہاری کھانسی تو خطرناک معلوم ہوتی ہے۔" تو ہم یہی جواب دیتے تھے کہ "میاں ہوش کی دوا کرو۔ کون سی کھانسی؟ کیسی کھانسی؟" ان کا علاج ختم ہوا تو دوسرے کرم فرما نے ایک اخبار میں سے دیکھ کے بتایا کہ...

"دو دن کا مکمل فاقہ کرو اور پیاز کی گٹھی سونگھتے رہو۔"

اب ہم نے یہ عمل کیا۔ اتفاق سے نقوی کلینک والے ڈاکٹر نقوی صاحب نے دیکھ لیا اور کہا۔

"میاں کیوں پاگل ہو رہے ہو۔ اخبار والے ہو کر بھی اخبار کی باتوں پر یقین کرتے ہو۔ یہ لو کیپسول اور یہ رہا مکسچر۔"

خیر اللہ نے صحت دی۔ ہم نے ان نفسیاتی معالج کو پکڑا کہ

"حضرت ہم تو ڈاکٹر کی دوا سے ٹھیک ہوئے۔ آپ کو پچھلے دنوں فلو ہوا تھا آپ کیسے نفسیاتی علاج سے ٹھیک ہو گئے۔" ہنس کے بولے۔

"میاں میں بھی ڈاکٹر ہی کی دوا سے ٹھیک ہوا تھا۔"

☆ (1970ء میں لکھا گیا) ☆

معروف اینکر، تجزیہ نگار، مصنف، صحافی

سہیل وڑائچ سے ملاقات

شاہین رشید

سہیل وڑائچ ایک معتبر نام بہترین تجزیہ نگار، بہترین صحافی اور بہترین اینکر ہیں، مگر طبیعت نہایت حلیم پائی ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ انٹرویو کے لیے وقت مانگوں گی تو پتا نہیں کتنے دن مجھے "آج کل آج کل" سننا پڑے گا، مگر ایسا نہیں ہوا اور مجھے بڑی آسانی سے انٹرویو کا ٹائم مل گیا۔ پروفیشنل لوگوں میں یہی بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ دو ٹوک بات کرتے ہیں۔ "کرنا ہے، نہیں کرنا ہے۔" لارے لپے والی عادت نہیں ہوتی اور شاید یہی ان کی کامیابی کی کنجی ہوتی ہے۔

"کیسے ہیں آپ؟ گزشتہ دنوں آپ ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ تو کیسا لگتا ہے ملک سے باہر جانا؟"

"جی! اللہ کا شکر ہے۔ شروع شروع میں تو بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی ایکسائٹمنٹ ہوتی تھی، مگر اب اتنی ٹریولنگ ہے کہ ایکسائٹمنٹ تو ختم ہی ہو گئی ہے۔"

"فیملی بھی ڈسٹرب ہوتی ہو گی اور دفتری کام ہوتے ہیں یا یہ جھمیلے آپ نے خود پالے ہوئے ہیں؟"

"جی ہاں! بالکل.... آپ کو پتا ہے کہ لڑکپن تو ختم ہو گیا ہے، سو اب تو سیٹ روٹین ہی اچھی لگتی ہے۔ دفتری کام بھی ہیں۔ جھمیلے بھی پالے ہوئے ہیں، کچھ فارغ رہنا بھی پسند نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ "آ بیل مجھے مار" میرا وہی حساب ہے۔ ویسے گھر والوں کو بھی ٹائم دیتا ہوں۔ ہر وقت رابطہ رہتا ہے بیوی بچے سے اور فیملی کے ساتھ ہر سال ملک سے باہر چھٹیوں میں ضرور جاتا ہوں۔ کیونکہ ایک ہی میری بیگم صاحبہ ہیں اور

ایک ہی میرا بیٹا ہے جو کہ چھ سال کا ہے۔ میری شادی ہوئی 1993ء میں اور بیٹا ہوا 2005ء میں، جو کہ کافی عرصے کے بعد ہوا۔"

"اولاد کے لیے اتنے برس انتظار کیا۔ اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس ہوئے؟"

"اصل میں میڈیکل ٹریٹمنٹ کی ضرورت تھی۔ لندن گئے تو اللہ نے اپنا کرم کر دیا.... اور میں تو اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوا.... کبھی لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دیا۔ آپ کو پتا ہی ہے کہ اولاد نہ ہو تو ہماری سوسائٹی کیا کیا ریمارکس دیتی ہے۔ میں خود بھی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہوں اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس بارے میں میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اکثر اپنی بیوی سے مذاق میں کہا کرتا تھا کہ "بھئی! اس وجہ سے میں نے دوسری شادی نہیں کرنی، کوئی اور وجہ ہوئی تو کر لوں گا۔" میری ماں جن کی میں اکلوتی اولاد ہوں وہ بھی اس بارے میں سوچتی تک نہیں تھیں کہ بیٹے کی دوسری شادی کروں۔ میری والدہ کی ایک بہت قریبی دوست تھیں۔ انہوں نے ایک دفعہ کہہ دیا کہ تمہارا اکلوتا بیٹا ہے، تمہیں اس بارے میں سوچنا چاہیے۔ وہ ان سے ناراض ہو گئیں اور پھر ان سے بات ہی نہیں کی۔ وہ کہتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ میری اسی بہو سے اولاد دے گا۔"

"بڑی بات ہے کہ اتنے صبر و تحمل کے ساتھ آپ دونوں نے وقت گزارا؟"

"اس میں عورت کا قصور یا فالٹ نہیں ہوتا کہ اسی کو آپ قصور وار ٹھہرائیں۔ ہاں! آپ ٹریٹمنٹ کرائیں، ڈاکٹروں کو دکھائیں اور جہاں تک ممکن ہو، علاج کروائیں اور پھر بھی نہ ہو تو پھر اللہ کی رضا پر راضی ہو جانا چاہیے۔ دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کی اولاد نہیں ہے اور جن کو اللہ نے اس نعمت سے نوازا ہوا ہے۔ ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کی اچھی تربیت کریں۔"

"اللہ تعالیٰ اولاد سے ضرور نوازے کہ یہ تو میٹھا میوہ ہے۔"

"بالکل! میرے پاس جب تک میرا بیٹا نہیں تو مجھے اتنا احساس نہیں تھا، لیکن جب سے "رحمت" (بیٹے کا نام) آیا، اندازہ ہوا ہے کہ واقعی اولاد میٹھا میوہ ہے۔"

"اب آپ کی فیلڈ کی طرف آتے ہیں۔ پہلے آپ اپنا فیملی بیک گراؤنڈ بتائیے۔"

"ضلع گجرات سے ہمارا تعلق ہے "لکھل والی" ہمارے گاؤں کا نام ہے۔ میرے نانا ضلع سرگودھا کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آف اسکول کے ہیڈ ماسٹر رہے۔ وہاں جوہر آباد ایک نیا شہر بنا تو ہم لوگ وہاں آ گئے۔ میرے نانا، میری دادی اور میرے والد تینوں کا تعلق ٹیچنگ سے تھا اور سب جاب کرتے تھے۔ میری دادی بھی پڑھی لکھی تھیں اور میرے نانا بھی بی اے تھے۔ میرے دادا بھی بہت پڑھے لکھے تھے۔ ان کے بھائی اس زمانے میں علی گڑھ موومنٹ میں شامل تھے اور زمیندارہ اسکول کے پہلے ہیڈ ماسٹر تھے۔ پھر بعد میں زمیندارہ کالج بنا اور یونیورسٹی بنی۔ ہماری فیملی کو ایجوکیشن سے بہت لگاؤ رہا ہے۔

میں جب صحافی بنا تو میرے والد اس وقت حیات تھے۔ انہوں نے کہا کہ اب ہماری فیملی میں ٹیچنگ کون کرے گا۔ تو میں نے ان کی خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے چودہ سال کالج میں پڑھایا۔ انگلش کا لیکچرار ہوا کرتا تھا میں، ساتھ ساتھ صحافت بھی کی، مگر پھر ایک وقت آیا کہ صحافتی مصروفیات کی وجہ سے ممکن نہ رہا پڑھانا تب میں نے لیکچرر شپ سے استعفیٰ دیا۔"

"آپ کب اور کہاں پیدا ہوئے؟"

"میں 8 نومبر 1962ء کو جوہر آباد میں پیدا ہوا۔ ہم مڈل کلاس لوگ تھے۔ کچھ زمینیں بھی تھیں تو اناج وغیرہ گھر پر ہی آجاتا تھا۔ چھوٹے شہروں میں اس اسٹیٹس کو اپر مڈل کلاس عزت حاصل ہوتی ہے۔ کبھی مالی پریشانی نہیں ہوئی۔ اچھے اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ میں نے ایم اے انگلش کیا ہے۔"

"صحافت سے کب وابستہ ہوئے؟"

"1985ء کے آخری دنوں میں صحافت سے وابستہ ہوا۔ ارادتاً" اس فیلڈ میں نہیں آیا بلکہ حادثاتی طور پر آیا..... میں تو سی ایس ایس کرنا چاہتا تھا۔ کسی نے کہا کہ کرنٹ افیئرز کے لیے آپ اخبار میں کام کریں۔ جب اخبار کے دفتر گیا تو اسی کا اسیر ہو گیا۔ سی ایس ایس کے لیے داخلہ فارم جمع کرائے مگر سی ایس ایس کیا نہیں۔ کام کر کے مزا آیا اور ایسا لگا کہ میری فیلڈ یہی ہے اور اب جب میں اس پس منظر میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ میری ٹریننگ شاید اخبار ہی کے لیے ہوئی تھی۔ کیونکہ میں اسکول میں بزم ادب کا سیکریٹری تھا۔ سرگودھا کالج میں جب زیر تعلیم تھا تو وہاں کے میگزین کا ایڈیٹر تھا اور مجلس اردو ادب کا سیکریٹری تھا..... ایف سی کالج میں اگرچہ میں سائنس کا اسٹوڈنٹ تھا لیکن وہاں کے میگزین کا ایڈیٹر بھی تھا۔ پنجاب یونیورسٹی میں آیا تو وہاں کے میگزین کا بھی ایڈیٹر رہا (انگلش ڈیپارٹمنٹ کے میگزین کا) تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایڈیٹری میرے خون میں تھی یا میرے پیچھے پیچھے رہی۔ کچھ قدرتی رجحان ہوتا ہے لیکن تقدیر کا بھی بڑا عمل دخل ہوتا ہے۔ میں اس بات کو بہت مانتا ہوں۔"

"صحافت میں جب حادثاتی طور پر آئے تو آپ نے کیا کیا؟"

"مجھے اخبار میں آئے ہوئے ابھی دو تین دن ہی ہوئے تھے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر خان کا انگریزی میں لکھا ہوا مضمون ملا جس کی تقریباً" 30 قسطیں شائع ہوئیں جس کا اردو ترجمہ میں نے کیا۔ مجھے سیاسی فیملیز کے بارے میں بہت معلومات تھیں تو جب بھی کسی کو کسی بھی قسم کی معلومات لینی ہوتی تھی تو سب مجھ سے رابطہ کرتے تھے۔ جبکہ میں ایک بہت ہی جونیئر پوسٹ پہ تھا۔ پھر میں رپورٹنگ کی طرف آیا اور پھر خود بھی لکھنے لگا..... اس زمانے میں میرا پورا نام "سہیل سرور سلطان" تھا۔ میری لکھی ہوئی کہانیاں "س س س" کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ پھر کہا گیا کہ نام تھوڑا مختصر ہونا چاہیے تو پھر قلمی نام کے طور پر سہیل وڑائچ لکھنے لگا۔ ایسا نہیں ہے کہ وڑائچ فیملی سے میرا تعلق نہیں ہے۔ تعلق ہے، مگر میرے نام کا حصہ نہیں تھا۔ جب نام مختصر کرنے کی بات آئی تو سہیل سلطان اچھا نہیں لگ رہا تھا اس لیے سہیل وڑائچ لکھنا شروع کر دیا۔"

"آپ نے بتایا کہ سیاسی فیملیز کے بارے میں آپ کو بہت معلومات تھیں تو کیا ان کے ساتھ آپ کا ملنا جلنا تھا؟ آپ ابتدا سے ہی جنگ سے وابستہ رہے؟"

"ان فیملیز سے میرا ملنا جلنا نہیں تھا بلکہ مجھے ان کے بارے میں پڑھنے، جاننے کا شوق تھا۔ ان کے بارے میں معلومات اکٹھی کرنے کا شوق تھا۔ اس طرح میں چھوٹا موٹا چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا بن گیا تھا تو جس کو معلومات لینی ہوتی تھی، وہ مجھ سے ہی لیتا تھا۔ ساری عمر جنگ کے ساتھ وابستگی میں ہی گزری ہے۔ درمیان میں دو مرتبہ چھوٹی موٹی ناراضی ہوئی تو ایک مرتبہ میں "نیشن" میں چلا گیا اور ایک مرتبہ "فرنٹیئر پوسٹ" میں چلا گیا تھا، مگر مجھے مزا نہیں آیا۔ کچھ جنگ والوں نے بھی فورس کیا۔"

"ایک دن جیو کے ساتھ" بہت پاپولر پروگرام ہے، یہ کس کا آئیڈیا تھا۔

"میں جب جنگ میں تھا تو اس وقت میں "ایک دن سیاست دانوں کے ساتھ" کیا کرتا تھا۔ پورا دن ان کے ساتھ گزارتا تھا، تصاویر لیتا تھا اور پھر لکھتا تھا۔ وہی آئیڈیا اب "ایک دن جیو کے ساتھ" ہے۔"

"ایک دن جیو کے ساتھ کتنے دن میں مکمل ہوتا ہے؟"

"عموماً" تو ایک ہی دن میں مکمل ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ دو دن لگ جاتے ہیں۔ ایسا 50 پروگراموں کے بعد کسی ایک پروگرام کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ بھی اس صورت میں کہ کہیں دور جانا ہو۔ وقت پر پہنچ نہیں پائے۔ تو پھر دوسرے دن کرتے ہیں، یا کسی مہمان کو کوئی مجبوری ہو جائے تو پھر وہ تھوڑا بہت آرام کر لیتے ہیں۔ 90 فیصد پروگرام ایک دن ہی میں ہو جاتا ہے۔"

"مشکل ہے یا آسان؟ پریشان کون کرتا ہے، فنکار یا سیاست دان یا دیگر فیلڈ کے لوگ؟"

"بہت مشکل ہے۔ کیونکہ دنیا سے کٹ جاتے ہیں اس لیے کہ فون بند ہوتا ہے۔ ایک پروگرام کے لیے ایک ایک دن آنا، جانا اور ایک دن پروگرام تو تین دن ہو جاتے ہیں۔ تو ایک پروگرام کے لیے اگر تین دن درکار ہوں تو حساب لگائیے کہ گزشتہ نو سال میں تین سال تو میں گھر ہی نہیں رہا فنکار بہت پریشان کرتے ہیں، تیاری میں، میک اپ میں کئی گھنٹے لگ جاتے ہیں۔ بہت انتظار کرواتے ہیں۔ ہم عادی ہوتے ہیں سیاست دانوں کے اور دیگر فیلڈ کے لوگوں کے جو بڑا احترام کرتے ہیں۔ شوبز کے لوگ خود چونکہ سلیبریٹی ہوتے ہیں تو ان کا صحافیوں کے ساتھ وہ رویہ نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے۔ عزت بھی کرتے ہیں۔ احترام بھی کرتے ہیں مگر انتظار کروانے میں ان کو کوئی شرمندگی نہیں ہوتی۔ صحافی اگر سیاست دان کے پاس جائیں اور سیاست دان پانچ منٹ لیٹ ہو جائیں تو وہ پانچ دفعہ سوری کرتے ہیں، جبکہ فنکار کے پاس جائیں اور وہ دو گھنٹے لیٹ بھی آئے تو وہ سمجھے گا کہ میں نے ان پر بڑی مہربانی کی ہے۔"

"سب کچھ ارینج ہوتا ہے کیا؟ کیونکہ آپ کی خاطر مدارات بھی بہت ہو رہی ہوتی ہے۔"

"کچھ چیزیں ارینج ہوتی ہیں اور کچھ وہاں جا کر بھی ہوتی ہیں۔ سب کچھ مکس ہوتا ہے اور خاطر مدارات تو پاکستانی معاشرے کی روایات ہیں اور جب ٹی وی پر آنا ہو تو ذرا زیادہ ہو جاتی ہیں۔ کھانے پینے کا آئٹم ایک زمانے میں ہم نے بند کر دیا تھا۔ لیکن پھر لوگوں نے کہا کہ نہیں یہ آئٹم ضرور ہونا چاہیے کیونکہ ہم بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔"

"آپ خود بھی کھانے پینے کے شوقین ہیں اور ان

سے فرمائش کر کے پکواتے ہیں کیا؟"

"میں بھی کھانے پینے کا شوقین ہوں۔ لیکن فرمائش کر کے ان سے کبھی نہیں پکوایا۔ فرمائش صرف اپنے گھر میں ہی کرتا ہوں۔"

"ہم سب امید سے ہیں" میں آپ کی پیروڈی بہت ہوتی ہے۔ کیسا لگتا ہے آپ کو؟ آپ ناراض ہوتے ہیں یا خوش؟"

"مجھے بہت اچھا لگتا ہے اور بالکل بھی ناراض نہیں ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ جب پہلی مرتبہ پیروڈی ہوئی تو میں بہت خوش ہوا۔ اور میں نے کہا کہ آج تو میرے پاؤں زمین پر نہیں لگ رہے کہ میں بھی اس قابل ہو گیا ہوں کہ میری پیروڈی ہو رہی ہے میں تو ان باتوں کو بہت پوزیٹو سمجھتا ہوں۔"

"بے شک آپ کو اچھا لگتا ہے۔ مگر کیا کبھی دل آزاری ہوئی آپ کی؟"

"دل آزاری ایک مرتبہ ہوئی کہ جو کریکٹر بنایا تھا۔ اس کو کسی بندے نے بطور صحافی پیسے دیے تھے تو اس پر میں نے اعتراض کیا تھا کہ آپ ایسا نہ دکھائیں اور میں تو خوش ہوتا ہوں پیروڈی پر۔ ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہوں۔ ان کو اپنے کپڑے دیتا ہوں، مشورے دیتا

ہوں، ہر طرح کا تعاون کرتا ہوں۔ اس لیے میں نے کہا کہ لوگوں پہ یہ تاثر نہیں بننا چاہیے کہ ہم صحافی پیسے لیتے ہیں۔"

"ویسے لفافے ملتے تو ہیں۔"

"ملتے ہوں گے۔ لیکن ہم چونکہ اس کے ہمیشہ مخالف رہے ہیں تو اس لیے مجھے اچھا نہیں لگا۔

سب سے جلدی "آغا شاہی" کا پروگرام ہوا تھا اور وہ بڑا یادگار پروگرام تھا۔ میں کئی سالوں سے ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ ایک مرتبہ میں پروگرام کرنے اسلام آباد گیا، مگر وہ کینسل ہو گیا۔ جب کوئی پروگرام کینسل ہوتا ہے تو بڑی شرمندگی ہوتی ہے اور ڈپریسڈ بھی ہوتا ہوں تو وہیں مجھے "آغا شاہی" صاحب کا خیال آیا اور میں نے ان کو فون کیا، کئی سالوں سے ہم ان کو کہہ رہے تھے اور وہ مان نہیں رہے تھے تو اس دن جب میں نے ان کو فون کیا تو کہنے لگے کہ "تم کدھر ہو؟" میں نے کہا اسلام آباد ہی۔ کہنے لگے "فوراً" آجاؤ" اور جب میں گیا تو تین گھنٹوں میں ان کا "ایک دن جیو کے ساتھ" مکمل ہو گیا۔ کیونکہ انہوں نے کہیں آنا جانا تو تھا نہیں۔ وہ ہمارا ہٹ پروگرام گیا اور جو پروگرام دیر سے ہوا، وہ نواب اکبر بگٹی کا پروگرام تھا ——— ——— ڈیڑھ دن میں ان کے پاس پہنچے۔ دو دن میں پروگرام کیا، پھر دو دن واپس پہنچنے میں لگے تو اس پروگرام کے لیے پانچ چھ دن لگ گئے۔"

"سیاست سے آپ کی وابستگی ہے بہترین تجزیہ نگار ہیں۔ لیڈروں کے بہت قریب ہیں...... سب کو جج کیا۔ یہ بتائیں کہ آپ نے نواز شریف، بے نظیر، پرویز مشرف، آصف علی زرداری اور عمران خان کو کیسا پایا؟ بحیثیت انسان، بحیثیت سیاست دان؟"

"قریب کسی کے نہیں رہا، سب مجھے جانتے ہیں اور میں سب کو جانتا ہوں۔ ان سب کو اگر الگ الگ دیکھیں تو بے نظیر بھٹو ایک آئیڈیل تھیں۔ میری ان سے جتنی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ شاید ہی کسی صحافی کی ہوئی ہوں گی۔

نواز شریف بڑے دل سے ملتے ہیں۔ بہت خاطر مدارات کرتے ہیں اور آپ نے جتنے نام لیے، سب اچھے سیاست دان ہیں۔ نواز شریف بھی دو مرتبہ وزیراعظم بنے۔ ان میں بڑی خوبیاں ہیں اور بے نظیر کی خامیوں کی طرف آئیں تو وہ جتنا انٹرنیشنل ڈپلومیسی کو سمجھتی تھیں۔ حکومت کو کامیابی سے نہیں چلا سکیں، گورنمنٹ میں وہ اتنی کامیاب نہیں ہوئیں۔

نواز شریف کی خامی کی طرف آئیں تو ایک خامی تو یہ ہے کہ دہشت گردی کے خلاف ابھی تک کوئی واضح موقف نہیں آیا ان کی طرف سے۔ اکانومی کے بارے میں وہ بڑے کلیئر ہیں۔ لیکن انٹرنیشنل ریلیشنز کے بارے میں وہ اتنے کلیئر نہیں ہیں۔ ہیومن رائٹس ایشوز میں انٹرنیشنل اسٹینڈرڈ میں بے نظیر بہت آگے تھیں جبکہ نواز شریف کافی کنزرویٹو (Conservative) ہیں۔

پرویز مشرف جب صدر تھے تو ان سے ملاقات ہوتی تھی۔ آخری دنوں میں بطور انسان وہ مجھے اچھے لگے، لیکن بطور ڈکٹیٹر میں ان کو پسند نہیں کرتا۔ میں جمہوریت کو پسند کرتا ہوں اور زرداری صاحب سے میرا تعلق 1988ء سے ہے، جب پہلے الیکشن ہوئے۔

ان کی خوبی یہ ہے کہ کافی کول (Cool) ہیں۔ ڈرائنگ روم سیاست کے ماہر ہیں اور خرابی یہ ہے کہ ان کو اپنے امیج کا بالکل خیال نہیں ہے جبکہ سیاست دان کو اپنے امیج کا بہت خیال رہتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ نواز شریف ہوں، شہباز شریف ہوں یا زرداری صاحب ہوں، جب یہ مجھے دور سے ہی دیکھتے ہیں تو "ایک دن جیو کے ساتھ" والا میرا اسٹائل اپنا کر کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور کہتے ہیں۔"

"ملک جس بحران کا شکار ہے کیا اس کے ذمہ دار آصف زرداری نہیں ہیں؟ کون ملک کے ساتھ مخلص ہے اور مخلص رہے گا؟"

"میں آپ کی اس بات سے اتفاق نہیں کروں گا۔ گورننس بہت بری رہی، لیکن سیاست بری نہیں کی اور میں تو سب کو ہی مخلص سمجھتا ہوں۔ ہاں! کسی کی صلاحیت گورننس کے لیے اچھی ہے اور کسی کی نہیں۔ موجودہ حکومت گورننس میں ناکام رہی ہے۔ لیکن اگر دوسری سائیڈ سے سوچیں تو مشکل حالات تھے۔ اکانومی خراب تھی، انٹرنیشنل سچویشن خراب تھی۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ تھی، ایسے میں ملک کو چلانا بہت مشکل تھا۔"

"عمران خان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"ان کے بارے میں اچھے جذبات کا اظہار کیا جا سکتا ہے، لیکن بات تو اس وقت بنے گی جب یہ اپنا پروگرام سامنے لائیں گے۔ جب اپنی ٹیم سامنے لائیں گے۔ جب وہ اپنے پروگرام کو پریکٹیکلی کریں گے وعدے تو سب ہی 63 سال سے کر رہے ہیں لیکن تبدیلی نہیں آئی۔"

"ہمارے پڑوسیوں نے تو ترقی کر لی، مگر ہم ان سے بہت پیچھے ہیں، بہت سے ادارے تباہی کی طرف جا رہے ہیں؟"

"جہاں تک ترقی کی بات ہے تو ہم نے بھی ترقی کی ہے کئی شعبوں میں۔ لیکن اس وقت چونکہ ہم مایوسی کے اندھیروں میں ہیں اس لیے ترقی نظر نہیں آ رہی۔ ہاں! ٹھیک ہے کہ ریلوے، پی آئی اے اور دیگر اداروں کا حال برا ہو گیا ہے۔ مگر آپ یہ بھی تو دیکھیں کہ ایسی بسیں چل پڑی ہیں جو ریلوے سے بہت بہتر ہیں۔ آپ نے اچھی سڑکیں بنا لی ہیں جو ریلوے ٹریک سے زیادہ اچھی ہیں۔ پاکستان پہلا ملک ہے جہاں موٹروے بنی۔ پی آئی اے مڈل ایسٹ کی پہلی ایئرلائن تھی کہ جس نے بہت ترقی کی۔ اب پاکستان میں چونکہ یہ سرکاری ادارہ ہے تو جب تک یہ سرکاری ادارہ رہے گا، یہ خسارے میں رہے گا۔ سرکاری اسکول نہیں چل پا رہے تو یہ کمرشل ادارے کیسے چل پائیں گے۔"

"عمران خان کے لیے تو کہا جاتا ہے کہ "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" آپ اس سے اتفاق کریں گے؟"

"میں نہیں مانتا اس بات کو، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ آپ نے اپنے گھر سے تو امیدوار نہیں لانے ہوتے، آپ نے وہی امیدوار لانے ہوتے ہیں جو موجود ہوتے ہیں۔ جیتنا بھی تو ہے۔ پندرہ سال سے امیدوار لا بھی تو نہیں پا رہے۔ پالیسی اچھی ہو، سب کو ڈسپلن میں رکھیں۔ چین میں جب لانگ مارچ ہوا "چواین لائی" کی قیادت میں تو چین کے لوگ جاپان سے تو نہیں آئے تھے۔ اسی طرح جب کسی ملک میں سوچ تبدیل ہوتی ہے تو وہی لوگ تبدیل ہو جاتے ہیں۔"

"ہمارے سیاست دان اپنی آدھی زندگی ملک سے باہر گزارتے ہیں۔ وہاں کے قوانین، ڈسپلن اور صفائی دیکھتے ہیں۔ پھر اپنے ملک کو ویسا کیوں نہیں بناتے؟"

"قوانین کو نافذ کر کے اس پر عمل کرانے کی ضرورت ہے۔ ہم دبئی میں جاتے ہیں، ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے ملک کی موٹروے پر جاتے ہیں تو ڈسپلن ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اندر صلاحیت تو ہے۔ اگر اسی طرح کے قوانین پر عمل کرائیں جیسے موٹروے پہ کراتے ہیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سارا کام گورننس کا ہے اور یہی بنیادی پرابلم ہے پاکستان میں۔ میں پاکستان کے حالات سے بالکل بھی مایوس نہیں ہوں ان شاء اللہ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"کافی باتیں ہو گئیں ملک کے حالات پر، یہ بتائیے کہ بچپن سے لے کر اب تک مزاج کے کیسے ہیں؟ کیا اتار چڑھاؤ آیا؟"

"میں بہت ٹھنڈے مزاج کا ہوں۔ غصہ کم آتا ہے۔ پڑھنے لکھنے سے بہت دلچسپی ہے۔ مصروف بہت رہتا ہوں۔ کسی سے لڑنے جھگڑنے کا وقت ہی نہیں ملتا اور کیا کرنا ہے غصہ دکھا کر۔ اپنی ہی انرجی ضائع ہوتی ہے۔ کبھی غصہ آ بھی جائے تو خاموش ہو جاتا ہوں۔"

"آپ نے کتنی کتابیں لکھی ہیں؟ اور کیا لوگوں کو

ابھی بھی مطالعے کا شوق ہے؟"
"میں نے آٹھ کتابیں لکھی ہیں اور ایسا نہیں ہے کہ لوگ پڑھتے نہیں ہیں' لوگوں کو اب بھی مطالعے کا بہت شوق ہے۔ میری ایک کتاب کے تیرہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ ایک کے چار ایڈیشن شائع ہوئے۔ اگر کتابیں اچھی ہوں' دلچسپ ہوں تو لوگ ضرور پڑھتے ہیں۔"
"کہا تو یہی جاتا ہے کہ انٹرنیٹ کا دور ہے۔ کمپیوٹر کا دور ہے' ایک کلک پہ سب کچھ مل جاتا ہے۔ اس لیے مطالعے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔"
"ہاں! یہ بات ٹھیک ہے کہ انٹرنیٹ کا دور ہے اور مطالعے کی طرف رجحان کم ہو گیا ہے' مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ لوگ بالکل ہی مطالعہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔ اگر اچھی کتابیں لکھی جائیں تو لوگ کیوں نہ پڑھیں گے اس لیے لکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ ایسی کتابیں لکھیں کہ لوگ اس طرف راغب ہوں۔"
"آپ نے انٹرنیشنل اخبارات میں بھی کالم لکھے؟ ..... کیا مالی اعتبار سے صحافت کی یہ فیلڈ اسٹرونگ ہے؟"

"میں نے انگریزی اخبارات میں بھی کالم لکھے ہیں۔ مالی اعتبار سے پہلے یہ فیلڈ اتنی اسٹرونگ نہیں تھی' مگر اب ہمارے لیے کافی بہتر ہو گئی ہے۔"
"اور جب یہ فیلڈ اتنی اسٹرونگ نہیں تھی تو کبھی آپ نے سوچا کہ کسی اور فیلڈ میں چلا جاؤں؟ اس سے تو دال روٹی نکالنا مشکل ہو رہا ہے۔"
"نہیں' ایسا کبھی نہیں سوچا۔ یہ میری پسندیدہ فیلڈ تھی۔ اس میں آ گیا تو بس آ گیا۔ پھر کبھی کسی اور فیلڈ میں جانے کے بارے میں نہیں سوچا۔"
"اتنی کتابیں لکھیں' اتنے کالمز لکھے' اپنی زندگی کا بہت قیمتی وقت آپ نے اس فیلڈ کو دیا۔ ایوارڈز کتنے ملے ہیں آپ کو؟"
"نہیں' کوئی ایوارڈ نہیں ملا۔ ویسے اصل ایوارڈ تو عوام کا ایوارڈ ہے' جو مجھے بہت چاہتے ہیں۔ میرے کام کو سراہتے ہیں۔ خواہش تو ہوتی ہے کہ ایوارڈ ملیں' مگر میں عوام کے ایوارڈ کو سب سے بڑا ایوارڈ سمجھتا ہوں۔"

"اس فیلڈ میں آکر کیا کھویا؟ کیا پایا؟"
"کچھ نہیں کھویا۔ میں نے اس فیلڈ میں آکر پایا ہی پایا ہے۔ کھویا بھی ہو گا تو کم ہی کھویا ہو گا۔"
"جو نوجوان اس فیلڈ میں آنا چاہتے ہیں' ان کے لیے آپ کیا کچھ کہنا چاہیں گے؟"
"محنت کریں' ایمان داری کے ساتھ کامیابی بالآخر قدم چومتی ہے۔ ہمارے پاس اور کچھ بھی نہیں ہے سوائے محنت کے..... کام' کام اور صرف کام۔"
"نوجوانوں میں صلاحیت ہے آگے بڑھنے کی' مگر Motivate (آمادہ) کرنے والا بھی تو کوئی ہو؟"
"Motivation بھی اپنے اندر خود پیدا کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔"
"صبح اٹھنے کے اوقات کیا ہیں آپ کے؟ فارغ اوقات میں کیا کرتے ہیں؟"
"صبح اٹھتے ہی چائے کے کپ کے ساتھ ہی اخبارات کا مطالعہ شروع ہو جاتا ہے۔ دو گھنٹے اخبار پڑھتا ہوں..... آج کل ایڈیٹوریل صفحہ میں ہی کرتا ہوں۔ فارغ اوقات میں کتابیں پڑھتا ہوں۔ کبھی کبھار دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا ہوں۔ کبھی فیملی کے ساتھ۔"
"فرمائش کر کے کیا پکواتے ہیں؟"
"گھر میں ہوتا ہوں تو فرمائش کر کے کھانا پکواتا ہوں بیگم سے۔ مجھے پلاؤ بہت پسند ہے۔ رات کو بھی پلاؤ پکایا تھا اور آج اتوار ہے تو آج بھی پکوایا ہے۔ سبزیاں بھی پسند ہیں۔ کریلے بھی اچھے لگتے ہیں اور گوبھی بھی۔"
اور اس کے ساتھ ہی ہم نے سہیل وڑائچ صاحب سے اجازت لی۔

صبیحہ ناز..... لاہور

میں نے یہ ڈائجسٹ کب سے پڑھنا شروع کیا' یہ تو یاد نہیں' مگر ایک چیز جو کبھی نہیں بھولی' وہ یہ ہے کہ اس نے میری ذاتی ارتقا اور اخلاقی تربیت میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ ذہن میں کوئی گرہ لگی ہوئی تھی' الجھنوں کا سامنا تھا کہ اچانک اس کی کسی کہانی' کسی شعر یا عدنان کے نام آنے والے خطوط کے جوابات یا پھر کسی اقوال زریں میں مجھے اپنی الجھن کا سرا مل گیا اور بات بگڑتے بگڑتے بن گئی۔
اس ماہ کے شمارے نے خط لکھنے پر مجبور کر دیا۔ جنوری کے شمارے کے سرورق پر ماڈل بہت خوب صورت تھی اور انداز دلربا تھا' مگر یکسانیت کا بری طرح احساس ہوا' دلہن' میک اپ' زیور' گلیمر بس بھی کرو۔ آپ کا شمارہ اب محض وقت گزارنے کا کام نہیں کر رہا۔ یہ اب نوجوان نسل کی ذاتی اور روحانی تربیت گاہ بن چکا ہے' سرورق ایسا ہونا چاہیے کہ دیکھتے ہی دل میں اللہ کی قربت کا احساس جاگے۔
جنوری کے شمارے میں اور کبھی کبھی اس سے پہلے بھی پروف کی کافی غلطیاں دیکھنے میں آئی ہیں' مثلاً "کس سے کی جگہ کسی سے" وغیرہ۔ دوسری بات یہ کہ ناول "چراغ آخر شب" کی قسط کبھی کبھار شامل ہی نہیں کی جاتی اور وجہ بھی نہیں بتائی جاتی۔ کنیز نبوی نے "روشنی کی خواہش میں" اچھا لکھا' محبت کی بے ساختگی اور بے چارگی بڑی نمایاں تھی اور عورت کی مظلومیت کا بھی بڑا واضح احساس تھا۔ مگر پھر بھی انجام تشنہ سا لگا۔ باقی سارے سلسلے ٹھیک جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی افسانے خاص متاثر کن نہیں ہوتے۔ فرحت اشتیاق کو مبارک باد' ان کا ناول بے حد سحر انگیز ہے۔ آخر میں ایک جملہ کہنا چاہوں گی۔
"معیار بنانے میں عمریں لگ جاتی ہیں اور اسے قائم رکھنے میں سانسیں رک جاتی ہیں۔"
ج: آپ نے صبیحہ ٹھیک کہا۔ معیار بنانا مشکل ہے مگر اسے قائم رکھنا اس سے زیادہ مشکل ہے۔ ہماری پوری کوشش ہوتی ہے کہ خواتین کا معیار برقرار رہے "چراغ آخر شب" کے بارے میں آپ کا کہنا درست نہیں ہے۔ صرف ایک بار ایسا ہوا ہے کہ قسط شامل نہیں ہو سکی۔ ورنہ یہ ناول باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔
خواتین ڈائجسٹ میں آپ کی آمد اچھی لگی۔ ٹائٹل کے لیے آپ کے مشورے پر غور کریں گے۔

شائستہ شہباز..... گجرات

میں گزشتہ بیس سال سے شعاع' خواتین ڈائجسٹ کی قاری ہوں۔ مجھے پاکستان کے موجودہ دور کے ادب میں اس سے بہتر کوئی لٹریچر نہیں لگتا۔ میری والدہ تو برسوں سے اس کی شیدائی ہیں۔ ہم ابھی بچے تھے کہ اپنی والدہ کو پڑھتے دیکھا۔ میں نے ٹین ایج میں لکھنا شروع کیا اور میری تحریریں کافی پسند کی جاتی تھیں 1995ء میں میری شادی کچھ ایسے ماحول میں ہوئی کہ ادب کا ساتھ چھوٹ گیا۔ زندگی میں تلخیاں اور الجھاؤ اتنے تھے کہ اپنی ہستی بھی

بھول گئی کہ میں کون ہوں؟ اب میں خواتین ڈائجسٹ کے لیے ناول لکھنا چاہتی ہوں اور شروع کر دیا ہے آپ اس سلسلے میں میری رہنمائی کریں۔

ج پیاری شائستہ! آپ ضرور لکھیں۔ خواتین ڈائجسٹ کے صفحات حاضر ہیں۔ صفحے کے ایک جانب سطر چھوڑ کر لکھیں اور ہمیں بھجوا دیں۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو ہم آپ کو فون کر کے بتا دیں گے۔

ام صغریٰ...... کراچی

اس سے پہلے خط لکھنے کی جرات نہ ہو سکی کہ نہ جانے شائع ہو گا کہ نہیں، میرا تعلق امی اور ابو دونوں کی طرف سے پنجاب سے ہے۔ سرگودھا سے چار گھنٹے کی مسافت پر ایک وادی ہے جہاں کے ہم باسی ہیں۔ خوشاب ایک چھوٹا سا شہر ہے، جہاں آپ ویگن سے اتریں گے۔ یہاں میں آپ کو ایک بات بتاتی چلوں سرگودھا کا ڈھوڈا، پتیسا اور ملتان کا ملتانی حلوہ جو آپ کو خوشاب سے ملے گا، وہ پورے پنجاب سے نہیں ملنے والا (دیسی گھی میں پکا ہوا) ہے۔ خوشاب سے بیس منٹ کی مسافت پر وادی سون ہے۔ چاروں طرف سے سنگلاخ پہاڑ ایک گول دائرے کی شکل میں اسے گھیرے ہوئے کھڑے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا نام وادی سون اس لیے پڑا کہ کسی زمانے میں یہاں ایک سمندر ہوا کرتا تھا جو بعد میں خشک ہو کر پہاڑوں کی شکل اختیار کر گیا۔ اب بھی یہاں بہت سی چھوٹی بڑی جھیلیں پائی جاتی ہیں جو کہ سمندر کا پتہ بتاتی ہیں۔ جب سورج کی کرنیں ان جھیلوں کے نیلے پانیوں پر پڑتی ہیں تو موتیوں کی طرح چمک پیدا ہوتی ہے جو آپ کو مبہوت کر دیتی ہے۔

یہاں کے چند پھل اور سبزیاں بہت مشہور ہیں جن میں آڑو، خوبانی، سیب، ناشپاتی، سبزیوں میں گوبھی، آلو، مکئی اور گندم وغیرہ زیادہ مشہور ہیں۔ گرمیوں کے موسم میں ہر طرف پھول اور سبز چٹانوں کا منظر ہوتا ہے۔ ہر طرح کے پھول عام مل جاتے ہیں۔ گلاب کی تو بات ہی کچھ اور ہے بادشاہ جو ہوا۔ خشک پہاڑ ہری پوشاکیں پہن لیتے ہیں۔ بارش آ جائے تو چشمے پھوٹ پڑتے ہیں۔ زیادہ عرصہ یہاں سردی پائی جاتی ہے۔ اسی لیے لوگ خشک میوے جمع کر کے اپنے گھروں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

یہاں کے لوگ بہت ہی سادہ مزاج ہیں۔ یہاں پٹھان، پنجابی مل کر رہتے ہیں بلکہ میں نے تو سندھی گھرانہ بھی دیکھا ہے۔ کاش کہ سارے پاکستانی اپنے اندر کے فرق کو مٹا ڈالیں۔ باجی کبھی آئیں نا ہماری وادی کی طرف خوب مہمان نوازی کرنے والے لوگ ہیں۔

ج ام صغریٰ خوشاب کے بارے میں اتنی اچھی طرح اور خوب صورتی سے لکھا کہ بے اختیار آپ کا مہمان بننے کو دل چاہا۔ کبھی زندگی نے موقع دیا تو آپ کی دعوت ضرور قبول کریں گے۔ وطن عزیز کا ہر شہر، ہر گاؤں بہت خوب صورت ہے اور کوئی نہ کوئی خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ ہم پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم ہے۔ کاش ہم اس کی قدر کر سکیں۔

آپ نے اپنے شہر کا تعارف تو کرا دیا لیکن خواتین ڈائجسٹ کے بارے میں کچھ نہیں لکھا آئندہ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کیجیے گا۔

فاطمہ اصغر...... ڈجکوٹ فیصل آباد

آپ کا شمارہ بہت اچھا ہے۔ اتنا اچھا ہے کہ اس کی تعریف کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ آپی میں نے ایک دو افسانے وغیرہ لکھے ہیں کیا وہ شائع ہو جائیں گے۔ آپی آپ سے ایک فرمائش کرنی ہے پلیز قومی کرکٹر سعید اجمل اور شاہد آفریدی کا ان کی بیویوں کے ساتھ انٹرویو کریں اور آپی میں نے ماہا ملک کا ناول جو چلے تو جاں سے گزر گئے منگوانا ہے۔ پلیز مجھے اس کا طریقہ اور قیمت اور ڈاک خرچ وغیرہ بتا دیں اور آپی اگر میں 600 روپے لفافے میں رکھ کر بھیج دوں تو کیا مجھے خواتین ہر مہینے مل جایا کرے گا۔

ج پانچ سال سے خواتین پڑھ رہی ہیں اور ایک بار بھی خط نہیں لکھا، اپنے افسانے بھجوا دیں۔ قابل اشاعت ہوئے تو ضرور شائع ہوں گے۔

ناول "جو چلے تو جاں سے گزر گئے" منگوانے کے لیے آپ 150 روپے درج ذیل ایڈریس پہ منی آرڈر کریں۔

مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی۔

کتاب آپ کو گھر پر مل جائے گی۔

خواتین ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کرنے کے لیے آپ رقم لفافہ میں نہ ڈالیں، اس میں رقم گم ہونے کا اندیشہ ہے۔ آپ 600 روپے درج ذیل ایڈریس پر منی آرڈر کریں۔

خواتین ڈائجسٹ۔ 37 اردو بازار کراچی۔ خواتین آپ کو گھر بیٹھے مل جائے گا۔

صائمہ سرفراز...... کراچی

آپی! مجھے یہ بتائیں کہ یہ خواتین اتنی دیر سے کیوں آتا ہے؟ اس دفعہ بھی پرچا تقریباً" دو دن میں پڑھ لیا حالانکہ ظالم سماج (میاں جی) نے دیوار بننے کی کوشش بہت کی مگر...... افسانوں میں "رنگ ہائے زیست" میں راشدہ جی نے متوسط طبقے کی عکاسی کی جو کہ اچھی کاوش تھی "ڈھل گئی رات" باپ بیٹوں کی کہانی مزاح کا عنصر لیے ہوئے اچھی لگی "سائباں" کی بات کریں تو اس میں راحت جی نے ہم لوگوں کو آئینہ دکھایا ہے کہ ہمارا مستقبل بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ ناولٹ میں "کہیں دیر نہ ہو جائے" صوفیہ جی کی اچھی تحریر تھی۔ "ساری بھول ہماری تھی" معاف کیجیے گا ہم ناول کی بات نہیں کر رہے بلکہ یہ تو راحت جبیں کے ناولٹ کا ذکر ہے۔ شروع شروع میں پڑھنے میں کنفیوژن رہی۔ چار چار گھروں کی کہانی اور پھر کرداروں کی بھرمار۔ جب کہانی سمجھ آنے لگی دلچسپ لگی تو نظر آیا باقی آئندہ چلو جی انتظار کرو۔ انتظار تو اب نگہت جی کے ناول "میرے خواب لوٹا دو" کا شدت سے ہے۔ جس میں نیا موڑ دیا ہے انہوں نے۔ نیا تو کچھ ناول "پناہ" میں بھی نظر نہیں آیا وہی روایتی پن۔ شروع میں الگ اور آخر میں مل جانا۔

مل جانا چاہیے لیزا کو بھی صبر کا پھل کہ فرحت جی معلوم نہیں کتنا بیچاری کو انتظار کروائیں گی کہ وہ سکندر کی تصویر بنانے میں کامیاب ہو سکے۔ کنیز نبوی کی تحریر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی جنہوں نے اتنی مصروفیت میں ہم بہنوں کے لیے اپنا قیمتی وقت نکالا اور اتنا اچھا شاہکار بھیجا۔ بہت زبردست ناول تھا باقی انٹرویو بھی ٹھیک تھے۔ آپی! میں آپ کے رسالے کے ذریعے اپنی بہنوں سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ پلیز یہ ویلنٹائن ڈے وغیرہ کچھ بھی نہیں۔ یہ سب غیر ملکی سازش ہے میڈیا، موبائل کے ذریعے مسلمانوں خاص طور پر نوجوان نسلوں کو بگاڑ رہے ہیں۔ پلیز اپنے آپ کو بچائیے، یہ سب ایک خاص وقت پر اچھا لگتا ہے اور کسی خاص کے ساتھ اچھا لگتا ہے۔ جو ہمارا اپنا یعنی لائف پارٹنر ہو۔

ج پیاری صائمہ! ہمیں احساس ہے کہ ہماری قارئین کو بے چینی سے خواتین ڈائجسٹ کا انتظار کرتی ہیں۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ یہ جلد آ جائے۔ لیکن ناول کی اقساط دیر سے موصول ہونے کی بنا پر ہم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہو پاتے۔

خواتین ڈائجسٹ پر تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

آسیہ مقصود (ای میل)...... ملتان

گزشتہ ماہ "سفال گر" کی آخری قسط دیکھ کر اداسیوں نے گھیر لیا۔ نجانے بشریٰ سعید سے اگلی ملاقات کب ہو۔ "سفال گر" کو پڑھ کر میں نے ہمیشہ جو محسوس کیا، اسے الفاظ کا روپ دینا میرے بے ہنر کلام کی بساط نہیں۔ بے بسی کا احساس ہمیشہ دامن گیر رہا، باوجود اس کے کہ میں نے بشریٰ کو خراج تحسین پیش کرنے کی کئی بار ادنیٰ سی کوشش کی ہے۔ مگر آمنہ زرین کا تبصرہ پڑھ کر دل کی بے کلی کسی حد تک کم ہو گئی۔ بے شک کچھ لوگوں کو حق ادا کرنے کا ہنر آتا ہے۔

صوفیہ امجد نے تو بڑے موقع سے افسانہ لکھ دیا۔ میں نے ایک عزیزہ کو پڑھنے کے لیے دے دیا۔ انہیں ضرورت تھی ناں۔ کنیز نبوی کی تحریریں جڑاؤ نگینے کی طرح ہوتی ہیں۔ اس میں الفاظ کے نگینے اس قدر نفاست سے صحیح جگہ پر جڑے ہوتے ہیں کہ قاری داد دیے بنا نہیں رہ پاتا۔ یہ طرز تحریر صرف آپ ہی کا خاصا ہے۔ کنیز! آپ نے اس موضوع پر قلم اٹھا کر بڑی جرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ "ساری بھول ہماری تھی" کو پڑھ کر نجانے کیوں پی ٹی وی کے ڈراموں کا وہ سنہری دور یاد آنے لگا جب ہر کردار کے مکالمے اور حلیے سے اس کی بھرپور عکاسی کی جاتی تھی۔ ناولٹ کا پلاٹ کئی کنبوں کے درمیان بہت خوب صورتی سے پھیلا ہوا ہے۔ نبیلہ کی مدبرانہ شخصیت ماسٹر صاحب کی فہم و فراست اور بلو بطور انگریزی ینگ مین۔ مجموعی طور پر تمام تحریریں اچھی تھیں۔ یعنی نئے سال کا آغاز بہت اچھا رہا اور مہربانی کر کے "کوہ گراں تھے ہم" کے بارے میں بتا دیں۔

ج آسیہ جی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ بشریٰ سعید نے وعدہ کیا ہے آپ آئندہ ماہ ان شاء اللہ ان کا مکمل ناول پڑھ سکیں گی۔ آپ کا افسانہ زرد زمین کی کوکھ بہت اچھا تھا، قارئین نے بھی پسند کیا، اپنی تحریر کے لیے آپ 32721666 پر فون کر کے معلوم کر لیں۔

سحراور صائمہ...... تونسہ شریف

جنوری کا شمارہ جب ہمارے ہاتھوں میں آیا تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کیا کوئی ٹائٹل اتنا خوب صورت ہو سکتا ہے۔

مکمل ناول میں کنیز نبوی کا ناول بہت پسند آیا۔ لیکن نبیلہ عزیز کا ناول کچھ خاص نہیں تھا اور ہاں فرحت اشتیاق کے ناول میں کچھ تیزی آئی ہے۔ ورنہ سکندر کی بیماری اور لیزا کی تیمارداری پڑھ پڑھ کر ہم سخت بور ہو گئے تھے۔ افسانوں میں مجھے راشدہ رفعت کا افسانہ بہت اچھا لگا۔ باقی شمارہ ہمیشہ کی طرح اچھا تھا۔ آپی! آپ سے ریکویسٹ ہے پلیز شاہد آفریدی اور اعصام الحق کا انٹرویو ضرور دیجیے گا۔

ج سحر اور صائمہ۔ خواتین کی محفل میں خوش آمدید ٹائٹل کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ شاہد آفریدی اور اعصام الحق کے انٹرویو کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ جلد پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔

دیا زورین...... ڈگری کالج ڈہرکی

سرورق اس بار لاجواب تھا۔ ٹائٹل گرل کی معصومیت اور ڈریسنگ بہت پسند آئی۔ فہرست میں نبیلہ عزیز کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا اور سب سے پہلے ان ہی کا مکمل ناول "پناہ" پڑھا۔

اس کے بعد فرحت آپی کا "جو بچے ہیں سنگ" پڑھا اس قسط میں کافی انکشافات ہوئے۔ سکندر شہریار کو پہلے اتنا اچھا دکھایا گیا تھا۔ پھر اتنا برا دکھایا گیا۔ کچھ عجیب سا لگا۔ "ڈھل گئی رات" ام ثمامہ کا افسانہ سب پر سبقت لے گیا۔ "رنگ ہائے زیست" راشدہ رفعت نے اچھا لکھا۔ سائباں راحت وفا کا افسانہ پسند آیا۔

"ساری بھول ہماری تھی" راحت جبیں کا ناولٹ بے حد پسند آیا۔ مگر باقی آئندہ ماہ پڑھ کر منہ بن گیا۔ دیگر مستقل سلسلے بھی اچھے جا رہے ہیں۔ خاتون کی ڈائری میں رافعہ بلوچ کا انتخاب اچھا لگا۔ "خالی ہاتھ" نگہت نسیم کی نظم بہت پسند آئی۔

ج دیا جی! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ندا فرحان (ای میل)...... کینیڈا

میں آپ کے تینوں ڈائجسٹوں کی بہت بڑی فین ہوں۔ فرحت اشتیاق میری موسٹ فیورٹ رائٹر ہیں۔ میں آٹھویں کلاس میں تھی، جب آپ کا "کوئی ایسا شجر ہو" پڑھا۔ اب تک یاد ہے اور اب "جو بچے ہیں سنگ" زبردست ہے۔ نبیلہ عزیز کی بھی کیا بات ہے۔ آپ کا شرط پڑھا اور اس کے بعد آج تک کوئی ناول نہیں چھوڑا۔ پلیز، "کوئی ایسا اہل دل ہو" کی طرح کا کوئی ناول لکھیں۔ نمرہ کا "مصحف" میری زندگی سے کافی ملتا ہے۔ افسانے سب اچھے تھے۔ ناولٹ میں صوفیہ امجد زبردست۔ بشریٰ سعید کو بہت بہت مبارک باد۔ ماڈل کو جب بھی دیکھا، اچھی لگی۔ ادارہ خواتین کا بہت شکریہ جن کی وجہ سے رائٹر کو اتنا نام، اتنی شہرت ملتی ہے۔

ج ندا! وطن سے اتنی دور خواتین ڈائجسٹ آپ کے ساتھ ہے۔ یہ جان کر دلی مسرت ہوئی۔ ہماری دعا ہے کہ یہ "ساتھ" ہمیشہ قائم رہے اور ہم آپ کی امیدوں پر پورے اترتے رہیں۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

عزت...... لاہور

ٹائٹل زبردست رہا اس بار بھی۔ نبیلہ عزیز کا مکمل ناول کمال کا تھا۔ ثمینہ عظمت اور ام ثمامہ کے افسانوں کا کیا ہی کہنا۔ سعدیہ خان سے ملاقات کر کے بہت خوشی ہوئی۔ میں نے 15 نومبر کو ایک تحریر "ترک تعلق کے باوجود" اقصیٰ زاہد شیخ کے نام سے بھیجی تھی وہ قابل اشاعت ہے یا نہیں۔

ج عزت! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ ہمیں بہت افسوس ہے آپ کی کہانی قابل اشاعت نہیں کہانی میں صرف تاثرات ہیں۔ کہانی پڑھ کر ادھورے پن کا احساس ہوا۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ایس ڈی طلحہ فاروق...... لاہور

آداب! چودہ سالوں میں بہت ہمت کر کے آج اس وقت دل نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا جب میرے آنگن میں ایک ننھا سا پھول کھل چکا ہے۔ "خواتین" سے میری بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ وہ انمول یادیں جو ماں کے دامن سے مجھے ہر پل باندھے رکھتی ہیں میں بہت چھوٹی تھی جب امی کے ڈائجسٹ ان سے چھپ چھپ کر پڑھتی تھی۔ آج ان کے انتقال کو نو برس ہو چکے ہیں اس لیے خواتین سے میرا رشتہ بہت انمول اور میری سنہری یادوں میں سے ایک ہے۔ "سفال گر" ان تحریروں میں سے ایک ہے جو دل و دماغ پر ایک انمٹ نقش چھوڑ جاتی ہیں۔ میں اتنا اچھا اور مکمل ناول لکھنے پر بشریٰ سعید کو تہہ دل سے مبارک باد پیش کرتی ہوں۔ اس ماہ ٹائٹل پر پیاری سی مسکراہٹ کے ساتھ سال نو کی نوید دیتی ماڈل نے دل موہ لیا۔ کرن کرن روشنی سے مستفید ہو کے آگے بڑھی تو پروین شاکر کے موتی جیسے لفظوں نے ابن انشا کو پھر سے دلوں میں زندہ کر دیا۔ عمران اسلم اور سعدیہ خان سے ملاقات اچھی رہی۔ سلسلہ وار ناول خاص طور پر فرحت اشتیاق کا "جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو" بہت اچھا جا رہا ہے کنیز نبوی کے ناول "روشنی کی خواہش" نے بہت متاثر کیا۔ معاشرے کی اس کالی تصویر پہ دل خون کے آنسو رویا۔ نبیلہ عزیز کی تحریر "پناہ" بھی اسی معاشرے کی تصویر کا ایک رخ تھی۔ افسانوں میں "ڈھل گئی رات" اور "سائباں" اچھے تھے۔

ج اچھی بہن! آپ نے اپنا نام نہیں لکھا۔ نام انسان کی شناخت ہوتا ہے۔ اس لیے نام ضرور لکھنا چاہیے۔ خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نینا گل (ای میل)...... نیویارک

خواتین کے بارے میں کیا کہوں یہ مجھے اتنا پسند ہے کہ میری خواہش ہے، ہر ماں اپنی بیٹی کو ضرور پڑھوائے۔ میں بھی اپنی بیٹیوں کو ضرور پڑھنے دوں گی۔

اب بات ہو جائے ذرا تحریروں کے بارے میں۔ کنیز نبوی کیا خوب لکھا آپ نے۔ موبل کا صبر بہت پسند آیا۔ گوہر کی سزا موت سے بڑھ کر ہونی چاہیے تھی، ساری عمر تڑپتا رہے۔ ناول کے لیے۔ "پناہ" کچھ ادھورا سا لگا۔ فرحت کو کیا کہوں مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ ام مریم کا سارا قصور ہو گا مجھے اندازہ تھا یہ ناول سپر ہٹ جائے گا۔ ثمینہ! آپ کو سلام کرنے کا جی چاہتا ہے۔ میں اتفاق کرتی ہوں کہ واقعی میڈیا کچھ زیادہ ہی آزاد ہو گیا ہے۔

ج پیاری نینا! آپ نے اتنی دور سے یاد کیا، تہہ دل سے شکریہ۔

مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔ "پناہ" آپ کو ادھورا لگا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ہمارے خیال میں تو کہانی مکمل تھی۔

فوزیہ ثمروٹ، طیبہ عمران...... گجرات

سرورق پر پنک ڈریس، پنک میک اپ میں مسکراتی ماڈل بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح کرن کرن روشنی سے اپنے اردگرد روشنیاں بکھیریں۔ قارئین کے جوابات سب ہی اچھے لگے سعدیہ خان سے ملاقات بس ٹھیک رہی۔

آپ کا باورچی خانہ کی جگہ کسی نئے سلسلے کو ہونا چاہیے۔ موسم کے پکوان میں اگر آئندہ کسی ماہ کڑاہی بنانے کا طریقہ بتا دیں جب ہم کڑاہی بناتے ہیں۔ تو وہ کھٹی نہیں بنتی)۔ رنگا رنگ پھول بہترین سلسلہ ہے۔

پلیز اگر ہو سکے تو قارئین کے لیے "مجھ سے ملیے" جیسا کوئی نیا سلسلہ شروع کریں دلچسپ سوالوں کے ساتھ۔ "سفال گر" بشریٰ سعید کی ناقابل فراموش تحریر تھی۔ بشریٰ سعید کی ایسی ہی زبردست داستان کے منتظر ہیں۔

نبیلہ عزیز کا "پناہ" جنوری کی بہترین کاوش تھی۔ ڈھل گئی رات ام ثمامہ نے بہت اچھا موضوع چنا تھا۔ کہیں دیر نہ ہو جائے، وہی ماؤں کا ازلی ڈر اور خوف کہیں بہو بیٹے کو چھین نہ لے اور ساس کو فالتو سامان کی طرح گھر کے کسی کونے میں رکھ دے۔

کنیز نبوی کی تحریر روشنی کی خواہش بھی اچھا تھا۔ ان کی تحریروں میں تھر کی کیناؤں کا درد بولتا ہے کیا ان کا تعلق سندھ کے علاقے سے ہے؟ راحت وفا کا سائبان بھی بہت اچھا لگا۔ راحت جبین کا ناولٹ ساری بھول ہماری تھی۔ اچھا لگا۔ اسٹوری میں جان دار کردار تایا جی اور تائی کا ہے جن کی پیار بھری لڑائی اور مکالموں کی تکرار اچھی لگ رہی ہے۔ لگتا ہے راحت جی کی باقی تحریروں کی طرح یہ تحریر بھی شان دار رہے گی۔

ج فوزیہ اور طیبہ! تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ کنیز نبوی کا

تعلق صوبہ سندھ سے ہے لیکن عورت کے جن دکھوں کو وہ زبان دیتی ہیں۔ وہ ہمارے ہاں عورت کا مقدر ہیں خواہ اس کا تعلق خیبر پختون خواہ سے ہو یا پنجاب اور بلوچستان سے ہر جگہ با اثر لوگ اپنے تحفظ کے لیے ایسے ظالمانہ قوانین کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ بشریٰ سعید کی تحریر ان شاءاللہ آئندہ ماہ شامل ہوگی۔

باورچی خانہ کا سلسلہ آپ کو پسند نہیں ہے اگر دیگر قارئین نے بھی تائید کی تو ہم یہ سلسلہ بند کردیں گے۔ کڑاہی بنانے کی ترکیب آئندہ ماہ پکوان کے سلسلے میں شامل ہوگی۔ ویسے آپ کی کڑاہی کھٹی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ ٹماٹر کم ڈالتی ہیں اگر ٹماٹر زیادہ ڈالیں گی تو کڑاہی کھٹی بنے گی۔

عائشہ انور (ای میل)...... سڈنی

میں گزشتہ بیس سال سے خواتین کی قاری ہوں جب میں ایک بچی تھی اور میری والدہ ڈائجسٹ پڑھا کرتی تھیں اور مجھے منع کرتی تھیں۔ مگر اب میں شادی شدہ ہوں۔ اب باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔ میں بڑے وثوق سے کہتی ہوں کہ خواتین ڈائجسٹ ایک ایسا ادارہ ہے، جو لڑکیوں اور خواتین کو زندگی کے حقائق سے روشناس کراتا ہے۔ خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں۔ میرے دو بچے ہیں اور میں سڈنی میں رہتی ہوں مگر خواتین پڑھنا کبھی نہیں بھولتی۔ میں بچوں کی کہانیاں لکھا کرتی تھی۔ اب خواتین ڈائجسٹ کے لیے لکھ رکھی ہیں۔ کیا میں بھیجوں آپ کو؟ شائع کریں گی اور کیا آن لائن بھیج دوں؟

ج عائشہ! آپ کی ای میل پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وطن سے اتنی دور رہ کر بھی خواتین سے آپ کا تعلق قائم ہے۔ ہمارے لیے اس سے بڑی بات کیا ہو سکتی ہے اس وقت خواتین ڈائجسٹ بیک وقت تین نسلوں کا پسندیدہ پرچا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کے لیے کہانیاں ضرور لکھیں لیکن آن لائن نہ بھجوائیں، بذریعہ ڈاک بھجوائیں۔

کرن تنیو...... میرپور خاص

میں نے نویں جماعت میں 76% سے کامیابی حاصل کی ہے اور اب دسویں جماعت میں آپ سب کی دعاؤں کی منتظر ہوں۔

تمام سلسلے بہت پسند آئے۔ میں بشریٰ سعید کی تحریر "سفال گر" کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتی، لفظوں میں اتنی سچائی گویا ایک فلم آنکھوں کے آگے چل رہی ہو گرانٹ کا آخری وقت پڑھ کر رونا آگیا۔ فرحت اشتیاق کا مکمل ناول "جو بچے ہیں" اچھا جا رہا ہے۔ سکندر کے اس رویے کی وجہ جان کر بہت حیرت ہوئی۔ ایسے بھائی بھی ہوتے ہیں؟ اتنا حسد اپنے چھوٹے بھائی سے۔ مجھے لیزا کا کردار بہت پسند ہے اور اس کا اسٹوڈیو بھی اور نبیلہ عزیز کا مکمل ناول "پناہ" بہت اچھا لگا اور شیخ زمان کے کردار سے بہت نفرت ہوئی اور اب آتی ہوں کنیز نبوی کی تحریر "روشنی کی خواہش" کی طرف، اس میں سرداروں اور وڈیروں کی ایک تلخ سچائی ہے۔ صوفیہ امجد کی تحریر "کہیں دیر نہ ہو جائے" اور راحت وفا کی تحریر "سائبان" اور ام ثمامہ کی تحریر "ڈھل گئی رات" بہت زبردست تھے۔

ج کرن! کامیابی پر ہماری جانب سے مبارک باد قبول کیجیے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ فرحت اشتیاق کے ناول میں آپ سکندر کا کردار سمجھ نہیں پائی ہیں۔ سکندر کو زین سے حسد نہیں ہے، یہ زین کا احساس ہے کہ سکندر اس سے حسد کرتا ہے۔

خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

رفعت ناہید سجاد

پروفیسر عباس رشید کا گھرانہ علمی و تہذیبی اعتبار سے مڈل کلاس روایات کا امین ہے۔ پروفیسر صاحب کی قابلیت اور نیک نامی مثالی ہے۔ وہ تاریخ کے مضمون کے استاد رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں' ان کا دروازہ ہر طالب علم اور خاص و عام کے لیے کھلا رہتا ہے۔ شاگرد' ان کے علمی خزینے سے فیض حاصل کرنے آتے رہتے ہیں۔ گھر کا تمام نظم و نسق پرانی گھریلو ملازمہ کریم بی کے ذمہ ہے جو بڑی جانفشانی سے سنبھالے ہوئے ہیں۔ ان کی بیگم کے ساتھ اولادوں کو بھی آزادی اظہار کی مکمل اجازت ہے۔ ان کی تین اولادیں ہیں۔ تنویر' عثمان اور عبیر۔

بڑی بیٹی تنویر ماں کی لاڈلی ہے۔ دوران تعلیم غیر نصابی سرگرمیوں میں خاصی سرگرم رہی۔ وہ مقامی کالج میں پڑھاتی۔ شادی کے بعد اس کی صلاحیتیں جیسے گہنا گئی ہیں۔ سسرال میں علم اور تہذیب دونوں کی کمی ہے۔ ساس گھر پر حاوی ہیں' اپنے آگے وہ شوہر سمیت کسی کی چلنے نہیں دیتیں۔ تنویر کا شوہر نعیم روایتی مرد ہے۔ وہ ایک مقامی روزنامے میں صحافی ہے لیکن ایک پڑھی لکھی بیوی کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی بے حسی لیے ہوئے ہے۔ ایک بیٹی گڑیا ہے۔ جس کی نگرانی کریم بی کے سپرد ہے۔ پسند کی شادی اور نوکری کرنے کے باوجود سسرال میں اس پر زبان بندی کا اصول سختی سے لاگو ہے۔

عثمان عباس کا شمار ان نوجوانوں میں ہوتا ہے جو قابلیت اور ڈگری کے باوجود معقول نوکری حاصل نہیں کرپاتے۔ تاہم گھر کے ماحول اور پر اعتماد فضا نے اسے مکمل مایوس نہیں کیا ہے۔ وہ مختلف آئی ٹی یونی ورسٹیز کے لیے پروگرامنگ کرکے اتنا کما لیتا ہے کہ گزر اوقات اچھی ہو جائے۔

۲۸

اٹھائیسویں قسط

بند ہوتی آنکھوں اور غنودگی کی حالت میں اسے لگا۔ وہ ہوش سے دور ہوئی جا رہی ہے۔ بھاگتے قدموں کی آوازیں جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دے رہی تھیں' کوئی طوفان اٹھا تھا' آندھی' گرد بگولے۔

☼ ☼ ☼

کار کی رفتار بیل گاڑی سے کہیں تیز تھی۔ شیشوں کے پیچھے سے اس نے آہستہ آہستہ دور ہوتے مکانات' درخت' مسجد دیکھے سب تیزی سے پیچھے کی طرف دوڑ رہے تھے' وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔

دونوں ہاتھ نیچے لٹکائے کھڑا اس کا خاندان امید اور التجا سے اس کی طرف دیکھتا ہوا' شاید اس کا جانا ان کے حالات بدل ڈالے' کسی کو تو بلی چڑھنا پڑتا ہے نا۔ جیسے ایک دفعہ چاچا کرم داد کا بیٹا دوبئی گیا تو وہ سب اس کو رخصت کرنے اس پکی سڑک تک آئے تھے۔ اس دن ان رخصت کرنے آنے والوں میں وہ خود بھی شامل تھی جو آج ان سے بچھڑ کر چاچا کرم داد کے بیٹے کی طرح کسی جہاز میں بیٹھ کر' کسی ان دیکھی بستی کی طرف جانے والی تھی' ان دیکھی انجان بستیاں جو گاؤں کی ہر بوڑھی کی کہانی میں ہوتی ہیں۔ وہ جو درخت کے نیچے ایک دوسرے کے سر سے جوئیں نکالتی بچوں کو سناتی جاتی تھیں۔

اس کہانی میں کبھی گانا آجاتا تھا' کبھی مکالمہ شروع ہو جاتا' کبھی امید بندھتی تھی' کبھی خوف سے سانس رک جاتا تھا' وہاں زیادہ تر کہانیاں منظوم قصے تھے۔ تو قصے کہانیوں کی دنیا' ماں باپ کی دنیا' اپنا دیس' اپنے لوگ ہر گزرتے سیکنڈ میں اس سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ فضا دھندلا گئی تھی۔ کچھ گاڑی کے پہیوں سے اٹھتی گرد سے' کچھ دل سے اٹھتے بگولوں اور آنکھوں سے ایک تواتر سے بہتے آنسوؤں سے دکھائی کچھ نہیں دیتا تھا نہ وہاں جہاں سے وہ آئی تھی' نہ اس جگہ جہاں اسے جانا تھا۔

زیادہ دن نہیں گزرے جب صحن میں بچھنے والی چارپائیوں میں ارشاد کی چارپائی کم ہوئی تھی۔ اب اس چارپائی پر دوسرے نمبر والا پیر پھیلا کر اکیلا سوتا تھا' آج رات سے ایک ہی چارپائی پر گچھ مچھ ہو کر سونے والوں میں مزید کمی ہو جائے گی۔ ایک روٹی چنگیر میں اور مٹی کی ہانڈی میں ڈوئی بھر سبزی اور بچ جائے گی۔ جو کسی اور فرد کی بھوک بھرنے کا سبب بنے گی۔

جب کھانے والوں میں دن بدن اضافہ ہوتا ہو اور کمانے والوں پر بوجھ بڑھتا جا رہا ہو تو کچھ تو کمی بیشی کرنی پڑتی ہے یا کھانے والے کم ہوں یا کمانے والے زیادہ ہوں۔ جب ارشاد گھر سے رخصت ہوا تو اس پر ماتم کی وہ کیفیت طاری نہیں تھی جو پروین عرف پینو پر چھائی ہوئی تھی۔

وہ پیدا ہوا تو اس کو جتا دیا گیا تھا' وہ بڑا لڑکا ہے اور اس کو ماں باپ کا سہارا بننا ہے۔ جوان جہان اولاد' ماں باپ کی کمائی' روٹی کے ٹکڑے نہیں توڑتی۔ وہ جوان ہو گیا حالانکہ ابھی اس کے چہرے پہ نہ روئیں کا غبار آیا تھا' نہ آواز ٹوڈر کاں کی طرح پھٹی تھی لیکن آدھی رات کو پانی کی باری لگانے سے کھیت کی کٹائی تک' ٹھٹھرتی سردی میں' تپتی دھوپ میں وہ باپ کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح رہتا یا شاید اس سے اچھا تھا کہ بغیر کوئی چیں چپڑ کیے باپ جس کے پاس چھوڑ کر آیا' تابع داری سے چلا گیا تھا۔ اب اس کی باری آئی تھی۔

مالکوں کی عورتوں کو وہ پسند آگئی تھی اور کیوں نہ آتی۔ ہر روز کھل بنولے سے سر دھو کر' کنویں کا تازہ پانی ڈول بھر بھر کر اپنے وجود پر انڈیلتے وہ اس لائق بنائی گئی تھی کہ شہریوں میں چلنے پھرنے کے قابل بن سکے۔ یہ اور بات کہ اسے خود شہریوں میں سے ناقابل برداشت بو آتی تھی لیکن پسند کرنے کا اختیار نہیں تھا اور ناپسند کرنے کا اختیار پروین کو کسی نے نہیں دیا تھا۔

کھیتوں اور تالاب سے پرے' گاؤں کی واحد دوکان سے اس طرف ایکڑوں پر پھیلی ویران حویلی میں' جو کبھی کبھی

آباد ہوتی' اس کو یہی سمجھا بجھا کر بھیجا گیا تھا کہ ایسے کام کرنا کہ مالکوں کو گلہ نہ ہو۔ ہم ان کا دیا ہی تو کھاتے ہیں۔ کھیت' کھلیان' دھرتی' پانی سب ان کا ہے۔ وہ بھل بھل بہتی کسی میں شلجم توڑ کر دھوتے کھاتی حیران ہوتی۔ اللہ کی زمین پر اگا یہ شلجم جس کا بیج اس کے باپ نے بویا۔ اس کو پانی اس کا بھائی دیتا تھا اور جس کو اس نے خود توڑا تھا' مالکوں کا اس پر کیا حق تھا۔ مالکوں کو تو کبھی شلجم توڑتے اور بوتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

امام صاحب جب کبھی بچوں کو اکٹھا کرتے' عربی قاعدے کی پہچان کے ساتھ ساتھ بہت سے دینی واقعات سناتے جاتے تھے۔ یہ دنیا بنی کیسے تھی؟ اور ختم کیسے ہو گی؟ وہ دجال کا ذکر کچھ اس طرح بیان کرتے کہ اسے لگتا وہ ان دجالوں میں گھر گئی ہے۔ جو زمین کے تمام خزانوں کے مالک بن بیٹھے ہیں اور قیامت بس آنے والی ہے۔ اسے قیامت سے خوف آتا تھا' اگر وہ گھر سے دور ہوئی اور قیامت برپا ہو گئی تو کیا ہو گا۔

پھر اس کا جانا ٹھہر گیا' دو وجوہات پر' ایک تو اس کی خوش نصیبی تھی کہ وہ مالکن کو پسند آگئی لیکن وہ بجائے اپنی خوش نصیبی پر ناز کرنے کے' چھپ چھپ کے روتی رہی' دوسرے اس لیے کہ چند روز تر نوالے کھا کر اب خشک روٹی حلق میں پھنسنے لگی تھی۔ سو جب روٹی پوری پڑنا بند ہو گئی تو اس کا جانا لازم ہو گیا۔

اس شام سے اس نے چنگیر میں اپنے حصے کی روٹی بن کھائے چھوڑ کر پیٹ بھرنا شروع کر دیا تھا۔ شاید اس طرح اور ان کا بوجھ کم ہو جائے اور دجالوں پر کوئی خدا خوفی طاری ہو لیکن شاید کسی کا اس طرف دھیان بھی نہیں گیا کہ وہ چنگیر سے صرف آدھی روٹی سے پیٹ بھر کر کیوں اٹھنے لگی ہے سو اس کی قربانی رائیگاں گئی۔

گاؤں میں بھوک کے سوا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ بھوک بھی حق کے فرق کے ساتھ' بیٹے کی بھوک یا بیٹی کی بھوک' بیٹا پہلے کھاتا ہے' اس کا چنگیر پر حق ہے۔ اس سے بچ جائے تو بیٹی کے حصے میں آتا ہے۔ بیٹی استحقاق سے نہیں ڈر ڈر کے چنگیر کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

"ماں! میں یہ لے لوں؟" پھر جھجک کر ہاتھ پیچھے کر لیتی ہے۔

بھائی چھین کے کھا لیتا ہے' پتا نہیں چھین جھپٹ کر کھانا بھی چاہیے یا نہیں..... لیکن کیوں نہیں؟ بھوک ہی کے لیے ہاتھ باندھ کر تھر تھر کانپتے' رحم کی بھیک مانگتے اس کے ماں باپ' مالکوں پر واری صدقے جاتے۔ دان میں اپنی اولادیں بخشتے' پھر بھی اس ملال میں گرفتار کہ حق ادا نہیں ہوا۔

مالکن کسی تقریب کے لیے اس بے آباد گھر میں آبسے تھے۔ گاؤں کا گاؤں امنڈ پڑا' جنگل میں منگل ہو گیا۔ تنور سے تازہ روٹیاں لگ کر جا رہی ہیں۔ سرسوں کا ساگ گھوٹا جا رہا ہے' مکھن کے پیڑے نذر کیے جا رہے ہیں اور اللہ وسایا تو وہ خوش نصیب تھا جس کی بیٹی مہمان داری کی خدمت کے لیے وقف کر دی گئی تھی۔

جتنے دن ان کا وہاں قیام رہا۔ وہ پورا دن ان کے ساتھ گزارتی۔ رات کو باپ اس خوف کے ساتھ لینے آتا کہ کہیں رد تو نہیں کر دی گئی۔ اگر کسی کام میں مصروف ہوتی تو الٹے قدموں لوٹ جاتا اور کوئی گلہ نہ کرتا۔ "آدھے گھنٹے بعد آنا۔" وہ برتنوں کے ڈھیر سے سرمار رہی ہوتی جب انواع واقسام کے پکوان کی تھیلیاں لیے وہ واپس اس کے بغیر گھر آجاتا۔

آدھا گھنٹہ گاؤں کی تاریک رات میں ضروری نہیں تیس منٹ کا ہی ہو کبھی وہ پھیل کر گھنٹے تک نکل جاتا' کبھی سکڑ کر پندرہ منٹ کا رہ جاتا۔ کام کروانے والوں کا آدھا گھنٹہ بھی' کئی گھنٹوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس کو پھر واپس لوٹا دیا جاتا۔

اس طرح اس کے ایک دن میں کئی چکر لگتے۔ لیکن وہ چکر لگاتے کبھی نہیں تھکتا تھا' نہ بیٹی کو گھن چکر بناتے کوئی رنج ہوا۔ وہ خوش تھا کہ مالکن اس سے خوش تھے۔ رات کا کھانا تو پورا گاؤں وہیں سے کھاتا تھا لیکن وسایا کے حصے میں اس کھانے کے سوا اور بھی بہت کچھ آتا تھا۔

رات ہوتی تو گاؤں کے لوگ منادی کے ذریعے کھانے پر مدعو کرلیے جاتے' وہ سب کے سب ان کے صحن کی منڈیر سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھے' پتا نہیں کب تک اس زردے کا انتظار کرتے رہتے جس میں رس گلے اور اشرفیاں کثرت سے پڑی ہوتی تھیں۔ کسی کسی کے حصے میں دری یا چٹائی آجاتی ورنہ ننگی زمین بھی کسی کو چبھتی نہیں تھی اور پروین کے سوا کسی کو ان کا یہ رویہ بھی نہیں چبھتا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ علامہ اقبال کون تھے' کیا کہتے تھے مگر اس کا دل کہتا تھا کہ اس رزق سے موت اچھی.....

اس کے خیالات میں امام صاحب اور ان کے باغی بیٹے کے تربیت کا گہرا اثر تھا۔ باغی اکبر جب گاؤں آتا' علاقے کے بچوں کو گھیر گھار کر بیٹھ جاتا اور جانے کون کون سا الم غلم ان کے ذہن میں انڈیلتا رہتا۔

"حق' حق دار کا ہے' جاگیریں ختم ہونی چاہئیں۔ جو تم سے طاقت کے بل پر کچھ چھینتا ہے اور کچھ نہیں کرسکتے تو اس کو پتھر دے مارو۔ ووٹ سردار کے باپ دادا کی میراث نہیں' تمہارا ہے اور جو تمہارا ہے' وہ تمہارا ہی ہے۔ اسے مانگو مت' اپنے اختیار میں رکھو۔"

گاؤں میں تو لوگ اس سے ڈرتے ہی تھے' خوف کی یہ خبریں اور بھی پہنچیں۔ جاگیردار کے چمچے' امام صاحب کو اٹھا کرلے گئے ان کے اکلوتے بیٹے کی زندگی یا موت کے چناؤ کی دھمکیوں کے بعد۔

وہ واپس پلٹے تو انہوں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کرلی۔ ان کو معلوم تھا' اپنے اختیار سے گاؤں چھوڑ کر وہ کبھی نہیں جائے گا لیکن ان کا بیٹا ہے' تنہا دربدر بھٹکنے کے لیے چھوڑے گا بھی نہیں۔ وہ پچھلی نسل کے نمائندہ تھے اور پچھلی نسل ہمیشہ پیچھے ہی رہ جاتی ہے۔ خوف زدہ' دبکی سہمی' مرعوب' جب تک کہ اگلی نسل بوڑھی ہو کر اس کی جگہ نہ لینے آجائے۔ پھر نئی بوڑھی نسل کی کھیپ اور وہی خوف' وہی سہم' وہی اندیشے۔ جب پروین کام سے فارغ ہو کر باہر نکلتی تو دیوار سے ٹھکے ٹھکے وجود اس کے چاچے' تائے اپنے سامنے اسٹیل کی خالی پلیٹیں رکھے' من و سلویٰ' اترنے کے منتظر ملتے' جھکے ہوئے سروں اور بیماری سے زرد چہروں کے ساتھ وجود ٹکائے منتظر۔

دروازے پر بندھے مالکان کے خونخوار کتے' اپنے حصے کا رزق تقسیم ہوتے دیکھ کر بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھائے رکھتے۔

"یہ کتا بھی عجیب مخلوق ہے۔" پروین باپ کے برابر برابر چلتے سوچتی "ہمیشہ میلے کپڑے والوں پر بھونکتا ہے۔ پینٹ کوٹ والے اسے چور نہیں لگتے یا وہ چور ہوتے ہی نہیں اور شاید وہ جانتا ہے کہ ہر روز چلتے سمے اس کے باپ کے ساتھ جو ایک گٹھر کردیا جاتا ہے وہ کس کا دیا ہوا ہے۔ مالکن کی وفاداری دکھانے میں' کتے اور لوگ بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ یہ الگ بات کہ لوگ صرف دم ہلا سکتے ہیں' بھونکنے کا حق ان کو ابھی تک نہیں ملا۔

باپ' دیا ہوا' سوغات سمجھ کر سینے سے سمیٹے گھر لے آتا' خواہ وہ چیز اس کے کسی کام کی نہ ہو۔ پلاسٹک کی بالٹی جس کے پیندے میں ٹیڑھ تھی' کنڈا ٹوٹا مگ' ولایتی رضائی' جسے چوہوں نے ٹک لیا تھا' کچھ ثابت چیزیں بھی ہوتیں مگر ان کے بغیر بھی اللہ وسایا کا گھر چل رہا تھا۔ ان کی کوئی ضرورت تھی یا نہیں' کوئی نہ کوئی مصرف نکال ہی لیتا تھا۔ وہ کچرا سمیٹ کر اتراتا یا اتراتا پلٹتا۔

ماں کو اس سے کسی حد تک اختلاف تھا' وہ جھلائی ہوئی پروین کے باپ کو کوستی جوان کے آگے پیچھے بچھتا تھا اور جس سے وہاں کوئی ڈھنگ سے بات کرنا بھی کسر شان سمجھتا تھا۔ عزت نفس' انسانی حقوق' خودداری یہ مشکل الفاظ تھے۔ گاؤں علم سے دور تھا' لہٰذا وہ سفر کر کے یہاں تک نہیں پہنچ پائے۔ صبر کرنا قابل فخر تھا' جوتے کھا کر اف نہ کرنا' باپ دادا اور ان کے باپ' دادا کی ریت چلی آرہی تھی۔

باپ موجودہ نظام معیشت سے واقف نہیں تھا۔ اس کے ہی کھاتے جنس کے بدلے جنس پر اٹک کر رہ گئے تھے۔ چاول کے بدلے نمک' گندم کے بدلے گڑ' اہمیت تو وقتی ضرورت کی ہے۔ لہٰذا ٹیڑھ آئی پلاسٹک کی بالٹی'

کنڈے ٹوٹے مگ، چوہوں کی کتری رضائی کے بدلے انہوں نے معصوم، سادہ، خوش خلق، ہر فیصلے پر سر جھکانے والی پروین ان کے حوالے کردی۔

کار تیزی سے آگے کی طرف جا رہی تھی یا گاؤں ہی ہوا کی سی تندی سے پیچھے رہتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼
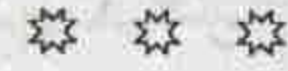
اس نے چکرا کر گرنے سے پہلے بند آنکھوں سے آخری منظر دیکھا۔ افراتفری میں صاحب کے کمرے سے نکلتا ان کا بیٹا۔ بالکل سامنے ننگے پاؤں دوڑتی عبیرہ عباس اور بائیں طرف سے نمودار ہونے والا اکبر۔ اس نے آنکھیں بند کرنے سے پہلے دیکھا، وہ محفوظ ہاتھوں میں تھی۔

پتا نہیں کتنے گھنٹوں کا سفر تھا اور کتنے زمانے لگے...... اس کی سیٹ کے برابر بیٹھی ہاجرہ شیشے سے باہر جھانکتی اپنے ساتھ بیٹھی ہمراہی سے ایسی بے نیاز دکھائی دیتی تھی جیسے اس کے برابر پتھر کا کوئی ٹکڑا بیٹھا، ٹھس ٹھس آنسو بہا رہا ہو۔ سڑک کے کنارے، کینو، مالٹوں کے چھوٹے قد کے درختوں، خودرو جھاڑیوں اور چمکتی سڑک میں اس کو زیادہ جاذبیت نظر آرہی تھی۔ پھر شاید اس کا رونا نہ ختم ہوا نہ تھا کہ اس کی توجہ گاڑی کے باہر سے گاڑی کے اندر آئی۔ اس کو نہ رونے کی تلقین بھی اس انداز میں ہوئی کہ وہ اور زور و شور سے رونے لگی۔

"لے ہاں۔ نخرے تیرے ایسے جیسے بڑی تو ماں کے گھٹنے سے لگ کے روٹی کھاتی تھی، شکر کر، روٹی تو پیٹ بھر کر ملے گی۔ شہر میں تین دفعہ روٹی کھاتے ہیں۔ ایسے ایسے ولایتی کھانے، تو نے کبھی خواب میں نہیں دیکھے، برگر، پزا کبھی نام سنا ہے تو نے؟ چھوٹا صاحب آدھا برگر کھا کر چھوڑ دیتا ہے۔ باقی آدھا ہم ہی کھاتے ہیں۔ تم لوگوں کو کھانے کی کیا تمیز...... روٹی پر رکھ کر گڑ کا ڈلا کھا لیا، بڑا ہوا تو پیاز مروڑ کر کھالی۔"

"میں واپس گھر کب جاؤں گی؟" اس نے بے بسی سے دانت جھڑی ہاجرہ بی بی کی طرف دیکھا۔

"لے، ابھی پہنچی ہے نہیں کہ واپسی کی بات کرتی ہے، تجھے پتا ہے، میں اس گھر میں کب آئی تھی۔ جب میری ماں تجھ سے بھی چھوٹی تھی۔"

"دیکھ لینا، ایک دن میرا باپ مجھے واپس لے جائے گا۔"

"لے!" بوڑھی ہاجرہ نے ہنس کر کیڑا کھائے سوراخوں والے زرد دانت دکھائے۔

"یہ امید تو ہمیشہ میری ماں کو رہی، مجھے بھی بڑے دن رہی۔ بھیجنے والوں نے بلانا ہو تو بھیجیں ہی کیوں۔"

اچانک ہاجرہ نے اپنی توجہ ڈرائیور کی طرف مبذول کر کے بے حیثیت سا رعب جھاڑا۔

"گاڑی تیز کیوں نہیں چلاتا۔" پھر ڈھل گیا، تیرا سا ہوال نہیں آیا۔"

ڈرائیور کے چہرے سے لگتا تھا۔ اس نے اس پھٹکار کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ رعب ڈالنے والے کے اختیارات سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ لیکن اس سے کتراتا بھی تھا۔ وہ جھوٹ اور سچ کا ملغوبہ ملا کر مالکوں سے چغلی کھانے کی ایسی ماہر تھی کہ وہ یقین کر لیتے تھے۔ رزق اپنے ہاتھ سے کون گنواتا ہے۔

گاڑی کے اندر خاموشی ہو گئی تھی۔ سسکیاں اور ہچکیاں بھی اب جیسے تھک گئی تھیں۔ وہ سڑکوں سے آگاہ نہیں تھی اور نہیں جانتی تھی کہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس قسم کے شہر، ایسی ٹریفک اور ان چمکتی ہموار سڑکوں پر یہ اس کا پہلا قدم تھا۔ اس نے اپنی توجہ راستوں پر لگے بلند قامت اشتہارات اور بورڈ پڑھنے پر بانٹ لی تھی لیکن جب تک اس کے ہجے مکمل ہوتے، سواری سبک رفتاری سے آگے نکل جاتی۔

وہ امام صاحب اور اکبر کی شاگرد رہی تھی اور ان کا خیال تھا، پروین بہت ذہین اور ہوشیار ہے۔ اس کا شمار جلدی سیکھنے والے گروپ میں ہوتا ہے۔ اگر ذرا سا زیادہ وقت دے تو دو سال میں میٹرک کا امتحان دے سکتی ہے۔ اکبر اب آخری دفعہ گاؤں آیا، اس کے لیے میٹرک کا نصاب لیتا آیا تھا لیکن اس کے ماں باپ کی نظر میں یہ محض وقت کا زیاں اور امیر آدمیوں کی عیاشی تھی۔ نو کلو میٹر دور لڑکوں کا ایک اسکول تھا۔ لڑکیوں کا اسکول کہاں تھا، یہ کسی کو نہیں پتا، ایسی جگہ رہتے علم نہایت بیکار قسم کی تفریح ہی تھی۔

سڑک کے باہر منظر تیزی سے بدل رہے تھے۔ اونچی اونچی دوکانیں اس کی گاؤں والی دکان جیسی سو دو کانیں، ایک دوکان میں شامل ہو جائیں۔ بلند و بالا گھر...... درختوں کی قطاریں، ساتھ ساتھ بھاگتی موٹریں، ہارن بجاتی، شور مچاتی، لیکن اس کو ان سب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سو اس نے نہ مرعوبیت سے دیکھا نہ دلچسپی سے۔

سڑک شہروں والے حصے چھوڑ کر ایک نسبتاً" کم آبادی والی سڑک سے جا ملی اور ایک بہت بڑے گھر میں جو اس کے گاؤں کے تمام گھروں کو ملا کر بھی بچ رہتا، کار ہلکی رفتار سے داخل ہوئی اور ایک جگہ آکر رک گئی۔ ہاجرہ باہر نکلی تو وہ سائے کی طرح خود بخود اس کے پیچھے آگئی۔ وہ کسی ایک جگہ کیوں نہیں ٹھہرتے...... کبھی اس گھر، کبھی اس شہر۔ کیا گھر بدلنا اتنا آسان ہوتا ہے۔

یہ ایک بے آباد گھر تھا۔ گو نظریں جھکائے سر نیچے کیے ایک گم صم خلقت ادھر ادھر گھومتی نظر آرہی تھی، چہل پہل بھی بے روح تھی۔ صحن جتنے بڑے کمرے میں صوفے میں دھنسی اس ٹھسے دار عورت کہ جس کا سارا وجود سونے سے لدا ہوا تھا اور جس کے ہونٹ کے اوپر والے حصے پر ایک موٹا سا مسہ تھا جس میں سیاہ بال اگے ہوئے تھے۔ اس کو اس کے روبرو لے جا کر ٹھہرا دیا گیا۔

اس نے اس عورت کو گاؤں والی حویلی میں حکم چلاتے، رعب گانٹھتے اور کھلا اناج بانٹتے دیکھا تھا لیکن دور دور سے۔ اس کا زیادہ تر تعلق برتن دھو کر خشک کرنے یا بھاگ دوڑ کے مختلف کاموں سے تھا۔ اس لیے اندرون رہائشی حصوں میں اس کی آمد و رفت کم کم ہی تھی۔ آج وہ اس کے روبرو لائی گئی تھی۔

"بیگم جی...... !" حاجرہ نے دبی زبان سے کہا۔

بیگم جی متوجہ نہیں تھیں، ان کے سامنے ایک اور لڑکی مجرم کی طرح سر جھکائے، سہمی کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک جلی ہوئی قمیص تھی، دوسری کوئی عورت جو اس کو بازو سے گھسیٹ کر لائی ہو گی۔ ابھی تک بازو پکڑے کھڑی تھی۔ حالانکہ وہ بھاگ کر کہاں جاتی۔ ہر جملہ ایک تھپڑ پر ختم ہوتا تھا۔ وہ اتنی عادی ہو چکی تھی کہ نہ تھپڑوں پر روئی، نہ احتجاج کا کوئی جملہ اس کے منہ سے نکلا۔ بیگم جی جو فقرہ بولتیں بازو پکڑے کھڑی عورت اس فقرے کو صرف ایک تھپڑ کے اضافے کے ساتھ اسی طرح دہرا دیتی تھی۔

"اندھی ہے تو...... اندھی ہے تو۔"

"کام میں دھیان نہیں، پراٹھے کھانے کا تجھے بڑا منہ ہے۔"

"کام میں دھیان نہیں......"

"آگے سے کبھی کوئی کپڑا جلایا تو یہ گرم استری میں نے تیرے چہرے پر پھیر دینی ہے۔"

"گرم استری۔"

پروین کا منہ تپ گیا، وہ خوف سے کپکپا گئی تھی۔

"کون ہے یہ۔ روز ایک نیا رنگروٹ آجاتا ہے۔" بیگم جھلا کر حاجرہ کی طرف پلٹی۔

"گاؤں سے آئی ہے بیگم جی! وہ جس کو آپ نے بلایا تھا۔" بیگم جی نے اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"بلقیسے......" انہوں نے اندر دور کسی کو آواز دی۔ بلقیسے ہاتھ باندھ کر حاضر ہوئی۔

"پانی لا۔"

"ادھر رکھ دے۔"

"جا چلی جا۔"

"بلقیسے !ادھر آ۔"

"گلاس واپس لے جا۔"

پروین چپ چاپ سر جھکائے کھڑی تھی۔ گھر میں نوکروں کا میلہ لگا تھا۔ اتنے کام نہیں تھے جتنی مخلوق جمع تھی۔ وہ نہ بھی آتی تو کیا کمی پڑ جاتی۔

"کیا کیا کام کرنا آتا ہے؟" وہ سیدھی کھڑی لڑکی کی طرف ذرا دیر سے متوجہ ہوئیں۔

اس نے اپنا نچلا ہونٹ دبایا۔ "ادھر آ میری پنڈلیاں کس۔" یہ کام تو اسے واقعی آتا تھا۔ وہ چپ چاپ زمین پر بیٹھ کر بڑی مہارت سے پھڑکتی مچھلیوں کو دبانے لگی۔ لیکن یہ مچھلیاں اس کی ماں جیسی نہیں تھیں۔ یہ ایک آرام طلب عورت کی ٹانگیں تھیں۔ جنہوں نے کبھی مشقت نہیں کی تھی۔ نہ اس کی طرح کسی ہوئی' نہ تنی ہوئی۔

"زور کا ہاتھ لگا' مفت کی روٹیاں توڑنے کو نہیں ہوتیں۔ جا اس کو نہلا دھلا۔ سن ہاجرہ! اس کا بستر اپنے ساتھ ہی رکھنا اور ذرا باقیوں سے اسے دور ہی رکھنا۔" اسے پہلی دفعہ اس احساس کا یقین ہوا کہ وہ اپنوں کے درمیان میں نہیں تھی اور محفوظ ہاتھوں میں بھی نہیں تھی۔ اسے لگا' وہ نیچے گر رہی ہے' آہستہ آہستہ۔۔۔۔

کوئی گہرے کنویں میں چھلانگ لگا دے' گرتا رہے اور دیر تک گرتا رہے۔

گرنے سے پہلے اس نے عبیو عباس کی آواز سنی جو کہیں دور کنویں کی منڈیر سے اس کو پکار رہی تھی۔

"جاگو پروین جاگو۔"

"اس اندھے کنویں سے نکلو۔۔۔۔"

"باہر آؤ عطن۔"

کیسی نامانوس ناموں کی پکار اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ حتیٰ کہ سخت پتھر کے سفید فرش پر اس کا وجود دھڑام سے گر پڑا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ دکھائی نہیں دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ سو کر اٹھی تو ابھی اندھیرا تھا' وہ تو گھر میں بھی بہت جلدی اٹھتی تھی۔ رات کی روٹی گھی میں تل کر ابا کو دیے" پہلا خیال اس کو آیا۔ یہ وہ صبح نہیں تھی لیکن یہ تو بہت ہی صبح تھی۔

رات بھر وہ پلاسٹک کے بان اور لوہے کے پائپ والی چارپائی پر کروٹیں بدلتے اجالے کا انتظار کرتی رہی۔ اجالا ہو گیا یا ابھی رات کی تاریکی باقی تھی' یہ کسی اور گھر میں اس کی زندگی کی پہلی صبح تھی۔ ڈانٹ پھٹکار کی وہ عادی تھی۔ کبھی کبھی ماں جھلا کر کمر میں دھمو کا بھی جڑ دیتی لیکن حقارتوں' سازشوں اور چالاکیوں کی یہ پہلی صبح تھی۔

اسے باقی لوگوں سے دور رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی لیکن قیمص جلانے والی میر تے بڑی دلچسپی سے اس کے پاس آگئی۔ وہ باورچی خانے میں دودھ کی دیگچی کو منہ لگا کر غٹ غٹ دودھ چڑھا رہی تھی۔ پروین کو دیکھ کر بھی اپنی چوری پر شرمندہ نہیں ہوئی۔ رات کی بے عزتی کا بھی کوئی رنگ اس کے چہرے پر نہیں تھا۔

"ہاجرہ سے بچ کر رہنا' چچی ہے مالکوں کی۔ تم نئی آئی ہو' اس لیے بتا رہی ہوں۔ تم نے کسی کو بتایا کہ میں نے دودھ پیا ہے تو میں سب سے کہہ دوں گی کہ تم نے پیا ہے۔ تم نئی ہو' سب تمہیں ہی چور سمجھیں گے۔ تمہاری صفائی کا اعتبار کوئی نہیں کرے گا۔ ادھر رہنا ہے تو میرا ساتھ دینا پڑے گا۔ ہم سب تمہیں الزام دے کر نکلوا دیں گے۔"

"مجھے یہاں سے بھجوا دو میر تے۔" اس نے بے بسی سے کہا۔ "مجھ پر الزام لگا دو بے شک۔۔۔۔"

"کدھر جانا ہے؟" مسرتے اس کی ہمدردی میں آئی۔

"گھر۔"

"وہاں کیا ہے؟"

"وہاں "گھر" ہے۔" اس نے بھول پن سے کہا۔ "تمہارا گاؤں کدھر ہے۔؟" پھر اس نے پوچھا۔

"میں تو خانیوال سے آئی ہوں۔" گاؤں تو نہیں ہے مگر بڑا شہر بھی نہیں ہے۔ میرا باپ مر گیا تھا' ماں کسی کے گھر کام کرتی ہے۔ ادھر ہی رہتی ہے۔ وہ لوگ مجھے نہیں رکھنا چاہتے۔ ان کا بیٹا نظر باز ہے۔ ہی ہی 'شک ان کو مجھ پر ہوتا ہے۔ خبردار جو کسی کو بتایا۔" مسرتے نے پھر آنکھیں نکالیں۔

پروین باورچی خانے کے سفید چمکتے فرش پر بیٹھ رہی۔

"مجھے کیا کام کرنا ہے؟"

"یہ دیگچیاں دھو۔" اس نے نلکا بند کر کے فورا" اپنا کام اس کے حوالے کر دیا۔

وہ چپ چاپ برتن دھونے لگی۔ ہر طرف لوگ ہی لوگ پھر رہے تھے۔ رات میں اس نے سوچا تھا' شاید مالکن کے رشتے دار ہوں یا کوئی ملنے والے مہمان... لیکن صبح تک اسے اندازہ ہو گیا کہ سب اسی کی حیثیت میں کہیں نہ کہیں سے آئے ہوئے تھے۔ سب کے سب ہل میں جتے بیلوں کی طرح' سر نیچے کیے 'سیدھی قطاریں بناتے بس چلتے جاتے تھے۔ نہ چہرے پر تھکن 'کوئی افسوس نہ دکھ۔ وہ بھی ہل میں جت گئی 'جوا کندھوں پر رکھ کر...

وہ جب ایک ماہ بعد واپس گاؤں بھیجی گئی تو اس نے تاریک کوٹھڑی کی چارپائی میں ہاجرہ کے خراٹوں میں برابر لیٹے ہر رات آنسو بہاتے گزاری تھی۔ وہ جب واپس آئی تو اس کا خیال تھا۔ وہ اپنے حصے کا کام کر آئی ہے۔ شاید اب اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔

اس گھر میں ایسا کوئی کام نہیں تھا جو پروین کے بغیر نہ ہو سکتا ہو' لیکن اس گھر کے سارے کام اس کے بغیر بند ہو گئے تھے۔ چھوٹا' پروین سے چمٹ کر دھاڑیں مار کر رویا' لیکن زبردستی اس کو اس سے الگ کر دیا گیا کیونکہ مالکن اپنے کسی کام سے ایک ہی دن کے لیے گاؤں آئی تھی' اس لیے اس کو ساتھ لیتی آئی تھی اور جب پلٹ کر جانا ہی ہے تو پلٹنا' چمٹنا' رونا' دھاڑیں مارنا کیسا؟

جب ماں ان کے گھر کے گھڑے بھرنے گئی تو بیگم نے جتا دیا تھا۔

"کام چور ہے تیری بیٹی... سارا دن بیٹھی آنسو بہاتی ہے۔ ذرا پتا کر جوان لڑکی ہے' کس کے لیے اتنا روتی ہے۔"

اس کا خیال تھا' ماں کا دل اس کے آنسوؤں کا سن کر پھٹ جائے گا لیکن وہ تو ہاتھ جوڑ کر اس کے کردار کی قسمیں کھانے لگی۔

"ایسی کوئی بات نہیں مالکن...! بھولی سودائن ہے' کبھی گھر سے باہر نہیں رہی۔"

اس کو پہلی دفعہ پتا چلا ماں باپ' گھر بار' گلی محلہ' آپ کا اپنا کچھ نہیں ہوتا۔ صرف پیٹ آپ کا اپنا ہوتا ہے۔ جو روٹی مانگتا ہے۔

"آپ کے حوالے کی جی... آپ ہی کوئی شریف سا گھر دیکھ کر اس کو بیاہ دیں۔ آپ ہی نے کرنی ہے۔ میں کون؟ نہ کپڑا' نہ لتا میں اس کو کہاں سے بیاہوں گی۔"

"وہ تو ہماری ذمہ داری ہے' ہم رکھیں گے تو جہیز بھی دیں گے' پر اس کا دل بھی تو لگے۔ پتا کرو۔ وسایا کی بیوی! تمہارا میاں شریف آدمی ہے۔ کل کو کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو ہمیں الزام نہ دینا۔"

"ایسے نہ کہیں بی بی! میں سمجھا دوں گی۔"

وہ جب واپس جا رہی تھی' اس کے قدم پیڑ تلے بیٹھے امام صاحب کے نزدیک آ کر رک گئے۔ "امام صاحب واپس آ گئے۔" وہ جا چکی تھی مگر اس کا دل خوش ہو گیا۔

امام صاحب نے قرات اور ترجمے کی جماعت کچھ دیر کے لیے روک کر اس کی طرف دیکھا۔ "پڑھو گی بیٹا؟"

"میں تو واپس جا رہی ہوں۔" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔

وہ چپ چاپ اپنے طالب علموں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "ہاں ترجمہ کرو اللہ بخش... اور جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا' وہ کس جرم میں گاڑی گئی..."

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں لیکن اس نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔

"چل نی...!" حاجرہ نے اس کو گھسیٹ کر مال مسروقہ کی طرح چھوٹی والی گاڑی میں پھینک ڈالا۔

وہ ایک بند گلی میں داخل ہو رہی تھی۔ پیچھے راستے بند تھے۔ وہ خود بھی اس کے برابر بیٹھ گئی۔ بڑی والی گاڑی ان سے آگے آگے تھی۔ جس میں صاحب اور مالکن سفر کر رہے تھے۔ مالکن جہاں جاتی' اسے ساتھ رکھتی حتی کہ اپنے رشتے داروں کے ہاں بھی جاتی تو اس کو ساتھ لے جاتی۔

صاحب کو البتہ اس سے کام لینے کی لت پڑ گئی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتا اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے اپنے ملازمین چھوڑ کر اسی کو آواز دیتا تھا یا کبھی اس کو پکارتا باورچی خانے تک چلا آتا۔ اسی کے ہاتھ سے پانی لے کر پینا اسے اچھا لگتا تھا۔ ہر دفعہ گلاس پکڑتے اس کا ہاتھ اس کی کلائی کو چھوتا گزرتا اور دیر تک اس کی کلائی سہلاتا تو آس پاس کھڑے سب نوکر جیسے اندھے ہو جاتے۔

ان کو پروین کا پیلا پھٹک ہوتا چہرہ دکھائی دیتا' نہ صاحب کی غلاظت سے چھپائی لال آنکھیں نظر آتیں۔

الیکشن کا زمانہ قریب تھا اور صاحب اپنے باپ دادا کی طرح اپنی سیٹ پر کھڑا ہو رہا تھا۔ وہ زیادہ وقت باہر گزارتا لیکن جب آتا تو کمرا بند کر کے بیٹھ جاتا۔ باہر مالکن تسبیح پڑھتی' آتے جاتوں پر نظر رکھتی تھی' کبھی کواڑ کھلتے اور وہ باہر آتا تو پروین کو لگتا۔ اس کی آواز بدلی بدلی ہے' جیسے ٹوٹ رہی ہو۔ آنکھیں بوجھل اور مزید غلیظ ہو جاتیں۔ وہ محض پانی کا گلاس مانگتا اور پھر کواڑوں کے پیچھے چھپ جاتا۔

گھر میں ہر وقت مہمان داری چلتی تھی۔ عورتیں اور مرد دونوں قسم کے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا۔ دینے والے سخی' مانگنے والے محتاج' در پر جیسے مجمع لگا رہتا۔ پھر بی بی بھی کبھی ووٹ مانگنے اور کبھی لوگوں میں اناج تقسیم کرنے جاتیں۔ ان دنوں وہ بہت سخی ہو گئی تھیں۔ مسرتے چونکہ نئی نہیں تھی اور زیادہ جانتی تھی۔ اس نے بتایا' الیکشن کے دنوں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ الیکشن گزر جائے تو سب پہلے جیسا ہو جائے گا۔"

اس رات جب وہ الیکشن مہم سے واپس پلٹیں تو وہ ان کے بستر کے قریب فرش پر اوندھی گری پڑی تھی۔ ایک لمحے کو ان کے قدم لڑکھڑائے لیکن پھر جیسے وہ ان قدموں کو سنبھال لینے کی عادی ہو گئی تھیں۔

"اٹھ پروین!" انہوں نے حقارت سے اسی سنبھلے قدم سے ایک ٹھوکر لگائی۔

جب اس کو ہوش آیا تو کوئی مانوس چہرہ اس کے سامنے نہیں تھا۔ وہ ایسے دھاڑیں مار کر روئی' اس سے پہلے زندگی میں کبھی نہیں روئی تھی۔

دجال چلے گئے' قیامت آ کر گزر گئی تھی۔ امام صاحب کو نہیں پتا کہ اک قیامت اپنے حصے کی بھی ہوتی ہے۔

"اٹھو پروین..." کسی نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس نے لمحے بھر کو آنکھیں کھولیں۔ لمبے بالوں والے اکبر کا چہرہ اس کے قریب تھا۔ قیامت گزر چکی تھی۔ یہ روز حشر ہو گا۔

"کون تھا۔؟" مالکن نے تیوری پر بل ڈال کر ہاجرہ سے پوچھا۔ جب ہاجرہ چپ رہی تو انہوں نے اسی حقارت اور گھن کھائے لہجے میں اوندھی پڑی لڑکی کی طرف دیکھا۔

"صبح اس کو لاہور بھجوا دو۔"

"گاؤں واپس نہ بھجوا دیں بی بی....." بے رحم ہاجرہ کے دل میں جیسے پہلی بار رحم جاگا۔

"پاگل تو نہیں ہو گئی؟" مالکن غصے سے پھنکاری۔

نیم بے ہوشی کی حالت میں اس نے مالکن کو بلند آواز میں جھگڑتے سنا۔ باہر پھرتے نوکر گونگے بہرے رہے۔ صاحب بار بار وضاحت دے رہا تھا۔

"بتایا تو ہے میں ہوش میں نہیں تھا۔ یہی رہ گئی تھی میرے لیے ان پڑھ گنوار۔ میں ایسا گیا گزرا بھی نہیں۔ الیکشن کا وقت ہے اس کو چلتا کرو اور سمجھا دینا ٹھیک سے۔"

"مالکوں سے ٹکر لینا آسان نہیں ان کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی۔"

ہاجرہ اس کا سامان سمیٹتے بغیر اس کی طرف دیکھے جیسے خود کلامی کر رہی تھی۔

"اپنی زبان بند رکھنا۔ پتا نہیں کتنی قبریں ہیں اس کچے فرش کے نیچے..... ایک قبر اور بن گئی تو کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ کوئی جگہ بھی تنگ نہیں پڑ جائے گی۔ صاحب کی چھوٹی بہن لاہور رہتی ہے۔ کل سے تم اس کے گھر رہو گی۔ اگر تم نے کبھی زبان کھولی یا کسی سے بھی کچھ کہا تو یہ لوگ بوٹی بوٹی کر کے کتوں کو کھلا دیں گے۔ ان کے کتے دیکھے ہیں؟ کتنے خونخوار ہیں۔ صاحب کی بہن سوشل ورکر ہے۔ پتا ہے سوشل ورکر کون ہوتا ہے؟"

اسے نہیں پتا تھا لیکن اس نے نفی میں سر ہلانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ جس وقت ایک لوڈر کے پچھلے حصے میں اسے دھکیل کر بٹھایا گیا تو ایسے ہی ایک دوسرے لوڈر میں سامان لوڈ کیا جا رہا تھا۔ گندم کی بوریاں کینو کے کریٹ گھی کے ڈبے چینی کے تھیلے بیگم جی نے باہر نکل کر اپنا پرس کھولا نوٹوں کی ایک موٹی گڈی ڈرائیور کے حوالے کرتے کہا۔

"یہ بھی اس کے باپ کو دے آنا کیا نام ہے بھلا اس کا.....؟"

"اللہ وسایا بیگم جی!"

بیگم واپس پلٹی۔ پھر کانوں سے اپنے وزنی جھمکے اتار کر اسے تھماتے ہوئے کہا۔ "اور یہ بھی... ہاں اسی کو دے دینا۔"

وہ لمحے کو رکی۔ ہاتھ میں پکڑی گڑ کی ڈلی لوڈر والے کو تھماتے بولی۔

"اور یہ میری طرف سے دے دینا اپنے اللہ وسایا کو۔"

اس کی گاڑی گیٹ سے باہر نکلی تو چونکہ وہ مکمل طور پر اپنے حواس میں نہیں تھی تو اس نے نہیں دیکھا کہ دوسرے ڈرائیور نے ہاتھ بڑھا کر نزدیک بہتی ندی میں کیا پھینک دیا۔

وہ جب ایک اور اجنبی شہر کے اجنبی گھر میں داخل ہوئی تو گھر سے بچھڑے مدت ہو چکی تھی۔ وہ اس قدر ہراساں نہیں تھی جیسے وہ پہلے مرتبہ نظر آتی تھی۔ وہ اب سودائن نہیں رہی ایک دم بڑی ہو گئی تھی اور بے حد سمجھ دار۔ وہ جان گئی تھی ہاجرہ کی طرح اب اس کی عمر قید شروع ہو گئی ہے۔ اس کے ماں باپ اچھے بیوپاری نہیں تھے۔ انہوں نے ترازو کے ایک پلڑے میں بھوک رکھی تھی دوسرے میں زمانے سے بے خبر اپنی بیٹی۔

☼ ☼ ☼

یہ مین گلبرگ تھا۔ بڑی بڑی عالی شان مال و اسباب سے لدی بلند و بالا دکانوں کا بازار اور ان دکانوں کے سامان

سے ٹھساٹھس بھرے گھر۔ نئے سکے کی طرح چمکتی ہموار لمبی لمبی سڑکوں کے کنارے اکادکا موٹے تنے والے درختوں کے ساتھ صاحب کی بہن کا گھر تھا۔

صاحب کی بہن زیادہ تر انگریزی بولتی اور ایک ایسے ہی وسیع و عریض گھر میں رہتی تھی جیسے گھر مالکوں کے ہوتے ہیں۔ درختوں کی گھنی چھاؤں میں قطار سے سجے پھولوں اور بیلوں سے ڈھکے پھاٹک پر غراتے کتے' وہ بیگم جی نہیں میڈم کہلاتی تھیں۔ میڈم نوکروں سے بہت زیادہ واسطہ' مطلب نہیں رکھتی تھیں۔ کبھی ان کا چہرہ دیکھ کربات نہ کرتی اور کبھی ان کے نام یاد رکھنا گوارا نہ کرتی تھیں۔ میڈم کے گھر میں بھی ہر وقت میلہ لگا رہتا' بار بار چائے بنتی' بیکری سے آئے بڑے بڑے لفافے پھاڑ کر پہیوں والی میز گھسیٹتی وہ مہمانوں کے سامنے لے جاتی۔ کیونکہ وہ ہمیشہ سے جلدی سیکھنے والی تھی' لہٰذا اس نے یہ سبق بھی یاد کرلیا کہ کیسے اس بھاگتی دوڑتی میز کا ایک ایک تختہ سامان سے لادا جاتا ہے۔

میڈم کے ساتھ جو رہتے' وہ عینک لگاتے تھے اور سر کہلاتے تھے۔ اور دو خوبصورت لیکن قدرے خود سر بچے نوکروں سے دور رہنے کی بار بار تنبیہہ کے باوجود پروین سے بڑی جلدی مانوس ہوگئے۔

سر سارا دن موٹی موٹی کتابوں میں غرق رہتے۔ صبح اٹھ کر کالا کوٹ پہن کر کہیں نکل جاتے' نہ ان کی آنکھیں صاحب کی طرح چیچپاتی تھیں نہ ان کو بے ضرورت پیاس ستاتی' اسے گھر میں کسی نے بتایا وہ ایک بہت بڑا جلوس نکال رہے ہیں' جو حکومت بدل ڈالے گا اور یہ جلوس اتنا اچھا ہے کہ اس نے کبھی ایک پتا بھی نہیں توڑا۔ میڈم سوشل ورکر تھیں اور سوشل ورکر کون ہوتا ہے' بیگم جی کے گھر سے نکلنے سے پہلے اسے پتا نہیں تھا۔ لیکن اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا۔ جہاں صبح دس بجے کافی پارٹی ہو' بارہ بجے ساری میڈم میں رنگ برنگے کپڑے بدل کر اپنی اپنی بولی بولتے میٹنگ کرتی ہوں اور شام کو پھولوں کا گلدستہ لیے گھر آتی ہوں' وہ سوشل ورکر ہوتا ہے۔

"پروین۔"

"ہاں!"

"ہاں نہیں کہتے۔ جی کہتے ہیں۔"

کیونکہ گھر نوکروں اور بچوں کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔ اس لیے وہ اسکول سے واپس آتے ہی اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے کمرے میں لے آتے۔ علاوہ ٹیکنالوجی کے۔۔۔۔ اس کی ترتیب بھی جاری تھی' ان کے ساتھ رہتے تمام کارٹون کریکٹرز کے نام یاد ہوگئے تھے۔ کچھ جملے سمجھ میں آنے لگے تھے' ریموٹ کا استعمال بھی اسے آگیا تھا' کبھی بچوں کو ہرا تو نہیں سکی لیکن ان کی ہمراہی میں کمپیوٹر پر گیم کھیلنا بھی اس نے سیکھ لیا تھا۔

قسط 19' ٹی وی ڈراموں میں اس کا دل لگنے لگا تھا اور یہ سب کرنے کے لیے اسے مسرتے کی طرح دودھ کی دیگچی کو منہ نہیں لگانا پڑتا تھا' کیونکہ گھر کھلا تھا اور گھر والے گھر سے بے نیاز۔

ایک دن میڈم کے ساتھ کوئی عورت گھر آئی جو سر اور میڈم دونوں کی دوست تھی۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی جو عمر میں پروین وسایا کی ہم عمر یا اس سے شاید ہی کچھ بڑی ہوگی۔ ایسا لگتا تھا کوئی بڑا مسئلہ پیش آگیا ہے' کیونکہ سب بحث کررہے تھے اور اونچا اونچا بول رہے تھے اور بہت جوش میں لگتے تھے لیکن ساری کی ساری گفتگو چونکہ انگریزی میں تھی' اس لیے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا' اتفاق سے انہوں نے اردو کا ایک ہی فقرہ بولا جو اس سے ہی متعلق تھا۔

"کون ہے یہ؟" میڈم کی دوست نے پروین کی طرف دیکھتے بڑی نخوت سے پوچھا تھا۔

میڈم نے چونک کر دیکھا۔ وہ جیسے اسے رکھ کر فراموش ہی کر بیٹھی تھیں۔

"کون ہوتی ۔۔۔ ہمارے بھائی صاحب کا ایک اور کارنامہ۔۔۔۔"

"اوہ!" دوست ادا سے آنکھیں میچ کر کہا۔ "یہ فیوڈل لارڈز اور ان کی رعایا۔" "لیکن وہ جلدی میں تھیں' لہٰذا وہ کسی لمبی بات کے موڈ میں نہیں تھیں۔ دروازے تک جاتے جاتے وہ رکیں۔

"سنو!" انہوں نے دوسری لڑکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جو کچھ چاہیے ہو' اس سے کہہ دینا' کچن میں حاکم بی بی ہے' اس کو بول دینا اور سنو!"

اب وہ پروین سے مخاطب تھیں۔

"ان کو گیسٹ روم لے جانا' واش روم چیک کرلینا ٹھیک سے۔۔۔۔" ایک "سنو" سے دوسرے "سنو" تک وہ غائب تھیں۔

لڑکی نے اپنے کمرے کا چاروں طرف سے جائزہ لیا۔ پردے کھسکا کر ایک طرف کیے' غسل خانے میں جھانکا' بالآخر قبولیت کا درجہ دے کر اطمینان سے کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں جھلانے لگی۔

"تم جانتی ہو میں جن کے ساتھ آئی ہوں۔۔۔ کون ہیں؟" پروین کے گیس کا انتظار کیے بغیر اس نے اسی سکون مگر قدرے فخر سے کہا۔ "سارا حق۔"

پروین کی سمجھ میں نہیں آیا' وہ حیرت کا اظہار کرے' خوشی کا یا خبر کے ناقابل یقین ہونے کا' جانے لڑکی اس سے کیا توقع کررہی ہو۔ اس کے لیے تو یہ نام قطعی اجنبی تھا' وہ کسی بھی رائے کا اظہار کیے بغیر میڈم کے حکم کے بموجب شاور کا مکسر چیک کرنے لگی۔

"آپ نہائیں گی؟" پروین نے مؤدب لہجے میں پوچھا۔

"بڑی مشہور ہیں' بڑی دنیا جانتی ہے ان کو۔۔۔۔" وہ وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ "اگر آج پاکستان قائم ہے نا تو ان جیسے لوگوں کی وجہ سے۔۔۔ جن کو ماں باپ نے ٹھکرا دیا ہو' یہ ان کا بھی سہارا بنتی ہیں۔" پروین کے قدم زمین پر جیسے جم گئے۔

"آپ کسی مصیبت کی وجہ سے گھر سے نکلی ہیں؟"

"مصیبت سی مصیبت۔۔۔۔" لڑکی نے اکتا کر کہا۔

"کیا تم غریب گھر کی لڑکی ہو؟" اس نے پوچھا

"فصلیں اچھی نہ ہوں یا جانور پانی میں بہہ جائیں تو کیا تمہارے گھر بھی فاقے پڑجاتے ہیں؟"

"فاقے؟" لفظ فاقے اس کے لیے اتنا ہی اجنبی تھا جتنا اس کی محسن کا نام پروین کے لیے۔

"امیری' غریبی ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی۔" مہمان بڑبڑائی۔ "دکتنا ظلم ہورہا ہے اس ملک میں۔ ماں' باپ اولاد کو کھا جاتے ہیں جیسے سانپ اپنے انڈے کھاتا ہے۔ کچھ نہیں ہوتی غریبی۔۔۔۔ کیا برائی ہے غریبی میں۔۔۔ اگر وہ غریب ہے اور میں امیر تو اس میں اس کا کیا قصور؟ محبت امیری غریبی نہیں دیکھتی۔ تمہیں پتا ہے میرے ساتھ کیا ظلم ہوا؟"

"نہیں پتا جی۔" پروین نے سادگی سے کہا۔

"میرے ماں باپ زبردستی میری شادی کررہے تھے۔ میری مرضی کے خلاف۔۔۔۔ میں نے سارا حق کو خط لکھا مجھے اس جہنم سے نجات دلائیں اور وہ ایسی فرشتہ ہیں کہ جان پر کھیل کر مجھے بچانے آگئیں۔ پھر انہوں نے ٹی وی پر تقریر بھی کی کہ لڑکی کی شادی اس کا ذاتی معاملہ ہے کوئی اور کون ہوتا ہے اس میں داخل دینے والا' لیکن وہ سننے والے کہاں تھے۔ تب میں رات کو اپنی ضرورت کی چیزیں لے کر دوڑ آئی۔ سارا حق نے کہا' وہ تمہیں تلاش کرتے سب سے پہلے میرے پاس آئیں گے۔ تمہیں بھی شوٹ کردیں گے۔ مجھے بھی۔ میرے والد ایسے ہی ظالم ہیں۔ پھر وہ مجھے یہاں لے آئیں کیونکہ اس جگہ تک وہ کبھی نہیں پہنچ سکتے۔"

کامیابی سے سرشار اس نے قہقہہ لگایا۔ "کل وہ بھی پہنچ جائے گا۔ کل یہیں اس گھر میں ہمارا نکاح ہوگا۔ ایسے ظالم والدین سے تو پرائے ہی اچھے۔ تمہارا ابھی کوئی بوائے فرینڈ ہے؟"

"میں حاکم بی بی سے کہتی ہوں' آپ کا سینڈوچ بنا دے۔" ایک دروازے سے نکلی تو دوسرے دروازے سے باہر چلی گئی۔

"تمہارا کوئی مسئلہ ہے تو سارا حق کو ضرور بتانا۔" اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔

پھر اگلے دو روز میں لڑکا پہنچ گیا۔ چونکہ وہ غریب تھا' اس لیے اس کو خالی ہاتھ آنے کا استحقاق تھا۔ سارا حق نے لڑکی ہی سے اپنی فیس طلب کی اور جتا دیا کہ ان کی فیس بہت بھاری ہے' لیکن ایک تو انسانیت کے کام وہ مفت کرتی ہیں دوسرے چونکہ تم گزارے کے لیے بہت بڑی رقم نہیں لائی ہوگی' اس لیے میں تم سے صرف نصف لوں گی۔

پھر وہ بیاہ کر چلی گئی۔ وہ جو دو دن کو گھر میں ایک ہلچل مچی تھی' ویران پڑ گئی۔ عینک والے سرجی نے اس سارے معاملے کو بیزاری سے دیکھا اور عین اس وقت جب ساڑھے بتیس روپے کے عوض وہ اس لڑکے کے سپرد کی جا رہی تھی' وہ باہر نکل گئے۔

"کیا نام ہے اس لڑکی کا؟" جب وہ اگلی دفعہ آئیں تو لڑکی اسی جامد سناٹے کے ساتھ باریک کپڑا لیے کرسی کے پائے چمکا رہی تھی۔

"گونگی ہے کیا؟"

"میں نے تو کبھی اسے بات کرتے نہیں دیکھا۔"

"ایسے لوگ بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ تم پتا نہیں کہاں کہاں سے اٹھا لاتی ہو۔ تمہارا نام پروین ہے؟" انہوں نے شک سے اسے دیکھا۔

"ہاں!" ایک لمحہ ٹھٹک کر اس نے کہا۔ "جی!"

"کوئی عورت تمہیں ڈھونڈتی میرے پاس آئی تھی۔ یہ اکبر کیا لگتا ہے تمہارا؟ وہ کیوں اس عورت کے ساتھ ہوتا ہے۔ بوائے فرینڈ ہے تمہارا؟"

پروین کی سمجھ میں نہیں آیا' اس کے پرس میں نئے نوٹ تھے' نہ کسی پوٹلی میں چمک دار زیورات' وہ ماں باپ سے حقارات کی تاریکی میں دیوار پھاند کر نہیں آئی تھی' پھر اکبر اس کا بوائے فرینڈ کیسے ہو سکتا تھا۔

"شادی کرنا چاہتی ہو اس سے؟" اب کی بار انہوں نے جھلا کر زیادہ سادہ زبان میں پوچھا تھا۔

"نہیں۔"

انہوں نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ اگر اس نے اپنا گھر کسی سے شادی کی خاطر نہیں چھوڑا تو اس کی زندگی سے ان کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

"اس کو واپس بھیج دو۔" سارا حق نے بغیر دودھ اور چینی کے قہوے سے چسکی بھرتے ہوئے کہا۔

"ہم کسی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔"

"واپس بھیج دیا' تب بھی مشکل میں پڑ سکتے ہیں۔"

"آہستہ بولو! اندر ہی بیٹھا ہے۔"

میڈم نے سر کے کمرے کی طرف ایک نظر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس کو اشارہ بھی ملا تو قتل ہی کر دے گا۔ وہ بھائی کے ویسے بھی خلاف ہے۔ اوپر سے الیکشن سر پر آ گیا ہے۔ تم چاہتی ہو ان کو ہمارے خلاف اسکورنگ کے لیے اتنا بڑا پوائنٹ مل جائے۔"

"تمہیں تو بھائی کا ساتھ دینا چاہیے۔ تم دونوں کے نظریات ایک ہیں۔ وہ بھی سامراج کے خلاف جنگ میں

تمہارے ساتھ ہے۔ اس فرسودہ نظام کا دیکھنا۔ ایک دن ہماری پارٹی ہی خاتمہ کرے گی۔"

وہ کسی اور موضوع پر بات کرنے لگے تھے۔ پروین کو اس میں سے بہت کچھ سمجھ میں نہیں آیا! جاگیری نظام، امیری، غریبی، استحصالی طبقہ، اسٹیبلشمنٹ پاکستان بنا ہی غلط تھا، انڈیا، اسے ان سارے لفظوں کا مطلب نہیں آتا تھا۔ لیکن درمیان سے جو لفظ اس کے کان میں پڑتے تھے، شاید وہ اپنے بھائی کی تعریف کر رہی تھیں جن کا تعلق کسی الیکشن سے تھا۔ اس عرصے کی تربیت میں اسے گونگے اور بہرے کا رول کرنا تو بخوبی آگیا تھا۔

پھر ایک دن اس نے دیکھا، وہ خاتون جو سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگائے اس گھر میں آتی تھیں، ویسی ہی لپ اسٹک لگائے ٹی وی پر بیٹھی ہیں، ٹی وی والے پتا نہیں کیا کچھ کہہ رہے تھے، انسان دوست، بے غرض کام آنے والی، وطن کی خدمت گار اور بھی بہت سے لفظ تھے جو اس کی سمجھ میں نہیں آئے، ٹی وی پر کوئی شور شرابا تھا۔ کسی اغوا شدہ لڑکی کی بازیابی کے لیے وہ مائیک کا گلدستہ اپنے سامنے سجائے اس فرسودہ نظام پر گرج برس رہی تھیں جو کسی کو انصاف نہیں دے سکتا، جو صرف جاگیردارانہ نظام کا تحفظ کر سکتا ہے۔ انڈیا کو دیکھیں! اس نے جاگیرداری پہلے دن ختم کردی تھی۔ ہم آج تک اپنا نظام بچائے ہوئے ہیں۔ کس لیے؟ جب تک اسمبلی میں یہ وڈیرے، جاگیر دار بیٹھے ہوں گے، ملک کو بچانا ناممکن ہوگا، پھر انہوں نے کئی مرتبہ کہا، ہم نے یہ ملک بنا کر غلطی کی۔۔۔ اور اگر غلطی کر ہی لی تو اس کو نباہیں تو سہی۔۔۔ اس ملک کو بچانا بھی آپ کی ذمہ داری ہے، میں حکمرانوں سے پوچھتی ہوں، کہاں ہے پروین؟ کدھر گئی پروین؟ زمین کھا گئی، آسماں نگل گیا۔۔۔ کیا آپ اس کو تلاش نہیں کر سکتے؟ پھر کیا حق بنتا ہے، آپ ملک پر حکمرانی کریں؟"

پھر سوال کرنے والوں نے اس قدر شور مچایا کہ اسے ایک لفظ نہیں سنائی دیا، لیکن پتا نہیں وہ کس پروین کو تلاش کر رہی تھیں، وہ تو یہاں بیٹھی تھی، اسی جگہ۔۔۔ وہ خود اس کو یہاں دیکھ بھی گئی تھیں۔ وہ بار بار گرجتی برستی تھیں۔ آج شاید وہ سچ مچ بہت غصے میں تھیں۔

"مغویہ کی ماں کا ذمہ دار یہ معاشرہ ہے۔ وہ عورت مری نہیں قتل کی گئی ہے اور اس کا قاتل یہ نظام ہے، جو غریب کو انصاف نہیں دے سکتا، اس کا حق نہیں دے سکتا، پاکستان میں غریب کے لیے اور قانون ہے، امیر کے لیے کوئی اور۔۔۔ معاف کیجئے! اگر ایسا ہے تو میں ایسے انصاف کو نہیں مانتی۔ میں کہتی ہوں یہ لاش پروین کی ماں کی نہیں، انصاف کی ہے، قانون کی ہے، نظام کی ہے۔"

وہ ریموٹ پکڑے چینل بدلتی رہی لیکن وہ تو ہر طرف چھائی ہوئی تھیں۔ اس کو پہلی دفعہ پتا چلا اس کی آنکھوں میں آنسو بھی خشک ہو چلے ہیں۔ اس نے رونا چاہا مگر ایک آنسو بھی باہر نہیں آیا۔ اس سارے منظر میں جہاں جلتی بجھتی روشنیوں کے چھپاکے تھے، آوازیں تھیں لوگوں کا اژدھام تھا، وہیں دور ایک کونے میں، لمحے بھر کے لیے کیمرا جس طرف گیا، وہاں اس کا باپ اپنی میلی پگڑی کے لٹکے ہوئے پلو سے آنکھ میں پڑا کوئی کنکر نکال رہا تھا کیونکہ وہ روتا تو نہیں تھا۔ پھر کیمرا غیر اہم لوگوں سے اہم لوگوں کی طرف مڑ گیا۔ باپ، پگڑی، کنکر سب پس منظر میں غائب ہو گئے۔

اور آخر کار وہ اسے بازیاب کرانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ اس کامیابی کا سہرا ان ہی کے سر جانا تھا۔ ان کے گلے میں بہت سے تمغے جھول رہے تھے۔ اس میں ایک اور کا اضافہ ہوا۔ وہ اسے واپس لینے آئی تھیں۔ اس نے ان سب کی سرگوشیاں سنیں، سب کی سب سمجھی یا نہیں لیکن اتنا سمجھ گئی کہ وہ ہاجرہ سے خوش قسمت رہی۔ کمرے سے باہر نکلتے صرف ایک جملہ اس کی سماعتوں کی گرفت میں آیا۔

"یہ تو ایک تیر سے دو شکار ہوئے۔ دیکھتے ہیں، اب وہ ہمارے مقابلے میں اپنی سیٹ پر کھڑا ہوتا ہے یا ضمانت ضبط کرواتا ہے۔"

"تم نے واپس جانا ہے اپنے گاؤں؟" انہوں نے ایسے سوال کیا جیسے اس کی مرضی بہت اہمیت رکھتی ہو۔

"دیکھو! ہم نے تمہیں بہت محبت، پیار سے رکھا، تمہاری ساری ضرورتوں کا خیال کیا، مٹھیاں بھر بھر کے تمہارے ماں باپ کو پیسے بھیجے، ہمیشہ پیٹ بھر روٹی دی۔ اگر تم نے واپس جا کر یہاں کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا تو۔" وہ دانت پیس کر دھمکی دیتی رک گئیں۔

"تم نے جا کر کہنا ہے میں ایک دن باغ میں کام کر رہی تھی کہ کوئی شخص مجھے اٹھا کر لے گیا۔ مجھے راستوں کا نہیں پتا اور میں پڑھی لکھی نہیں اس لیے مجھے نہیں پتا میں کہاں رہی۔ اگر تمہیں تصویریں دکھائی جائیں تو اس آدمی کو فوراً پہچان لینا۔ اس شکل کو غور سے دیکھو۔ اس نے تمہارے ساتھ زیادتی کی تھی۔ خبردار! بھولے سے بھی صاحب اور بیگم جی کا نام تمہاری زبان پر نہ آئے۔ ان لوگوں نے اتنا عرصہ تمہیں رکھا یہ کم احسان تو نہیں۔ ماں باپ نے تو تمہیں نکال دیا تھا۔ چلو اب واپس چلو۔"

پھر گونگی پروین نے میڈم اور اس کے ٹولے کی طرف دیکھا۔

"اگر مجھے گھر بھیجا تو میں سب کو سچ سچ بتا دوں گی کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ اگر چاہتے ہو میں زبان بند رکھوں اور اس شخص کی طرف نہ انگلی اٹھاؤں تو مجھے امام صاحب کی طرف بھیج دو۔"

"تمہارا چکر ہے امام کے بیٹے کے ساتھ؟"

"چکر نہ ہو تو آپ کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔"

"تم تو کہہ رہی تھیں گاؤں کی لڑکی ہے، یہ تو بڑی مکار ہے۔ چلو ٹھیک ہے۔ ہمیں تمہاری شرط منظور ہے۔" میڈم نے رسان سے کہا۔ "کچھ لو اور دو کا معاملہ تو ہوتا ہی ہے، پر کبھی تم نے زبان کھولی تو تم، تمہارا خاندان، امام صاحب، اکبر کوئی زندہ نہیں بچے گا۔ ہم ایسے ہی لوگ ہیں۔"

پتا نہیں ایسا ہونے پر انہیں فخر تھا کہ شرمندگی۔ پھر وہ وہاں سے سیدھی انہی کیمروں کی طرف لے جائی گئی جہاں ایک قطار میں بہن بھائی اس کے منتظر کھڑے تھے۔ امید اور بدگمانی میں ڈولتے، وہ سب اس کی طرف لپکے لیکن چھوٹا نہیں دوڑا۔ وہ اتنے سالوں میں اسے بھول گیا تھا۔

"کیا ہوا؟" پروین وسایا نے کوچ پر لیٹے لیٹے اپنے اوپر جھکے متفکر، پریشان چہروں کی طرف دیکھا۔ عبیر، فاروق، اکبر پاس۔

"کچھ نہیں۔" عبیر نے ملائمت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ "تم کچھ دیر کے لیے بے ہوش ہو گئی، شکر ہے اب ٹھیک ہو۔"

"کتنی دیر کے لیے؟" پروین نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"وقت تو میں نے نہیں دیکھا، شاید دو منٹ یا تین منٹ۔"

"اچھا!" پروین نے گہرا سانس لیا۔ "مجھ پر سے تو زمانے گزر گئے۔"

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

صبیحہ اقبال
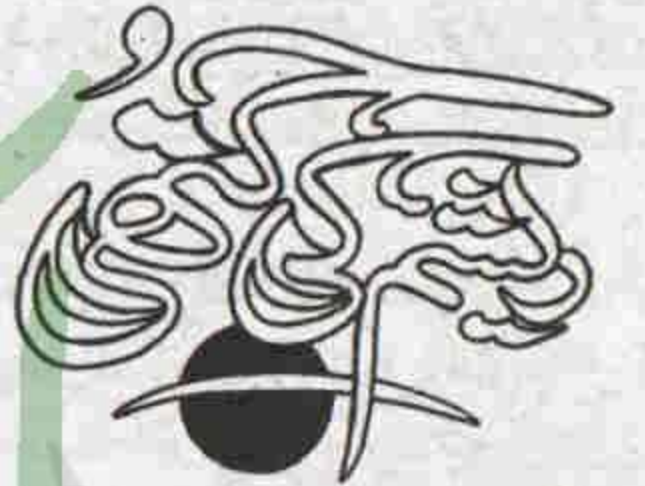
"ماما! میری گڑیا اذان بھیا نے لے لی۔" مریم ماں کے پاس روتی ہوئی آئی تھی۔ نیلی آنکھوں والی یہ گڑیا ہی تو اس کی محبت اور توجہ کا مرکز تھی جو اس وقت اذان کے قبضے میں تھی' ننھی مریم کے آنسو نہ تھم رہے تھے۔

"مریم! کیوں روتی ہو' ابھی اذان بھیا آپ کی گڑیا واپس دے دیں گے۔" مہر نے بیٹی کو پچکارا۔

"بھیا نے میری گڑیا کو مارا تو؟" مریم سراپا سوال تھی۔ مہر کی ہنسی چھوٹ گئی۔ مریم کی ننھی سی جان اور اس کی یہ سوچ۔

"ہر لڑکی پیدائشی عورت ہوتی ہے۔" مہر کو کبھی کا پڑھا جملہ یاد آگیا۔ گڑیا کے لیے مریم کی بے قراری دیکھ کر مہر نے آگے بڑھ کر اذان سے گڑیا لی اور مریم کو تھما دی' جسے پاکر وہ ایسی مسرور تھی جیسے اسے ہفت اقلیم مل گئی ہو۔ ہاں اس وقت سب سے اہم مریم کے لیے اس کی گڑیا ہی تو تھی۔

"ماما! یہ دیکھیں اذان بھیا میرا اسکول بیگ نہیں دے رہے۔" مریم رو دینے کو تھی۔

مہر نے بیٹے کو گھورا۔ "تم بہن کو کیوں ستاتے ہو؟"

"امی! میں تو بس یہ دیکھ رہا تھا کہ مریم کی آنکھوں میں آنسو آنے میں کتنی دیر لگتی ہے' تاکہ بجلی کی لوڈشیڈنگ میں پانی سے بے فکری ہو جائے۔" وہ مریم کی آنسو بہانے والی عادت کا مذاق اڑاتے ہوئے بولا۔

ادھر بن موسم کے برسات شروع ہو چکی تھی۔ اذان نے جلدی سے بیگ اس کے کندھوں پر ڈالا' شرارت سے ہاتھ جوڑ کر یہ جا وہ جا۔

"اف اتنے گھرے بادل' اذان بھیا تو جہاں ہوں گے' پریشان ہو رہے ہوں گے۔" مریم جانتی تھی کہ اذان گھن گرج' بارش سے بہت ہی خوف زدہ ہوتا ہے۔ اس لیے بادلوں کے گھر آنے پر وہ بہت فکر مند تھی۔

"پتا نہیں کیا مسئلہ ہے؟" وقفے وقفے سے چار مرتبہ کال کرنے کے باوجود بھی اذان نے فون ریسیو نہیں کیا تھا۔

"اب کیا ہو گا؟" پڑھائی سے فارغ ہو کر سب دوست کمرے سے باہر آئے تو موسم کی شدت پر اذان کے حواس ہی جواب دے گئے۔

"ان بادلوں کے برسنے سے قبل گھر پہنچنا تو یقیناً معجزہ ہو گا۔" اذان نے سوچا اور گھر کی جانب اسکوٹر دوڑا دی۔ اتنا اندھیرا عین دوپہر کے وقت۔ خوف سے اذان کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں یخ اترتی محسوس ہوئی۔ "بہن کی دعائیں ساتھ ہوں تو کامیابی کے لیے مطمئن رہو۔" اسے کسی مفکر کے قول نے دلاسا دیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا اس وقت ماما سے زیادہ مریم اس کے لیے دعائیں کر رہی ہو گی۔

ادھر اذان نے کال بیل پر انگلی رکھی۔ ادھر گیٹ کھل گیا اور مریم بھائی کو سامنے پاکر خوشی کے آنسو روکنے میں ناکام ہو رہی تھی۔ وہ تھی ہی ایسی' اذان کی چھوٹی چھوٹی سی تکلیفوں کو محسوس کرنے والی بہن اور اس کی خوشی میں اس سے بڑھ کر خوشی محسوس کرنے والی۔

☼ ☼ ☼

"ہاؤ ڈیسنٹ۔" شادی میں جانے کے لیے تیار ہو کر اپنے کمرے سے باہر آتے اذان کو دیکھ کر مریم نے بے ساختہ تعریف کی تھی۔

"دیکھو! نظر نہ لگا دینا اپنے اکلوتے بھیا کو کبھی کوئی چڑیل پیچھے نہ لگ جائے۔" اذان نے مریم کو جان بوجھ کر ستایا۔

"اللہ نہ کرے بھیا!" دو موٹے موٹے آنسو آن کی آن میں اس کے گالوں پر لڑھک آئے۔

"یہ لڑکیاں نہ جانے کس کس چیز اور ہستیوں کے لیے کن کن مواقع پر آنسو بہاتی ہیں' ان کی محبت کا محور کیا ہوتا ہے۔" اذان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

"بھیا! وہ آج بڑی پھوپھو کی بیٹی اساورہ باجی کی منگنی ہے نا۔"

"ہاں ہے تو پھر؟" اذان نے جملہ پورا ہونے سے قبل ہی مریم کو ٹوک دیا۔

"وہ بھیا! ٹیلر میرا سوٹ نہیں تیار کرپایا۔ شام سات بجے تک دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ میں تو اتنی دور دوبارہ نہ آسکوں گی۔" مریم نے تمہید باندھی۔

"بھیا! آپ واپسی پر میرا سوٹ لیتے آنا۔" اس نے ٹیلر کی دکان پر ہی کھڑے کھڑے اذان کو پوری صورت حال سے آگاہ کیا۔

"نہ بھئی نہ' یہ خالص خواتین والا کام مجھ سے نہ ہو گا۔ تم کوئی دوسرا سوٹ پہن لینا۔ دسیوں سوٹ تو بناتی رہتی ہو۔" اذان نے اپنی جان چھڑائی۔

"بھیا پلیز۔" مریم روہانسی ہو گئی۔

"اچھا بابا دیکھ لوں گا۔" مریم کا بھیگا بھیگا لہجہ اس کو گھائل کر گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"لیجیے محترمہ مریم رانی! کپڑوں کی دیوانی! پکڑیے اپنے کپڑے۔" اذان نے شاپر اس کی طرف اچھالا۔ "خوار کر دیا تمہارے ٹیلر صاحب نے دو منٹ کا کہہ کر پورے تیس منٹ انتظار کرایا۔" اذان واقعی چڑا ہوا تھا۔

"شکریہ بھیا شکریہ!" کہہ کر مریم شاپر لے کر آگے بڑھ گئی۔

"خالی خولی شکریے پر ٹرخا دیا۔ ایک پیالی چائے کو ہی پوچھ لیا ہوتا۔ پتا نہیں بھیا پیارا ہے یا یہ کپڑے۔" اذان ایک مرتبہ پھر بگڑا۔

☼ ☼ ☼

آج کل پورے گھر میں بھونچال آیا ہوا تھا کہ مریم بی بی میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہوئی تھیں اور اب گھر کی سیٹنگ تبدیل کرنے کی دھن سوار تھی۔

"اذان بھیا! آج آپ کو کہیں نہیں جانا۔" مریم نے بھائی کو باہر کی جانب بڑھتے دیکھ کر ڈرائنگ روم ہی سے ہانک لگائی۔

"لو بھلا! امتحانات سے یہ فارغ ہوئی ہیں۔ گھر میں ماما کا ہاتھ انہیں بٹانا ہے اور گھرداری مجھ ناچیز سے کرائی جائے گی۔" اذان بھلا چوکتا تھا؟

اور پھر پورا ہفتہ مریم اور مہر نے گھر کے سامان کو نئی ترتیب دینے میں گزار دیا۔ مریم نے ماں کے ساتھ ساتھ بھیا کو بھی خاصا مصروف رکھا تھا۔

"یہ سامان کباڑی کو دے دیں۔" مریم صبح ہی صبح ڈھیروں سامان نکالے کھڑی تھی۔ اس میں وہ گڑیا بھی تھی' جس کو اذان کی مار کا خوف مریم کو آنسو رلاتا تھا تو اسکول کا وہ بیگ بھی تھا' جس کی حفاظت مریم اپنی جان سے بڑھ کر کیا کرتی تھی۔ مریم نے وہ ڈھیروں کپڑے بھی ایک بڑے بیگ میں ٹھونس رکھے تھے' جن کی تیاری کے لیے وہ ہفتوں ماما کے سر رہتی اور درزیوں کے نخرے سہتی تھی۔ ایک بڑے شاپر میں کاسمیٹکس کا وہ سامان بھی نظر آرہا تھا جو کبھی بڑی چاہت اور حفاظت سے چھپا چھپا کر رکھا جاتا رہا تھا۔ دوستوں اور عزیزوں

کے بھیجے ہوئے ڈھیروں کارڈز جن کے ملنے پر وہ خوشی کے آنسو اور خراب ہوجانے پر غم کے آنسوؤں سے چہرہ دھوتی تھی۔ اب بے توجہی اور دل سے اتر جانے کا شکوہ کررہے تھے۔

"ایں! یہ سب؟" اذان حیران تھا۔

"جی جی! یہ سب سامان، مگر آپ اتنے حیران کیوں ہیں؟"

"یہ تم لڑکیاں بھی عجیب سیمابی فطرت رکھتی ہو، کل تک جو خوب تھا، وہی آج ناخوب ہوا والی کیفیت، وہی چیزیں جن کو پانے کے لیے اپنی جان ہلکان کرتی ہو، جن پر جان چھڑکتی ہو، کوئی نقصان ہوجائے تو آسمان سر پر اٹھالیتی ہو۔" اذان اپنی دھن میں بولے جارہا تھا۔

"بس کریں بھیا!" مریم سچ سننے کو تیار نہ تھی۔ مگر اذان توجہ اور محبتوں کے بدلتے محوروں کو ضرور محسوس کررہا تھا۔

وقت دبے پاؤں گزر گیا اور بکریوں کی طرح منمناتی مریم اب تتلیوں کی مانند رنگ بھر کر گریجویٹ ہوگئی تھی۔

گریجویشن کے بعد مہر اور افغان صاحب کو امید تو یہ تھی کہ اب بڑی آپا، بی اماں کے فیصلے کے مطابق مریم کو صہیب کی دلہن بنا کر لے جانے کا تقاضا کریں گی، لیکن بڑی آپا آئیں تو صہیب کی منگنی میں شرکت کی دعوت دے گئیں۔ والدین کی آنکھیں ڈبڈبائیں تو، لیکن وہ بیٹی کے ماں، باپ ہونے کے ناتے کوئی وعدہ یاد نہ دلا سکے اور مریم کو اپنی یہ توہین مہینوں رلاتی رہی۔ خاموش بیٹھی مریم کو دیکھ کر ٹوٹی چوڑیوں کا احساس ہوتا۔ یہ لڑکیاں چوڑیوں کی طرح بنا کچھ کہے ٹوٹ جاتی ہیں۔ ان کے دل کہاں کہاں اٹکتے ہیں اور کب کب ٹوٹ جاتے ہیں بغیر چھناکے کے۔ نہ جانے کیوں ہر ہر لمحہ دھڑکنے والے دل کو لوگ پتھر کا جانتے ہیں۔

موم کی شمع کی مانند بے آواز پگھلتی مریم اذان کو حیرت زدہ کررہی تھی۔ کیا مریم کی محبت کا محور صہیب بھائی؟

"مریم! چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔" اس نے سوچوں میں گم مریم کو مخاطب کیا۔

"بھیا! سوری، مجھے اس وقت بہت تھکن ہورہی ہے۔" وہ بے زاری کے ساتھ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی تھی۔

آج مریم نے پہلی مرتبہ اذان کے کسی کام کو منع کیا تھا۔ "پھپھو! آپ نے اچھا نہیں کیا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "مریم کے دل کو زخمی کرکے آپ کو کیا ملا؟" وہ تاسف کے ساتھ خود کلامی کررہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج پھر کچھ لوگ اسے دیکھنے آرہے تھے۔ پتا نہیں، یہ آنے والے بغیر بتائے کیوں نہیں آجاتے؟ یہ امید و یاس کے درمیان کٹتے لمحے جیسے صدیوں کا روپ دھار گئے۔ مریم بہت دکھی ہورہی تھی، ساتھ ہی چہرے سے بے زاری عیاں تھی۔ وہ بار بار مسترد کیے جانے پر خود کو مجرم گردان رہی تھی۔ آنکھوں میں بار بار چھلک آنے والے نمکین پانی کو اس نے بمشکل قابو کیا ہوا تھا۔

"آپ کی بچی تو ماشاء اللہ بڑی سوبر ہے۔" آنے والی معمر خاتون نے نرمی سے دست شفقت مریم کے سر پر رکھا۔

"اللہ کرے! ہمارے شارب بھائی بھی آپ کی توقع پر پورے اتریں۔" ملیحہ نے مریم کو پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا تو اس کی دل کی دھڑکنیں "آمین آمین" کی صدا دینے لگی تھیں۔

اور پھر ہوا بھی یہی کہ مریم کے لیے شارب کا انتخاب ہوگیا۔ جذبات سے گندھی ذرا سی تپش سے پگھل جانے والی مریم بڑے حوصلے کے ساتھ بابل کا آنگن پار کرگئی۔ لیکن بابل کے آنگن سے سسرال کی دہلیز تک پہنچتے پہنچتے بیگم طارق اور ملیحہ کا لہجہ تبدیل ہوچکا تھا۔

"دلہن! تھوڑا تو جھک کر چلو۔ ہمارے ہاں بہوئیں گردن تان کر نہیں رہتیں۔" کار سے اترتی مریم کو آئندہ زندگی گزارنے کا سلیقہ سمجھا دیا گیا تھا۔

"ارے بھابھی! ذرا اپنا شرارہ تو سنبھالیں۔ نیچے لٹک رہا ہے۔ خراب ہوجائے گا۔ آپ کو بھی اندازہ ہوگا، کس قیمت کا ہے۔" ملیحہ نے پیچھے آکر سرگوشی کی تو مریم کو اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔

...سرائی نرم دھوپ کی طرح آنگن میں اترتی مریم کو ...کانچ پر ننگے پیر چلنے کا تجربہ ہورہا تھا۔

...ای سے اس طرح کیوں بات کی؟

...ای کو اس طرح کیوں کہا؟

...بھیا سے یہ کیوں پوچھا؟

...بھی سالن میں خوامخواہ نمک تیز محسوس ہوتا اور ...بھی روٹیاں جلی ہوئی لگتیں۔ تبصرے اور طنز کے تیر ...دل چھلنی کیے دیتے۔ بڑی سنبھل سنبھل کر پیر رکھنے ...والی مریم پھر بھی زخموں سے چور، لہولہان ہی رہتی۔ ...ماں کی عزت و حرمت پر لیکچر دیتا شارب اسے کسی ...بھی اپنا نہ لگتا۔ بس ایک کچے دھاگے کے مانند ...بندھن جو ہر لمحے ٹوٹنے کو تیار۔ تلے اوپر تین بچوں کی ...آمد نے بھی شارب کے زنگ آلود ذہن کو تبدیل ...نہیں کیا تھا۔

اور اب شارب اپنی کمپنی کی جانب سے مسقط جارہا ...تھا، مریم کو اس کی فرقت کا سوچ کر قرار نہیں تھا۔

"شارب! آپ نہ جائیں، آپ کمپنی والوں کو منع ...کردیں۔" وہ آنکھوں کے بھرے کٹورے لیے ...شارب کے پہلو میں کھڑی تھی۔

اپنے دل میں سمندر جیسی وسعت رکھنے والی ...عورت کو بھلا کب یہ گوارا ہوتا ہے کہ اس کا شوہر اس ...سے دور ہو، یہی کیفیت مریم کی تھی، وہ اس کی ہزار ...زیادتیوں کے باوجود بھی اس کی قربت کی خواہاں تھی۔

☼ ☼ ☼

...روز روز ماں کے گھر آنے والی دونوں نندیں مہمان ...رہتیں اور مریم کے میکے جانے سے روکنے کا ...بہانہ ہوتی۔ "گھر میں مہمان آئے ہیں اور تمہیں اپنے ...میکے جانے کی سوجھی ہے۔" کبھی کبھی فون پر ہی خیر ...خیریت ہوجاتی تو اسی کو بہت گردانا جاتا۔ ہفتے کے پانچ ...دن اسی طرح گزر جاتے، چھٹے دن گھر کے رکے ہوئے ...کام نمٹانے ہوتے اور ساتواں دن چھٹی کا ہوتا۔ یوں ...اگر کبھی بہت ہی مچلتی تو شارب کے ساتھ ہی ...گھنٹہ دو گھنٹہ میکے ہو آتی۔ وہ آج تک شارب کے بغیر میکے نہیں آئی تھی۔

اور آج وہ پہلی بار شارب کے بیرون ملک ہونے کی وجہ سے اکیلی ہی میکے آئی تھی۔ بچے تو گاڑی سے اترتے ہی بھاگم بھاگ نانو اور ماموں کی جانب لپکے تھے۔ مگر ایک، دو، تین، چار، پانچ منٹ گزر جانے کے باوجود بھی جب مریم مطلع پر نمودار نہ ہوئی تو اذان کو تعجب ہوا۔

"ہوسکتا ہے، رکنے کے خیال سے آئی ہو اور بچوں کا سامان وغیرہ گاڑی سے اتار رہی ہو، لیکن اتنی دیر؟" وہ بے چین سا ہوکر پورچ کی جانب لپکا۔

وہاں ہمیشہ کی طرح برکھا پورے زوروں پر برس رہی تھی۔

"ایں! تم یہاں کھڑی کون سی گمشدہ چیز تلاش کررہی ہو؟" اذان اس کی برستی آنکھوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کرگیا۔ "یہ جبینوں پر چڑھی تیوریاں اتار دو تو پیشانی منور ہوجائے اور ہم بھی شاد کام ہوں۔"

اذان نے مریم کو باتوں میں لگا کر اندر لے جانے کی سعی کی۔

"تم اب تو یہاں رکو گی نا؟"

"ہاں اذان! اب تو یوں لگتا ہے جیسے زندگی سوت کی انٹی کی طرح ایک ہی مدار پر حرکت کررہی ہے۔"

مریم بے کیفی کے عالم میں گویا تھی، اسے شارب کے بغیر اکیلے میکے آنا بہت رلا رہا تھا۔ اذان کو لگا جیسے وقت کے تقاضے بدل گئے ہوں اور مزاج کے سانچے تبدیل ہوگئے ہوں۔

سانچے مسلسل تبدیل ہورہے تھے، نیلی آنکھوں والی گڑیا سے لے کر شارب تک۔ ریشم کی نلکیوں کی طرح الجھتی گتھی کہ "عورت سب سے زیادہ کس کو چاہتی ہے؟" مریم کی حالت نے سلجھا کر اذان کی ہتھیلی پر رکھ دی اور وہ جان چکا تھا کہ رات کو بچوں کی حمایت میں باپ سے الجھتی ماں.... دن کو باپ کے حق میں بچوں کو دلائل کیوں دیتی ہے؟

☼

ثمرہ بخاری

مئی کا آغاز تھا۔ فضا میں حدت اور پکی گندم کی باس رچی بسی تھی۔ آندھیوں کا زور شروع ہو چکا تھا۔ ہر دوسرے روز عصر کے بعد مغرب کی طرف سے ایک غبار سا اٹھتا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف مٹی کی چادر سی تن جاتی۔ گھروں کے کواڑ بجنے لگتے اور جانور گھبرا کر ڈکرانے لگتے۔ ہوا جیسے بھٹی سے نکل کر آتی تھی، گرم تھپیڑے جسم کو بری طرح جلانے لگتے تھے، مگر کوئی بھی بارش کی دعا نہیں مانگتا تھا۔ کیسے مانگے.... یہ گندم کی کٹائی کا موسم ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی کے کھیت کی باری ہوتی ہے۔ سب مل کر کام کرتے ہیں۔ شام تک ایک کھیت کا کام نبٹاتا ہے، پھر کسی دوسرے کا کھیت شروع ہو جائے گا۔

دن چڑھنے سے بہت پہلے ڈھول بجنے لگتا ہے اور دن بھر کے تھکے ہارے آنکھیں ملتے ہوئے فوراً" اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ چولہوں میں آگ روشن ہونے لگتی ہے اور گیہوں کی سوندھی روٹی کی خوشبو ہر سو پھیل جاتی ہے۔ سورج نکلنے سے پہلے کھیتوں میں کام کا آغاز ہو جاتا ہے۔

تصور بی بی دو روز پہلے گاؤں سے شہر آگئی تھی۔ مجبوری میں آنا پڑا تھا۔ کاکا بیمار پڑ گیا تھا اور چاچے کی تو جان تھی کاکے میں۔ اسے زکام بھی ہو جاتا تو چاچے چوہدری خیردین کی جان پر بن آتی تھی اور اب تو بخار چڑھ گیا تھا اسے۔ چوہدری خیردین نے فوراً" گاڑی نکلوائی اور کاکے کو اس میں ڈالا۔ اب چار سالہ کاکے کے ساتھ اس کی ماں تصور بی بی کا جانا تو ضروری تھا ہی۔ دو روز شہر رہے۔ کاکے کو ڈاکٹر نے ہسپتال میں داخل کر لیا تھا۔ یہ دو دن خیردین کے تو فون پہ فون کرتے ہی گزر گئے۔ شکر کا کلمہ پڑھا، جب خبر ملی کہ کاکے کا بخار اتر گیا ہے۔

"ڈاکٹر کہتا ہے گرمی لگ گئی تھی۔ خیال رکھا کرو اس کا۔" تصور فون پر بتا رہی تھی۔

دو روز بعد شہر سے واپسی ہوئی۔ گاؤں کی حدود شروع ہوا چاہتی تھی، گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی اور وہ چلتے چلتے رک گئی۔

"او! کیا ہو گیا ہے؟" تصور نے کڑک کر ڈرائیور سے پوچھا تھا۔

"بس بی بی صیب! ابھی ٹھیک ہو جائے گی۔" ڈرائیور بی بی کے غصے سے واقف تھا۔

تصور بی بی چوہدری خیردین کی بھتیجی اور اس کے مرحوم بیٹے کی نوجوان بیوہ تھی۔ اپنے بیٹے کاکے کے ساتھ وہ تایا کی حویلی میں مقیم تھی اور یوں لگتا تھا مرحوم شوہر کے ساتھ تصور نے بھی اپنے سارے ارمان مٹی میں دفن کر دیے ہیں۔ اس نے جذبات کو سلا دیا ہے اور اب وہ ایک ایسی عورت ہے جس کے سینے میں دل نہیں پتھر ہے۔

چوہدری خیردین بے چینی سے پوتے کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے ہی گاڑی حویلی میں داخل ہوئی، وہ لپک کر آیا اور پوتے کو گود میں لے لیا۔

تصور نے مسکرا کر دادا پوتے کا لاڈ دیکھا۔

"فکر نہ کرو چاچا! اب یہ بالکل ٹھیک ہے۔ ڈاکٹر نے گلوکوز کی بوتل لگائی ہے اسے۔"

"چلو پتر تصور! جلدی جلدی اندر چلو۔ آندھی آنے والی ہے۔" خیردین کے توجہ دلانے پر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ایک غبار تھا، جو تیزی سے سارے آسمان پر چھاتا جا رہا تھا۔

"چاچا! ملازم لڑکیوں نے صحن سے سب کچھ ہٹا لیا ہے ناں! یہ بڑی کام چور ہیں۔ موقع ملنا چاہیے انہیں بیٹھ کے کہانیاں ڈالنے کا۔"

"او پتر! فکر نہ کر۔ سب ہو گیا ہے، اندر چل۔ یہ کاکے کو پکڑ، میں ذرا بیٹھک تک جاتا ہوں۔"

"کوئی آیا ہے چاچا؟" کاکے کو گود میں لیتے تصور نے یونہی پوچھ لیا تھا۔

"ہاں نواں پٹواری آیا ہے۔ عمر کا تو ہلکا ہے، پر کام میں بڑا تیز ہے، پھر جوان خون ہے۔ ضرورت سے زیادہ چستی دکھا رہا ہے۔"

"روٹی پانی بھجواؤں اس کے لیے؟"

"تو خود تھکی ہوئی شہر سے آئی ہے۔ جا کے آرام کر، ملازم ہیں ناں، سب دیکھ لیں گے۔"
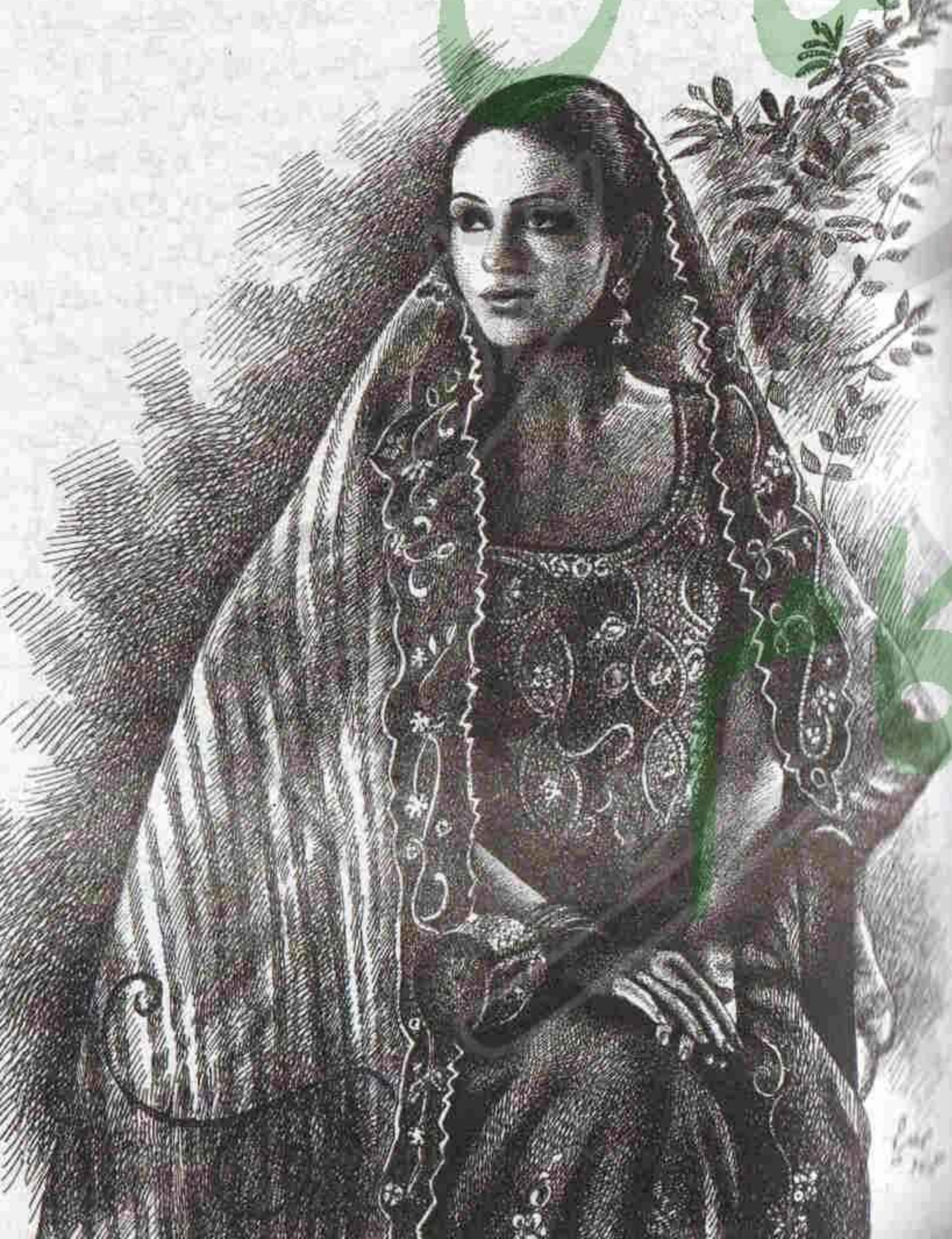
"پر چاچا! یہ سرکاری بندے۔ خاطر خدمت میں کوئی کمی رہ جائے تو لینے کے دینے ڈال دیتے ہیں۔ میں دیکھتی ہوں کھانے میں کیا پکایا ہے نوراں نے۔"

برآمدے میں آکر اس نے کاکے کو ایک ملازمہ کی گود میں دیا اور خود باورچی خانے میں آئی۔

نوراں کام کرتے ہوئے گنگنا رہی تھی۔ گدرایا بدن چمکتا گندمی رنگ، کالی آنکھوں میں جادوئی کشش اور سب سے بڑھ کر اس کے موتیوں کی طرح چمکتے ایک قطار میں جمے دانت۔ جب وہ ہنستی تھی تو سامنے والا پوری توجہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

"سلام بی بی!" اپنی ازلی لاپروائی سے اس نے سلام کیا اور پھر سے کام کی طرف متوجہ ہو رہی تھی۔

"کیا بنا رہی ہو؟" تصور نے اپنے مخصوص کھردرے انداز میں پوچھا تھا۔

"مرغی بھونی ہے جی۔ خوب سارا دیسی گھی اور ٹماٹر ڈال کے۔ سوجی کا حلوہ بھی بنا لیا ہے میں نے۔ اب یہ قیمہ بھون رہی ہوں۔"

"سن! چائے زیادہ پتی والی بنانا۔ شہر سے آیا ہے وہ۔" ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ آندھی آنا شروع ہو گئی، تیز ہوا کی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ اس شور میں باقی ساری آوازیں دب گئی تھیں۔ نوراں نے چولہا بند کر ہانڈی ڈھک دی۔ بے شک باورچی خانے میں کواڑ لگے تھے، پر یہ مٹی تو درزوں سے بھی گھس کر سارے میں پھیل جاتی تھی۔ دونوں خاموش کھڑی ہواؤں کی غراہٹ سن رہی تھیں۔ میراں بھاگتی ہوئی آئی تھی۔

"وہ جی غضب ہو گیا ہے، بارش کی چھینٹ پڑ گئی ہے۔"

دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا، پھر میراں کے پیچھے ہی باہر نکل آئیں، واقعی آسمان تو اب کالے بادلوں سے ڈھک چکا تھا، بجلی کڑک رہی تھی اور اس کی چمک اتنی تیز تھی کہ دلوں کو چیرتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

"ربا! سارے سال کی محنت نہ رول۔ ہمارے گناہ معاف کر دے اس پانی کو روک لے۔"

سارے گاؤں کے لبوں پہ یہی دعائیں تھیں اور ادھر بیٹھک میں بیٹھا پٹواری سلیم خان بہت خوش ہو کر ان سیاہ بادلوں اور اکا دکا گرتے پانی کے قطروں کو دیکھ رہا تھا۔

"او چوہدری صاحب! بارش ہونے والی ہے۔ شکر ہے اس گرد کے طوفان سے تو جان چھوٹے گی۔"

چوہدری نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

آندھی آئی مگر اس کے ساتھ ہلکی سی بارش بھی ہو گئی۔ تیز ہواؤں نے بادلوں کو برسنے نہیں دیا۔ وہ ہوا کے دوش پر کسی اور دیس سدھار گئے۔ گاؤں والوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

وہاں گرد بھی کچھ بیٹھ گئی اور سلیم خان کے حصے میں بھی اطمینان آگیا۔

اس کے لیے رات کا کھانا بھجوایا گیا مگر اس نے برائے نام ہی کھایا۔

"شاید اچھا نہیں لگا۔" چولہے کے پاس اس کے برتن واپس لا کر رکھتی میراں کہہ رہی تھی۔

"نئیں تے ناں سہی۔" نوراں نے ذرا بھی توجہ نہ دی۔ "ہاں ٹھیک ہے ناں۔ اپنی طرف سے تو اچھا ہی بنایا تھا۔ اب اگلے کی مرضی، پسند نہیں آیا کوئی کیا کر سکتا ہے۔"

"چائے کو کہہ رہا تھا۔" میراں نے جتایا۔

نوراں نے اثبات میں سر ہلا کر چائے کا پانی چولہے پر رکھ دیا۔ میراں کسی اور کام سے نکل گئی۔

چائے تیار کر کے نوراں نے بڑے مگ میں ڈالی، مگ ٹرے میں رکھ کر وہ بیٹھک میں آئی۔ سلیم خان اس وقت ٹی وی پر کوئی پروگرام دیکھ رہا تھا۔

"ہاں، ادھر ٹیبل پر رکھ دو۔" اس نے نوراں کی جانب دیکھے بغیر ہی کہا تھا۔

"صاحب! میں نے چینی نہیں ڈالی۔ یہ ساتھ رکھی ہے۔ اپنی مرضی سے ڈال لینا۔"

"ہوں، ٹھیک ہے۔" مگر ساتھ ہی جو نظر نوراں کی طرف اٹھی تو کچھ بھی ٹھیک نہیں رہا۔ وہ کوئی پھینک نوجوان نہیں تھا، پر دل کیا کرے۔ کشش تو تھی۔ جی چاہتا تھا ایک ٹک دیکھتے رہو اور پھر کلائی تھام لو۔ اتنی زور سے کہ ہڈی تک چیخ جائے۔

نوراں نے ایک خوبرو جوان کی بے تحاشا تپش دیتی آنکھوں میں بس ایک لمحے کے لیے ہی جھانکا۔ اسے لگا، اس تپش سے اس کا دل جلنے لگا ہے۔ ٹھہرنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ الٹے پاؤں پیچھے ہٹی اور باہر نکل گئی۔

"یوں بھی ہوتا ہے... یوں بھی ہو سکتا ہے..." اپنی اپنی جگہ دونوں حیران تھے اور ایک بار پھر اسی نظارے کو بے چین بھی تھے۔

☼ ☼ ☼

سلیم کے لیے ادھر گاؤں میں سرکاری کوارٹر موجود تھا مگر اس کی حالت بہت خستہ تھی۔ چوہدری خیر دین نے نہر کنارے جو ریسٹ ہاؤس بنوا رکھا تھا سلیم خان کو وہاں ٹھہرنے کی درخواست کی اور درخواست قبول بھی ہو گئی۔ تصور نے سنا تو بولی۔

"یہ آپ نے بڑا اچھا کیا چاچا جی! افسر اپنی مٹھی میں رہے گا۔"

مگر یہ تو تقدیر ہی جانتی تھی چوہدری نے اچھا کیا یا برا کیا، یا پھر بہت ہی برا کیا۔

مئی گزرا، فصلیں گھروں میں آئیں۔ گاؤں میں زندگی مسکرانے لگی۔ شادی بیاہ کے معاملے فصل اترنے پر ہی نبٹائے جاتے تھے۔ تاریخیں رکھی جا رہی تھیں، شگن ہو رہے تھے۔ ہر روز ہی کسی نہ کسی گھر سے ڈھولک کی آواز اور کنواریوں کے شوخ گیت فضا میں تیرتے یہاں وہاں جادو بکھیرتے تھے۔ یہ دن ہنسنے مسکرانے کے لیے ہیں۔ کنواریاں نئی نئی جوان ہوتی لڑکیاں بڑی بہنوں بھائیوں کی شادیوں کی تیاریاں جی جان سے کرتی ہیں۔ دوپٹوں پر ستارے ٹانکے جاتے ہیں تو جوڑے بھی رنگ برنگ کے دھاگوں اور گوٹے کناری سے سجائے جاتے ہیں۔ اگر یہ وقت کسی کے لیے کڑا تھا تو تصور کے لیے۔ وہ جوان بیوہ ہے، اس کے لیے سرخی پاؤڈر شوخ لباس تو حرام ٹھہرا ہے۔ سب سے بڑھ کر اذیت وہ منظر دیتا ہے جب کسی بھی بیاہ کی تقریب میں ہر آنکھ اس کی طرف اٹھتی ہے اور اعتراض کا رنگ لیے ہوتی ہے۔

"اسے کیا ضرورت تھی آنے کی۔ ہم نے بلایا ضرور تھا مگر اسے آنا نہیں چاہیے تھا۔"

وہ ان دنوں اپنے کمرے میں بند ہو جانا چاہتی تھی مگر یہ بھی ممکن نہیں تھا، لوگ کسی حال میں بھی جینے نہیں دیتے۔

اسے ان بیاہ شادیوں میں شرکت کرنی تھی، لبوں پر مسکراہٹ رکھنی تھی اور تحفے تحائف لے کر جانے تھے۔ ہاں! مگر یہ دھیان رکھنا تھا کہ اس کا لباس بالکل سادہ رہے اور چہرے پر میک اپ کا مٹا مٹا سا بھی نشان تک نہ ہو۔

آج میراں کے چاچے کے پتر کی مہندی تھی۔ سب ہی جانے کو تیار تھیں مگر تصور کو نوراں نے چونکا دیا تھا۔ گہرا نیلا رنگ جس پر ستارے ٹکے تھے۔ کیا یہ رنگ کسی پر اتنا بھی سج سکتا ہے؟ اس کا جی چاہا وہ نوراں کو سامنے بٹھا کر دیکھتی رہے۔ پھر سر جھٹکا۔

"اب ایسی بھی حور پری نہیں لگ رہی یہ نوراں۔"

"ہم جائیں بی بی! آج مہندی ہے نا؟"

تصور نے انہیں جانے کی اجازت دی اور جلدی واپس آنے کو بھی کہا۔

نوراں اور اس کی ماں اس حویلی میں رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ چند دوسرے ملازموں کو بھی چوہدری صاحب نے حویلی کے پچھواڑے مکان بنوا کر دے رکھے تھے۔ جب سے چوہدری کا جوان بیٹا مرا تھا، چوہدری کو وہم بہت ستانے لگے تھے۔ ساری دنیا دشمن نظر آتی تھی اور وہ اپنے گرد وفاداروں کی فوج کھڑی دیکھنا چاہتا تھا۔ تصور کے مقابلے میں اس کا رویہ بھی اپنے ملازموں سے بہت نرم ہوا کرتا تھا۔

مہندی کی تقریب میں تصور کو بھی جانا تھا مگر اسے صرف شادی کا تحفہ لے کر جانا تھا اور دے کر واپس آجانا تھا۔ کاکا سو چکا تھا۔ چوہدری خیر دین گھر پر ہی تھا وہ کاکے کو اس کے بستر پر ڈال کر آرام سے جا سکتی تھی۔

"کسی ایک کڑی کو تو روک لیتی پتر! اب اکیلی جائے گی۔"

"نہیں چاچا! اکیلی کیوں؟ نوراں کی ماں گھر پہ ہی ہے، میں اسے ساتھ لے لوں گی۔"

"چلو ٹھیک ہے، ویسے جلدی نکلنے کی کرو۔ مجھے موسم کے آثار ٹھیک نہیں لگ رہے اور میں حیران بھی ہوں۔ جون کا مہینہ ہے اور آسمان پر بادل اکٹھے ہو رہے ہیں۔"

تصور نے بھی صحن میں جھانک کر دیکھا اور بولی۔

"چاچا! بس ایسے ہی جھلک دکھا رہے ہیں۔ برسیں گے تھوڑی۔ بھلا جون میں کہاں بارش ہوتی ہے۔"

"ہاں کہتی تو تو ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے چاچا! پھر میں چلتی ہوں۔ تو کا کے کا دھیان رکھنا۔"

"بے فکر ہو کر جا پتر۔"

تصور نے کمرے میں جا کر کپڑے بدلے۔ بالوں کو سلجھا کر لمبی سیدھی چٹیا بنائی اور خود کو آئینے میں بہت غور سے دیکھا۔

"ربا! تیری تو ہی جانے۔"

آنکھوں کی نمی پونچھتی وہ مربعوں کی مالک گاؤں کی سب سے عزت دار عورت باہر آ گئی۔ نوراں کی ماں اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ دلہن اور دولہا کے لیے ان کے ہاں سے تحائف اور نقد جا تو چکا تھا، پھر آج اپنے ہاتھ سے بھی کچھ رقم اسے وہاں جا کر دینا تھی۔

دونوں خاموشی سے حویلی سے نکلیں۔ گیٹ پار کرتے ہی تصور کو احساس ہوا تھا۔ جس ہوا نے اس کے گالوں کو چھوا ہے، اس میں جون کی حدت نہیں ہے۔ یہ ہوا ٹھنڈی اور شوخ ہے مگر اپنی سوچوں میں دور تک اترے اس نے بہت زیادہ دھیان بھی نہیں دیا۔

یہ زمین پوٹھوہار کی تھی۔ وادیاں اونچی نیچی اور ناہموار آبادیوں سے دور، یہاں جنگلی جانوروں کی بہتات تھی۔ خاص کر بھیڑیے اس علاقے میں عام تھے۔ گرمیوں میں سانپ اور بچھو بھی بکثرت نکلتے تھے جبکہ سردیوں میں یہاں چیتے بھی دیکھے گئے تھے۔ خیر! یہ جانور آبادیوں کی طرف نہیں آتے تھے۔ ان کا ٹھکانہ ادھر سے دور تھا۔ وہ دونوں حویلی سے کچھ ہی آگے گئی تھیں کہ ہوا نے بہت تیزی اختیار کر لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مہربان جھونکے خوفناک آندھی میں بدل گئے۔

"نذیراں! تم میرا ہاتھ پکڑ کر رکھنا۔ اڑتی گرد میں ہم ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتیں۔" نذیراں نے اس کی آواز سن کر اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا تھا اور اس نے تھامنے کی کوشش کی تھی۔

"بی بی! تم کدھر ہو بی بی؟" اس نے پکارا مگر اس کی آواز بادلوں کی گڑگڑاہٹ میں دب کر رہ گئی۔ وہ دیوانہ وار بی بی کو پکارنے لگی اور ایسے میں ہی چھما چھم بارش شروع ہو گئی۔

"بی بی! تم کہاں ہو؟" وہ اس اندھیری برستی رات میں اپنی مالکن کی تلاش کی دھن میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

ہاں ایک بار اس نے کسی کے چلانے کی آواز ضرور سنی تھی۔ یہ آواز یقیناً تصور کی تھی اور یہ آواز ایک بار نہیں، دو تین بار سنائی دی تھی۔ یقیناً وہ دونوں گاؤں سے دور ٹیلوں کی طرف آ نکلی تھیں اور یہاں ٹیلوں سے ٹکرا کر آواز کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔

نذیراں کو شدید گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ وہ راستہ بھٹک گئی ہیں، اس خیال سے اس کی روح فنا ہونے لگی تھی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ آنکھوں کے سامنے چادر سی تن گئی تھی اور برستے پانی میں سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سلیم بہت دیر تک سیل پر اپنے شہری دوستوں سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اسے بادل کی گرج نے متوجہ کیا۔ بادل اور اس موسم میں.... یہ کسی اور شے کی آواز ہو گی وہ کھڑکی تک آیا اور اسے خوشگوار حیرت ہوئی۔ بادل گھر گھر کر آیا تھا۔ ہوا میں تیزی تھی۔

"شکر ہے گرمی کا زور ٹوٹا۔" وہ کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ کھڑا ہوا۔ یہ چوہدری خیر دین کا گیسٹ ہاؤس تھا جس کے ایک کمرے میں آج کل سلیم ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ عمارت زمین سے خاصی بلندی پر بنائی گئی تھی اور اچھی خاصی خوب صورت بھی تھی۔ بجلی چمکی اسے لگا، گیسٹ ہاؤس کی بیرونی چار دیواری کے باہر کچے راستے پر کوئی تھا۔ مگر اس وقت کون ہو سکتا ہے وہ برآمدے میں کھڑا تھا، جو صحن کے فرش سے تقریباً" چھ فٹ اونچا تھا اور یہاں کھڑے ہو کر وہ دیواری کے باہر آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ کیا واقعی کوئی تجسس نے اسے یہیں رکنے اور باہر کچے پر نظر رکھنے پر مجبور کیا۔ بجلی ایک بار پھر چمکی تو اس نے جانا یہ اس کا وہم نہیں تھا۔ باہر واقعی کوئی تھا۔

بارش بہت تیز تھی۔ پوٹھوہار کی ڈھلوانی سطح پر بارش کا پانی کسی تند و تیز ریلے کی طرح بہہ رہا تھا۔ سلیم نے اسے لڑکھڑا کر گرتے ہوئے دیکھا تھا، جو کوئی بھی ہے مجھے اس کی مدد کرنی چاہیے۔ ہاتھ میں پکڑا سیل اس پڑی کرسی پر رکھ کر وہ برآمدے سے باہر آ گیا۔ چھ سیڑھیاں اتر کر آگے بڑھنا اتنا دشوار ہو گا۔ اس کا اندازہ اسے ہموار چھت تلے کھڑے ہو کر بالکل نہیں ہو سکتا تھا۔

اسے لگا، بند ٹوٹ گیا ہے اور پانی بپھر کر باہر آیا ہے۔ قدم جمانے کی لاکھ کوشش کے باوجود ایک بار وہ گر پڑا۔ جیسے ہی اس وجود کے قریب پہنچا، بجلی زور سے کڑکی۔ وہ وجود مارے خوف کے خود میں سمٹنے لگا اور سلیم نے دیکھا، سراپا کسی جوان عورت کا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس لڑکی کا بازو تھاما۔ طوفان کے شور کے باوجود اس نے لڑکی کی چیخ سنی مگر وہ اس وقت وضاحتیں دینے کی پوزیشن میں کب تھا۔ اسے کھینچا، قدموں پہ کھڑا کیا اور اپنے ساتھ ساتھ گھسیٹنے لگا۔ مگر وہ روتی تھی اور ہاتھ چھڑاتی تھی۔

"دوست ہوں، دشمن نہیں ہوں۔ سلیم ہے میرا نام۔" پھر مزاحمت دم توڑ گئی تھی۔ وہ اسے برآمدے کی ہموار چھت تلے لے آیا۔ پھر اندر جا کر ٹارچ روشن کی اور اسے باہر رکھ دی۔ مگر ایسا کرنے کے بعد اسے اپنی بے وقوفی کا احساس ہوا۔ برستا بادل، تنہائی اور گیلے لباس میں زلفوں سے ٹپ ٹپ پانی ٹپکاتی جوان حسین عورت۔

"کون ہو تم؟" سلیم نے توجہ ہٹانے کے لیے سوال کیا۔

"میں تصور ہوں۔ چوہدری خیر دین صاحب کی بہو۔"

"اوہ!" سلیم کا دھیان واقعی بٹ گیا وہ بیٹھے سے کھڑا ہو گیا۔ "آپ یہاں اس حال میں؟ یہ تو آپ کا اپنا گھر ہے، آپ اندر چلیں، آرام سے بیٹھیں۔"

"نہیں، میں پہلے نہاؤں گی۔ میرے سارے کپڑے پاؤں کیچڑ نے خراب کر دیے ہیں۔"

وہ اب ذرا اعتماد میں تھی اور گاہے گاہے سلیم کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میں ادھر دائیں ہاتھ والے کمرے میں جاتی ہوں۔ یہ میرا کمرا ہے، میں جب فصلوں کی بوائی کی نگرانی کے لیے اس طرف آتی ہوں تو پھر کچھ وقت اسی گیسٹ ہاؤس میں گزارتی ہوں۔ وہاں الماری میں میرے کچھ کپڑے بھی رکھے ہیں۔"

یقیناً" اپنا یہ حلیہ اور وقت کی نزاکت اسے بھی پریشان کر رہی تھی۔ وہ اندر چلی گئی اور سلیم کے لیے اس رات کو مزید خوب صورت بنا گئی۔ وہ بے اختیار مسکرایا تھا۔

اس نے نہانے اور کپڑے بدلنے میں زیادہ وقت نہیں لیا۔ بالوں کو تولیے میں لپیٹے، وہ پھر باہر آ گئی تھی۔ اس نے اب دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا، مگر سلیم کو لگا، ویسے نہیں جیسے اسے اوڑھنا چاہیے تھا اور اسے سلیم کے سامنے رکھی کرسی پر بھی تو نہیں بیٹھنا چاہیے تھا، مگر وہ بیٹھ چکی تھی۔

"آپ سلیم ہو، شہر سے آئے ہو؟"

"دل لگ گیا گاؤں میں؟"

"ادھر کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟"

وہ برابر چھوٹے چھوٹے سوال کرتی رہی، سلیم جواب دیتا رہا۔

"لگتا ہے، یہ بارش تو آج کی رات تھمنے والی نہیں ہے۔"

"اللہ نہ کرے، کیسی باتیں کر رہے ہو اگر جو بارش اسی طرح برستی رہی تو میں گھر کیسے جاؤں گی۔ مجھے پو پھٹنے سے پہلے گھر پہنچنا ہے۔"

"تم ادھر کہاں نکل آئی تھیں؟"

"میں نہیں نکلی۔ مجھے طوفان بہا کر ادھر لے آیا ہے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ سمت کا اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا ورنہ میں خود ہی گیسٹ ہاؤس میں آجاتی۔ میرے ساتھ تو وہ ملازمہ بھی تھی۔"

اسے اچانک یاد آیا۔

"اوہ! پتا نہیں کدھر رہ گئی وہ۔ اگر جنگل کی طرف نکل گئی تو پھر بھیڑیے اسے چھوڑنے والے نہیں ہیں۔"

"بھیڑیے؟" سلیم نے دھرایا۔

"ہاں تو تمہیں نہیں پتا، ان ٹیلوں کے پیچھے بھیڑیوں کے بھٹ ہیں، اگر کوئی اکیلا انسان ادھر چلا جائے۔ گھیر لیتے ہیں۔ ہاں، زیادہ لوگوں کو کچھ نہیں کہتے۔"

"وہ بے چاری تمہاری ملازمہ، خدا کرے وہ ادھر نہ نکلی ہو۔" سلیم نے فکر مندی اور درد مندی سے کہا تھا مگر جواب میں ایسا کوئی فقرہ، کسی نیک خواہش کا اظہار تصور نے نہیں کیا تھا۔

"تم اس وقت گھر سے نکلی کیوں تھیں؟"

"ایک شادی میں شرکت کرنا تھی، میرا اس شادی میں جانا ضروری تھا۔"

وہ اب دھیان سے سلیم کی جانب دیکھتے ہوئے بولی تھی اور سوچ رہی تھی بھلا مرد بھی اتنا اجلا اجلا، چمکدار صاف ستھرا ہو سکتا ہے۔ یہ تو کوئی خوشبو استعمال کرتا ہے اور اس کے بال کتنے سلیقے سے بنے ہوئے ہیں۔ وہ مجھے بچانے کے لیے کیچڑ میں اترا تھا۔ اس نے آتے ہی کپڑے بھی بدل لیے ہیں اور ہاتھ پاؤں دھو لیے ہیں۔

ٹارچ کی روشنی بہت زیادہ نہیں تھی۔ جدھر تصور بیٹھی تھی، ادھر اندھیرا تھا مگر سلیم پھر بھی خود پر اس کی محویت نوٹ کر رہا تھا اور عورت کا ایک ٹک کسی مرد کو دیکھنا اسے پریشان نہیں کرتا، اعتماد کو جلا بخشتا ہے۔

سلیم کوئی دل پھینک عاشق مزاج لڑکا نہیں تھا مگر مقابل خود ہی شعلوں کو ہوا دینے پر تلا دکھائی دیتا تھا۔ وہ برابر سوال کرتی جا رہی تھی اور اب اسے واپس گھر پہنچنے کی جلدی بھی نہیں تھی۔

بارش کا زور ٹوٹ چکا تھا۔

"میں فون ملاتا ہوں۔ چوہدری صاحب سے کہتا ہوں، تمہیں لے جانے کا بندوبست کریں۔" سلیم نے فون اٹھایا۔ تصور نے ایک دم سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایسی غلطی مت کرنا۔"

سلیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "کیا مطلب! پھر تم گھر کیسے جاؤ گی؟"

"میں کیسے بھی جاؤں، مگر اطلاع مت دینا۔" وہ التجا کے انداز میں کہہ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد پھر بولی۔

"سنو! بارش کا زور ٹوٹ چکا ہے۔ ہمارے ہاں کی زمین ڈھلوانی ہے۔ پانی ٹھہرتا نہیں ہے، بہہ جاتا ہے۔ ایک گھنٹے تک پانی نکل جائے گا، پھر تم مجھے گاؤں سے ذرا فاصلے پر چھوڑ دینا۔ گاڑی ہے تمہارے پاس؟"

"نہیں، میرے پاس بائیک ہے۔"

"چلو بائیک ہی سہی۔ وقت کیا ہو رہا ہے؟"

اس وقت ایک بجنے کو ہے، ابھی صبح ہونے میں بہت دیر ہے۔"

"چلو ہم باتیں کرتے ہیں۔" تصور مسکرائی۔

سلیم نے اس کے چہرے کی مسکراہٹ کو دیکھا تو مسکرا دیا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس سے باتیں کرنے لگا۔ گھنٹہ کیا، دو گھنٹے گزر گئے۔

سلیم نے بائیک نکالی۔ وہ پہلی بار اس سواری پر بیٹھنے والی تھی۔ ہنس بھی رہی تھی اور ڈر بھی رہی تھی۔ جیسے ہی اسٹارٹ ہوئی، اس نے زور سے سلیم کو پکڑ لیا، اس گرفت میں اتنی حدت تھی کہ سلیم کو دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا تھا اور دہکتا ہوا وہ وجود سانسوں میں بھی آگ لیے ہوئے تھا۔ سلیم کی پشت جلنے لگی تھی اور تصور کو لگا۔ وقت ٹھہر گیا ہے اور دنیا یہی ہے۔ بس یہی ایک عورت ایک مرد۔ ایک توانا، دوسرا حسین و نازک اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اپنا سر بھی اس کی پشت سے ٹکا دے۔ آنکھیں موند لے اور سو جائے۔ اس منظر

...گرد پھونک مار کر حصار کھینچ دے۔

مگر جب آنکھ کھلی تو ایسا کچھ نہ تھا۔ وہ حویلی واپس آ ... تھی۔ رات کی سیاہی نے پردہ رکھ لیا تھا۔ اس نے ... کیا تھا، راستہ بھٹک گئی تھی۔ ہاں اپنے کمرے میں آ کر آئینے میں خود کو دیکھا تو چونکی۔ سب جانتی تھیں، بی بی کون سے کپڑے پہن کر نکلی تھیں۔ شکر ہے۔ رات نے ایک اور پردہ رکھ لیا، وہ کپڑے تبدیل کر کے بستر پر آ لیٹی اور آنکھیں موند کر گزرے پل کو آواز دے ڈالی۔

اس نے راز کو راز رکھنے کی سر توڑ کوشش کی تھی، مگر کیا کرتی، چال بدل گئی تھی۔ آنکھیں بہت چمکدار ہو گئی تھیں اور لب مسکرانے لگے تھے۔ اس کا مزاج بدل گیا تھا۔ اس نے سب کو حیران کر دیا تھا۔

نوراں کی ماں بھیڑیوں سے بچ گئی تھی، وہ ایک ٹیلے ... کھڑی رہی تھی اور سویرا ہونے کے بعد روتی دھوتی پہنچی تھی کہ اس کے خیال میں بی بی طوفان کی نذر ہو گئی تھی اور ایک لحاظ سے خیال تو اس غریب کا ٹھیک ... بی بی واقعی طوفان کی نذر ہی تو ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

نوراں کام کو دل لگا کر کرنے والی لڑکی تھی مگر اب کام میں اس کا جی نہیں لگ رہا تھا اور وہ دن کے کسی نہ کسی حصے میں غائب بھی ہو جاتی تھی۔ تصور جو ہوش ... ہوتی تو کھال کھینچتی اس کی، مگر اب تو وہ موجود ہو کر ... وجود نہیں رہتی تھی۔ اس سے بھلا کوئی شکایت ... کی جا سکتی تھی۔

... حویلی آیا تھا۔ اسے چوہدری صاحب نے کسی ... سلسلے میں بلایا تھا اور ساتھ میں ایک دعوت ... دی تھی۔ نوراں گنگناتی جا رہی تھی اور ریکاتی جا ... تھی۔ ... اس سے کوسوں دور تھی حالانکہ وہ ... کام میں لگی ہوئی تھی۔ تصور نے اس کی آمد کا ... کپڑوں کی الماری کھول لی تھی۔ ایک سے ایک ... رنگ کے بالکل سادہ سوٹ، یہ کپڑے ایک بیوہ ...

اسے غصہ آیا، جھنجلاہٹ ہوئی، باری باری ہر کپڑا دیکھنے لگی اور آخر کار ایک ہلکے گلابی رنگ کا چکن کا جوڑا مل ہی گیا۔ نہا کر کپڑے بدلے۔ بال سنوارے، تھوڑا سنگھار بھی تو ہونا چاہیے، مگر وہ کیا سنگھار کرے، اس کا سنگھار تو سب کو چونکا دے گا۔

سرمے دانی کی جانب بڑھتا اس کا ہاتھ بار بار رکا مگر دل کی خواہش جیت گئی۔ اس نے آنکھوں میں سرمہ لگا ہی لیا۔

چوہدری خیر دین کافی دیر بیٹھک میں بیٹھا تھا اور یہ وقت تصور نے ادھر ادھر ٹہلتے ہوئے بہت بے چینی سے گزارا تھا۔ جیسے ہی خیر دین بیٹھک سے نکلا، وہ تیزی سے اس کی جانب لپکی تھی۔ بیٹھک میں داخل ہوتے ہی جس منظر نے پیروں تلے انگارے رکھ دیے وہ نوراں اور سلیم کا اتنے قریب ہونا تھا۔ نوراں تو ادھر چائے دینے آئی تھی، پھر بیٹھیں کی ہو رہی تھی۔ تصور کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں لیکن لب بھینچ گئے تھے۔ نوراں نے اسے دیکھا، گھبرا کر پیچھے ہٹی اور پھر باہر نکل گئی۔

"آؤ چوہدرانی! کیسی ہو، آؤ بیٹھو۔" سلیم کا اعتماد جوں کا توں تھا۔

تصور خاموشی سے آ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیا بات ہے، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟"

تصور نے گہری سانس کھینچ کر خود کو سنبھالا۔ "کیسے ہو، میں بہت دنوں سے تمہاری منتظر تھی۔"

"اچھا، کیوں، کوئی کام تھا مجھ سے؟"

"کام، ہاں کام ہی تو تھا۔"

"اچھا اگر کوئی کام ہو ناں تو نوراں کے ہاتھ کہلوا دیا کرو۔ یہ مجھے بتا جایا کرے گی۔"

تصور کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رینگ گئی۔

"نوراں ہی کیوں، میری ساری ہی ملازمائیں وفادار اور تابعدار ہیں۔"

"تمہاری مرضی۔" سلیم نے شانے اچکائے۔

تصور کو لگا، وہ بہت بد صورت بے حد عام سی عورت ہے، جو کسی بھی مرد کی ذرا سی توجہ بھی نہیں کھینچ سکتی۔

بکی کا شدید احساس اس کے تنے ہوئے بدن کو ڈھیلا کرنے لگا۔

"میں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی اور مجھے یہ بھی کہنا تھا اس رات کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

"یہ بھی کوئی کہنے والی بات ہے چوہدرانی! معاملے کی نزاکت کو میں خود بھی سمجھتا ہوں۔"

اور تصور تھکی تھکی چال چلتی کمرے سے باہر آ گئی۔

مگر دل کب کسی بات سے بہلا ہے' دل میں جو سما جائے وہ نکلا ہے کبھی' تو پھر تصور کے دل سے سلیم کیسے نکل جاتا۔ نوراں اس کے سامنے اس گھر میں چلتی پھرتی تھی۔ اس کی ایک ایک ادا کو وہ بغور دیکھتی نوراں بات بہ بات مسکراتی تھی' شوخی کرتی تھی اور اب وہ پہلے سے نڈر بھی ہو گئی تھی۔ چوہدرانی کے سامنے ڈری سہمی نہیں آتی تھی' بڑے اعتماد سے بات کرتی تھی۔

تصور کا جی چاہتا' اس لڑکی کو زندہ جلا دے۔ اسے کسی بھی طرح ختم کر دے۔

☼ ☼ ☼

نوراں اور چھمو اناج صاف کرتے ہوئے کھڑ کھڑ ہنسے جا رہی تھیں۔ تصور ان سے بہت فاصلے پہ کھڑی انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔

"او مرن جوگیو! کیا شور ڈالا ہوا ہے؟" اس نے کڑک کر کہا۔ چھمو تو سہم کر چپ ہو گئی۔ نوراں نے ہنسی روک کر بے نیازی سے تصور کو دیکھا تھا پھر مسکرا کر کام کرنے لگی تھی۔

"مفت کی روٹیاں توڑتی ہو' جس دن کام سے نکال باہر کروں گی' تمہارے پچھلے روتے ہوئے منتیں کرنے پہنچ جائیں گے۔ کمی کمین.... جتنا لحاظ کرو' اتنا ہی سر پہ چڑھتے ہیں۔" وہ چلاتی رہی۔ نوراں کی بے نیازی اسے غصہ دلاتی رہی۔

"وہ جی پٹواری سلیم صاحب آئے ہیں۔" ایک ملازم نے آ کر اطلاع دی تھی اور سلیم کے نام پر نوراں چونکی تھی اور اس کے یوں چونکنے پر حاسد عورت تصور کے اندر پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔

"وہ میرا ہے' صرف میرا اور یہ' ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والی۔ کیا اس قابل ہے کہ اتنے اونچے خواب دیکھ سکے۔"

چوہدری صاحب گھر میں نہیں تھے۔ تصور نے چادر اوڑھی اور چھمو سے بولی۔

"چاء لے کر تب تک نہ آنا جب تک میں نہ کہوں اور نوراں۔ تو اب شکل گم کر' چلی جا اپنے گھر۔"

"پر بی بی! میں تو چاء بناؤں گی ناں۔"

"کیوں' اس گھر میں اور کسی کو چاء بنانی نہیں آتی۔ دفع ہو جا اپنے گھر۔"

"نہیں بی بی! ابھی تو بہت کام پڑا ہوا ہے۔" وہ جانا نہیں چاہتی تھی۔

"کام کرنے والوں کی کمی نہیں ہے ادھر' جا چلی جا۔"

نوراں بد دلی سے چل دی اور تصور کے دل میں لگی آگ پر پانی کی چھینٹ پڑ گئی۔

"آج کیسے آنا ہوا پٹواری!" تصور اس بار بہت سنبھل کر بات کر رہی تھی "چوہدری صاحب سے کچھ کام تھا؟"

"گرمی بہت ہے' پانی تو پلوا دو چوہدرائین!" وہ ادھر ادھر دیکھ کر بولا تھا اور تصور جانتی تھی' اس کی آنکھیں کسے تلاش کر رہی ہیں۔

"ہاں' میں شربت منگواتی ہوں۔ تم آرام سے بیٹھو تو۔" تصور نے چھمو کو آواز دیتے ہوئے نظر اس کے چہرے پر رکھی تھی اور اس کی مایوسی نے تصور کے ہونٹوں پر بے اختیار طنزیہ مسکراہٹ دوڑا دی تھی۔

کچھ دیر کے بعد چھمو شربت لے آئی۔

"پرانی ملازمہ کدھر ہے تمہاری؟" وہ بے اختیار پوچھ بیٹھا تھا۔

"کون' کس کی بات کر رہے ہو' یہاں میری حویلی میں تو کئی ملازمائیں ہیں۔ تمہیں کس کے ہاتھ سے شربت چاہیے؟" تصور کے انداز پر وہ چونکا ضرور' گھبرایا نہیں۔

"بتا دوں گا' وقت آنے پر یہ بھی بتا دوں گا۔"

"میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتی تھی۔"

"کیسا؟"

"تم بھی عورت کو جی بہلانے کا مال سمجھتے ہو۔"

"تم سے کسی نے کہا چوہدرانی؟" وہ اس کی بات پر برا مانے بغیر بولا تھا۔

"یہ ملازمہ کے بارے میں جو اتنا کرید کر پوچھ رہے ہو تو کس لیے؟"

"تمہیں برا لگا؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سوال کر رہا تھا۔ تصور نے آنکھیں چرا لیں۔

"میں چلتا ہوں۔" ایک گلاس شربت پیتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اتنی جلدی' بیٹھو ناں کھانا کھا کر جانا۔"

"نہیں! میں چوہدری صاحب سے ملنے آیا تھا' وہ موجود نہیں' اب چلتا ہوں۔" اس کے کچھ اور کہنے سے پہلے وہ دروازے کی جانب بڑھ گیا۔

تصور چاہنے کے باوجود روک نہ سکی مگر بعد میں خود ہی خفا ہو گئی۔ "میں کیوں نہ روک سکی۔ کتنا اچھا موقع تھا' اشارے میں ہی سہی' جی کا حال تو کہہ دیتی اس سے۔ باتوں باتوں میں ہی سہی' اسے بتا تو دیتی کہ میں کتنی زمینوں کی مالک ہوں صرف اس گاؤں میں ہی نہیں' میرے میکے گاؤں میں بھی ایک بڑی جائیداد میرے نام ہے۔"

رات کو وہ سلیم کو سوچتے ہوئے ہی سوئی اور صبح اس کی آنکھ معمول سے کہیں دیر سے کھلی۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ بڑے کمرے میں آئی۔ چھمو صفائی کر رہی تھی۔

"جا! پہلے جا کے نوراں سے میرے لیے ناشتا بنوا لا۔"

"نوراں تو آج نہیں آئی جی۔"

چھمو کی بات نے اسے حیران بھی کیا غصہ بھی دلایا۔

"کیا ان' ایسی اکڑ آ گئی ہے اس کم ذات میں۔ غصے میں گھر سے جانے کو کہا تھا تو اس نے آج بھی آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔"

"گھر سے بلا لاؤں جی اس کو؟"

"نہیں' کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

تصور کمرے میں بیٹھی غصے سے کھولتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"او! گل سن تصور پتر!" چوہدری خیر دین گھر میں داخل ہو کر سیدھا اس کے پاس آیا تھا اور بتا رہا تھا۔

"سلیم بیمار ہے' بخار ہو رہا ہے اسے۔ میں نے کہہ دیا ہے جب تک پوری طرح سے ٹھیک نہیں ہو جاتے۔ تم ادھر حویلی میں ہی رہو گے۔ تم کمرہ تیار کروا دو۔"

وہ تیار کرواتی کیوں' اس نے تو سب اپنے ہاتھ سے کیا۔ دل لگا کر ایک ایک چیز سیٹ کی تھی۔ سلیم کے لیے پرہیزی کھانا بھی وہ خود ہی بناتی مگر نوراں کو چوہدری خیر دین نے بلوا لیا تھا۔ وہ اسی کے ہاتھ کا بنا کھانا پسند کرتے تھے۔ نوراں سلیم کے لیے پرہیزی کھانا بھی بنا رہی تھی۔

حویلی میں مہمان آتے رہتے تھے' جن میں اکثر سرکاری افسر بھی ہوا کرتے تھے' مگر تصور کبھی کسی کو سلام کرنے نہیں گئی تھی۔ آج وہ منتظر تھی' چوہدری گھر سے باہر جائے تو وہ بھی جا کر ایک نظر سلیم کو دیکھ لے۔ یہ موقع قسمت نے اسے دے دیا۔ قریبی شہر سے چوہدری کو فون آ گیا۔ اس کے کسی دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ چوہدری نے جاتے ہوئے تصور کو تاکید بھی کر دی۔

"مہمان گھر میں ہے' خیال رکھنا اس کا۔"

اور تصور تو جی جان سے خیال رکھنے کو تیار تھی۔ اس نے چوہدری کے جانے کے بعد جیسے سلیم کی پٹی پکڑ لی تھی۔ اس کی دیوانگی سے اب وہ خوف کھانے لگا تھا۔ جلد سے جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا مگر بخار اترنے میں نہیں آ رہا تھا۔ تصور نے پورا خیال رکھا تھا' نوراں اس کے کمرے میں جانے نہ پائے' مگر ایک دید تو دوسرا نین تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح سب کی نظر بچا کر سلیم

کے کمرے میں پہنچ ہی جاتی تھی۔

ایک دن تو غضب ہو گیا۔ نوراں کھانا لے کر خود پہنچ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے سلیم کو کھانا بھی کھلایا اور دوا بھی کھلادی۔

"تو وہاں کیا کرنے گئی تھی؟" تصور کو پتا چلا تو اس کے بال مٹھی میں لے کر چلانے لگی۔ اس کی ماں کو بلا کر کہہ دیا۔ "اب اپنی دھی کی جلدی کہیں شادی کر دو۔"

"آہو جی بی بی! رشتہ تو پکا سمجھو میں جلد ہی یہ خوش خبری آپ کو سنانے والی تھی۔"

منوں بوجھ اتر گیا تصور کے سر سے۔

"سلیم میری محبت کو پہچان تو گیا ہے، پر پتا نہیں کیوں اظہار کرتے ہوئے جھجک رہا ہے، مگر اسے میری بات ماننا ہو گی۔ یہ چچا خیر دین راہ میں روڑے انکائے گا۔ یہ تو چاہتا ہے میں اس کے بیٹے کی بیوہ بن کر زندگی گزار دوں، مگر میں اس کی نہیں سنوں گی۔"

سلیم کا بخار اتر گیا۔ ایک صبح اس سے ملے بغیر ہی وہ گیسٹ ہاؤس میں واپس چلا گیا اور اسی شام نوراں کی ماں شہر کے بنے موتی چور لڈوؤں کی پلیٹ لیے آگئی۔

"نوراں کی بات پکی ہو گئی ہے جی!"

"اچھا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔" تصور نے واقعی بہت خوش ہو کر لڈو اٹھالیا۔

"اس سے بڑی بات یہ کہ رب نے میری بیٹی کا نصیب میرے خیالوں سے بہت اونچا لکھا ہے۔ وہ پٹواری سلیم کی دلہن بن رہی ہے جی۔"

لڈو تصور کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے نوراں کی ماں کو دیکھا تھا۔ جو اپنی خوشی میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگ نہیں دیکھ سکی تھی۔

تو چوہدرائن تصور ہار گئی اور ایک معمولی ذات کی غریب نوراں جیت گئی۔ وہ تو سمجھی تھی، سلیم کسی رات اسے بلائے گا اور پھر اس کو کسی پرانے استعمال شدہ کپڑے کی طرح پھینک دے گا۔

ان دنوں چوہدرائن کا غصہ آسمان کو چھو رہا تھا۔ وہ کسی کو بھی بخشنے کو تیار نہیں تھی۔ دولت اور طاقت کے بل بوتے پر ہر شے خرید لینے والی عورت دل کی بازی ہار رہی تھی۔ یہ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا تھا، مگر اسے جو بھی سوچنا تھا ٹھنڈے دل سے سوچنا تھا۔

"نوراں! یہ پنجیری ہے۔ بادام پستے اور خشخاش ڈال کر بنائی جاتی ہے۔ میرے میکے سے آتی ہے۔ لے تو بھی کھا کے دیکھ۔"

اچانک اس کا غصہ کم ہونے لگا تھا اور نوراں پر تو اب خاص نظر کرم تھی۔ اس روز اس نے بہت تھوڑی سی پنجیری لاکھ خوبیاں گنوا کر نوراں کو دی تھی اور تاکید کی تھی، کھا ضرور لینا۔ نوراں چلی گئی اور اب وہ خبر کی منتظر تھی۔ وہ بے تاب تھی اور پھر خبر آگئی چھمو دوڑتی ہوئی آئی تھی۔

بی بی! غضب ہو گیا۔ سلیم اور نوراں مر گئے۔"

"سلیم بھی؟" اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا اور پھر ایک مہیب سناٹا اس کی روح تک اتر گیا۔

عمر کے آخری حصے میں آکر جہاں بالوں میں چاندی اتر آئی ہے۔ بدن کے کس بل، دل کے ارمان سب خواب ہوئے ہیں۔ وہ آج بھی ان دو قبروں پر جاتی ہے دعا کرتی ہے اور سوچتی ہے۔

ان کی لگن کتنی سچی تھی۔ ان کی محبت کتنی خالص تھی۔ وہ دو چمچ کے برابر پنجیری نوراں نے اکیلے نہیں کھائی، سلیم کا حصہ بھی رکھا اور ہمیشہ کے لیے ایک ہو گئے۔

گاؤں والے کہتے ہیں تصور بی بی کو اپنی ملازمہ نوراں سے بہت پیار تھا، مگر وہ کسی کو کیسے بتائے... کیسے بتائے محبت میں سب جائز ہے، کے نعرے پر عمل کر کے وہ مجرم بن بیٹھی ہے۔ وہ اندر ہی اندر جل رہی ہے اور تاعمر جلتی رہے گی اور اسے یقین ہے نوراں کی محبت اس کی محبت سے زیادہ طاقت ور تھی، تب ہی تو وہ پہلو بہ پہلو سو رہے ہیں اور وہ سالوں سے تنہا کھڑی ہے۔

☆

بیگم عائشہ فیاض

یوں تو آمنہ کا سارا دھیان سلور کی اس دیگچی پر تھا، جسے آج پانی گرم کرنے کے لیے بے دریغ استعمال کیا گیا تھا، مگر کن انکھیوں سے وہ شہزاد کو بھی دیکھے جا رہی تھیں، جو اب تک باورچی خانے کے بہت سارے چکر لگا چکی تھی۔ اب تو خود آمنہ کو بھی اس کی سوالیہ نگاہوں سے شرمندگی سی ہونے لگی تھی، پر کیا کرتیں؟ اپنی نفاست پسند طبیعت سے مجبور، ہر رات کی طرح انہیں اپنے باورچی خانے کو مکمل صاف کر کے ہی

باہر نکلتا تھا۔ ویسے روز کی بات ہوتی تو وہ بہت پہلے ہی فارغ ہو جاتیں لیکن۔۔۔ جی ہاں سلور کی دیگچی میں تین چار بار پانی گرم کیا گیا تھا اور اب اس کی چمک دمک تو ایک طرف' اندر سے سیاہ پڑ کر وہ پہچانی ہی نہ جاتی تھی اور اسی کو چمکاتے' رگڑتے آج آمنہ کو معمول سے کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی تھی۔

باورچی خانے کی کنڈی لگا کر جونہی وہ پلٹیں' شہزاد اس کے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"ارے میری جان! ابھی تک جاگ رہی ہے۔"

انہیں اور بھی شرمندگی ہوئی' پھر آگے بڑھ کر اسے اپنی گود میں اٹھا لیا۔

"میری اچھی بڑی امی! اب تو آپ نے سارا کام ختم کر لیا ناں' اب تو میرے ہاتھوں پہ مہندی لگا دیں۔"

ساڑھے چار سالہ شہزاد نے مہندی کی کون ان کے ہاتھ میں پکڑائی تھی۔

"ہاں بھئی! کیوں نہیں۔" وہ پورے دل سے مسکرائیں۔ یہ بات بھلا کر کہ پورے دن کی سخت مشقت کے بعد اب ان کا جسم کچھ دیر آرام کے لیے دہائیاں دے رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

"اب بس بھی کرو آمنہ! میری نیند کا نہیں تو کچھ اپنی حالت کا ہی خیال کر لو۔"

کافی دیر سے سلائی مشین کا شور برداشت کرتے اکبر کا ضبط آخر جواب دینے ہی لگا تھا۔

"بس تھوڑی دیر اور۔" انہوں نے جواب دیا۔

"پچھلے ایک گھنٹے سے یہی کہہ رہی ہو تم' آخر کون سے ضروری کپڑے ہیں یہ' جو آج ہی سلنے ضروری ہیں۔" وہ جھنجلا گئے تھے۔

"کچھ خاص نہیں' بس شہزاد کے دو تین فراک ہیں' وہ بھی بس سل ہی گئے سمجھیں۔" وہ اور بھی زیادہ سکون سے بتا رہی تھیں۔

"کیوں' اس کی اپنی ماں مر گئی ہے' جو تم یہ سب کر رہی ہو۔ چلو اٹھو اب' بہت ہو گیا۔ میں تو اب تک یہی سمجھتا رہا کہ تم اپنے آنے والے بچے کے لیے کچھ سی رہی ہو مگر تم۔۔۔"

وہ بستر سے اتر کر اب ان کے سر پہ کھڑے بول رہے تھے' سو انہیں اٹھنا ہی پڑا۔

"ایسی حالت میں اتنی اتنی دیر بیٹھو گی تو یہی حال ہو گا تمہارا۔ ابھی گرنے لگی تھیں۔" چوکی سے اٹھ کر کھڑی ہوتی آمنہ کا شاید پاؤں مڑ گیا تھا' انہوں نے فوراً سنبھالا اور لا کر بیڈ پر لٹا دیا۔

"اللہ کرے اس بار تم بیٹی کی ماں بن جاؤ۔ کتنا ارمان ہے ناں تمہیں اپنی بیٹی کا۔" انہوں نے بہت نرمی سے آمنہ کو کھیس اوڑھاتے ہوئے سرگوشی میں دعا دی مگر یہ سنتے ہی آمنہ کی بند آنکھوں کے پیچھے بہت سارے آنسو جمع ہونے لگے تھے۔ وہ چپ چاپ ان سے رخ موڑ کر لیٹ گئی تھیں۔ انہیں آج بھی یاد تھا۔۔۔

شادی کے بعد جب وہ پہلی بار امید سے ہوئیں تو ان کی ساس انہیں بڑے چاؤ سے کسی بزرگ کے پاس دعا کے لیے لے کر گئیں۔

"بس بابا جی! مجھے تو بیٹوں کی ماں ہونے کی دعا دیں' کبھی بیٹی نہ پیدا ہو ہمارے ہاں۔" نورانی صورت والے وہ بزرگ آدمی آمنہ کی اس بے لچک فرمائش پر حیران سے رہ گئے تھے۔

"مگر بیٹیاں تو رحمت ہوتی ہیں بیٹا!" انہوں نے بہت نرمی سے کہا۔ اس کے جواب میں انہوں نے بہت برا سا منہ بنا کر شاید کوئی بات کی تو تھی مگر ساس کے ڈر سے ذرا مدھم لہجے میں۔

"اچھا بیٹا! جیسے آپ کی مرضی۔" پیر صاحب نے ایک تاسف بھری نگاہ ان پر ڈال کر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ آمنہ بھی کیا کرتیں' سات بہنوں میں وہ چھٹے نمبر پر تھیں۔ ایک بن مانگی' ان چاہی شے' ماں باپ کے سینوں پہ دھری ایک وزنی سل۔ اپنی ذات سے جڑے ان سب منفی حوالوں کے بعد' وہ کہاں "رحمت" سے آشنا ہونا چاہتیں۔

شاید اس لمحے کو شرف قبولیت عطا ہوا تھا۔ آمنہ کو اللہ نے پورے سات بیٹوں کی ماں بنایا اور ہر بار ان کی گردن فخر سے مزید اکڑتی چلی گئی۔ ہاں مگر جس دن ان کی دیورانی کے ہاں شہزاد پیدا ہوئی تو۔۔۔ ان کا پانچواں دنیا میں چلنے ہی لگا تھا۔ گلابی تولیے میں لپٹی وہ چھوٹی سی گڑیا اور اس کا بہت سرخ چہرہ' چھوٹی سی ناک' سر پر ریشمی بال جیسے ریشم کی سیاہ ٹوپی اوڑھ لی ہو۔ وہ کتنی دیر تک اسے بہت غور سے دیکھتی رہیں' پھر ایک عجیب تاسف میں گھر گئیں۔

"کیا بیٹیاں اتنی زیادہ پیاری ہوتی ہیں۔ کاش میں بھی۔۔۔"

اکبر کسی بھی طرح مزید بچوں کے حق میں نہیں تھے مگر آمنہ کے دل میں اٹھنے والی اس "کاش" کے ہاتھوں ہار گئے مگر شہزاد کے بعد وہ پھر دو مزید بیٹوں کی ماں بن گئیں۔

شہزاد سے ان کی محبت غیر ارادی تھی یا شاید خود اپنا کفارہ۔۔۔

"ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ شادی کے چودہ سال بعد اللہ نے اگر دیا بھی تو کیا۔۔۔ بیٹی' ہونہہ!"

شکیلہ' ان کی دیورانی بڑی نخوت سے کہتی تو وہ شہزاد کو اپنے ساتھ لگا لیتیں۔

"ناشکری مت بنو شکیلہ! اتنی پیاری نعمت دی ہے اللہ نے' خبردار جو اسے کچھ کہا تو' یہ تو میری بیٹی ہے' میری جان۔"

شکیلہ تو سدا کی بیمار' منہ سر لپیٹے پڑی رہتی اور شہزاد کا سارا وقت آمنہ کے ساتھ ہی گزرتا تھا' جو اس کی بڑی امی تھیں۔ اس کے بیٹھنا سیکھنے سے لے کر پاؤں پاؤں چلنے' پہلا جملہ ادا کرنے سے ٹر ٹر بولنے تک اور اسکول جانے تک زندگی کے ہر خاص موڑ پر شہزاد کے حوصلے کے لیے اس کی بڑی امی موجود تھیں۔ پھر اس کے بعد شکیلہ جڑواں بیٹوں کی ماں بن کر شہزاد سے بے گانہ ہو گئی تھی۔

"شہزاد تو میری بیٹی ہے۔"

بڑی امی کے اس جملے نے ہمیشہ اسے سہارا دیا تھا۔ جب کبھی اس کا دل سگی ماں کے لیے ہمکتا اور وہ اپنے بیٹوں میں مصروف ہوتی تو اسے جھڑک دیتی یا پھر دلار سے کہتی۔

"دیکھو ناں بیٹا! ابھی مجھے بھائی کو سلانا ہے' آپ اپنی بڑی امی سے کنگھی کروا لو۔۔۔ بڑی امی سے کہو' آپ کے کپڑے بدل دیں۔۔۔ بڑی امی سے کہو ناں' تمہاری ٹیچر سے جا کر مل آئیں۔۔۔"

وہ تو شکر ہے کہ اسے اسکول لے جانے اور چھوڑنے کا ذمہ دادا ابا نے اٹھا رکھا تھا' ورنہ شاید یہ کام بھی بڑے ابا یا بڑی امی کو ہی کرنا پڑتا۔

شہزاد کا یونیورسٹی میں آخری سمسٹر چل رہا تھا' جب بڑی امی کے اشعر کی منگنی ہوئی اور خاندان ہی میں ہونے والی بہت سی چہ مگوئیوں نے ان کے گھر میں دخل اندازی کی۔

"آمنہ نے بڑے تین بیٹوں کو تو بیاہ دیا' اب چوتھے کی منگنی بھی کر ڈالی اور گھر کی جوان جہان لڑکی نظر ہی نہ آئی۔" جانے کون سی رشتے کی تائی' پھوپھی نے شکیلہ کے کان بھرے تھے اور وہ جو آج تک اپنی بیٹی کے پسندیدہ رنگ اور کھانے تک سے لاعلم تھیں' میاں کے سامنے بیٹی کا دکھڑا لے کر بیٹھ گئیں۔

انور نے ان کی ساری بات سن کر یوں سر ہلایا جیسے سنا ہی نہیں۔

"تم تو بلاوجہ پریشان ہوتی ہو نیک بخت! بھائی اور بھابھی کے ہوتے مجھے اپنی بیٹی کے لیے فکر کرنی تو کیا کچھ سوچنے کی بھی ضرورت نہیں۔"

"ہم لڑکی والے ہیں میاں جی۔ جیسے بھی ہو' آپ ایک بار بھائی جان سے بات تو کریں۔"

شکیلہ نے اٹھتے بیٹھتے انہیں اتنا ستایا کہ آخر وہ بھی' بڑے بھائی کو پرکھنے چل دیے۔

"بھائی صاحب! وہ کل شکیلہ کی بڑی بہن آئی تھیں' اپنے بیٹے کے لیے۔ وہ ہماری شہزاد کا۔۔۔"

بہت جھجک جھجک کر بھی وہ جملہ پورا نہیں کر پائے۔

"اچھا تو پھر تم نے کیا جواب دیا؟" اکبر صاحب نے خود ہی آگے بڑھ کر بھائی کی بات سنبھالی تھی۔

"میں نے تو بس یہی کہا کہ اپنی شہزاد پر سب سے زیادہ حق تو آپ دونوں کا ہی ہے' جیسے آپ کی مرضی۔"

وہ مؤدب ہوئے تھے۔ اکبر محض ایک لمبی سی 'ہوں' کرکے کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

"لو بھلا' آپ بھی تو کمال کرتے ہیں اکبر! شہزاد اور ہماری بہو' اس سے بڑھ کر اور میری خوشی کیا ہوگی بھلا۔"

رات کو جب اکبر نے ان سے بات کی تو وہ سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔

"مگر آپ نے پہلے تو کبھی ذکر نہیں کیا؟" وہ متجسس ہوئے۔

"یہ خیال تو میرے ذہن میں کئی بار آیا تھا اکبر! لیکن آپ سے یا کسی اور سے اس لیے نہیں کہا کہ وقت سے پہلے منہ سے بات کیا نکالنی بھلا۔ ویسے بھی شہزاد کا زیادہ وقت تو ہمارے گھر میں گزرتا ہے۔ ایسے ہی میں بلاوجہ اسے پریشان کردیتی' لیکن اب شاید وقت آگیا ہے' کسی فیصلے پر پہنچ جانے کا۔ میں کل ہی شکیلہ سے بات کرتی ہوں۔"

آمنہ اس قدر خوش لگ رہی تھیں جیسے پہلا بیٹا بیاہنے جارہی ہوں۔

"اچھا آپ سوجائیں میں ابھی آتی ہوں۔"

خوشی سے چمکتا چہرہ لیے وہ کمرے سے باہر آگئیں' بڑے سے صحن کے پرلے حصے میں انور اور شکیلہ کا پورشن تھا۔ شہزاد کے کمرے کی بتی ابھی روشن تھی۔

"کیوں ناں' اتنی بڑی خوشی کی خبر میں سب سے پہلے شہزاد ہی کو سناڈالوں۔

ہاں بھئی آمنہ بیگم! اب یہ منفرد اعزاز بھی لے لو تم۔ ایسی ماڈرن ساس بننے کا' جو سب سے پہلے لڑکی سے خود ہی بات کرے گی۔" وہ تیزی سے اس کے کمرے کی طرف بڑھی تھیں۔

"میرا خیال ہے اکبر! آپ کو اپنے بھائی اور بھابھی سے معذرت کرلینی چاہیے۔ مجھے شہزاد کو اپنی بہو نہیں بنانا۔"

آمنہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے' آمنہ اٹھ کر چلی بھی گئیں۔

"یہ کیا مذاق ہے آمنہ! انتہائی بے ہودہ۔" وہ بھی ان کے پیچھے چلے آئے۔

"میں نے تو کوئی مذاق نہیں کیا۔" انہوں نے کچن میں جاکر پرات اٹھائی۔

"مگر پرسوں رات ہی تو میری بات ہوئی تھی' تم بہت خوش تھیں ناں؟" وہ اپنے غصے پر قابو پاکر نرمی سے پوچھ رہے تھے۔

"میں آج ہی رضیہ آپا کو فون کرتی ہوں۔ بڑے اچھے اچھے رشتے جوڑے ہیں انہوں نے۔ ہماری شہزاد کے لیے بھی کوئی اچھا سا رشتہ ضرور ڈھونڈ لیں گی وہ۔"

آمنہ نے پرات کے آٹے میں پانی ڈال کر اسے گوندھنا شروع کردیا تھا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں۔" وہ پھر سے جھنجلا گئے۔

"بچے گھر آنے والے ہوں گے اکبر! مجھے ان کے لیے کھانا بنانا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم اس مسئلے پر بعد میں بات کریں۔" گندھا آٹا فریج میں رکھتے وقت ان کا لہجہ بے لچک تھا۔ اکبر کچھ نہ بول سکے۔ چپ چاپ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

☼ ☼ ☼

"لیکن آپ میرے ساتھ یہ کیسے کرسکتے ہیں بھائی جان!" انور کا لہجہ گلوگیر ہو چلا تھا۔

"دیکھو میرے بھائی! پہلے تو یہ بات سن کر مجھے بھی بڑا دھچکا لگا تھا' مگر پھر غور کیا تو بات سمجھ میں آبھی گئی۔ میرے بیٹے آج کسی بھی طرح شہزاد کے قابل نہیں ہیں۔ بڑے تینوں کو دیکھ لو' شادیاں ہوتے ہی الگ گھر لے کر بیٹھ گئے۔ اشعر منگنی شدہ ہے اور اس سے چھوٹا اظفر صرف میٹرک پاس۔ ایک معمولی سی دکان چلاتا ہے اور ابھی تک ماں باپ کا محتاج ہے اور اپنی شہزاد سولہ پڑھ چکی ہے۔"

"چھوڑیں ناں بھائی صاحب! بھلا اپنوں میں یہ سب باتیں کون دیکھتا ہے؟" انور نے بڑے آرام سے سب اعتراض رد کردیے تھے۔ "ہم دونوں بھائی تو جڑے رہیں گے ناں۔ ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط ہوجائے گا۔"

وہ بڑی آس سے انہیں دیکھ رہے تھے' جو اپنے چہرے پر بڑا سا "نہیں" لے کر بیٹھ گئے تھے۔

"ارسلان اور ریحان وہ دونوں ہی شہزاد سے چھوٹے ہیں۔ ریحان تو ابھی نویں کلاس میں آیا ہے اور......"

"تو بھیا! ارسلان تو ہے ناں وہ تو بی اے کررہا ہے۔ کہیں جاب وغیرہ بھی کرتا ہے۔"

انور نے ان کی بات بیچ میں ہی کاٹ دی تھی۔ اکبر ایک بار پھر سے چپ کر گئے تھے۔

"وہ بھی شہزاد سے تین سال چھوٹا ہے انور! اور ویسے بھی اس کا قد شہزاد کے تو کندھوں تک بھی نہیں آتا وہ......"

پچھلے کمرے سے اچانک آمنہ باہر نکل آئی تھیں اور ان کے لفظوں نے انور کے کندھے ہمیشہ کے لیے جھکا دیے۔

"پھر مجھے بتائیں کہ میں کیا کروں' سات سات بھتیجے ہیں میرے اور پھر بھی اپنی بیٹی کسی غیر کے ساتھ رخصت کروں۔ یہ کیسا اندھیر ہے بھابھی؟" ان کے لہجے میں شکایت واضح تھی۔

"ایسا مت کہو انور وہ کوئی غیر نہیں ہوگا۔ تمہارا داماد اور تمہاری بیٹی کا شوہر ہوگا' جس کے ساتھ ہم اس کی شادی کریں گے۔ اپنی بہت ساری دعاؤں کے ساتھ اسے رخصت کریں گے۔" آمنہ نے انور کو تسلی دی تھی۔

"اور میرا بھائی...... وہ تو مجھ سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گا ناں۔" انور کے سوال نے اکبر کے چہرے کو بھی تاریک کردیا تھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اپنے بھائی سے مشروط محبت کرتے ہو؟ کچھ لو اور کچھ دو والی محبت؟" آمنہ کی فوری بات نے انور کو بوکھلا دیا تھا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا بھابھی! وہ میں تو......" وہ ہچکچائے۔

"خاندان کے اندر شادیاں کس لیے کی جاتی ہیں انور! صرف اس لیے کہ پہلے سے موجود رشتوں کو اور بھی زیادہ مضبوطی اور اعتماد حاصل ہوسکے' لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے ناں کہ نئے رشتے' اتنے سخت اور نوکیلے بن جاتے ہیں کہ پرانے رشتوں کو بھی توڑ دیتے ہیں اور اس قیمت پر مجھے شہزاد کو اپنی بہو ہرگز نہیں بنانا' اگر آپ کو میری کسی بات سے تکلیف پہنچی ہے تو میں دونوں ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔"

آمنہ نے سچ مچ ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"نہیں بھابھی! ایسا مت کریں۔ میں چھوٹا ہوں ناں' ابھی آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکتا۔ ممکن ہے آپ ٹھیک ہوں۔"

انور دل گرفتہ ہوکر کمرے سے باہر نکل گئے تھے۔ اکبر کی شکایتی نظریں آمنہ کی طرف اٹھیں جنہیں وہ نظرانداز کر گئیں۔

☼ ☼ ☼

"دیکھا! آخر دکھا دی ناں تم نے اپنی حقیقت۔ بڑا شوق تھا تمہیں بڑی امی کہلوانے کا۔ جب ثابت کرنے کا وقت آیا تو چپ چاپ پیچھے ہٹ گئیں۔" اگلے ہی دن شکیلہ' آمنہ کے سر پر کھڑی چلا رہی تھی۔

"میرا خیال ہے تم آرام سے بیٹھ کر بھی مجھ سے بات کرسکتی ہو۔" آمنہ جانتی تھیں کہ شکیلہ کا ردعمل ایسا ہی ہوگا' سو لہجے کو کافی نرم بنا کر بولیں۔

"مجھے نہیں بیٹھنا تم جیسی جھوٹی عورت کے ساتھ۔ جو کہتی کچھ ہے اور کرتی کچھ ہے۔" شکیلہ اور بھی شیر ہوئی۔

"تمیز سے بات کرو شکیلہ! میں رشتے اور عمر دونوں

میں بڑی ہوں تم سے۔" آمنہ کو بھی غصہ آنے لگا۔

"شہزاد تو میری بیٹی ہے۔ میری بیٹی ہے۔ ساری عمر یہی راگ الاپتی رہی ہو تم اور اب جو رشتہ کرنے کا وقت آیا تو اپنی ہی بات سے مکر گئی ہو بھابھی! جھوٹی نہ کہوں تو اور کیا کہوں میں۔" شکیلہ دہائیاں دینے لگی۔

"ہاں تو بیٹی ہی کہا تھا ناں' کوئی بہو تو نہیں کہہ دیا تھا میں نے شہزاد کو اپنی۔ آج بھی میں یہی کہتی ہوں کہ شہزاد میری بیٹی ہے۔ تمہیں جو کرنا ہے' جا کے کرلو۔" آمنہ کا صبر بھی جواب دینے لگا تھا۔

"ہائے! میری سونے جیسی بچی۔ چار سال پہلے میرے دونوں بھائیوں نے سوال کیا تھا اس کے لیے اگر مجھے پتا ہوتا تو انہیں ہاں کردیتی۔ میری پھول سی بیٹی اپنوں میں تو رہتی ناں۔"

شکیلہ کا واویلا جاری تھا۔ آمنہ خود ہی وہاں سے ہٹ گئیں۔

☆ ☆ ☆

سرخ دہکتے گلابوں سے سجے اس کمرے میں دولہا اور دلہن ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے تھے۔ نکھری رنگت والا تبریز علی دولہا تھا اور کھڑی ناک والی شہزاد وہاں دلہن بن کر بیٹھی تھی۔

"کیا ابھی تک آپ کو یقین نہیں آیا کہ ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہوگئے ہیں؟" دلہن بنی شہزاد بڑے اعتماد سے پوچھ رہی تھی۔

"سچ کہوں؟" تبریز نے نرمی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے دل فریب انداز میں مسکرایا۔

"مجھے تو ابھی تک یہ کوئی خواب ہی لگتا ہے۔ تم نے تو مجھے ہر طرح سے ناامید کردیا تھا۔ وہ تو شکر ہے تمہاری تائی جان۔۔۔"

"اوں ہوں۔ بڑی امی!" شہزاد نے اس کی بات کاٹ کر تصحیح کی۔

"جی جناب! آپ کی بڑی امی کا ساتھ نہیں ہوتا تو شاید تم میرے لیے ایک خواب ہی رہتیں۔"

تبریز کے خوش دلی سے کیے گئے اعتراف محبت نے شہزاد کو اندر سے سیراب کردیا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے طمانیت سے آنکھیں موند لیں۔

ان کے کمرے کی کھڑکی سے نظر آتی اماوس کی رات کی سیاہ آنکھوں کے سامنے اسی لمحے ایک اور کمرے کا منظر بھی کھلا پڑا تھا۔ شہزاد کی بڑی امی کے کمرے کا منظر۔ شادی والے گھر سے بیٹی اور مہمان ایک ساتھ ہی رخصت ہوچکے تھے' سو کسی بھی طرح کی ہلچل اور گہما گہمی کے آثار تک نہیں تھے۔ تقریباً" سب ہی گھر والے سو چکے تھے حتیٰ کہ اکبر بھی۔

آمنہ نے کروٹ بدل کر گہری نیند سوئے اپنے شوہر کو دیکھا اور جانے کتنے مہینوں کے چھپائے گئے آنسو آج انہوں نے اپنے تکیے پر سر رکھ کر بہا ڈالے۔ اس رات جب وہ بڑے ارمان سے شہزاد سے بات کرنے اس کے کمرے میں گئیں تو اس کے جواب نے انہیں ایک بہت بڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ شہزاد نے اپنی محبت کا انجام 'ان کے ہاتھوں سونپ دیا۔

اور پھر آمنہ' تبریز اور اس کے گھر والوں سے جاکر ملیں۔ پوری طرح مطمئن ہوکر' ہر ممکن تسلی کرلینے کے بعد ہی انہوں نے گھر میں وہ قدم اٹھایا' جس کے لیے نہ گھر والے تیار تھے اور نہ ہی ان کا اپنا دل' لیکن انہوں نے اپنے دل پہ پتھر رکھا' صرف شہزاد کو اس کے دل کی خوشی دینے کے لیے۔ رشتوں کا تقدس اور خوب صورتی اپنی جگہ' لیکن ان ہی رشتوں کو جوڑنے کے لیے دل جیسی ان مول شے کو توڑنا بھی غلط ہے ناں۔ وہ سوچ رہی تھیں اور دلیلوں کے بھاری پتھر تلے سسکتا ہوا ان کا دل بار بار بھر آتا تھا۔ وہ دل جس میں شہزاد کی محبت تھی' شہزاد کو اس کے حصے کی خوشی دینے کے لیے انہوں نے اسے خود سے دور کردیا تھا' مگر اب وہ خود اپنے حصے کی خوشی سے شاید ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی تھیں۔ ان کا تکیہ پھر سے بھیگنے لگا تھا۔ کھڑکی کے پار اتری اماوس کی سیاہ رات کی طرح۔

☆

صوفیہ بشیر

"ایک جملے میں اتنی طاقت ہوتی ہے کیا کہ بندے کے جسم کا سارا خون سمیٹ کر اس کے رخساروں پر سجا دے۔"

دائم نیب نے بہت حیرت اور دلچسپی سے فلور کشن پہ بیٹھی خفا خفا سی حدیقہ کو دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں حیا کے رنگ سج گئے تھے۔ مگ تھامے اور یونہی بالوں میں گھومتے دونوں ہاتھوں میں ہلکا ارتعاش اتر آیا تھا۔

"ممی! یہ آپ اپنا ارادہ ظاہر کر رہی ہیں یا بھائی کو دھمکی دے رہی ہیں۔" عائزہ نے معصومیت سے ماں سے سوال کیا۔ جواب میں ان کی گھوریاں ہی ملیں۔ پروا وہ بھی کب کرنے والا تھا۔ "رخصت کروانے کی کیا ضرورت ہے، پائی تو یہ ہر وقت ویسے بھی یہیں جاتی ہیں۔"

"ہاں تو میرا گھر ہے، میں رہوں گی یہاں۔ تمہیں تکلیف ہے کیا؟" وہ جھٹکے سے کھڑی ہوتی ہوئی بولی۔ دائم کی ٹھہری ٹھہری سی نگاہوں کا مرکز وہ روپ تو چند پل کا تھا۔ جلد ہی وہ اپنے آتشیں مزاج میں لوٹ آئی۔

"نہیں نہیں۔۔۔ میری مجال جو مجھے کوئی تکلیف ہو۔ اور اگر ہو تو اسے نوک زباں تک لاؤں؟" اسے اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر عائزہ نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"بڑی بہو ہوں اس گھر کی۔۔۔ میرے ساتھ تمیز سے بات کیا کرو تو اچھا ہے۔" مگ میز پر پٹخ کر اسے خبردار کرتی ہوئی وہ لاؤنج سے نکل گئی۔ امی بھی اس کی پیچھے پیچھے چلی گئیں۔

"توبہ توبہ۔۔۔ میں بتا رہا ہوں بھائی! میرا گزارا مشکل

ہے اس لڑکی کے ساتھ۔"

"گزارا تمہیں نہیں، مجھے کرنا ہے۔" دائم نے بے چارگی سی صورت بنائی۔

"مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے۔"

"عائز! تمہیں مسئلہ کیا ہے۔ بچی گھڑی دو گھڑی کے لیے آتی ہے اور تم اسے خفا کر کے بھیج دیتے ہو۔" امی نے واپس آکر اس کی خبر لی۔

"گھڑی دو گھڑی کے لیے۔۔۔ امی! مجھے تو لگتا ہے وہ رہتی ہی یہیں ہے۔" اس نے پکوڑوں سے بھرے منہ سے اپنی والدہ کے لفظوں پر نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"ہاں تو اس کا گھر ہے۔ جب جی چاہے آئے۔ جب تک دل چاہے رہے۔"

"اس کا گھر۔۔۔ مجھے تو لگتا ہے، میری بیوی کے لیے اس گھر میں کوئی جگہ ہی نہیں۔"

"تمہاری بیوی۔۔۔" امی عارضہ قلب میں مبتلا ہونے لگیں۔

"ہونے والی۔" اس نے بروقت تصحیح کر کے ماں کو صدمہ سے بچایا۔ پھر ان کی گھوریوں کی تاب نہ لا کر لاؤنج سے کھسکنے لگا۔

"دائم! تم بھی پتا نہیں، پھر کس کورس کے چکر میں پڑ گئے شادی کر لیتے، بچی کو رخصت کروا کے گھر لے آتے تو اچھا تھا۔" امی پھر اسی موضوع کی طرف آگئیں جس کے شروع ہونے پہ حدیقہ کا چہرہ گل رنگ ہوا تھا۔

"ایک سال کی تو بات ہے امی!"

"ایک سال۔۔۔ ایک سال کم نہیں ہوتا دائم! بچی ہے کہ ایک دن بھی سکون میں نہیں ہے وہاں۔"

"بچی رخصت ہو کر آگئی تو میرے ہنستے مسکراتے راج دلارے بھائی کا کوئی دن سکون میں نہیں ہوگا۔" عائز جاتے جاتے واپس پلٹا۔

"عائز!" اس سے پہلے کہ امی اس تک پہنچتیں، وہ پلیٹ میں پڑے آخری دونوں پکوڑے منہ میں ڈال کر ایک جست میں لاؤنج سے باہر تھا۔

دائم مسکرا کر رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

دھیرے دھیرے گھونگھٹ سرکاتی صبح کی تمام تر خوب صورتی کو سراہتے ہوئے اس کی تازگی کو سانس سانس میں سموتے ہوئے وہ اپنے دن کا آغاز کرتا تھا۔ سحر خیزی اور صبح کی سیر اس کی عادت تھی۔ جن دنوں عائز پر وزن کم کرنے کا بھوت سوار ہوتا، وہ بھی صبح کی چہل قدمی میں اس کا ساتھ دے دیتا۔ اور جب وہ اپنا چار کلو وزن گھٹانے میں کامیاب ہو جاتا پھر وہ دن چڑھے تک گھوڑے گدھے بیچ کر سوتا رہتا۔

آج کل بھی وہ دائم کا ساتھ نہیں دے رہا تھا مگر اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اپنے بڑھتے وزن کی طرف سے لاپروا ہو گیا تھا۔ بلکہ رات بھر موبائل پر لگا رہتا۔ پھر بھلا صبح کی سیر کیسے ممکن ہوتی۔ چنانچہ دائم آج بھی اکیلا ہی سیر پہ نکلا تھا۔ جب وہ قریبی پارک سے لوٹا تو حدیقہ لان میں ادھر سے ادھر تیزی سے چکر لگاتی نظر آئی۔ اس نے حیران ہوتے ہوئے ایک نظر گھڑی پہ ڈالی اور پھر اس کی طرف چلا آیا۔

"حدیقہ! خیریت۔۔۔ اتنی صبح صبح؟"

"کیوں۔۔۔ اتنی صبح صبح نہیں آسکتی کیا میں۔۔۔ گھر ہے یہ میرا، جب چاہے آؤں۔ کیا تمہیں بھی عائز کی طرح تکلیف ہے؟" وہ اس پہ چڑھ دوڑی۔

"عائز صحیح کہتا ہے، تمہارے ساتھ گزرا واقعی مشکل ہے۔" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوا لان میں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ "میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اتنی صبح تمہیں کبھی دیکھا نہیں ناں۔"

"آج میں نے جو اس منحوس کی صورت اتنی صبح دیکھ لی۔" جتنی تیزی سے وہ چکر کاٹ رہی تھی اتنی ہی تیزی سے اس کی زبان بھی چلی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی سرزنش کرتا، حدیقہ کا فون بج اٹھا۔

"نہیں ہوں، مر نہیں گئی۔۔۔ اور آپ بھی سن لیں، جب تک وہ ذلیل عورت اس گھر میں رہے گی۔ میں وہاں قدم بھی نہیں رکھنے والی۔"

دوسری طرف یقیناً "پھپھو تھیں، دائم کو اندازہ ہو گیا تھا۔

"کہیں بھی رہ لوں گی، آپ میری فکر چھوڑ دیں۔ دائم منیب کے گھر جگہ نہیں ہوگی تو بھاڑ میں چلی جاؤں گی مگر واپس اس گھر میں نہیں آؤں گی جہاں وہ۔۔۔"

آگے اس کی ایسی شعلہ بیانی شروع ہوئی کہ دائم کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔

"کسی کے لیے اس طرح سے بات نہیں کیا کرتے۔" وہ موبائل پٹخ کر ساتھ آبیٹھی تو دائم نے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

"اس کے لیے ایسے ہی بات کرتے ہیں۔ تم نہیں جانتے وہ بلڈی بچ۔۔۔"

"حدیقہ!" دائم کا لہجہ سخت ہوا، اس کی زبان وہیں رک گئی۔

دائم مزید کچھ نہیں بولا مگر اس کی آنکھوں اور چہرے سے غصہ اور خفگی ظاہر ہو رہی تھی۔ جس قسم کی زبان وہ آج کل استعمال کرنے لگی تھی، وہ دائم جیسے مہذب اور نفیس طبیعت بندے کی برداشت سے باہر تھی۔

وہ لب بھینچ کر کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہی پھر جھٹکے سے اٹھی اور چل دی۔ رخ گیٹ کی طرف تھا۔ دائم نے آواز دی مگر وہ رکی نہیں۔ اس نے تیزی سے لپک کر آکر اس کا بازو تھاما۔ وہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سیاہ آنکھوں کی بھیگتی سطح دائم کو بے بس سا کر گئی۔

"میں تو اس لیے خفا ہو رہا تھا کہ اس طرح گالیاں دو گی تو ہمارے بچے بھی گالیاں دینا سیکھ جائیں گے اور کوئی قابل فخریات تو نہیں ہوگی ناں!" وہ اس کا گال چھوتے ہوئے نرمی سے کہہ رہا تھا۔

"اگر ان کا باپ بھی میرے باپ جیسا نکلا تو گالیاں میں سکھاؤں گی انہیں۔" اس نے دائم کا ہاتھ جھٹک کر پرے کیا۔

"اتنا غصہ!" دائم نے تاسف سے سر ہلایا۔ "چلو ایک بات تو ثابت ہوئی، نفرت میں محبت سے زیادہ طاقت ہوتی ہے۔" وہ ناسمجھی کے انداز میں اسے دیکھنے لگی۔

"کیا مطلب؟"

"دیکھو ناں! ان خاتون کا چہرہ صبح صبح دیکھ کر حدیقہ دائم کو غصہ تو آجاتا ہے، مگر اپنے دائم کو صبح سویرے دیکھ کر ان کے موڈ پر کوئی خوش گوار اثر نہیں پڑتا۔" وہ بڑی معصوم سی صورت بنائے کہہ رہا تھا۔

وہ بے اختیار مسکرا دی۔ وہ چند پل اسے دیکھتا رہا۔ صبح اور نکھر گئی تھی۔

"تم مسکراتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔" وہ ہنس دی۔

"ہنستے ہوئے تو اور بھی اچھی لگتی ہو۔" وہ فوراً بولا۔

"دائم! تمہارا تصور، تمہارا چہرہ ہی تو ہے، جو مجھے خوش رکھتا ہے ورنہ تو۔۔۔"

"چلو آؤ، تمہیں ناشتا کروادوں۔" اس سے پہلے کہ وہ پھر اپنا جی جلانے لگتی، دائم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر کی طرف بڑھا۔ اس وقت تو وہ آرام سے اس کے ساتھ یہ فرمائش کرتی ہوئی چل دی کہ "صرف چائے پیوں گی، وہ بھی تمہارے ہاتھ کی بنی۔" مگر بعد میں پچھتائی کہ کاش وہ اس کے ساتھ اندر نہ گئی ہوتی۔ چلی گئی تھی تو اس کے ہاتھ کی بنی چائے کا ایک کپ پی کر نکل آتی۔ تاکہ نہ مامی اور مائرہ کے اصرار پہ ناشتے کی میز پہ بیٹھنا پڑتا اور نہ ہی ماموں کا سامنا ہوتا۔ اور اگر سامنا ہو گیا تھا تو کاش دائم وہیں ہوتا، اپنے کمرے میں نہ گیا ہوتا۔

مگر حقیقت یہی تھی کہ اس وقت منیب حسن اس کے سامنے کھڑے اپنے ازلی خشک لہجے میں اس سے پوچھ رہے تھے۔ "تم اس وقت۔۔۔ اتنے سویرے یہاں؟"

اور وہ واحد انسان تھے جن سے وہ بڑی دھونس کے ساتھ یہ بھی نہ کہہ پاتی "میرا گھر ہے جب جی چاہے گا

آؤں گی۔" وہ محض نظریں جھکا کر لب کاٹ کر رہ گئی۔

"کبھی اپنے گھر میں بھی ٹکا کرو۔ باپ کو شکل دکھاتی رہو گی تو اسے یاد رہو گی۔ ورنہ وار دے گا وہ سب کچھ اس عورت پہ۔" کرسی پہ بیٹھتے ہوئے انہوں نے اپنے ناشتے کا آغاز اسی ہدایت سے کیا۔

"وار دیں، بے شک وار دیں۔ مجھے ان کے پیسے، جائیداد کی ضرورت بھی نہیں۔" وہ منیب حسن کے سامنے خاموش رہنے میں ہی بہتری سمجھا کرتی تھی، پھر بھی جانے کیسے کہہ گئی۔

"ایک تو تم عورتیں... جاہل، جذباتی۔" حقارت ان کے لفظوں سے زیادہ لہجے سے جھلک رہی تھی۔ "اکڑ پتا نہیں کس بات کی دکھاتی ہو۔ ہو کیا... ہو کیا آخر تم اپنے باپ کے نام، باپ کے پیسے کے بغیر؟"

وہ پراٹھے کا نوالہ منہ تک لے جانا بھول گئی۔ ان کی طرف بے یقینی سے دیکھتی رہی۔

یہ شخص اس کا ماموں تھا، سگا ماموں۔

یہ سچ ہے کہ منیب حسن نے اپنے لب و لہجہ، اپنے الفاظ، اپنے رویے سے کبھی کسی کو عرش پہ نہیں بٹھایا تھا۔ پھر بھی حدیقہ نے کبھی نہ سوچا تھا کہ وہ اپنی بھانجی، اپنی بہو کی ہستی کو یوں سرے سے جھٹلا دیں گے۔

"اپنے باپ کے نام، اس کے پیسے کے بغیر کچھ نہیں میں؟" اس کی آواز کا زور ختم ہو گیا تھا۔

"نہیں بیٹا! تمہارے ماموں کے کہنے کا یہ مطلب نہیں تھا، وہ تو کہنا..."

"میرا مطلب وہی ہے، جو یہ سمجھ رہی ہے۔" منیب حسن نے ہاتھ اٹھا کر بیوی کو صفائیاں دینے سے روکا اور اطمینان سے جوس کا گلاس ہونٹوں سے لگاتے ہوئے اخبار آگے کر لیا۔

وہ کچھ دیر اس مادہ پرست شخص کو دیکھتی رہی۔ جب آنکھوں کے پیمانے چھلکنے کو ہوئے تو جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے ڈائننگ روم سے نکل گئی۔ مامی نے آنکھوں کے اشارے سے مائرہ کو اس کے پیچھے جانے کو کہا مگر باپ کی موجودگی میں وہ ہمت نہ کر پائی۔

✵ ✵ ✵

"میرے اور دائم کے باپ، دونوں مر کیوں نہیں جاتے۔"

اس جملے کو سن کر اگر عفت کا ہاتھ حدیقہ پر اٹھا تھا تو اس میں حیرت کیا تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھیں جن کے باپ بھائی، شوہر یا بیٹے جو مرضی ستم ڈھا لیں، جو چاہے ظلم کر جائیں، یہ ان پہ صدقے قربان ہوتی جائیں گی، مصلیٰ پہ بیٹھی ان کی صحت و سلامتی، ان کی ترقی و کامرانی کے لیے وظیفے پڑھتی نظر آئیں گی۔ سو بیٹی کے منہ سے ایسے منحوس الفاظ سن کر وہ اسے چومنے سے تو رہیں۔ جواب گال پہ ہاتھ رکھے بے یقینی سے ماں کی جانب دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں پانی جھلملا رہا تھا۔

"کیوں لیتی ہو میرا اتنا امتحان حدیقہ!" بہت دکھ سے بولتے ہوئے انہوں نے اپنا کانپتا ہاتھ صوفے کی پشت پر رکھ کر جیسے سہارا لیا۔ ذیابیطس کی مریضہ تھیں وہ۔ وقت پر کھانا اور دوا نہ لیتیں تو طبیعت بگڑنے لگتی، مگر آج صبح چھ بجے ہی حدیقہ اور رومانہ کے بیچ جو جھڑپ ہوئی، پھر حدیقہ تو گاڑی کی چابی اٹھا کر نکل گئی جبکہ انہوں نے ناشتا تو کیا، پانی کا گھونٹ تک منہ میں نہ ڈالا تھا۔ اور اب جسم کی رہی سہی طاقت بیٹی کو تھپڑ مار کر کھو بیٹھیں۔

"میں... میں لیتی ہوں امتحان اور آپ کے عزت مآب شوہر اور اس کی لاڈلی بیوی..."

"حدیقہ! جیسا چل رہا ہے بیٹا، ویسے ہی قبول کر لو۔" انہوں نے اس کی بات کاٹ کر تھکے ہارے لہجے میں کہا۔ "آج عالم تمہاری ہر حرکت برداشت کر لیتے ہیں، کیونکہ تم ان کی اکلوتی اولاد ہو۔ ان کی ساری محبت کی حق دار۔ کل دوسری اولاد آ گئی تو محبت بھی بٹ جائے گی، پھر..."

"بٹ جانے دیں محبت... آپ کے حصے کی محبت سے بھی تو انہوں نے دوسری عورت کا دامن بھر دیا۔

زندہ ہیں ناں آپ۔ میرے حصے کی محبت بھی اٹھا کر وہ دوسری اولاد پہ لٹا دیں گے تو کون سا مر جاؤں گی میں۔"

ماں سے تھپڑ کھا کر آنکھیں بے شک بھیگ گئی تھیں، مگر غصے پہ پھوار نہ پڑی تھی۔ لہجہ ابھی تک سلگ رہا تھا۔ "آپ کو شوق ہے تو بے شک ہوتا رہے اس شخص کے ٹکڑوں پہ پلنے کا، اس کی نگاہ کرم کی بھیک مانگنے کا، جس نے بائیس سال... بائیس سال آپ سے محبت کے دعوے کیے اور بھلانے میں شاید پل بھی نہ لگایا۔ مجھے اس شخص کی محبت، اس کے نام، اس کے پیسے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ بات آپ بھی سمجھ لیں اور اپنے بھائی کو بھی سمجھا دیجیے گا۔"

عفت عالم کے اندر مزید بحث کی ہمت رہی نہ ہی کھڑے رہنے کی طاقت۔ وہ صوفے کی پشت کا سہارا لیے اس پہ گر سی گئیں۔ ان کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا عفت! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟" عالم مرتضیٰ آفس جانے کے لیے نکل رہے تھے۔ ان کی بدلی ہوتی رنگت دیکھ کر تیزی سے ان کی طرف بڑھے۔ حدیقہ باپ کو دیکھ کر ایک لمحہ بھی وہاں ٹھہری نہ تھی۔

✵ ✵ ✵

"پھول... پھول جیسی لڑکی کے لیے۔"

"اپنے باپ کو دو جا کر یہ پھول۔" حدیقہ نے اس سفید اور گلابی پھولوں کی جانب ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"باپ روٹھا ہوا نہیں ہے بیوی روٹھی ہوئی ہے۔" دائم نے ذرا برا نہیں مانا اور اسی خوش گوار لہجے میں بولا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے، ایسے میں مان جاؤں گی۔ ایسے حربے میرے باپ کو بھی بہت آتے تھے۔ وہ بھی لاتا تھا میری ماں کے لیے پھول... بائیس سال بے وقوف بنایا اس نے میری ماں کو ایسے ڈرامے کر کر کے۔" وہ پھر بظاہر اپنے موبائل میں پوری طرح گم ہو چکی تھی۔

دائم نے اپنا پھولوں والا ہاتھ ابھی بھی پیچھے نہیں کیا تھا۔

"حدیقہ! کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے اپنے باپوں کو بھول نہیں سکتے۔"

"باپوں۔" اسے بے اختیار ہنسی آگئی۔ پھر نخرا کیسا، اس نے گلدستہ تھام لیا۔

"پھول میں لے رہی ہوں، مگر ایک بات اچھی طرح سے یاد رکھنا دائم! تم الگ گھر لو گے تو ہی میں رخصت ہو کر تمہارے ساتھ جاؤں گی۔ ورنہ منیب حسن کے گھر میں تو میں اب قدم بھی نہیں رکھنے والی۔ یہ فیصلہ میں نے آج اس گھر سے نکلتے وقت ہی کر لیا۔"

"کچھ ایسا ہی فیصلہ آپ نے اس گھر سے نکلتے ہوئے بھی کیا تھا۔" دائم نے بڑے مزے سے اس کے

بیڈ پر نیم دراز ہوتے ہوئے اس کا جی جلایا۔

"کتنے کمینے ہو تم دائم۔" اس نے تکیہ اٹھا کر اس پر مارا۔

"توبہ توبہ... مجازی خدا کی یہ عزت۔"

"زیادہ سر پہ چڑھانے والی نہیں میں مجازی خدا کو۔ اپنی ماں کا حال دیکھ لیا ہے میں نے۔" وہ پھر سے تلخ ہونے لگی۔ "بس پوجنے کی کمی رہ گئی تھی' باقی سب کچھ کیا میری ماں نے اور کیا صلہ ملا انہیں' بائیس سال کی وفاؤں کا' خدمتوں کا..."

"حدیقہ پلیز! ہر وقت ایک ہی بات پہ نہ کڑھا کرو۔ اور نہیں تو پھپھو کا ہی خیال کر لیا کرو۔ نہ کیا کرو ایسی باتیں ان کے سامنے۔ طبیعت دیکھی ہے کتنی خراب رہنے لگی ہے ان کی۔ ابھی مل کر آ رہا ہوں' بہت کمزور لگ رہی تھیں جیسے برسوں کی بیمار ہوں۔"

"ہاں تو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں وہ اس شخص کو' جس نے ان کا یہ حال کیا ہے۔" ماں کی حالت وہ بھی دیکھتی تھی مگر دل میں ماں کے لیے جو غصہ تھا وہ اسے بے حس سا بنا دیتا۔

"چھوڑنا اتنا آسان نہیں ہوتا حدیقہ!" دائم نے رسان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

"کیوں آسان نہیں ہوتا... میرا شوہر ایسا کرے تو میں اسی وقت لات مار کر اپنی زندگی سے باہر نکال پھینکوں۔"

احساس توہین سے دائم کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ اس کے باپ کے کسی بھی فعل کسی بھی عمل کا وہ ذمہ دار نہیں تھا۔ پھر بھی اپنا غصہ' اپنی بھڑاس اس پر نکالتے ہوئے وہ اسے بھی بیچ میں گھسیٹ لاتی۔

اس کا فون آیا تو وہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ عینا کا فون تھا مگر آواز صحیح نہیں آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر "ہیلو ہیلو" کرتا ہوا بالکونی میں آ گیا۔

"کس کا فون تھا؟" کمرے میں آیا تو حدیقہ نے پوچھا۔

"عینا کا۔"

"جہاں تک میں جانتی ہوں' اس کا پورا نام نور العین ہے... لیکن لگتا ہے تمہاری بڑی بے تکلفی ہو گئی ہے اس سے۔" بڑا چبھتا ہوا لہجہ تھا اس کا۔

"ہاں تو... ہم ساتھ کام کرتے ہیں' دوست ہیں۔ اتنی بے تکلفی تو ہو ہی جاتی ہے۔" اس نے ضبط سے جواب دیا۔

"ہوں... ساتھ کام کرتے ہیں... بائی داوے' ایسی بھی کیا بے تکلفی ہو گئی کہ میرے سامنے بات نہیں ہو سکتی تھی۔"

"کمرے سے باہر میں اس لیے گیا تھا کہ سگنلز نہیں آ رہے تھے یہاں۔" اس نے ذرا مشکل سے ہی اس کے لہجے کو ہضم کیا تھا۔

"میرے باپ کو بھی کمرے سے باہر ہی سگنلز ملتے تھے' جب اس حرافہ کا فون آتا تھا۔ تمہیں ابھی سے ایسے حربے آ گئے... میں بے وقوف..."

"بند کرو اپنی بکواس۔" اس کے لفظ اور لہجہ دونوں برداشت سے باہر ہوئے تو وہ چلا اٹھا۔ "تمہارا مسئلہ یہ ہے حدیقہ!" اس نے حدیقہ کا بازو سختی سے پکڑا۔ "بائیس سال تک تمہیں میری وفا پہ یقین نہیں آئے گا' ہاں تیئسویں سال شاید تم پہ ثابت کر پاؤں کہ میں تمہارے باپ جیسا نہیں۔" پھر ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑا اور اس کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ بھیگی آنکھوں سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"پھول... خوشبو جیسے شخص کے لیے۔"

دائم نے ایک نظر اسے دیکھا اور خاموشی سے سرخ گلاب تھام لیا۔ پھر اسے میز پر رکھ کر دوبارہ سے اپنے کیمرا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"خفا ہو؟"

"نہیں۔"

"میں جانتی ہوں تم خفا ہو۔" دائم کے یک لفظی جواب سے اس کی تسلی نہیں ہوئی تھی۔

"خفا نہیں ہوں حدیقہ! ہاں دکھ ضرور ہوتا ہے جب تم یوں مجھ پہ شک کرتی ہو۔"

"سوری... آئندہ کبھی میں ایسا نہیں کروں گی۔" وہ شرمندہ سی اس کے قریب کھڑی تھی جبکہ دائم اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا' محض احساس دلانا چاہتا تھا۔ اس کا دائم پر شک کرنا' آئندہ زندگی میں مسائل کی بنیاد بنتا۔

"پیکنگ کرو میری۔" وہ کیم کورڈر کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے نارمل لہجے میں بولا تو وہ پرسکون ہوتے ہوئے بیڈ پہ کھلے پڑے بیگ کی طرف بڑھ گئی۔

"وہ کپڑے رکھنا۔ جن میں تمہیں میں بہت اسمارٹ لگتا ہوں۔"

"ایسا میں بالکل نہیں کروں گی۔ میں کب چاہوں گی تم کسی اور کو اسمارٹ لگو اور اس کی نظریں تم پہ جم جائیں۔"

"دیکھو! ابھی ابھی تم نے وعدہ کیا ہے کہ مجھ پر شک نہیں کرو گی۔"

"تم پر شک کب کر رہی ہوں میں' شک تو مجھے ان لڑکیوں پہ ہے' جو تمہیں دیکھیں گی۔" وہ مسکرا دیا۔

"دائم! تم چلے جاؤ گے؟"

"واپس بھی آؤں گا۔"

"اسی لیے تو جانے دے رہی ہوں۔ مگر ایک سال... ایک سال کیسے گزرے گا تمہارے بغیر۔" وہ بہت اداس ہو رہی تھی۔ دائم نے کیم کورڈر میز پر رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔

کمر تک آتے سیاہ بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی آگے کیے' پیکنگ میں مصروف وہ بڑی گھریلو سی لگ رہی تھی۔

"حدیقہ! ایک بات کہوں۔"

"کہو۔"

"تم بہت اچھی لگ رہی ہو' اتنی کہ جی چاہ رہا ہے... جی چاہ رہا ہے۔"

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور حدیقہ اس کی نیت بھانپ کر اس سے بھی زیادہ تیزی سے دروازے کی طرف۔

"جی چاہ رہا ہے یہ شرٹ پہن کر تمہیں بھی اتنا ہی اچھا لگوں۔" اس نے ہلکے آسمانی رنگ کی شرٹ بیڈ سے اٹھاتے ہوئے شرارتی لہجے میں ادھورا جملہ مکمل کیا۔ وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

"یار! تمہاری ہنسی بہت پیاری ہے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "مگر اس ہنسی میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہیں روک لے۔"

وہ کچھ بول نہیں پایا۔ کیا کہتا' جانا تو اسے تھا۔ اس سے پہلے کہ حدیقہ کی بدلیاں بنتی آنکھیں برس پڑتیں' وہ کمرے سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"حدیقہ!" عائزا اسے دیکھتے ہی چلایا۔ "شکر ہے تم آ گئیں۔ ورنہ میں کس کے کندھے پہ سر رکھ کر روتا۔ کس کو اپنے غم سناتا۔"

"کیوں... کیا تکلیف ہے تمہیں؟" اس نے تنک کر پوچھا۔

"میرا تیسرا پیار ادھورا رہ گیا حدیقہ!" وہ غم سے ادھ موا ہونے لگا۔

"کیوں' ماریہ نے تمہیں دھوکہ دے دیا؟" مائرہ نے ٹی وی سے نظریں ہٹا کر ہمدردی سے دریافت کیا۔

"ماریہ... کون۔ ماریہ... اچھا اچھا... وہ ماریہ... وہ تو میرا پہلا پہلا پیار تھی۔" ندا کے ساتھ ساتھ ماریہ کے دیے زخم بھی ہرے ہو گئے۔

"زہر لگتے ہیں مجھے تم جیسے لڑکے... دل پھینک... ہر روز نئی لڑکی کے پیچھے بھاگنے والے۔" حدیقہ بری طرح چڑ تو گئی تھی۔

"بھائی نے تو جو پہاڑ کھودنے تھے' کھود ڈالے... اور نکلا کیا' چوہا... سوری سوری چوہیا۔ ہم نے تو دریافت کے باب ابھی کھولنے ہیں۔"

"امی! اسے دیکھیں' مجھے چوہیا کہہ رہا ہے۔" حدیقہ نے فوراً شکایت لگائی۔

"چل رے... چاند سی بہو ہے میری۔ تم خود کیا ہو الو... رات رات بھر جاگتے ہو۔ اور جب جاگنے کا وقت ہوتا ہے تو سو جاتے ہو۔" انہوں نے دائم کی

پسندیدہ رس ملائی بناتے ہوئے ملحقہ کچن سے ہی حدیقہ کی شکایت پر اس کی عزت افزائی کی۔

"مامی! آپ کو نہیں پتا' یہ ساری رات جاگ کر لڑکیوں سے باتیں کرتا ہے موبائل پہ۔"

"وہ تو میں اپنی ماں کے لیے چاند سی بہو ڈھونڈنے کی جستجو میں ہوں۔"

"رہنے دو تم... چاند سی بہو... خود ہی ڈھونڈ لوں گی میں۔" انہوں نے پھر کچن سے جواب دیا۔

"پھر تو نتیجہ ایسا ہی ہو گا۔" اس نے حدیقہ کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں تو کیا کمی ہے میری پسند میں..."

"وہ تو جب آپ میری پسند دیکھیں گی تب جانیں گی۔"

"جیسے بے شرم تم... ویسے اوصاف اس کے ہوں گے۔ جو غیر مردوں سے یوں راتوں کو فون پہ باتیں کرتی ہے۔" امی نے تو واقعی سمجھ لیا کہ وہ لڑکی پسند کر چکا ہے۔ وہ جوش میں کچن سے باہر نکل آئیں۔ مائرہ اور حدیقہ کو ہنسی آ گئی اس کی عزت ہوتے دیکھ کر۔

"ایک میرا دائم... نیک فرماں بردار۔ ایک دفعہ ماں نے اپنی خواہش کا اظہار کیا' اس نے سر جھکا دیا۔ ماں کی پسند کو اپنی رضا بنا لیا۔" وہ دائم کے گن گانے لگیں۔

"قسم کھائیں امی!" وہ دائم کی خوبیوں سے ذرا متاثر ہونے والا نہ تھا۔

"ہاں تو اور کیا... دنیا رشک کرتی ہے میرے نصیب پہ۔"

"قسم کھائیں امی!" وہ پھر بولا۔

"ایسا لعل ہر ماں کا نصیب کہاں۔" ان کے لہجے میں فخر ہی فخر تھا۔

"قسم کھائیں امی۔" آخر ان کا مکا کھا کر ہی سکون حاصل ہوا۔ مائرہ ہنستی چلی گئی جبکہ حدیقہ کو جیسے چپ سی لگ گئی تھی۔

"کیا ہو رہا ہے بھئی؟" دائم لاؤنج میں داخل ہوا اور خوشگوار لہجے میں پوچھتے ہوئے عائز کے برابر میں بیٹھ گیا۔

"امی آپ کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہیں۔"

"اور تمہاری شان میں؟" وہ مسکرایا۔

"میں تو سوتیلا ہوں ان کا۔ مجھ میں کوئی خوبی تھوڑی نظر آتی ہے ان کو۔" وہ ہنستے ہوئے سنجیدہ سی بیٹھی حدیقہ کی طرف متوجہ ہوا۔

"تمہیں کیا ہوا... پھر ستایا ہے کیا اس نے؟" اس نے عائز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ امی کو چیلنج کر رہا ہے کہ حدیقہ سے اچھی بہو ان کے لیے ڈھونڈ نکالے گا۔" مائرہ نے اطلاع دی۔

"حدیقہ سے اچھی کوئی ہو گی تو ملے گی ناں۔" دائم نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

حدیقہ نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"بھائی کو بالکل صحیح حلیے میں نیویارک پہنچنا ہے۔ اس لیے وہ اس طرح کے بیانات دینے پہ مجبور ہیں۔" عائز کہاں سدھرنے والا تھا۔

"ارے نیویارک سے یاد آیا' میری پیکنگ ابھی رہتی ہے۔ لوگ تو کسی کام کے نہیں۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے حدیقہ کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہی تھی مگر دھیان شاید کہیں اور تھا۔

"کہاں کھوئی ہوئی ہو... فکر نہ کرو اس کو میں نے وارن کر دیا ہے۔ اگر تمہیں تنگ کرے گا تو اس کو آئی فون نہیں لا کر دوں گا۔" اس نے کھڑے ہوتے ہوئے اسے متوجہ کیا۔

"ارے حضور! کیا کہہ رہے ہیں آپ... بھابھی جی! میں آپ سے اگلی پچھلی تمام گستاخیوں کی معافی مانگتا ہوں۔" وہ ایک لمحے میں صوفے سے اٹھ کر اس کے چرنوں میں آ بیٹھا۔

دائم مسکراتے ہوئے اٹھ کر باہر آیا۔ حدیقہ بھی عائز کو پرے ہٹا کر اس کے پیچھے چلی آئی۔

"دائم!" اس کی آواز سن کر وہ پلٹا۔ وہ عین اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"دائم!" وہ لب کچلتی ہوئی کچھ متذبذب سی لگی۔

"کیا بات ہے حدیقہ؟"

"دائم! کیا تم نے صرف مامی کی خواہش پر مجھ سے نکاح کیا ہے۔ تمہارے دل میں میرے لیے کوئی خاص جذبہ نہیں تھا؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے حدیقہ! کوئی خاص جذبہ نہیں تھا تو کیا ہوا... اب تو تم میرے لیے بہت اہم ہو ناں۔" دائم نے نرمی سے جواب دیا۔

"دائم! تمہارے دل میں میرے لیے کچھ نہیں تھا' مگر میں نے تمہیں شدت سے چاہا ہے۔"

"حدیقہ! یہ کہنے کی ضرورت ہے کیا... ہم دونوں..."

"ضرورت ہے دائم... کچھ باتیں کہنے کی بہت ضرورت ہوتی ہے' کچھ اظہار لازم ہوتے ہیں۔" اس نے دائم کی بات کاٹ کر کہا۔ "یاد رکھنا دائم! میں نے تم سے بہت محبت کی ہے۔ صرف تمہارے خواب دیکھے ہیں۔ صرف تمہیں چاہا ہے۔" اس کی نم آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اتر آئی تھی۔ وہ اس کے نزدیک آیا۔

"دائم منیب کی اس سے بڑی خوش بختی اور کیا ہو سکتی ہے۔" اس نے پیار سے اس کے گال کو چھوا۔ وہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر آسودہ سی مسکرا دی۔

"میں نے کچھ نہیں دیکھا... میں نے کچھ نہیں دیکھا... یارو! میرا کمرا کدھر ہے' ذرا بتا دو۔" عائز آنکھوں پہ ہاتھ رکھے جان بوجھ کر ادھر سے ادھر ٹکرانے لگا۔

وہ جھینپ کر دائم سے دور ہوئی۔

"جاہل! تمہیں تمیز نہیں... دو بندوں کی پرائیویسی کا خیال نہیں رکھتے۔"

"دو بندے جب کاریڈور کے بیچوں بیچ کھڑے رومانس بگھار رہے ہوں تو کوئی دیکھے نہ دیکھے... شبیر تو دیکھے گا۔"

"بدتمیز۔" وہ گلابی سی پڑ گئی۔

وہ ہنستے ہوئے بہت اچھی لگتی تھی اور بھیگی آنکھوں کے ساتھ ہنستی ہوئی تو دائم منیب کو مبہوت سا کر گئی۔

☼ ☼ ☼

ائیرپورٹ اور اب اپارٹمنٹ کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر گوری گوری' ننگی ننگی سی لڑکی پہ پڑتی تو بے اختیار مسکرا اٹھتا۔ حدیقہ بھی ناں...

کرنے کو وعدہ تو کر لیا تھا کہ اب شک نہیں کرے گی مگر اسے الوداع کرنے آئی تو ائیرپورٹ پہ ڈپارچر لاؤنج کی طرف جاتی ایک انگریز حسینہ کی پنڈلیوں پہ نظر پڑ گئی تو تشویش پھر شروع۔

"دائم! سنا ہے وہاں گوری گوری ننگی ننگی لڑکیاں ہوتی ہیں۔"

وہ سر تھام کر رہ گیا۔ جانتا تھا یہ تشویش چند دنوں بعد تفتیش بن جائے گی۔ کبھی اسے حدیقہ کے یہ وہم یہ پریشانیاں مزا دیتیں' کبھی وہ بری طرح چڑ جاتا۔ وہ ہمیشہ سے بڑا شریف بندہ رہا تھا۔ بے شک لڑکیوں سے اس کی دوستی بھی تھی۔ ان سے بے تکلفی سے گفتگو بھی کر لیتا۔ مگر اس کا انداز سب کے ساتھ ایک جیسا رہتا۔ کبھی ایسا نہیں کہ لڑکیوں پہ خوامخواہ زیادہ توجہ دی یا کبھی ایسا نہیں کہ لڑکیوں کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو بڑا شریف ظاہر کیا۔

وہ جیسا تھا' ویسا ہی رہتا۔

سب کزنز کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایک جیسا۔ یہاں تک کہ حدیقہ کو بھی نکاح سے پہلے اس نے کبھی کسی اور نظر سے نہ دیکھا تھا' مگر جب رشتہ بدلا تو دل بھی اس کی طرف مائل ہونے لگا۔ اور اب تو وہ اسے بہت عزیز ہو گئی تھی۔ اسے لگتا' حدیقہ اس کی زندگی کا بہت اہم حصہ ہے جس کے بغیر وہ جی ہی نہیں سکتا۔ اور حدیقہ تھی کہ باپ کی دوسری شادی نے اسے مرد ذات سے بدگمان کر کے رکھ دیا تھا۔

"حدیقہ! دائم صرف تمہارا ہے..." اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندتے ہوئے اسے دل ہی دل میں مخاطب کر کے یقین دلایا۔

☼ ☼ ☼

اسٹریٹ ایکروبیٹس (سڑکوں پر تماشا کرنے والے) سڑک پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے۔

رنگین روشنیوں کا مرکز بنی وہ نازک کامنی سی لڑکی

فٹ بال پر نہایت مہارت سے اپنا توازن برقرار رکھتی ہوئی ڈانس کر رہی تھی۔ ہجوم اپنی سانسیں روکے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے بدن اور فٹ بال کی ہر حرکت پر انہیں لگتا کہ وہ ابھی گر پڑے گی۔ بیچ بیچ میں منچلوں کی سیٹیاں سنائی دیتیں۔ مگر وہ ہر شے سے بے نیاز رقصاں رہی۔

دائم بھی اپنی کھڑکی میں کھڑا دلچسپی سے اسے دیکھتا رہا پھر اپنا کیم کورڈر اٹھا لایا اور اس منظر کی عکس بندی کرنے لگا۔ جیسے ہی اس کا رقص ختم ہوا' تالیوں' سیٹیوں اور چیخوں کا شور فضا میں بلند ہوا۔ اور اس لڑکی پہ سکوں اور نوٹوں کی بارش ہونے لگی۔ دائم نے اس وقفے میں اپنا کیمرا اس منظر عکس بند کرنے کی نیت سے چاروں اطراف گھمایا۔ نیچے سے ہوتا ہوا اس کا کیم کورڈر سامنے کی رہائشی عمارت کی طرف گیا۔ وہاں بھی کھڑکیوں سے نیچے جھانکتے کچھ چہرے تھے۔

ایک بچے کی نظر اس پہ پڑی تو ہاتھ ہلانے لگا۔ اس نے بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دوسرا ہاتھ ہلا دیا۔ اور جب کیم کورڈر گھوم کر عین سامنے والی کھڑکی کی طرف آیا تو وہ وہاں سے نظر ہٹانا بھول گیا۔

کسی ساحر نے پورے منظر پر کوئی منتر پڑھ کر پھونک ڈالا تھا جیسے۔ ہر شے پل بھر کے لیے ساکت ہو گئی۔ نیچے چار لڑکوں کا گروہ شعبدہ بازی میں مصروف تھا۔ چیخوں اور تالیوں کا شور ہی بتا رہا تھا کہ ان چاروں کی پرفارمنس کس قدر شاندار ہے۔ مگر اس نے انہیں شوٹ کرنے کے بجائے آہستہ سے اپنا کیم کورڈر نیچے کر دیا۔

نگاہیں ابھی بھی اسی کھڑکی کی طرف جمی تھیں۔ اس طلسمی منظر کے سحر سے ابھی وہ آزاد نہ ہو پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ پاکستان میں اس وقت اگلا دن چل رہا تھا اور یہاں ابھی رات۔ ابھی کچھ دن اس کے ساتھ الٹا چکر چلنے والا تھا' پھر کہیں جا کر اس کی روٹین ان اوقات کے ساتھ سیٹ ہوتی۔ گھر میں سب سے بات ہو گئی۔ حدیقہ سے بھی گھنٹہ بھر بات کر لی۔ اب کیا کرتا۔ لیپ ٹاپ کھول کر بیٹھا مگر کچھ کام کرنے کا موڈ نہ بنا۔ ٹی وی چلایا تو جلد اکتا کر بند کر دیا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔

"کون تھی وہ؟" سوالیہ نشان پھر اس کے سامنے ابھرا۔ آنکھیں کھول کر وہ سیدھا ہو بیٹھا۔ تھوڑی دیر یونہی بیٹھے رہنے کے بعد ایک دم اٹھا اور کھڑکی کی طرف آ گیا۔ سامنے والی کھڑکی کے پار اندھیرا تھا۔ وہ وہاں سے ہٹ گیا۔

صبح چائے بناتے ہوئے بھی اس کے ذہن میں وہی سوال ابھر رہا تھا جو رات بھر اس کے دماغ میں گردش کرتا رہا۔ اور جواب تھا کہ مل ہی نہ رہا تھا۔

"کون تھی وہ... کیوں مجھے لگا کہ میں اسے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا ہوں۔"

چائے کا مگ لیے وہ صوفے پہ آ کر بیٹھا ہی تھا کہ حدیقہ کا فون آ گیا۔

"جلدی سے آن لائن ہو جاؤ۔ تمہیں دیکھنے کو دل چاہ رہا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے فوراً" حکم کی تعمیل کی۔

"کیسی ہو؟"

"یہ مت پوچھو دائم... یہ بتاؤ کہ تمہارے بغیر رہوں کیسے؟"

وہ ہنس پڑا۔ "تمہارے ساتھ سب ہیں... مجھ سے پوچھو' جسے تنہا پورا سال گزارنا ہے۔"

"سب تمہارا نعم البدل تو نہیں ہیں ناں دائم..." وہ بہت اداس لگ رہی تھی اور شاید روتی بھی رہی تھی۔

"تمہاری چھوٹی والدہ صاحبہ سے جھڑپ ہوئی ہے کیا... جو روتی رہی ہو۔" وہ جان بوجھ کر اسے تنگ کرنے لگا۔

"روئی میں تمہاری جدائی میں ہوں۔ اس کی اتنی اوقات نہیں کہ اس کی وجہ سے آنسو بہاؤں۔" وہ چڑ گئی۔ وہ ہنسنے لگا۔

"دیکھو پلیز میرے لیے ایک کام کرو۔ رونا بالکل نہیں... ورنہ میرا دل کیسے لگے گا اپنے کام میں۔ سال بھر کی بات ہے' پھر جیسے ہی میں واپس آؤں گا..." اس نے خوش آئند مستقبل کی جھلک دکھا کر اس کی اداسی ختم کی۔ یہاں تک کہ وہ بھی اس کے ساتھ سپنے بننے لگی۔

"اک بات اچھی طرح سے سن لو دائم منیب... خبردار کسی اور لڑکی کی طرف دیکھا بھی... صرف مجھے سوچنا' صرف مجھے یاد کرنا' صرف میرے خواب دیکھنا۔"

آخر میں اسے دھمکی دی۔ اور اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تابع داری سے سر ہلا دیا تھا۔

جیسے ہی لیپ ٹاپ بند کر کے ایک طرف رکھا' دھیان پھر وہیں چلا گیا۔

"کون ہے وہ؟" حدیقہ نے کیا کہا تھا۔ اور وہ لاشعوری طور پر سوچ کس کو رہا تھا۔ اگلے چند سیکنڈ میں اس کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔

"نہیں... مجھے یقین نہیں ہوتا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھا۔ وہ بند تھی۔ وہ ہاتھ پہ مکا مارتے ہوئے واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ کھول کر اس کے پاور بٹن پر انگلی رکھ دی۔ اسے اپنے شک کو یقین میں بدلنا تھا اور بلاشبہ انٹرنیٹ اس سلسلے میں بہترین مددگار تھا۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم!"

وہ مال سے نکل رہی تھی' جب دائم نے اسے مخاطب کیا۔ وہ ٹھٹک کر رکی۔ ایک نظر اس اجنبی پر ڈالی پھر نظر انداز کر کے آگے بڑھ گئی۔ وہ اس کے ساتھ ہی چلنے لگا۔

"کیا آپ میری کچھ مدد کر سکتی ہیں؟" سوال سن کر اس کی شہد رنگ آنکھوں میں استعجاب ابھرا تھا۔

"دراصل میں نیویارک میں نیا ہوں۔ رستہ بھول گیا ہوں۔ آپ کو ایک دو بار اپنی بلڈنگ کے پاس دیکھا ہے۔ آپ شاید یونین اسکوائر میں رہتی ہیں۔ یقیناً" آپ اتنی مروت تو دکھائیں گی کہ میری مدد کر دیں؟"

جانے کیوں' اسے اس اجنبی کی بات پہ یقین نہیں آیا۔ وہ کوئی بچہ نہیں تھا اور نہ ہی اتنا بے وقوف لگ رہا تھا کہ رستہ بھول گیا ہو۔ اور اگر ایسا تھا بھی تو اس کی مدد کے لیے وہی رہ گئی تھی کیا۔

وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔ اسے لگا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ کیبل کار میں ابھی بیٹھی ہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔

"مجھے دائم منیب کہتے ہیں۔"

اسے اس کے نام میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ پیکٹ برگر نکال کر کھانے لگی۔

"ہمارے ہاں اگر پاس کوئی بیٹھا ہو تو اسے بھی کھانے کی آفر ضرور کی جاتی ہے۔" اس نے کھڑکی سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا اور شاپر میں سے ایک بسکٹ کا پیکٹ نکال کر اس کے طرف بڑھا دیا۔

"جزاک اللہ۔"

وہ چونک کر اس کے طرف دیکھنے لگی۔

"امریکہ پہلی بار آیا ہوں... آپ یہیں رہتی ہیں؟" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"میں امریکی ہوں۔" اس نے نظریں پھر سے کھڑکی کی طرف موڑتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ جسے وہ بمشکل ہی سن پایا۔

جیسے ہی وہ کیبل کار سے اتری' وہ بھی ساتھ ہی اتر آیا۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ بلڈنگ تک چلا آیا۔ پھر لفٹ میں بھی وہ اس کے ساتھ داخل ہو گیا۔ اس کے چہرے پہ الجھن کے آثار تھے۔ جنہیں محسوس کر کے دائم دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

"اب آپ یہ مت کہیے گا کہ آپ کا اپارٹمنٹ بھی اسی فلور پر ہے۔" وہ ناگوار لہجے میں اسے جتا گئی۔

"نہیں... میرا اپارٹمنٹ تو اس بلڈنگ میں ہی نہیں۔" اس نے آرام سے جواب دیا۔

وہ ایک بار پھر ٹھٹک گئی۔ یہ اجنبی کیا چاہتا تھا۔ لفٹ رکی تو وہ باہر آ گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہی باہر آ جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اس نے دل

ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے قدم آگے بڑھایا۔
"آپ سے مل کر خوشی ہوئی ذواتا کروبی!" پیچھے سے اسے آواز آئی۔
وہ جھٹکے سے مڑی۔ اجنبی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اطمینان سے مسکرا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اللہ ظالم ہے" (اس کا عقیدہ تھا)
وہ نیت باندھ رہی تھی۔
"اللہ نے عورت کو مرد کی تسکین کے لیے پیدا کیا ہے۔ اور اس کی اوقات جوتی جیسی رکھی ہے۔" (اس کا خیال تھا) اب وہ رکوع میں جا رہی تھی۔
"مردوں کو چار شادیوں کی اجازت جبکہ عورت تمام عمر ایک ہی مرد کے تلوے چاٹتی رہے۔ اسلام میں پولی گیمی ہے تو پولینڈری کیوں نہیں؟" (اس نے ایک انٹرویو میں کہا تھا)
اب وہ رکوع سے سیدھی ہو رہی تھی۔
"طلاق کا حق مرد کے پاس ہے تو عورت کے پاس کیوں نہیں؟ زندگی کا ہر فیصلہ لینے کے لیے وہ مرد کی محتاج ہے۔" (اس نے پوچھا تھا)
اب وہ سجدے میں گر رہی تھی۔
"اسلام میں بیٹی کا جائیداد میں کم حصہ رکھ کر اسے بیٹے سے کمتر ثابت کر دیا۔" (اس نے اپنی کتاب میں لکھا تھا)
اب وہ سجدے سے سر اٹھا رہی تھی۔
"عورت کی گواہی آدھی۔ کیا وہ معتبر نہیں، کیا وہ سچی نہیں؟" (اس کا سوال تھا)
وہ پھر بارگاہ الٰہی میں جھک رہی تھی۔
"بیوی پہ ہاتھ اٹھانے کی اجازت... یہ اس کی ذات کا استحصال نہیں تو اور کیا ہے۔" (وہ اسے ظلم سمجھتی تھی)
وہ سلام پھیر رہی تھی۔
"مسلمان عورت کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں ہوتیں، پاؤں میں بیڑیاں نہیں ہوتیں، مگر وہ سراپا زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔" (اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی)
اب اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔
"اسلام مرد کا ہے عورت کا نہیں۔" (اس کا خیال تھا)
"اللہ مرد کا ہے، عورت کا نہیں۔" اس نے دعا مانگ کر ہاتھ چہرے پر پھیر لیے۔
دائم نے گہرا سانس لیا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ جو کچھ اس نے دیکھا۔ وہ حقیقت تھی یا واہمہ؟

☼ ☼ ☼

"نیویارک فلم اکیڈمی" میں پہلا قدم رکھتے ہوئے اس کی آنکھیں خوشی سے جھلملا اٹھیں۔ اس اکیڈمی کا گریجویٹ ہونا اس کا بہت بڑا سپنا تھا۔ لیکن منیب حسن اس خواب کی تعبیر میں حائل رہے۔ اس نے باپ کی خواہش پر ایم بی اے کیا تھا، مگر ایک کامیاب بزنس مین نہ بن پایا کیونکہ اس طرف اس کا رجحان ہی نہ تھا۔ پھر جب اس کی ڈاکومنٹری فلم "فطرت اور انسان" کو تائیوان فلم فیسٹیول میں گرینڈ پرائز ملا تو منیب حسن نے اس کے دل کو اپنی مرضی کی پرواز کرنے کی اجازت دے دی۔ اور اب وہ یہاں سے "ڈاکومنٹری فلم میکنگ" کا ایک سالہ کورس کر رہا تھا۔
اس اکیڈمی میں آنے کے ہفتہ بعد ہی اس کا دوسرا بڑا خواب پورا ہوا۔ جب اس نے کرسٹوفر الیگزینڈر کو دیکھا۔
کرسٹوفر الیگزینڈر ایک ایسا ڈائریکٹر جس کی درجن بھر ایوارڈ یافتہ ڈاکومنٹری فلمیں وہ اپنے بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا اور اپنی فیلڈ میں اس کے لیے رول ماڈل تھا آج اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ وہ اس کے اتنے قریب کھڑا ہے۔ اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا۔
"انسان بے حساب کام کرتا ہے مگر اپنی زندگی میں شاہکار ایک ہی تخلیق کرتا ہے، جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

"جیسا کہ آپ کا شاہکار... فرسٹ برتھ آف [illegible]" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
کرسٹوفر الیگزینڈر مسکرا دیا۔ "ویل... مجھے لگتا ہے کہ میں اس سے بہتر کام بھی کر چکا ہوں مگر میری پہچان فرسٹ برتھ آف ڈیتھ ہی بنا۔"
"شاید آپ "وومن از دا بیسٹ کری ایشن آف اللہ" کی بات کر رہے ہیں۔"
"شاید نہیں یقیناً۔" کرسٹوفر الیگزینڈر نے بہت گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا اور اس کلاس ختم ہونے تک وہ اس کا پسندیدہ شاگرد ٹھہر چکا تھا۔ اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کے کام کے بارے میں ہر طرح کی معلومات رکھتا تھا اور تعریف کے علاوہ تنقیدی پہلوؤں پہ بھی اس کی بڑی گہری نگاہ تھی بلکہ اس لیے بھی [illegible] ہیرے کی پہچان کر چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج موسم بہت خوشگوار تھا۔ کچھ اس کا موڈ بھی اچھا تھا۔ کرسٹوفر الیگزینڈر نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا تھا۔ "نیویارک فلم اکیڈمی خوش قسمت ہے کہ تم جیسا ہیرا اس کے دامن میں گرا۔"
یہ اس کے لئے کوئی معمولی جملے نہ تھے بلکہ اپنے اندر اس کی کامیابی و کامرانی کی ضمانت تھے۔ وہ گنگناتا ہوا گھر کی طرف جا رہا تھا۔ جب اس نے ذواتا کو دیکھا جو مسز جانسن سے بات کر رہی تھی اور اس کے بے بی اسٹرالر میں بیٹھی ایک گول مٹول سی بچی ہر کسی کو [illegible] کا تحفہ پیش کر رہی تھی۔ دائم نے جھک کر اسے پیار کیا۔
"مسز جانسن کے تو بچے نہیں تو کیا یہ ذواتا اور جیمز کی بیٹی ہے؟" وہ الجھن میں تھا۔
اسے اس کے اپارٹمنٹ میں کسی بچے کی موجودگی کے آثار تو محسوس نہ ہوئے تھے۔ جیمز اور اس کے [illegible] سال پہلے علیحدگی ہو چکی تھی۔ یہ تو وہ جانتا تھا مگر ان کا کوئی بچہ بھی ہے یہ علم اسے نہ تھا۔
ذواتا مسز جانسن سے بات کر کے پلٹی تو اسے کیرن کے اسٹرالر کے پاس جھکے دیکھ کر اس کے ماتھے پہ بل آگئے۔
"السلام علیکم۔" سیدھا ہوتے ہوئے وہ مسکرایا۔
وہ خاموشی سے اسٹرالر تھام کر چل دی۔
"سلام کا جواب دینے پر آپ کو بھی نیکیاں ملیں گی۔" وہ بھی ساتھ ہی چلنے لگا۔
"جو شخص گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو چکا ہو، ایسی چھوٹی چھوٹی نیکیوں سے اس کے میزان کے پلڑوں میں برابری آنے والی نہیں۔" وہ اپنی عمارت کی لابی کے طرف جا رہی تھی۔
وہ رک گیا۔ بہت عظیم انقلاب آچکا تھا ذواتا کروبی کی زندگی میں۔ اس کی نگاہیں آگے جاتی ہوئی ذواتا کروبی کے ایرانی کوٹ پر تھیں اور سوچ اس کی بہت آگے جا پہنچی تھی۔

☼ ☼ ☼

مشہور برانڈ کا نیا کیم کورڈر اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔
اس کی دھڑکنوں میں تیزی تھی۔ چہرے سے جوش جھلک رہا تھا۔ آنکھیں ایک بڑا سپنا بن رہی تھیں۔ اور کانوں میں الفاظ گونج رہے تھے کرسٹوفر الیگزینڈر کے۔
"انسان بے حساب کام کرتا ہے مگر اپنی زندگی میں شاہکار ایک ہی تخلیق کرتا ہے۔ جو اس کی پہچان بن جاتا ہے۔" وہ مسکرا دیا۔
عیسائی اور یہودی متعصب نہ ہوں تو وہ آئندہ سال کے آسکر ایوارڈ کا حق دار تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ کیرن کو گود میں لیے بینچ پہ بیٹھے سامنے کھیلتے بچوں کو دیکھنے میں محو تھی، جب دائم آہستگی سے اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔ احساس ہونے پہ اس نے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر بچوں کی طرف متوجہ ہو گئی۔
"مجھے بھی بچے بہت اچھے لگتے ہیں۔" دائم کو پل میں اس کے آدھے نظر آتے چہرے کے تاثرات

تبدیل ہوتے محسوس ہوئے۔ خاموش وہ پھر بھی رہی تھی۔

”پہلے میں نے سوچا یہ آپ کی بیٹی ہے۔“ اس نے کیرن کے گال کو نرمی سے چھوتے ہوئے کہا۔ ”پھر میں نے سوچا کیرن تو شاید سال کی بھی نہیں جبکہ آپ اور جیمز کے بیچ تین سال پہلے طلاق ہو چکی ہے۔“

ذوا تا نے تیکھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

”بہت خبریں رکھتے ہو میرے بارے میں۔“

”ہاں۔۔۔ میری جنرل نالج بہت اچھی ہے۔“ اس نے اس کے طنزیہ لہجے کا ذرا برا نہ مانا۔

”تو پھر یہ سوچ لیتے کہ یہ میری اور میرے کسی بوائے فرینڈ کی بیٹی بھی ہو سکتی ہے۔“

”آج سے مہینہ بھر پہلے شاید میں ایسا سوچ سکتا تھا۔“

”کیوں۔۔۔ ایک مہینے میں تمہاری سوچ میں کیا فرق آگیا۔“

”یہ تو پتا نہیں۔۔۔ مگر آپ میں جو فرق آگیا‘ وہ دیکھ کر حیران ہوں۔ سچ پوچھیں تو آپ کو دیکھ کر پہلے پہل میں پہچان نہیں پایا تھا کہ آپ۔

women in islam Distinguished

(اسلام میں عورت کا درجہ) کی مصنفہ ہیں۔“

”اسلام میں عورت کا رتبہ“ کی مصنفہ کو اب میں بھی پہچان نہیں پائی کہ وہ میں ہی تھی۔“

دائم کو اس وقت وہ اس ہارے ہوئے انسان سی لگی جو اپنی متاع اپنے ہاتھوں سے لٹا چکا ہو۔ اور اب اپنے خالی ہاتھ تک رہا ہو۔ وہ اسے دیکھتا رہا اور وہ دور کہیں جانے کس غیر مرئی نکتے کو تکتی رہی۔ کیرن کی غوں غاں نے ان کی نگاہوں کے ارتکاز کو توڑا۔ وہ اسے گود میں لیے اٹھی اور اسٹرالر میں بٹھانے لگی۔

”آج کل آپ کیا لکھ رہی ہیں؟“ وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

”میں نے قلم توڑ دیا ہے۔“ اسے دیکھے بغیر جواب دیا اور پارک سے نکل گئی۔

وہ ایرانی حسن کی نظیر تھی۔ دیکھنے والا مبہوت ہو جاتا۔ شہد آگیں بڑی بڑی آنکھیں‘ جن میں حزن و ملال بسیرا کیے رکھتے‘ اداسی ڈیرا ڈالے رکھتی‘ نمی آباد رہتی۔

کھلے گلاب جیسے عارض‘ جو کبھی گلابی ہوتے تو کبھی سرخ۔

چھوٹی سی ناک میں ہیرے کی لونگ جگمگاتی رہتی۔

عنابی لب اک دوجے سے یوں جڑے رہتے جیسے کبھی ان کلیوں کے کھلنے کا ارادہ نہ ہو۔

باغی اور مرتد ذوا تا کروبی لوگوں کو بے حد حسین‘ بے انتہا مغرور اور دنیا کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھنے والی نظر آتی تھی مگر اب اس کا غرور‘ تمکنت اور وقار میں ڈھل گیا تھا۔ جس سے اس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ وہ ہزاروں کے بیچ بھی منفرد دکھائی دیتی‘ حالانکہ گھر سے باہر وہ ہمیشہ اپنے مخصوص حلیے میں دکھائی دیتی تھی۔

گھٹنوں سے نیچے آتا کوٹ جس کا رنگ زیادہ تر سیاہ ہوتا۔ سر پر ایرانی طرز کا اسکارف۔ اگر وہ اسے صرف گھر سے باہر دیکھتا تو کبھی اس کے بالوں کا رنگ اور ان کی لمبائی نہ جان پاتا۔ مگر اب وہ جانتا تھا کہ اس کے ریشم سے گیسو اس کی آنکھوں کے ہم رنگ ہیں‘ جو کہ اس کی کمر تک جاتے ہیں اور پھر ہلکا سا مڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔

باہر دیکھنے والے کو لباس میں اس کی جینز ہی نظر آتی تھی۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ زیادہ تر سفید‘ نیلی اور فیروزی رنگ کی سادہ یا چیک والی کالر شرٹس یا کالر شرٹس پہنتی ہے۔

آج بھی وہ پارک میں کیرن کے ساتھ اپنے مخصوص حلیے میں مخصوص جگہ پر بیٹھی تھی۔ اس کے انداز میں ایسی شان اور تمکنت تھی کہ اسے دل میں اقرار کرنا پڑا کہ اگر وہ ذوا تا کروبی کے ماضی سے واقف ہوتا تو اسے کسی سلطنت کی ملکہ سمجھتا۔ وہ آہستہ چلتا ہوا اس کے پاس آکر بیٹھ گیا۔

”کیرن کو تم نے ایڈاپٹ (گود لینا) کر لیا ہے کیا؟“

وہ اب اس کی ڈھٹائی کی عادی ہوتی جا رہی تھی اس لیے اسے دیکھ کر ماتھے پر بل ڈالنا چھوڑ دیے تھے۔

”الزبتھ بوڑھی ہو چکی ہے‘ بے چاری خود کو سنبھالے یا کیرن کا خیال رکھے۔ اس کا ساتھی مرد بھی بد مزاج ہے۔ کئی دفعہ کیرن کو اٹھا کر باہر پھینک چکا ہے اور وہ اکیلی باہر بیٹھی بلبلاتی رہتی ہے۔ اس لیے اکثر میں اسے اٹھا کر لے آتی ہوں۔ اس کو کھلا پلا دیتی ہوں‘ نہلا کر کپڑے تبدیل کر دیتی ہوں‘ تھوڑا کھیل لیتی ہوں۔۔۔ اس سے الزبتھ کا بوجھ بھی ہلکا ہو جاتا ہے اور میرا دل بھی بہلا رہتا ہے۔“

”شاید اس میں تمہیں اپنی بیٹی نظر آتی ہے۔“

”شاید نہیں یقیناً“۔“ وہ مسکرائی۔

دائم نے محسوس کیا۔ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بڑی اجنبی سی لگتی تھی۔

”کیرن کے پیرنٹس کہاں ہوتے ہیں۔“

”باپ کا تو پتا نہیں۔ ماں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی ہے۔“

دائم نے تاسف سے سرہلاتے ہوئے بچی کی طرف دیکھا۔ جس کو ابھی اپنے وجود کے اتنا ارزاں ہونے کا احساس نہ تھا۔

”یہ وہ آزادی ہے دائم! جو مسلمان معاشرے کی عورت کو اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ جب اس کا اپنے ماحول میں دم گھٹتا ہے تو وہ مغرب کی عورت کی آزادی پر رشک کرتی ہے۔ جہاں عورت اور مرد کو برابری کے حقوق حاصل ہیں۔ مگر کیسی برابری دائم۔۔۔ کمائی میں برابری‘ بے حیائی میں برابری۔۔۔ کاش ہماری عورت سمجھ جائے‘ یہ برابری عورت کو کتنا نیچا کر دیتی ہے۔ کس پستی میں گرا دیتی ہے۔“

دائم کو محسوس ہوا‘ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی ہے۔ جس کو وہ پلکیں جھپک جھپک کر ختم کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ بہت غور سے ”اسلام میں عورت کا درجہ“ کی مصنفہ کو دیکھ رہا تھا۔ اسے اس نکتے کی تلاش تھی‘ اس نے ذوا تا کروبی کی زندگی کی کایا پلٹ دی تھی۔

☼ ☼ ☼

”بہت مصروف ہو گئے ہیں آپ۔۔۔ فرصت ہی نہیں ہوتی آپ کے پاس کہ میری کال اٹینڈ کر سکیں۔“ وہ اس کے طنزیہ لب ولہجہ پہ مسکرا دیا۔ یہ ”آپ جناب“ والی بولی وہ اس کے ساتھ بگڑے تیوروں میں ہی بولتی تھی۔

”میں تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔“ لاک کھول کر گھر میں داخل ہوتے اس نے وضاحت دی۔

”فون کرنا تو دور کی بات‘ اٹھانا ہی دوبھر لگتا ہے شاید تمہیں اب۔“

”اتنا غصہ۔۔۔ اتنا غصہ۔۔۔ میں تمہیں بتا بھی چکا ہوں کہ مجھے تم ہنستی ہوئی زیادہ پیاری لگتی ہو۔“

”تو کام بھی ایسے کیا کرو ناں کہ میں ہنستی رہا کروں۔“ وہ اور جلی۔

”اچھا مثلاً“۔۔۔ ہاتھ میں پکڑے شاپرز کاؤنٹر پہ رکھتے ہوئے اس نے مزید جی جلایا۔

”یہ بھی میں تمہیں بتاؤں؟ نکاح کروانے کا شوق تھا بس بیوی کو کیسے خوش رکھتے ہیں‘ یہ خبر نہیں۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”یہ اتنی مرچیں کیوں چبا رہی ہو۔۔۔ اتنے دنوں بعد بات کر رہے ہیں۔ میٹھی میٹھی باتیں کرو۔“ فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے اس نے اس کا پارہ نیچے کرنے کی کوشش کی۔

”اتنے دنوں بعد بات کر رہے ہیں تو اس میں دوش میرا نہیں۔ آپ ہی بڑے مصروف ہوتے ہیں۔“

”صحیح کہہ رہی ہو۔۔۔ مصروف تو بہت ہوتا ہوں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تمہاری یاد نہیں آتی۔ دن ہو یا رات‘ گھر کے اندر ہوں یا باہر‘ تمہاری ہی یاد ستاتی ہے۔“

”اچھا اچھا بند کرو یہ ڈائیلاگ۔ صاف پتا چل رہا ہے‘ کسی فلم کے چرائے ہوئے ہیں۔“ وہ مزید چڑی تھی۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دیا۔

”ویسے آج کل کیبل مجھ پہ مہربان ہو رہی ہے۔“ وہ اس کو ستانے کے موڈ میں آگیا تھا اور وہ واقعی جل بھن کر کوئلہ ہو رہی تھی۔ پھر تو اس نے کال ہی منقطع کر دی۔ دائم نے مسکراتے ہوئے نمبر ملایا۔ جو اس نے

بار بار کاٹنے کے بعد چوتھی بار اٹھایا۔

"مجھ پر کیوں وقت ضائع کر رہے ہو... جا کر وقت گزارو اپنی اس مہربان کے ساتھ۔"

"گزار لیتا وقت... اگر وہ میری حدیقہ سے اچھی ہوتی۔"

"اور اگر کوئی حدیقہ سے اچھی مل گئی تو کیا..."

"حدیقہ سے اچھی کوئی نہیں۔" اس نے اتنے وثوق سے کہا کہ حدیقہ ساری کوفت، ساری خفگی بھول گئی اور دلفریب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ آ کر ٹھہر گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ آج گرین مارکیٹ آیا تھا ہفتہ بھر کی سبزیاں اور پھل لینے۔ ایک اسٹال پر اسے زواتا کروبی کھڑی نظر آئی تو اس کی طرف بڑھ آیا۔

"السلام علیکم۔"

وہ ہلکا سا مسکرا کر پھر سے اسٹال پر سجی گاجروں کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"واہ... تم تو کیرن کی طرح خوش اخلاق ہو گئی ہو۔" اس کی مسکراہٹ دیکھ کر اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ وہ پھر مسکرا دی۔

دائم بھی اپنی پسند کی سبزیاں لینے لگا۔ اس اسٹال سے اپنی خریداری مکمل ہونے کے بعد زواتا اپنے بیگ سے بٹوہ نکالنے لگی۔ لیکن جب تک اس نے بٹوے سے پیسے نکالے، دائم ادائیگی کر چکا تھا۔ زواتا نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا اور خاموشی سے سبزیاں لے کر گرین مارکیٹ سے نکلنے لگی۔ وہ بھی پھل خریدنے کا ارادہ ترک کر کے اس کے پیچھے چلا آیا۔

"آئندہ ایسی حرکت مت کرنا۔" اس کے لہجے میں ناگواری صاف محسوس کی جا سکتی تھی۔

"کیسی حرکت؟" وہ انجان بن کر پوچھ رہا تھا۔

"تم نے اسٹال پر ادائیگی کیوں کی؟"

"اچھا! تم اسے حرکت کہہ رہی ہو۔ ہم اسے مردانہ وصف کہتے ہیں۔" وہ ہنسا۔ زواتا چپ سی ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

"ایسا کرو اگر تم قرضہ اتارنا ہی چاہتی ہو تو ایک کپ کافی پلا دو مجھے۔" دائم نے اس کی طرف ہاتھ بڑھا کر بھاری شاپرز اس کے ہاتھ سے لینے چاہے، مگر اس نے ہاتھ پرے کر لیے۔

"تو تمہارے مردانہ اوصاف کافی ہاؤس میں مجھے بل ادا کرنے کی اجازت دیں گے؟" اس کا لہجہ طنزیہ تھا، جبکہ وہ محظوظ ہو کر ہنس دیا۔

"تو کافی ہاؤس جانے کی بات کون کر رہا ہے۔"

"سوری... میں ایک اجنبی کو اپنے گھر نہیں لے جا سکتی۔" وہ قطعی انداز میں کہتے ہوئے آگے بڑھنے لگی۔

"ایک اجنبی خاموشی کے ساتھ آپ کے ساتھ ساتھ تو چل سکتا ہے نا۔"

وہ بولا تو زواتا کوئی جواب دیے بنا چلتی رہی۔ وہ دونوں گرین مارکیٹ سے نکل آئے۔

"کافی۔" دائم نے ایک کیفے ٹیریا کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے متذبذب ہوئی، پھر اس کے ساتھ چلی آئی۔

"تم جانتے ہو یہ مردانہ اوصاف صرف مسلمان مردوں میں ہوتے ہیں۔" وہ دونوں باہر رکھی کرسیوں پر آ بیٹھے۔ کچھ دیر بعد اسے زواتا کی آواز سنائی دی تھی۔ سڑک پہ نظریں جمائے اس سے مخاطب تھی۔

دائم نے اپنی گھڑی کا رخ نامحسوس طریقے سے اس کی طرف کر دیا۔

"یہاں اگر میاں، بیوی بھی اکٹھے کھانا کھانے جائیں تو دونوں کو اپنا اپنا بل خود ادا کرنا ہوتا ہے۔ اور اگر کچھ مہذب ہوں تو اپنی باری رکھ لیتے ہیں کہ ایک دفعہ ،، تو اب بل ادا کریں گے۔"

"ہاں میں دیکھتا ہوں، یہاں عورت پر بھی اتنی معاشی ذمہ داریاں ہیں جتنی کہ مرد پر۔" وہ متفق ہوا۔

"جبکہ اسلام میں ایسا نہیں۔ اللہ نے تو عورت کو گھر کی ملکہ بنا دیا۔ مرد محنت کرتا ہے، کماتا ہے، گھر

بیوی، بچوں کے ناز نخرے اٹھاتا ہے، ان کی خواہشیں پوری کرتا ہے۔ تمام معاشی ذمہ داریاں اسی کے سر ہوتی ہیں۔ اسی لیے تو اسلام میں بیٹے کا وراثت میں دگنا حصہ رکھا گیا ہے۔" یہ وہ اعتراض تھا جس پہ زواتا کروبی نے اپنی کتاب میں پورا ایک باب تحریر کیا تھا۔ آج وہ خود ہی اس کا جواب دے رہی تھی۔ بھاپ اڑاتی کافی کے مگ دونوں کے سامنے یوں ہی رکھے تھے۔

"ویسے بھی یہ توازن آگے چل کر واضح ہو جاتا ہے۔ بیٹی بیاہ کر اگلے گھر جاتی ہے تو اس کا شوہر وراثت میں دو حصے رکھتا ہے۔ اس طرح بیٹے کے گھر جو لڑکی بیاہ کر آتی ہے، وہ ایک حصے لے کر آتی ہے۔ یوں میاں، بیوی کے حصے ملا کر توازن قائم ہو جاتا ہے۔ اور ہم چیختے رہتے ہیں کہ عورت کے ساتھ زیادتی ہو گئی، بے انصافی ہو گئی، اور بات کرتے ہیں عورت مرد کی برابری کی۔ حالانکہ عورت مرد کی برابری کی بحث ہی غلط ہے۔ کیونکہ بات عورت مرد کی نہیں بات رشتے کی ہے۔ جب عورت ماں ہے تو وہ اس کا مقام اعلا ہے۔ جب مرد، شوہر ہے تو وہ عورت سے زیادہ اختیار رکھتا ہے۔ جب بات اولاد کی ہے تو بیٹا اور بیٹی برابری میں آ جاتے ہیں۔"

دائم حیرانی سے دیکھ رہا تھا۔ زواتا کروبی ان سوالوں کے جواب دے رہی تھی، جو اس نے اپنی کتاب میں اٹھائے تھے۔

☼ ☼ ☼

منیب حسن کی فطرت سے سب ہی بخوبی واقف تھے پھر بھی جب انہوں نے اپنا مطالبہ عالم مرتضیٰ کے سامنے رکھا تو کچھ پل کے لیے سب سناٹے میں آ گئے۔ اگر مہرتاب کو خبر ہوتی کہ منیب حسن وہاں جا کر ایسی باتیں کریں گے تو وہ انہیں روکنے کی، سمجھانے کی کوشش کرتیں۔ یہ اور بات کہ وہ آج تک نہ کسی کی سمجھتے تھے، نہ مانتے تھے۔ اور اب مہرتاب سوچ رہی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ نہ آئی ہوتیں۔ کم از کم اس شرمندگی سے تو بچ جاتیں جس نے اب نظریں اٹھانے کے قابل نہ چھوڑا تھا۔

"میرا سب کچھ حدیقہ کا ہی تو ہے۔" عالم مرتضیٰ نیچی آواز میں کہہ رہے تھے جبکہ رومانہ کے لبوں پہ بچی طنزیہ مسکراہٹ پہ عفت پہلو بدل کر رہ گئیں۔ سوتن کے سامنے ان کا مان مٹی میں ملا دیا تھا، ان کے بھائی نے ایک چھوٹی بات کر کے۔ اور یہاں تو بات صرف میکے کی شان کی نہ تھی بیٹی کے سسرال کے بھرم کی بھی تھی۔ اور مہرتاب اپنی جگہ اس بات سے ڈر رہی تھی کہ اگر حدیقہ یا دائم میں سے کسی کو پتا چلا کہ منیب حسن نے حدیقہ کا حصہ اس کے نام لگانے کا مطالبہ کیا ہے تو ان کا رد عمل کیا ہو گا۔ پہلے بھی دائم بہت خفا ہوا تھا۔ انہوں نے ڈرتے ڈرتے واپسی پہ انہیں جتا بھی دیا۔

"تو کیا غلط بات کہہ دی میں نے۔ پہلے کیا کچھ نہیں لگا چکا وہ اس عورت کے نام۔ اب اس عمر میں پھر باپ بننے کا شوق چرایا ہے۔ بیٹا ہوا تو دگنا حصہ تو وہ لے جائے گا۔" مہرتاب نے اس وقت اللہ کا شکر ادا کیا کہ ان کے بچے اس معاملے میں اپنے باپ پر نہیں گئے تھے۔

"دائم کو پتا چلا تو وہ..."

"اس کا تو دماغ خراب ہے۔ میرے نام نہیں لگنی یہ ملیں، میں نے قبر میں نہیں لے جانا یہ پیسہ... اسی کے بہتر مستقبل کی تدبیر کر رہا ہوں۔ جو پیشہ اس نے چنا ہے، اس میں جان مارنی پڑتی ہے، پھر کہیں جا کر پہچان بنتی ہے۔ ایک گرینڈ پرائز حاصل کر کے وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہے۔" وہ شروع ہو چکے تھے اور مہرتاب کے پاس سننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ بے تحاشا رو رہی تھی۔ دائم کا دل جیسے اس کے آنسوؤں نے جکڑ لیا ہو۔ اس نے کیم کورڈر پیچھے کر لیا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ بھاگ کر جائے اور زواتا کروبی کے آنسوؤں کو پونچھ لے۔ ساری رات بے چینی میں گزری۔

آنکھیں موندتا تو وہ سامنے آجاتی۔ روتی ہوئی، سسکتی ہوئی۔

صبح وہ کیمپس جانے کے لیے بے دلی سے تیار ہوا اور جب باہر نکلا تو قدم خود بخود بس اسٹاپ کے بجائے ذوا تا کروبی کی عمارت کی طرف بڑھ گئے۔ وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔

"آج میں بہت اداس ہوں، گھر کی اور گھر والوں کی یاد آرہی ہے۔ سوچا ایک دوست کے ساتھ یہ اجنبی ایک کپ چائے ہی پی لے، کچھ تو تنہائی دور ہوگی۔" وہ لہجے کو بشاش بناتے ہوئے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

وہ مزید حیران ہوئی اور پھر خاموشی سے پلٹ گئی۔ وہ اس کے پیچھے چلا آیا۔ آج شاید وہ واقعی کسی دوست، کسی ہمدردکی ضرورت محسوس کررہی تھی اور اتنا تو وہ جان ہی چکی تھی کہ دائم منیب اس کا دشمن نہیں ہوسکتا۔ وہ کچن کی طرف بڑھ گئی۔ دائم کاؤنٹر کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"کیا لوگے کافی یا چائے؟" اس نے پوچھا۔ وہ اس وقت سفید پینٹ کے ساتھ نیلی اور سفید دھاریوں والی کالر شرٹ میں ملبوس تھی۔ سر پر سفید اسکارف تھا۔ رویا رویا گلابی چہرہ رت جگے کی داستان سنا رہا تھا۔

"چائے.... مگر خالی چائے نہیں ساتھ ناشتا بھی، اس کے بغیر میرا گزارا نہیں۔"

ذوا تا نے اس کی طرف دیکھا اور فریج سے ڈبل روٹی نکالنے لگی۔

"ہم ناشتا اکٹھا کریں گے۔"

"میں صرف کافی کا کپ لیتی ہوں اور وہ لے چکی ہوں۔"

"اس کی آنکھوں میں نمی سی اترنے لگی تھی۔

"میں اپنی تنہائی سے گھبرا کر تو تمہاری طرف آیا ہوں، تم ساتھ نہیں دوگی تو فائدہ۔" دائم نے دانستہ اپنے لہجے کو بشاش بنایا اور ڈبل روٹی اور انڈے کی پلیٹ اس کے سامنے رکھی۔

"جس کے ساتھ اتنے رشتے ہوں وہ تنہا نہیں ہوتا دائم!"

"رشتہ تو تمہارے پاس بھی ہے، پھر بھی تم اکیلے روتی ہو۔"

اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ محض ایک پل کے لیے وہ بھی گڑبڑایا، پھر سنبھل گیا۔ "تمہاری آنکھیں بتا رہی ہیں کہ تم روتی رہی ہو۔" اسے بروقت بات بنانی آگئی تھی۔

اس کی گلابی آنکھوں کی سطح پھر آبی ہونے لگی۔ وہ رخ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ وہ اٹھ کر اس کے سامنے آیا۔ اس کی آنکھوں میں ساون بھادوں کی جھڑی لگی ہوئی تھی۔

"تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کس رشتے کی بات کررہا ہوں، خاکسار دائم منیب جیسے سچے اور مخلص دوست کی بات کررہا تھا۔"

وہ آنسو صاف کرتے ہوئے مسکرادی۔

"یہاں بیٹھو ذوا تا!" اس نے کاؤنٹر کے پاس رکھی دوسری کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ وہ خاموشی سے آبیٹھی۔

"اب بتاؤ.... تم روئی کیوں ہو؟" اس کا نرم دوستانہ لہجہ ذوا تا کو وجہ بتانے پہ مجبور کرگیا۔

"دائم! روشنک کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے، وہ اسپتال میں ہے۔" وہ ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رودی۔ ایک ثانیے کے لیے وہ چپ سادھ گیا۔

"تمہاری اس سے بات ہوئی؟" وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"ماہ یار نے۔"

اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ کون سے لفظوں کا سہارا لے کہ ایک ماں کو قرار مل جائے۔

"میں نے دونوں جہانوں میں اپنے لیے جہنم خود چنی ہے.... اب مجھے جلنا تو ہے۔" وہ تڑپ رہی تھی، سسک رہی تھی۔

اس نے اپنی گھڑی کا رخ اس کے آنسوؤں سے ... کی طرف کردیا۔

✡ ✡ ✡

میرا باپ امیر کروبی بو علی سینا یونیورسٹی میں فزکس کا پروفیسر تھا۔

وہ بہت مذہبی تھا مگر صرف عورت کے لیے۔ وہ پڑھا لکھا بندہ یہ تو جانتا تھا کہ بیوی بیٹی کو سر تاپا ڈھانپ کر سات پردوں میں چھپا کر رکھنا ہے، مگر اسے یہ معلوم نہ تھا کہ بیوی کو عزت بھی دیتے ہیں۔ وہ پیر کی جوتی سے زیادہ اوقات بھی رکھتی ہے۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ بیٹی رحمت ہے، اللہ کا عطا کردہ نایاب تحفہ ہے۔ اس کے سر پر کبھی ہاتھ بھی رکھتے ہیں۔ اس سے پیار کے دو بول بھی بولتے ہیں۔

وہ یہ تو جانتا تھا کہ اس کی بیوی بیٹیوں پہ بیٹیاں پیدا کرنے کا سنگین جرم کررہی ہے مگر یہ نہ جانتا تھا بیٹا یا بیٹی مرد کی قسمت سے ہوتے ہیں۔

وہ مذہب کے احکامات صرف عورت پر لاگو کرتا چاہتا تھا۔ شوہر کے حقوق اسے بڑی اچھی طرح یاد تھے، بیوی کے فرائض اسے ازبر تھے۔ باپ کا مقام کے تمام ... اس نے رٹ رکھے تھے مگر بحیثیت شوہر اور باپ ... فرائض کے اسباق اسے بھولے سے بھی یاد نہ ...

... بیوی کو مارنا پیٹنا ہے، بیٹی پر ہاتھ اٹھانا ہے، انہیں ... کہہ کر دھتکارنا ہے۔ یہ سب کرتے وقت اسے ... بھول جاتا کہ اس بارے میں اسلام کیا کہتا ہے۔ تب ... فراموش ہوجاتا کہ وہ مسلمان ہے۔

... بیٹیوں کے بعد میری ماں نے امیر کروبی کے لیے ... اکر دیا مگر اپنی جان کا نذرانہ دے کر۔ اب باپ کی تمام تر توجہ و محبت کا مرکز اس کا بیٹا، اس کا وارث رہ ... جس نے اس کی نسل چلانی تھی۔ ہم بیٹیاں تو جیسے اس کے سینے پہ دھرا بوجھ تھیں۔ مجھے نہیں یاد پڑتا، ... کبھی ہم پہ ایک پیار بھری نگاہ بھی ڈالی ہو۔ ... صورت سے بھی اسے نفرت تھی جیسے۔

... بڑی بہن اسوہ ابھی تیرہ سال کی بھی نہ ہوئی تھی کہ اس نے اس کا نکاح ایک ساٹھ سالہ مرد سے کر دیا۔ اس کی نظر میں اس کی بچی بالغ ہوچکی تھی اور ولی کی حیثیت سے وہ اس بوجھ کو اٹھا کر پھینک سکتا تھا۔ جب اس آدمی کی عمر پر خاندان والوں نے باتیں کیں تو اس نے بہت آرام سے مذہب سے اس کی مثالیں دے دیں۔ وہ بڑے آرام سے ان اعلا اور عظیم ہستیوں سے اس گھٹیا شخص کا موازنہ کرڈالتا۔ اسے اسلام اپنے مطلب کا ہی سمجھ آتا تھا اور میں اس کے دکھائے گئے آئینے میں اسلام دیکھتی رہی۔

دوسرے نمبر والی بہن بہاراں کو اس نے اپنے ہی جیسے ایک ذہنی مریض فتح ثانی کے ساتھ بیاہ دیا، جو اس سے بھی چار ہاتھ آگے تھا۔ وہ اسے لاتوں اور مکوں پہ رکھتا اور بات بات پر روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا۔ وہ شرابی جواری بھی تھا۔ شادی کے سال بھر بعد اس نے کسی بات پر طیش میں آکر اسے تین طلاقیں دے ڈالیں۔ میری بہن آگے کی رہی نہ ہی پیچھے کی۔ میرے باپ کا بس چلتا تو اس کے لیے تمام دروازے بند کردیتا، مگر دنیا کو بھی منہ دکھانا تھا۔ میری بہن کے لیے شوہر کا یا باپ کا گھر ایک جیسا ہی تھا۔ وہاں بھی اسے سانس لینی تھی، یہاں بھی موت کا انتظار کرنا تھا۔ مگر موت اتنی اذیت ناک ہوگی، اس کا اندازہ اسے نہ تھا۔

ایک دن میرے باپ نے اچانک یہ مژدہ سنایا کہ وہ بہاراں کا نکاح کررہا ہے۔ ہم سب اس کا گھر پھر سے بس جانے پہ مطمئن تھے اور دعا گو تھے کہ اب اس کی قسمت میں بہتر شخص لکھا ہو۔ شادی کے ایک ہفتے بعد جب وہ گھر لوٹی تو اس کا کھلا کھلا چہرہ، اس کی چمکتی آنکھیں دیکھ کر ہمیں لگا کہ ہماری دعا قبول ہوگئی۔ وہ بہت خوش تھی۔ بات بات پر تبسم اس کے لبوں پہ بکھر بکھر جاتا اور ہم اس کو دیکھ کر خوش تھے۔ "مگر.... مگر...."

اس کا گلا رندھ گیا اور وہ رک گئی۔ اسے لگا، وہ آگے ایک لفظ نہ بول پائے گی۔ اس کی شہد رنگی آنکھوں میں غم یوں اتر آیا کہ دائم منیب کا جی چاہا وہ اب کچھ نہ بولے۔ کچھ یاد نہ کرے۔ جو کچھ بھی ہوا، وہ سب کچھ

بھول جائے۔ ماضی کا ٹکڑا کسی قینچی سے کتر کر اس کی زندگی سے الگ کر ڈالے۔ مگر انسان کے پاس ایسے اختیارات کب ہوتے ہیں۔

"دائم! جانتے ہو پھر کیا ہوا۔۔۔ اگلے دن میری بہن نے خودکشی کرلی۔"

دائم نفی میں سر ہلا کر رہ گیا۔ وہ اپنی آنکھیں میچ کر اپنے لب بھینچ کر ضبط کی کوشش کرنے لگی مگر ناکام رہی۔ آنسو ہر بند توڑ بیٹھے۔

"جانتے ہو اس نے ایسا کیوں کیا۔۔۔ کیونکہ اس کے دوسرے شوہر نے سات دن اسے کسی جنت میں رکھ کر طلاق دے دی تھی۔ امیر کروبی اور فتح ثانی نے مل کر یہ منصوبہ تیار کیا تھا اور اس کی دوسری شادی حلالہ کی نیت سے کروائی تھی۔ اس کے دوسرے شوہر نے یہ سب کسی لالچ میں کیا' یا دباؤ میں' کسی کو خبر نہ ہوئی مگر بہاراں یہ زیادتی برداشت نہ کرپائی اور چلی گئی اس دنیا سے۔"

وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ دائم نے اسے چپ نہ کروایا اور بہت دقت سے اس کے لرزتے وجود سے نظریں ہٹا کر اسے کھل کر رونے دیا۔ وہ چاہتا تھا' اسے اپنے ماضی پہ جتنے آنسو بہانے ہیں' سب آج بہا ڈالے اور پھر آنسو کبھی اس کا مقدر نہ بنیں۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔

"باپ کے سارے جراثیم بہرنگ میں بھی تھے۔ وہ بے حد بدمزاج تھا۔ ہم بہنوں کا کام بھائی کو پالنا' اس کے ناز نخرے اٹھانا' اس کی بدتمیزیوں کو ہنس کر سہنا رہ گیا۔ میری بہنوں کو تو شاید اس کی عادت ہوگئی تھی مگر اسی ماحول میں پیدا ہونے' اسی میں پلنے بڑھنے کے باوجود میں عادی نہ ہوسکی۔ میرے اندر بغاوتی جراثیم شروع سے رہے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا اپنے باپ کو زہر دے دوں' اپنے بھائی کو سڑک پر چلتے ہوئے کسی گاڑی کے آگے دھکا دے دوں' خود کو آگ لگالوں یا پھر اس گھر سے بھاگ جاؤں۔

اور پھر میری آخری خواہش پوری ہوگئی۔

ماہ یار محسنی میرے والد کا شاگرد تھا۔ وہ اکثر ان سے ملنے گھر آتا تھا۔ اس کے نرم خو لہجے نے مجھے اپنی طرف مائل کیا اور پھر میرے اور اس کے بیچ دل کا رشتہ پنپنے لگا۔ میں اپنی دونوں بہنوں کا حال دیکھ چکی تھی اور اپنے ساتھ ایسا کچھ ہونے سے پہلے فیصلہ کرلینا چاہتی تھی۔ امیر کروبی کو میرے اور ماہ یار کے بیچ تعلق کا علم ہوا تو اس نے ایک ہنگامہ برپا کردیا۔ مجھے مارا پیٹا اور قید میں ڈال دیا۔ میں اپنی ماں اور باقی بہنوں کی طرح صابر نہیں تھی' اس لیے مزید اس کا ظلم برداشت کرنے سے انکار کردیا اور ماہ یار کے ساتھ نکاح کرلیا۔ میرے باپ نے مجھ سے ہر تعلق توڑ لیا۔ میری وجہ سے دوسری بہنوں کی زندگی میں امتحان کچھ اور بڑھ گئے' مگر ان کے لیے میں اپنے باپ کو موقع تو نہیں دے سکتی تھی نا کہ وہ اسوہ اور بہاراں کی طرح میری زندگی بھی برباد کر دے۔

ماہ یار ابھی اپنی تعلیم مکمل کر رہا تھا اس لیے پارٹ ٹائم نوکری کرنے پہ مجبور تھا۔ ایسے میں' میں نے اس کا ساتھ دیا۔ میں ایک لکھاری تھی۔ میرے قلم نے اس کے مشکل دنوں میں اس کا ساتھ دیا "اسلام میں عورت کا درجہ" سے پہلے میری جو چار کتابیں شائع ہوئیں۔ وہ اسی عرصہ کی بات ہے' جب ماہ یار مجھ پر انحصار کرتا تھا۔

ان ہی دنوں میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ اپنی زندگی میں ہی وہ اپنی جائیداد کا بڑا حصہ بہرنگ کے نام کر گئے تھا۔ باقی ماندہ روپے و جائیداد ہم بہن بھائی میں ہوئی تو بھی ہم بہنوں کو ایک ایک حصہ ملا جبکہ اسے دوگنا حصہ ملا۔ پہلے ہی باپ نے ساری عمر بیٹے کو نوازا پھر اسلامی قانون کے مطابق بھی وہ ہم سے زیادہ حقدار ٹھہرا۔ مجھے اسلام میں یہ تقسیم ۔۔۔ اچھی نہ لگی۔

تعلیم مکمل ہونے کے بعد ماہ یار کو اچھی نوکری ملی اور ہمارے اچھے دن شروع ہوگئے' مگر یہ اچھا وقت بہت کم عرصہ پہ محیط تھا۔ روشنک ابھی تین ماہ کی تھی کہ ماہ یار کی زندگی میں لالے آگئی۔ ماہ یار کے رویے میں آتی تبدیلی میں محسوس تو کر رہی تھی مگر اس کا گمان نہ ہوئی تھی۔

میں نے جتنا ٹوٹ کر اسے چاہا' اتنی ہی محبت کا میں خود کو بھی حق دار سمجھتی تھی۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ مجھ سے بے وفائی کرے گا اور جب اس نے ایسا کیا اور لالے کو دل کے سنگھاسن پہ بٹھا کر مجھے کسی پرانے سامان کی طرح ایک کونے میں پھینک دیا تو میرے اندر ایسی آگ بھڑکی' جو سب کچھ جلا کر خاکستر کرنا چاہتی تھی۔

وہ میرے سامنے اس کے ساتھ رہتا' ہنستا بولتا اور ہنستا ہنساتا۔ اس وقت اسے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ کبھی وہ میرے ساتھ بھی یہی وقت گزار چکا ہے۔ وہ میرے باپ کی طرح مجھے گالیاں نہ دیتا تھا' مار تا پیٹتا نہ تھا مگر وہ میرے جذبات کے ساتھ کھیلتا' اس کی تکلیف' اس کی اذیت اس ظلم سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ وہ مجھے اور روشنک کے تمام حقوق بھلا کر لالے کے ساتھ اپنی زندگی میں مگن تھا۔ وہ اپنی ذمہ داریوں اور ہم دونوں سے قطعی لاتعلق ہوگیا۔ ہمارا نان نفقہ ادا کرنا چھوڑ دیا۔

میں نے ماہ یار کا ہر سلوک ہر رویہ برداشت کیا بلکہ بہت برداشت کیا مگر پھر حد ہوگئی۔ وہ تیری بیوی اٹھا ... لگا اب اگر میں ایک منٹ بھی اس گھر میں رہی تو میرے دماغ کی شریان پھٹ جائے گی۔

کچھ غم ایسے ہوتے ہیں جو حلال و حرام کا فرق بھلا دیتے ہیں۔ انسان کی سوچ پر شیطان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ وہ خود کچھ سوچنے جوگا رہتا نہیں۔ اس کے ذہن کی سلیٹ پر ابلیس تحریر کرتا ہے اور انسان پڑھ کر عمل کرتا ہے۔ جب شیطان انسان کے نفس پر قابض ہو جاتا ہے تو منفی خیالات اس کے ذہن کی آماجگاہ بن جاتے ہیں۔

میں شیطان کے نرغے میں بری طرح پھنس چکی تھی۔

اپنی بہنوں اور اپنی زندگی پر نگاہ کرتی تو عورت مرد کی جوتی کے سائے تلے سانس لیتی نظر آتی۔

مذہب میں مرد کے لیے بہت نرمی تھی' رعایت تھی' گنجائش تھی اور عورت کے لیے پکڑ ہی پکڑ تھی۔۔۔

مرد کو چار چار شادیاں جائز۔ عورت شوہر کے علاوہ کسی اور کی طرف دیکھ بھی لے تو بے حیا' بدچلن۔۔۔

جائیداد میں بیٹے کے دو حصے اور بیٹی کا ایک حصہ۔۔۔

عورت کی گواہی آدھی۔۔۔

طلاق کا حق صرف مرد کے پاس۔ جس سے وہ عورت کی جان کھینچ کر رکھتا۔۔۔

مرد کو عورت پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت۔۔۔

حلالہ کے لیے عورت کا امتحان۔۔۔

اب سب حقائق کو اگر آنکھوں پر شیطان کی چڑھائی عینک لگا کر دیکھو' اگر ذہن کو اس کے تابع کر کے سوچو تو عورت کے اندر وہی سوچ جنم لیتی ہے' جو میرے اندر پیدا ہوئی۔

ماہ یار سے میں نے طلاق لینی چاہی تو اس کے لیے بھی اس نے مجھے خوب رولا' مگر میں اب اس کے منہ پر تھوکنا بھی نہ چاہتی تھی۔ اس کے ساتھ رہنا تو ناممکن تھا۔ خلع کے لیے مجھے عدالت جانا پڑا۔ وہاں ماہ یار نے میرے کردار پر کیچڑ اچھالی۔ اگر میرے پاس بھی طلاق کا حق ہوتا تو میں اتنی خوار و رسوا نہ ہوتی۔ تب مجھے لگا کہ اللہ نے عورت کو مرد کی پسلی سے نہیں' اس کی جوتی سے پیدا کیا ہے۔

"میرے دل سے ماہ یار کی محبت ختم ہوئی اور پھر ۔۔۔ مذہب کی بھی اور۔۔۔ اللہ کی بھی۔"

میرے اندر کی آگ ایسی بھڑکی' جو بجھنے والی نہ تھی۔ میں ایک لکھاری تھی۔ اپنے اندر کی سرکشی کو قلم کے ذریعے باہر نکال ڈالا۔ لفظوں کی اس آگ کو بجھایا اور "اسلام میں عورت کا درجہ" لکھ ڈالی اور آدھی دنیا کی تھو تھو اور آدھی دنیا کی واہ واہ سمیٹی۔ مجھے کسی شے کی پروا نہ تھی۔ اس وقت مجھے لگتا تھا کہ میں حق سچ کی علمبردار ہوں۔ یہ بھول بیٹھی کہ اندر کی آگ بجھانے کے لیے اپنے پورے وجود کو نار جہنم میں جھونک ڈالوں گی۔

سلمان رشدی اور تسلیمہ نسرین کی طرح مجھ پر بھی کفر کا فتویٰ لگ گیا، مجھے ملک بدر کر دیا گیا۔ کئی ممالک سے مجھے مذہبی پناہ کی پیشکش ہوئی۔ میں نے امریکہ آنا پسند کیا۔ یہاں میری بہت پذیرائی ہوئی۔ میری کتاب کو کئی ایوارڈ بھی ملے۔ ان دنوں مجھے حق و باطل کی تمیز اس حد تک بھول گئی تھی کہ میں سراپا شیطان بن گئی۔

جہاں تک بات تھی اپنی بیٹی کی تو وہ صرف میری بیٹی تو نہ تھی، پھر میں کیوں اسے پالتی۔ ماہ یار سکون سے اپنی بیویوں کے ساتھ رہتا اور میں اس کی اولاد پالتی پھرتی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں نے روشنک کو اس کے پاس چھوڑ دیا۔ میں تو ان دنوں سراپا نفرت بن گئی تھی۔ میں نے روشنک کے وجود کو یکسر فراموش کر دیا اور بس اپنے جذبہ نفرت اور سرکشی کو زندہ رکھا۔

اللہ کے بنائے گئے قوانین کے ساتھ، اس کے دیے گئے احکامات کے ساتھ اعلان بغاوت کرتے ہوئے میں نے شراب بھی پی۔ جوا بھی کھیلا۔ امیر کروی کا شملہ نیچے کرنے کے لیے اور ماہ یار محسنی کو تکلیف دینے کے لیے اس کا چین چھیننے کے لیے اور اپنے دل کو تسکین دینے کے لیے میں نے غیر مردوں کے ساتھ دوستیاں بھی رکھیں۔ جیمز وولف جو کہ ایک امریکی گلوکار تھا۔ اس نے شادی کی پیش کش کی تو میں نے قبول کر لی۔ میں ماہ یار محسنی کو دکھانا چاہتی تھی کہ میں بھی پھر اپنا گھر بسا سکتی ہوں۔

شادی کے دو مہینے بعد ہی جیمز کے رنگ ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہر دوسرے دن نئی لڑکی نظر آتی۔ بات دوستی تک رہتی تو ٹھیک تھی، مگر ان کے بیچ جو تعلقات تھے، وہ میری برداشت سے باہر تھے۔ مردوں سے دوستیاں کرنے کے باوجود میں کبھی بے راہ روی کا شکار نہ ہوئی تھی۔ اس لیے میں جیمز کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی تھی۔ جس کی وجہ سے ہمارے بیچ روز چخ چخ ہوتی۔ مجھے اس سے گھن آنے لگی تھی۔ اس کا وجود غلاظت کا ڈھیر لگنے لگا۔ چھ ماہ بعد میں نے اس سے طلاق لے لی اور اکیلے رہنا شروع کر دیا۔

یہ جو سامنے والا اپارٹمنٹ ہے نا۔ اس میں ایوا رہتی تھی اپنے بوائے فرینڈ پال کے ساتھ۔ ان کے دو بچے تھے۔ دس سالہ بیٹی اور سات سالہ بیٹا۔ پال شادی شدہ تھا اور اس کی اپنی پہلی بیوی سمانتھا سے بھی تین بچے تھے۔ جب میں یہاں آئی تو اس کے دو ماہ بعد ہی پال کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد ایوا اپنے دونوں بچوں کے ساتھ رُل گئی۔ کیونکہ پال کی ساری جائیداد اس کی بیوی سمانتھا اور اس کے تینوں بچوں میں تقسیم ہو گئی۔ کیونکہ وہی اس کی قانونی بیوی تھی اور اس کے بچے ہی قانونی وارث تھے۔ ایوا کی کوئی حیثیت تھی نہ ہی اس کے بچوں کی۔ اس کی حالت اور اس کی بے کسی دیکھ کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اسلام میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس میں دوسری بیوی کی بھی معاشرے میں عزت ہے، قانون میں برابری کا درجہ ہے۔ اس کے بطن سے پیدا ہونے والے بچے ناجائز نہیں کہلاتے۔ ان کا بھی باپ کے نام پر حق ہوتا ہے۔ اپنے باپ کے قانونی وارث ہوتے ہیں۔ ان کی تضحیک نہیں ہوتی، ان کو حرامی ہونے کی گالی نہیں سننی پڑتی۔

مرد اور عورت ذہنی اور جسمانی طور پر فطرتاً "مختلف" ہیں۔ عورت جس سے محبت کرتی ہے، بس اسی کی ہو جاتی ہے۔ وہ کسی دوسرے مرد کو سوچنا بھی گناہ [illegible] ہے۔ ایسا سو فیصد نہیں تو نوے فیصد ضرور ہے۔ جبکہ مرد کے معاملے میں حساب الٹ ہے۔ اس کی زندگی میں ایک کی موجودگی میں دوسری عورت بڑے آرام سے قدم دھر دیتی ہے۔ اس کے دل میں بڑی گنجائش رہتی ہے۔ اس کی فطرت عجیب ہے۔ کوئی عمر بھر عام شکل صورت کی بیوی کی محبت میں مبتلا رہ کر اس سے نبھاتا جاتا ہے تو کوئی حسین و جمیل، خوب صورت بیوی سے چند برسوں میں اکتا جاتا ہے۔ کبھی گھر والوں کی پسند سے آنے والی بیوی تمام عمر اس کے دل پہ راج کرتی ہے تو کبھی وہ عورت جسے جنون کی حد تک چاہ کر، دعاؤں میں مانگ مانگ کر، گھر بھر خاندان بھر کی مخالفت مول لے کر بیاہا ہوتا ہے، کچھ عرصہ بعد اسی سے جان چھڑاتا ہے۔

کبھی بے اولاد مرد راضی برضا رہ کر تمام عمر اپنی بیوی کے سنگ گزار دیتا ہے، اور کوئی صحت مند، خوب صورت اولاد کی نعمت پانے کے باوجود بھی دوسری عورت کی طرف جانے کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔ غرض مرد کا دل پھرنے کی کوئی وجہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں مرد کی فطرت کے مطابق جائز رستہ رکھا گیا۔

غیر مذاہب میں مرد کو ایک سے زیادہ شادی کی اجازت نہیں اس لیے وہ ایسے حالات میں چور راستے تلاش کرتا ہے۔ بدکاری کی طرف جاتا ہے۔ بے حیائی اور بے راہ روی رواج پاتی ہے۔ مرد کو ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت نہیں، اس لیے دوسری عورت سے ہونے والا معصوم بچہ ناجائز کہلاتا ہے۔ اس کا وجود گالی بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کے یقیناً کئی منفی اور برے اثرات مرتب ہوتے ہیں ان کی شخصیت پر۔ لوگوں کو گندگی میں رہنے کی اتنی عادت ہو گئی ہے کہ ایک شادی بھی انہیں بوجھ لگنے لگی ہے۔ یہ بغیر کسی رشتہ کے رہنے میں زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں، اس لیے ان میں شادی کا رواج ہی ختم ہو رہا ہے۔ جبکہ مسلمان معاشرے میں ہر رشتہ حلال اور جائز ہے۔ ماہ یار سے مجھے نفرت ہوئی تھی، مگر کبھی اس سے گھن نہیں آئی۔ جیمز سے مجھے گھن آتی تھی۔

ایک نامور مسلمان عالم سے کسی نے اسلام میں پولی گیمی (مرد کی چار شادیاں) کے بارے میں سوال کیا تھا۔ جواب نے کسی حد تک میرے اعتراض کو دور کیا۔

انہوں نے کہا کہ مرد اور عورت کی شرح پیدائش ایک سی ہے مگر شرح اموات مردوں میں زیادہ ہے۔ جنگوں میں، حادثات میں یہاں تک کہ طبعی طور پر بھی مردوں کی اموات زیادہ ہوتی ہیں۔ یوں مردوں کی تعداد کم ہوتی جاتی ہے اور عورتوں کی زیادہ۔ اس لیے اگر مرد کے نکاح میں ایک سے زیادہ عورت بھی ہے۔ تو اس سے بگاڑ پیدا نہیں ہوتا۔

انہی دنوں مجھے ایک فلم کا اسکرپٹ لکھنے کے لیے تبت جانا پڑا۔ انڈیا، نیپال اور بھوٹان کے کچھ علاقوں کی طرح تبت میں بھی پولینڈری (عورت کے ایک وقت میں ایک سے زیادہ شوہر) پریکٹس میں ہے۔ وہ شوہر اکثر اوقات آپس میں بھائی ہوتے ہیں۔ یہ عورت پر کیسا ذہنی اور جسمانی تشدد ہے، اس کے لیے کیسی اذیت ہے۔ اس کی عزت نفس، اس کے پندار پہ کیسی قیامت ہے۔ ہر ذی ہوش بندہ سمجھ سکتا ہے۔

جب ماہ یار نے لالے سے شادی کی تو میرا دل چاہتا تھا، میں بھی دوسری شادی کر کے اس کی نظروں کے سامنے دوسرے مرد کے ساتھ رہوں۔ وہ ایک انتقامی جذبہ تھا، جس نے مجھے اس قدر گھٹیا سوچنے پہ مجبور کیا۔ اسلام تو بہت پیارا دین ہے۔ اس میں عورت کو اجازت دی گئی کہ اگر اسے اپنا شوہر پسند نہیں تو وہ اسے چھوڑ سکتی ہے۔ اپنی پسند کے مرد سے نکاح کر سکتی ہے مگر ایک طریقے سے۔ تاکہ اس کی زندگی میں بگاڑ پیدا نہ ہو۔ وہ ذہنی اور جسمانی اذیت نہ سہے۔ اس لیے اسلام میں پولینڈری نہیں ہے۔

جہاں عورت ایک سے زیادہ شوہر رکھتی ہے وہاں ان کے بچے کا باپ کون ہے یہ خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ جب بچے کے سامنے ایک وقت میں چار چار باپ کھڑے ہوں تو وہ کس کو "ڈیڈ" کہے۔ ماہر نفسیات کہتے ہیں، جس بچے کو اس کی مکمل پہچان اور شناخت نہیں ملتی۔ وہ بھرپور زندگی نہیں گزارتے عورت کے سامنے اس کا بچہ اس کے سامنے سوالیہ نشان بن کر کھڑا نہ ہو۔ اس لیے اسلام میں پولینڈری نہیں ہے۔

اصل میں اسلام کچھ اور ہے اور مسلمان کچھ اور۔ اللہ نے اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ضابطہ حیات دیا اور مسلمان نے اس کی کیا شکل بنا دی۔ معاملہ وراثت کا ہو یا کاروبار کا، مرد کے حقوق کا ہو یا عورت کے، شادی کا ہو یا زوجین کے بیچ سلوک کا، طلاق کا ہو یا حلالہ کا، معاشرتی ہو یا اقتصادی۔ ہر معاملے میں اسلام کو نہیں، مسلمان کو دیکھا جاتا ہے اور سب سے بڑا المیہ یہ کہ اسلام کو جاننے، سمجھنے اور پرکھنے کے لیے بھی اسلام کو نہیں مسلمان کو دیکھا جاتا

ہے اور آج کا مسلمان ہے کیا فرقوں اور مسالک میں بٹا ہوا گروہوں اور طبقات میں منقسم۔

میں بھی یہی کرتی رہی' اسلام کو نہیں مسلمان کو دیکھتی رہی۔ امیر کروبی' ماہ یار محسنی اور فتح ثانی جیسے مسلمان کو۔

اور جب اسلام کو دیکھا' اس کو جانا تو مجھے ہر سوال کا جواب مل گیا' سب سمجھ میں آگیا مگر......

عزت' سکون اور بیٹی کو کھونے کے بعد....

اللہ کو کھونے کے بعد.....

✡ ✡ ✡

وہ بول بول کر جیسے تھک چکی تھی۔ یا شاید ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹک کر تھک گئی تھی۔ اس نے صوفے کی پشت کے ساتھ ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ دائم پانی کا گلاس بھرنے گیا اور وقت دیکھنے کے بہانے اپنی کلائی سامنے کی اور گھڑی میں نصب کیمرا جھٹکے سے بند کر دیا۔

"شکریہ دائم۔" اس نے گھونٹ گھونٹ پانی اپنے اندر اتارتے ہوئے ہلکا سا مسکرا کر کہا۔

"میرے ساتھ دینے کا۔ اس وقت حقیقتاً" مجھے ایک دوست کی ضرورت تھی۔"

"دوست کہہ رہی ہو تو یاد رکھو۔ دوست کو شکریہ کہتے ہیں نہ ہی سوری۔" وہ ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سامنے کارنر اسٹینڈ پر پڑی روشنک کی تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ کیا ایسی سبیل پیدا ہو کہ ذواتا اپنی بیٹی سے مل لے۔ وہ ماہ یار سے رابطہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ شاید وہ اس کی مدد کرے۔ آخر بیٹی کے ایکسیڈنٹ کی خبر بھی تو اس نے ذواتا کو دی۔ اس کا مطلب ہے فطرتاً" وہ اتنا برا شخص نہیں۔

"دائم! دعا کرو میری بیٹی ٹھیک ہو جائے۔" اسے تصویر کی طرف دیکھتے پا کر اس نے درخواست کی۔

"ان شاء اللہ بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔" اس نے تسلی دی۔

"تم جانتے ہو دائم! اس کی یہ تصویر میں نے کہاں سے لی ہے؟ ایک اخبار سے تراشی ہے۔ میں تو اتنی غریب ہوں کہ میری متاع میں میری بیٹی کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔ میں جب امریکہ آئی تھی تو سارے رشتے ختم کر کے' اپنا ماضی بھلا کر ایران سے نکلی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ میں ایک ماں ہوں۔ اب روشنک بھول چکی ہو گی کہ اس کی ایک ماں بھی ہے' سگی ماں۔"

"وہ نہیں بھولی ہو گی۔" دائم نے اسے یوں ہی تسلی دی۔

"صحیح کہتے ہو' وہ نہیں بھولی ہو گی۔ لوگ اسے بھولنے نہیں دیتے ہوں گے۔ اس کو دیکھ کر سرگوشیاں کرتے ہوں گے' طعنے دیتے ہوں گے۔ دائم! دعا کرو لوگ بھول جائیں کہ روشنک محسنی ذواتا کروبی کی بیٹی ہے۔ یہ حوالہ اسے مزید تکلیف نہ دے' اذیت نہ دے۔"

وہ پھر بے تحاشا رو رہی تھی۔

اس پل دائم منیب کا دل چاہا' وہ ان آنسوؤں کو اپنے پوروں پر چن لے۔ اس کا ہاتھ تھام لے۔ اس کے سارے زخم مٹا دے۔ بس مسکراہٹیں ہوں' خوشیاں ہوں' مسرتیں ہوں۔

✡ ✡ ✡

آج حدیقہ کی سالگرہ تھی۔ صبح سے اسے دائم کے فون کا انتظار تھا' مگر فون آیا نہ ہی اس کا کوئی پیغام۔ تلملاتی ہوئی ادھر سے ادھر چکر لگا رہی تھی اور عائزہ اسے عاجز کر دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔

"یہ تمہیں تنگ کر رہا ہے حدیقہ.....! دائم کا تمہیں پتا تو ہے نہ اس نے کبھی اپنی سالگرہ منائی' نہ ہی اسے کسی کا برتھ ڈے یاد رہتا ہے۔" مہرتاب اسے اپنے

ساتھ لگائے پیار سے کہہ رہی تھیں۔

"حدیقہ کتنی' تو نہیں ہے امی!" عائزہ نے جان بوجھ کر کتنی پر زور دیا۔ حدیقہ کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔

"ملاؤ اس کا فون.... میں خود اس سے پوچھتی ہوں۔" اس کو اتنا اداس دیکھ کر وہ جوش میں آگئیں۔

"نہیں ماما پلیز' یوں بھلا مجھے کیا خوشی ملے گی۔ دل تو تب خوش ہو گا نا جب اسے خود سے یہ دن یاد ہو گا۔" اس نے انہیں سختی سے منع کر دیا۔

شام میں دائم کا فون آیا' مگر اسے یاد ہی نہ تھا۔ آخر مہرتاب نے ہی دانستہ ذکر کر دیا۔

"وہ امی! ابھی یہاں 11 تاریخ چل رہی ہے۔ حدیقہ کی سالگرہ تو 12 کو ہوتی ہے نا۔ تو مجھے آج کیسے یاد رہتی۔" اسے بروقت بہانہ سوجھا تھا۔ نیویارک کے دس گھنٹے پیچھے ہونے کا کچھ تو فائدہ ہوا۔ حدیقہ سے بات کرتے ہوئے بھی اس نے یہ ہی بہانہ گھڑا۔ دل ہی دل میں وہ خود کو ملامت کر رہا تھا کہ اسے یہ دن یاد رکھنا چاہیے تھا۔

"ویسے میں بڑا خوش ہوں۔ امریکہ ہم سے کہیں تو پیچھے ہے' اور خوش تو بھائی بھی ہوں گے کہ آج اس وجہ سے ایک بڑے جھگڑے سے بال بال بچ گئے۔"

عائزہ اسے پھر ستا رہا تھا۔

وہ چڑی نہیں کیونکہ اس کا دھیان دائم کی طرف تھا۔ آج وہ کچھ الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ اس کا لہجہ بھی ہمیشہ کی طرح تر و تازہ اور خوش گوار نہیں تھا۔

✡ ✡ ✡
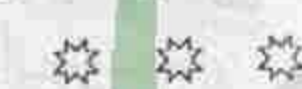
وہ ماہ تاباں رقص کر رہی تھی۔

اس کے پنکھڑیوں جیسے عنابی ہونٹوں پہ کوئی گیت مچل رہا تھا۔ اس کے رخساروں پہ ہمیشہ کی طرح گلاب کھلے ہوئے تھے۔ وہ بے خود سا اسے دیکھتا چلا گیا۔

اس نے اسے بے تحاشا روتے ہوئے' تڑپتے ہوئے دیکھا تھا۔ ساری ساری رات سجدوں میں پڑے دیکھا تھا۔ مسجد الرحیم میں گھنٹوں گزارتے دیکھا تھا۔ بے سکون و بے قرار دیکھا تھا' مگر اس روپ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

وہ بہت خوش لگ رہی تھی۔ اس کے لبوں پہ مسکراہٹ مستقل سجی ہوئی تھی۔ شاید وہ کوئی فارسی گیت تھا' جس پر وہ رقصاں تھی۔ دائم منیب کا دل بھی جیسے اس کے بدن کے انگ انگ کے ساتھ تھرکنے لگا۔

اس نے بغیر بازوؤں کا آتشی گلابی رنگ کا لباس پہن رکھا تھا جو پیروں تک جا رہا تھا۔ اس کے گہرے گلے پہ کوئی کام ہوا تھا۔ جس کے بوجھ سے وہ ڈھلکا جا رہا تھا۔ دائم نے نظریں چرائیں' مگر کچھ لمحوں بعد وہ پھر اس کے سراپے میں کھویا ہوا تھا۔ وہ اس قدر حسین لگ رہی تھی کہ اس پر سے نگاہ ہٹانا دائم منیب کے لیے دنیا کا مشکل ترین کام ہو گیا۔ وہ اپنے آپ کو بہت بے بس پا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا قیامت تک ذواتا کروبی رقصاں رہی تو وہ قیامت تک اپنی پلکیں جھپک نہ پائے گا۔

کیا تھی یہ ذواتا کروبی....

سیاہ چادر میں چھپی ہوتی یا اس آتشی گلابی پیراہن میں ظاہر.... وہ ساحرہ ہی رہتی۔

نیناں نیر بہاتے یا لب تبسم سجاتے' وہ طلسم ہی پھونکتی۔

دائم کو پلکیں جھپکانی پڑیں' اس کے ہوش ربا سراپے سے نگاہ چرانی پڑی' اس کے دودھیا بازو پہ کہنی کے پاس سجا وہ گہرا سیاہ تل اس کیم کورڈر نے اس خوب صورتی کے ساتھ زوم کر کے دکھایا تھا کہ دائم منیب کا دل اس تل کو چھو کر محسوس کرنے کے لیے مچل اٹھا۔

اس نے اپنے ہی دل کی خواہش پہ گھبرا کر کیم کورڈر پیچھے کیا اور کھڑکی کے سامنے سے ہٹ گیا۔ مگر دل تھا کہ وہیں کہیں اس کھڑکی کے پار اس ایرانی مہ جبیں کے ساتھ رقصاں تھا۔

✡ ✡ ✡

وہ اپنی رات والی حرکت پر نادم تھا۔

یہ تو بہت معیوب حرکت تھی۔ وہ کس مقصد کے لیے اس کھڑکی کے پار کے مناظر کو شوٹ کر رہا تھا۔ اب یوں ہی فارغ وقت میں کھڑکی میں کھڑے رہنا اس کی عادت سی ہو گئی تھی۔ نہیں' شاید ذوا تا کروبی کو دیکھنا اس کی عادت سی بن گئی تھی۔

اس کی کھڑکی بہت کم کھلی ہوتی تھی' مگر وہ وہاں کھڑا ہوتا تھا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد گھوم پھر کر اس کی نگاہ اس کھڑکی پر جا رکتی۔ جس جستجو میں وہ تھا اس کے لیے گھنٹوں کھڑکی کے آگے کھڑا رہنا ضروری تو نہ تھا مگر شاید... نہیں' یقیناً" اسے ذوا تا کروبی کو دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

یہاں تک تو ٹھیک تھا' مگر کل رات والی حرکت۔

اس نے خود کو ملامت کی اور فیصلہ کیا کہ آئندہ کبھی وہ یوں کھڑکی کے اس پار نہیں جھانکے گا۔ ویسے بھی اب کام کے مناظر وہ عکس بند کر چکا تھا۔

دل چپکے سے اس کے فیصلے پر ہنس پڑا اور دائم منیب پر بہت جلد یہ بات کھل گئی کہ اب وہ کتنی بھی کوشش کر لے۔ ذوا تا کروبی اس کے دل کی سرزمین پہ قدم رکھ چکی ہے' وہ بھی بلا اجازت۔ جیسے وہ اس کی ذاتیات میں بغیر اجازت داخل ہوا تھا۔

وہ آنکھ بند کرتا تو سسکتی ہوئی ذوا تا کروبی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی۔

وہ آنکھیں کھولتا تو مسکراتی گنگناتی محو رقص ذوا تا کروبی سامنے آ جاتی۔

اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

وہ حدیقہ کے ساتھ خیانت کر رہا تھا۔ یہ احساس ہونے کے باوجود وہ مجبور تھا دل کے ہاتھوں۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگتا کہ اسے تو عمر بھر وفا نبھانی تھی۔ حدیقہ کا ساتھ نبھانا تھا۔ اس کا وفاؤں پر یقین بحال کرنا تھا' مگر وہ کر کیا رہا تھا۔

بائیس سال تو کیا بائیس ہفتے وہ اس سے وفا نبھا نہ پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

نیویارک آئے اسے سات ماہ ہو چکے تھے۔ انہی دنوں مائرہ کی شادی طے پا گئی۔ امی اور بابا چاہتے تھے کہ پانچ' چھ ماہ انتظار کر لیا جائے' تاکہ دائم کی شادی بھی ساتھ ہی رکھ دی جائے؟ مگر جاذب انہی دنوں پاکستان آیا ہوا تھا۔ اس لیے اس کے گھر والوں کی طرف سے اس ماہ شادی کا اصرار کیا جا رہا تھا۔ سو ان کی بات مان لی گئی۔ اس کی اکلوتی بہن کی شادی تھی' اسے تو جانا ہی تھا۔ مائرہ کے بھی فون پہ فون آ رہے تھے۔ اس کے پاکستان جانے کا سن کر ذوا تا اداس سی ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ کہا نہیں تھا۔ پھر دائم کے ساتھ شاپنگ اور سب کے لیے تحائف خریدنے میں اس کی مدد بھی کی۔ جس دن اس کی فلائٹ تھی اس دن کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت تھی۔ پھر واپسی پر پہلی بار وہ اس کے ساتھ اس کے اپارٹمنٹ آئی تھی۔

وہ جو شے لے کر آتا' اسے صوفے یا میز پر یوں رکھ دیتا۔ ارادہ تھا کہ ایک ساتھ پیکنگ کرے گا۔ ذوا تا نے تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد خود ہی پیکنگ شروع کر دی۔ دائم نے منع بھی نہیں کیا۔

"یہ کس کے لیے لیا ہے؟" ذوا تا نے ایک سفید اور نیلے رنگ کا سوٹ ہاتھ میں تھامتے ہوئے پوچھا۔

"حدیقہ کے لیے۔"

"حدیقہ بہت خوش قسمت ہے' اس کو تم جیسا جیون ساتھی ملا۔" وہ سادہ سے لہجے میں کہہ رہی تھی۔ دائم ہلکا سا مسکرا کر کافی کا گرم گھونٹ بھر گیا۔

"دائم! تم چلے جاؤ گے؟"

وہ ٹھٹک کر مڑا "چند دنوں کے لیے۔" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

وہ مزید کچھ نہیں بولی مگر دائم کو لگا وہ رو رہی ہے۔ اس نے قریب آ کر اسے آواز دی مگر وہ چہرہ دوسری طرف کیے کھڑی رہی۔

"پلیز ذوا تا! مت روؤ۔ مجھے جانا مشکل لگے گا۔"

"ان آنسوؤں میں اتنی طاقت کہاں کہ تمہیں روک لیں۔"

"تم کہو گی تو میں نہیں جاؤں گا۔" بالکل بے اختیار اس کے منہ سے نکلا' پھر جیسے اپنے ہی لفظوں پہ ٹھٹک گیا۔

"مگر اس ہنسی میں اتنی طاقت نہیں کہ تمہیں روک لے۔" حدیقہ کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔ وہ لب بھینچ کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

حدیقہ نے دائم منیب سے محبت کی تھی۔ اور محبت کرنے والا محبوب کے دھڑکتے دل' اس کی پلکوں کی جنبش تک پہ نگاہ کیے رکھتا ہے۔ اس لیے اس کے انداز و اطوار میں اس کی نگاہ میں آئے فرق کو سب سے پہلے محسوس کر جاتا ہے۔ وہ بھی بدلے ہوئے دائم منیب کو دیکھ رہی تھی۔ جو اس سے نگاہ چرائے رکھتا تھا۔ اس کے پاس اکیلا بیٹھنے سے گھبراتا تھا۔ وہ اس کے لیے تحائف لایا تھا' مگر وہ تحفے اسے دینے میں گرمجوشی نہ تھی۔ وہ اس سے بات کرتا تھا' مگر حدیقہ کو اس کا دھیان کہیں اور محسوس ہوتا۔

مائرہ کی مہندی والے دن اس نے دائم کی پسند کا رنگ پہنا۔ دل سے اس کے لیے تیار ہوئی۔ سب نے اس کی تعریف کی۔ مگر دائم نے شاید اسے نظر بھر کر بھی دیکھا۔ وہ اسے سیڑھیوں سے نیچے آتا دیکھ کر مسکرائی تھی' مگر وہ موبائل کان سے لگائے اس کے پاس سے گزر کر چلا گیا۔ اسے تضحیک کا احساس ہوا۔ کوئی اور ہوتا تو وہ اس کو پھر منہ بھی نہ لگاتی۔ مگر وہی... دل کا عالم... جس میں گنجائش خود بخود نکل آتی ہے۔ دل والے کو رعایت خود بخود مل جاتی ہے۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔

"پاکستان کے حالات ٹھیک ہیں' تم فکر نہ کرو۔" وہ لان میں ایک کونے پہ کھڑا کسی سے بات کر رہا تھا۔ "ہاں ہاں... بجلی بھی ہوتی ہے۔" وہ ہلکا سا ہنسا۔ "تم اپنا خیال رکھنا۔"

بات کر کے پلٹا تو حدیقہ کو لگا وہ اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔

"کوئی کام تھا؟" سنبھل کر وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔

"تمہارے پاس آنے کے لیے' تم سے بات کرنے کے لیے کوئی کام ہونا ضروری ہے کیا۔"

"نہیں..." اس نے ایک نگاہ اس پہ ڈالی۔

دھانی لباس میں بجھی بجھی سی لگ رہی تھی وہ۔ اسے احساس ندامت نے گھیر لیا۔ وہ کیا کر رہا تھا اس کے ساتھ۔ اس نے تو اس کا ہو کر رہنے کا وعدہ کیا تھا۔ عہد وفا نبھانا تھا۔ حدیقہ نے لب بھینچے۔ وہ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا' مگر دھیان اس پر نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔

اپنی ایک عادت جو دائم کو پہلے پسند تھی' اب سخت ناپسندیدہ محسوس ہو رہی تھی۔

اسے خود پہ خول چڑھانا کیوں نہیں آتا۔ کیا ہے جو اس کا دل رکھنے کے لیے وہ وہی دائم بن جائے جو نیو یارک جانے سے پہلے تھا۔ جس کے دل میں کوئی اور نہیں بسا تھا۔ جس کے خیالوں میں کسی اور کی پرچھائیں نہ تھی' مگر وہ دل رکھنے کے لیے بھی ویسا کیسے بن سکتا تھا۔ جب کہ وہ پہلے والا دائم منیب رہا ہی نہ تھا۔

☼ ☼ ☼

سلمان رشدی بھارت آیا ہوا تھا۔

ٹی وی پر کوئی ٹاک شو چل رہا تھا۔ جس میں سلمان رشدی کے ساتھ ساتھ تسلیمہ نسرین اور ذوا تا کروبی کو بھی موضوع بحث بنایا ہوا تھا۔

"توبہ... توبہ... مسلمان ہو کر کیسا کفر کیا اس نے۔" امی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

"ایسا کفر تو تقریباً" ہر عورت کرتی ہے امی... آپ بھی' آپ کی یہ بہو بھی۔" دائم نے حدیقہ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم... اللہ نہ کرے جو ہم کفر کریں۔" امی نے بے اختیار اپنے کانوں کو چھوا۔

"کیوں' کیا غلط کہہ رہا ہوں میں' جب کسی مرد کی دوسری شادی کا سنتے ہیں فوراً" کہہ دیتے ہیں۔ اس نے برا ظلم کیا۔ اس وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے

مرد کو یہ اجازت دی اور جس کام کی اجازت اللہ نے دی اس کو کرنے والا ظالم کیسا۔ دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ظلم کی اجازت دی' اللہ ظالم ہے' اب یہ کفر نہیں تو اور کیا ہے....."

"تمہاری زبان جل جائے جو ہم یہ کہیں کہ اللہ ظالم ہے۔ میں مانتی ہوں مرد کو دوسری شادی کی اجازت ہے' مگر کوئی وجہ بھی تو ہو' جیسے اولاد نہ ہو' بیوی....."

"اسلام میں بغیر کسی وجہ کے بھی دوسری' تیسری اور پھر چوتھی شادی کی اجازت ہے امی!"

عائز جو ابھی اندر آیا تھا' اس کا منہ اس کے آخری جملے سن کر کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"اور امی! یہ کوئی ایسی انہونی بھی نہیں' پچھلی صدی تک دیکھیں۔ آپ اپنے دادا ہی کو دیکھ لیں' جنہوں نے تین شادیاں کیں۔ ایک بیوی تو چلو کم عمری میں وفات پا گئی' باقی دونوں نے کیسی پرسکون زندگی گزاری۔ ان کی اولادوں میں فرق کوئی باہر کا بندہ کر پاتا تھا بھلا؟ آپ کے سوتیلے چچا' سوتیلی پھوپھو کبھی آپ کو سگے تایا اور سگی پھوپھو سے الگ لگے؟ ان کی آپس کی محبت مثالی تھی۔ جس کا ذکر آپ خود کرتی ہیں۔ اب اگر مرد دوسری شادی کر لیتا ہے تو آخر ایسی کیا قیامت آجاتی ہے کہ ہر کوئی افسوس کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ وہ آپ کے کزن جن کی عیاشیوں کی خبر ہر ایک کو ہے' وہ ظلم نہیں کرتے اور عالم انکل نے جائز طریقے سے عقد ثانی کر لیا' ایک جوان بیوہ کی زندگی کو سنوار دیا تو وہ ظالم ہو گئے۔"

امی نے لاجواب ہو کر حدیقہ کی طرف دیکھا تھا' مگر حدیقہ تو دھواں دھواں چہرہ لیے اس دائم منیب کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ اس کا دائم تو نہیں تھا۔ عائز جو اپنی عادت کے مطابق دائم کے خیالات پر کچھ بول کر حدیقہ کو چڑانا چاہ رہا تھا' اس کی صورت دیکھ کر کچھ بول نہیں پایا۔

☼ ☼ ☼

وہ مائرہ کی شادی کی ویڈیو میں ایڈیٹنگ کر رہا تھا' جب اس کے کمرے میں کوئی داخل ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ حدیقہ تھی' وہ اس سے نظر چرا گیا۔ وہ اس کے سامنے آکر رک گئی۔ چند لمحوں کی اذیت بھری خاموشی کے بعد اس کی آواز ابھری تھی۔

"کون ہے وہ؟"

"کون؟" وہ جان کر انجان بنا۔ نظریں اسکرین پر تھیں۔

"وہی..... جس نے دائم منیب کا نقطہ نظر تبدیل کر دیا۔ اب اسے مرد کی دوسری شادی' اس کا حق لگنے لگی ہے۔"

"میں تو یوں ہی ایک بات کر رہا تھا حدیقہ!"

"یوں ہی ایک بات کرنے کے لیے نظریں نہیں چرانی پڑتیں۔"

وہ نگاہ اٹھا نہیں پایا' اور وہ نگاہ جھکا نہیں پائی۔ وہ اسے دیکھتی رہی' دیکھتی رہی۔ اس کی خاموشی کسی زوردار دھماکے سے زیادہ تباہ کن تھی۔

"اللہ کرے مر جائے وہ جس نے....."

"اسے بددعا نہیں دو حدیقہ!" وہ تڑپ کر اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ "جو کہنا ہے مجھے کہو' جو بددعا دینی ہے مجھے دو' اسے کچھ مت کہو۔"

وہ یک دم سکتہ میں آگئی۔ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی' پھر مڑ کر تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔

وہ اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

آنے والے فون نے اس کے حواس معطل کر دیے تھے۔ وہ جس طرح سے اسپتال پہنچا تھا' یہ وہ جانتا تھا یا اس کا رب' جس سے پورے راستے وہ ایک ہی دعا مانگتا آیا تھا۔ حدیقہ کی زندگی کی دعا۔ وہ وہاں پہنچ کر مجرموں کی طرح سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ پھوپھو کے آنسو پونچھنے کی ہمت نہ ہوئی' عالم مرتضیٰ کو تسلی دینے کے لیے لفظ نہ ملے۔

"دائم! میری بیٹی سے کہو' وہ ایک بار اٹھ جائے۔ اس نے رومانہ کی وجہ سے یہ قدم اٹھایا ہے نا۔ میں

اسے چھوڑ دوں گا بس اسے کہو وہ اٹھ جائے۔"
پھپھو نے جھٹکے سے سر اٹھایا وہ اپنی جگہ چپ کا چپ رہ گیا۔ مہر تاب روتی ہوئی آئیں۔ وہ منیب حسن کو مجرم گردان رہی تھیں، جو کئی دنوں سے عالم مرتضیٰ سے تقاضا کر رہے تھے کہ وہ حدیقہ کا جائیداد میں سے حصہ باقاعدہ اس کے اور دائم کے نام لگا دیں۔
دائم خاموشی سے سب سنتا گیا۔ وہ کیا کہتا کیا بتاتا۔
مجرم رومانہ نہیں وہ ہے۔
پوری رات اس نے حدیقہ کی زندگی کی دعائیں مانگی تھیں۔
اسے شب بھر میں پتا چل گیا تھا کہ وہ اس کے لیے کیا معنی رکھتی ہے۔
یہ تصور ہی اسے لرزا دیتا کہ اگر وہ نہ بچی.....
پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ اس خیال سے چھٹکارا پانے کے لیے سر جھٹکتا۔ جب ڈاکٹر نے اس کی زندگی خطرے سے باہر ہونے کی نوید دی تو وہ بے اختیار سجدہ شکر بجا لایا۔

☼ ☼ ☼

اس کی آنکھ کھلی تو وہ دشمن جاں سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پھر سے سوتی بن گئی۔ لیکن جب تک وہ اس کا جاگنا محسوس کر چکا تھا۔ وہ اس کے نزدیک آگیا۔ کچھ دیر کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس کی پلکوں کی جنبش اس کی نظروں سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔
"میں اتنا برا لگنے لگا ہوں کہ دیکھنا بھی گوارا نہیں۔" اس نے آنکھیں نہیں کھولیں، مگر اس کے ہاتھوں میں لرزش اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔
"میں نے یہ کہا تھا کہ اسے مرنے کی دعا نہ دو... یہ کب کہا تھا کہ اپنی جان لے لو۔"
آنسو پلکوں کی حد پار کر کے بہا اور اس کی کنپٹی سے ہوتا ہوا سیاہ بالوں میں کہیں کھو گیا تھا۔
"حدیقہ... میں اسے بھول جاؤں گا۔" اس نے دوسرے ہاتھ سے اس کا دوسرا آنسو صاف کیا۔
اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔ اس نے محبت کا ذائقہ چکھا ہوا تھا۔ اسے پتا تھا بھول جانا ناممکن ہوتا ہے۔ اگر یہ ممکن ہوتا تو وہ سامنے بیٹھے اس ہرجائی کو گولی مار کر خود مزے سے نئے سرے سے زندگی جینے کے خواب بنتی۔

☼ ☼ ☼

اس نے خاموشی سے سوپ کا پورا پیالا ختم کیا اور جب عفت اس کے پاس سے اٹھنے لگیں تو اس نے ان کا ہاتھ تھام لیا۔
"سوری ماما!" اسے کوئی رشتہ یاد نہ رہا تھا۔ صرف اور صرف یہ یاد رہا تھا کہ اس کا دائم اب اس کا نہیں رہا۔ اسے حرام موت کے معنی بھول گئے تھے، اگلے جہاں کا جہنم بھول گیا تھا، صرف اور صرف یہ یاد رہا تھا کہ دائم کے بغیر اس کی زندگی دوزخ ہے۔ عفت نے پیار سے اس کا ماتھا چوما۔ کچھ دیر اس کی طرف دیکھتی رہیں۔ ان کے لب کھل کر بند ہو جاتے۔ وہ کشمکش و پیچ میں مبتلا تھیں کہ حدیقہ سے یہ بات کریں یا نہیں۔
"کیا بات ہے ماما! آپ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔" وہ جو انہیں بغور دیکھ رہی تھی، سمجھ گئی۔
"حدیقہ..." وہ کچھ دیر کے لیے رکیں۔ "حدیقہ! عالم کو اور مجھے بھی لگتا ہے تم نے خود کشی رومانہ کی وجہ سے کرنے کی کوشش کی تھی اور تو کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سے ہی جھگڑا ہوا تھا نا تمہارا اس رات، جب اس نے تمہیں لالچی سسرالیوں کا طعنہ دیا تھا۔ اب عالم تم سے پوچھیں گے۔ تم انہیں کہہ دینا کہ رومانہ کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔"
وہ ماما کی بات سن کر محض لب کاٹ کر رہ گئی۔
"دیکھو بیٹا! وہ ماں بننے والی ہے۔ اس کو اس حال میں نہ رولو۔ تم تو میرے صبر کو ضائع کر دو گی۔ اپنے باپ کو سمجھاؤ، وہ یہ قدم نہ اٹھائے۔"
"کون سا قدم؟"
"وہ رومانہ کو طلاق دے رہے ہیں۔"
"کیا؟" جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"ہاں... حدیقہ! تمہاری محبت میں ایسا قدم اٹھا رہے ہیں، جس سے کسی کو بھی سکون ملنے والا نہیں۔ جن کے ضمیر زندہ ہوتے ہیں ناں بیٹا! وہ کبھی کسی کو تکلیف دے کر خود خوش نہیں رہ سکتے۔ اور وہ معصوم روح جس نے ابھی دنیا میں آنکھیں بھی نہیں کھولی، اسے باپ کی محبت سے محروم رکھ کر کیا قرار حاصل ہوگا تمہیں؟ اس کے بعد تمہارا باپ مکمل توجہ و محبت کبھی تمہیں بھی نہیں دے پائے گا۔ اس کے دل کا ایک ٹکڑا اس سے دور ہو جائے گا۔ کیا ایسا آدھا ادھورا باپ تمہیں چاہیے؟ مجھے تو ایسا شوہر نہیں چاہیے۔"
وہ حیرت سے گنگ اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ کیسا ظرف تھا اس عورت کا۔
"ماما! آپ کو جب پتا چلا کہ بابا کی زندگی میں کوئی اور ہے تو کیسے سہا آپ نے یہ دکھ۔"
"تب تو ایسے لگتا تھا، زندگی اندھیر ہو گئی۔ اب نہ میں مر پاؤں گی نہ ہی جی سکوں گی۔"
"پھر بھی آپ نے بابا کو اجازت دے دی دوسری شادی کی۔"
"میں انہیں تمہارے ذریعے سے شادی نہ کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ مگر ان کے دل کو کیسے مجبور کرتی کہ رومانہ کو بھول جائیں۔ بیٹا! مرد کا دل دوسری عورت کی طرف پھر جائے تو اسے باندھ کر رکھنے کا کوئی فائدہ۔ اگر میں انہیں اجازت نہ دیتی تو وہ شاید دوسری شادی نہ کرتے مگر ان کے اور میرے بیچ رومانہ ہمیشہ رہتی۔ وہ مجھ سے اکتا جاتے، بےزار رہنے لگتے۔ ان کی محبت تو کھو ہی دیتی مگر وہ عزت بھی کھو دیتی جو آج وہ مجھے دیتے ہیں۔ وہ تو اس سے بڑی ہار ہوتی۔ اس سے بڑھ کر کرب ناک زندگی ہوتی۔ کیونکہ بیٹا! عورت سہاگ کے بغیر رہ سکتی ہے عزت کے بنا نہیں۔"
وہ صبر و عظمت کے اس پیکر کو دیکھ کر رہ گئی۔
"ماما! آپ جیسا حوصلہ کیسے آتا ہے؟" اس نے [illegible] لہجے میں پوچھا۔ کچھ تو تھا اس کے یاسیت [illegible] لہجے میں جو عفت ٹھٹک سی گئیں۔ کیا وہ لوگ غلط سمجھ رہے تھے۔ کیا اس کے اقدام خودکشی کے پیچھے رومانہ اور اس کا زوردار جھگڑا نہیں۔ کیا اس کے اور دائم کے بیچ....
انہوں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹکا۔

☼ ☼ ☼

سلونی شام اداسی کے تمام رنگوں کی ردا اوڑھ کر آئی تھی۔ وہ اس اداسی کا حصہ بنی سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی، جب وہ آہستگی سے آکر اس کے قریب بیٹھا۔ اسے چہرہ موڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ اس کی مہک سے اسے پہچانتی تھی۔
"لات مار کر اپنی زندگی سے نہیں نکالو گی حدیقہ؟" اسے اس ستمگر کی آواز آئی۔
"نہیں... اپنے بچوں کو گالیاں دینا سکھاؤں گی۔"
وہ کچھ دیر تو حیرت سے بول ہی نہ پایا۔ یعنی اب بھی وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی۔
"حدیقہ! میں چاہتا ہوں کہ....."
"تم جو بھی چاہو، جسے بھی چاہو... میں تمہیں چاہتی ہوں۔" وہ اس کی بات کاٹ کر مضبوط لہجے میں بولی۔
"حدیقہ! میں تمہیں دکھ نہیں دینا چاہتا۔"
"وہ تو تم دے چکے ہو۔" اس نے پھر اس کی بات مکمل نہیں ہونے دی تھی۔
"دائم! تم چلے جاؤ۔ جو تمہارا جی چاہتا ہے وہ کرو۔ بس مجھ سے اپنا نام نہ چھیننا۔"
وہ اپنی ماں سے خفا رہتی تھی کہ وہ اس شخص کو چھوڑ کیوں نہیں دیتیں، جس نے ان سے بے وفائی کی۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا وہ اب عالم مرتضیٰ کی مہیا کی گئی آسائشوں کی بغیر رہ نہیں سکتیں۔ ورنہ اس شخص کو اسی وقت چھوڑ دیتیں، جس وقت وہ رومانہ کا ہاتھ پکڑے اس گھر میں داخل ہوئے تھے۔ جس گھر کو اس کی ماں نے بائیس برسوں میں بنایا تھا، سنوارا تھا۔ اب وہ ماں سے خفا نہ رہتی تھی۔ وہ جان چکی تھی، چھوڑنا آسان نہیں ہوتا۔ کہاں وہ دائم کے قریب کسی لڑکی کو

دیکھ نہ پاتی تھی۔ اس کے منہ سے کسی اور کا ذکر سن کر جل بھن کر رہ جاتی تھی، کوئی لڑکی دائم کو ذرا غور سے دیکھ لیتی تو مرنے مارنے پہ اتر آتی تھی۔ کہاں اب دائم کے دل میں کوئی اور آکر آباد ہو گئی۔ وہ قیامت سہہ رہی تھی، پھر بھی اسے چھوڑنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔

"دائم!" وہ جانے لگا تو اس نے پیچھے سے پکارا۔ وہ رک گیا۔

"کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟"

وہ چپ رہا۔

"تم نے جواب کیوں نہیں دیا دائم... فکر مت کرو، اب خود کشی نہیں کروں گی۔" وہ سیڑھیوں سے اٹھ کر اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ "کیا وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت ہے؟"

"مجھے لگتی ہے۔" اس نے نگاہیں جھکا کر مجرموں کی طرح جواب دیا، وہ ایک قدم پیچھے ہٹی تھی۔

پہلے اتنی برداشت نہ تھی کہ دائم کسی اور کو دیکھے، کسی اور کو سوچے، کسی اور کی تعریف کرے۔ اب جب حقیقت میں وہ کسی اور کا اسیر ہو گیا تو روح و جسم سے ساری طاقت، ساری جان نکل گئی۔ اب تو اتنی سکت بھی نہ رہی تھی کہ وہ نقیب سامنے آئے تو اسے گالیاں دے کر تھپڑوں سے اس کا منہ لال کر کے دائم کی زندگی سے باہر نکال پھینکے۔ دھکے دے کر اس کی نظروں کے سامنے سے غائب کر دے۔

☼ ☼ ☼

جب وہ آیا تھا تو سینے پہ ایک بوجھ دھرا تھا۔ اب جا رہا تھا تو اس بوجھ کا وزن کئی گنا زیادہ ہو گیا تھا۔ اتنا کہ اس کو سانس لینے میں تکلیف ہونے لگی تھی۔ اس کی رگیں سکڑنے لگیں تھیں۔ وہ اس بوجھ کو اٹھا کر پھینک دینا چاہتا تھا۔

اس نے کنپٹیاں دبائیں اور گھنٹی بجا کر ایئر ہوسٹس کو بلایا اور چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لانے کو کہا۔ آدھے گھنٹے تک سر درد میں آرام آگیا، مگر ضمیر نام کی بھی ایک شے ہوتی ہے، جو بیدار ہو تو دماغ پر دھرا بوجھ کم ہونے نہیں دیتی اور مصیبت یہ کہ نیند کی کوئی گولی ایسی نہیں کہ اس کم بخت ضمیر، ملال اور احساس کو سلایا جا سکے۔ اس کی نظر کے سامنے سے حدیقہ کا مرجھایا ہوا زرد چہرہ جا تا نہ تھا۔

کاش! آسکر ایوارڈ کا لالچ اسے ذوا تا کی نجی زندگی میں جھانکنے کا خیال پیدا نہ کرتا۔ کاش! وہ اس کے رونے پہ نہ تڑپتا۔ کاش! وہ اس کے حسن کا شیدائی نہ ہوتا۔ کاش اس کے دل میں اس کے لیے ہمدردی اور ترس کے جذبات پیدا نہ ہوتے۔ کاش! یہ جذبہ کسی اور جذبے کے قلب میں نہ ڈھلتا۔ بہت سارے کاش اس کی زندگی کے ساتھ جڑ چکے تھے، مگر جب وہ ذوا تا کے ساتھ ہوتا تو یہ کاش مٹتے جاتے، ایک ایک کر کے ختم ہوتے جاتے، پھر وہ اس وقت کا مشکور ہوتا جس لمحے وہ اس کی زندگی میں آئی۔

مگر جب وہ حدیقہ کے بارے میں سوچتا۔ ایک بار پھر سارے کاش ایک ایک کر کے مالا میں پروئے چلے جاتے۔

وہ ہرجائی نہ تھا۔ دل پھینک بھی نہ تھا۔ بس وقت اس کے ساتھ ایک کھیل یہ کھیل گیا کہ ترتیب غلط کر گیا۔ اگر ذوا تا کروبی اس کی زندگی میں پہلے آجاتی تو وہ کبھی حدیقہ کی زندگی خراب نہ کرتا۔ کبھی اسے خواب نہ دکھاتا، مگر یہ جو دل اور بخت ہیں ناں، یہ وقت اور ترتیب کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہ کب کہاں پلٹا کھا جائیں، کب کہاں دھوکہ دے جائیں، خبر ہی نہ ہو پاتی۔ ان کو نہ وقت کی فکر ہوتی ہے اور نہ ترتیب کی پروا۔

دائم چلا گیا تھا، ساتھ ہی اس کے لبوں سے مسکان اور اس کی زندگی سے رعنائی لے گیا۔ اس کو لگتا تھا، مرد ذات کو سمجھ گئی ہے۔ بے وفائی کہیں اس کے خمیر میں گوندھ دی گئی ہے۔ اب جب وہ ایک مرد دائم غنی سے نفرت نہیں کر پائی تھی تو دوسرے مرد کو اسی فعل کی سزا کیا دیتی۔ اس لیے باپ کے ساتھ تعلقات میں اس قدر بہتری آئی تھی کہ اب وہ ان کو دیکھ کر منہ نہیں پھیرتی تھی۔ بات چیت اس حد تک شروع ہوئی کہ وہ ان کی بات کا جواب دے دیتی۔

☼ ☼ ☼

نیویارک بوٹنیکل گارڈن میں موسم بہار کا فلاور شو تھا۔ دائم نے ذوا تا کو ساتھ چلنے کی دعوت دی تھی۔ یہاں آکر دائم کو اندازہ ہوا کہ وہ تو پھولوں کی دیوانی تھی۔ اس کا موڈ ایک دم خوشگوار ہو گیا تھا۔

"تمہیں کیسے پتا چل جاتا ہے دائم! آج میں اداس ہوں، آج میں خوش ہوں۔ مجھے کیا پسند ہے؟" وہ سرخ و سفید گل لالہ پہ جھکی اس سے پوچھ رہی تھی، وہ ہلکے سے ہنس دیا۔

"میں اپنی کھڑکی میں سے تمہارے کمرے میں جھانکتا ہوں۔" اس نے ایک دم سنجیدہ ہوتے ہوئے اسے بہت غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا۔" وہ ہنسی۔ "میں نے تو تمہیں وہاں کھڑے نہیں دیکھا۔"

"میں تمہاری نظروں میں آئے بغیر یہ کام کرتا ہوں۔"

وہ ہنستی رہی۔ "اچھا۔" وہ اس کی بات کو سراسر مذاق لے رہی تھی۔

"میری کھڑکی تمہارے ساتھ والے کمرے کی کھڑکی نہیں، تیس بتیس فٹ کا فاصلہ ہے بیچ میں۔" "میں دوربین لگا کر دیکھتا ہوں۔" وہ لاشعوری طور پر شاید یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جب اس کو خبر ہو گی کہ دائم کس طرح سے اس کی نجی زندگی میں جھانکتا رہا تو اس کا رد عمل کیسا ہو گا۔ اور اس کا اندازہ دیکھ کر پہلی دفعہ اس کو یہ ڈر محسوس ہوا کہ جب اس کا یقین ٹوٹے گا تو اس کا رد عمل کیا ہو گا۔

ایک جواب اور بھی تھا اور یہ جواب پہلے جواب سے زیادہ سچا تھا کہ اب وہ کھڑکی میں اپنا کیم کورڈر اس طرح نہیں سیٹ کرتا تھا کہ وہ ذوا تا کروبی کے شب و روز کو ریکارڈ کر سکے اور ذوا تا کروبی کو یا کسی دوسرے کو خبر بھی ہو۔ اب تو وہ اس کی بند کھڑکی کی طرف دیکھنے سے بھی احتراز برتتا تھا۔ پھر بھی ذوا تا کروبی کے چہرے پہ ایک نگاہ ڈال کر وہ سمجھ جاتا تھا کہ آج وہ چپ چپ سی ہے، آج وہ پریشان ہے۔ آج وہ روئی ہے۔ آج وہ ٹھیک ہے۔ جانے کیوں وہ یہ جواب دے نہ پایا۔

"دائم! دیکھو۔" اس کے ہاتھ میں ادھ کھلا گلابی گلاب تھا۔

"دائم! میری روشنک اس پھول سے زیادہ پیاری ہے۔" اس کی آنکھوں میں بے تحاشا پیار کے ساتھ ساتھ جدائی کی نمی بھی تھی۔ اس کے چہرے پہ ممتا کا لاثانی حسن تھا۔ اس نے اس گلابی کلی پر اپنے لب رکھ دیے۔ دائم اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی اداسی کا، اس کی خوشی کا، اس کی پسند کا تعلق روشنک سے ہی ہوتا تھا۔ اس کی بیٹی اسپتال میں تھی تو وہ یہاں تڑپ رہی تھی۔ اس کی بیٹی کی سالگرہ تھی تو وہ خوشی سے ناچ رہی تھی۔ گلابی رنگ اس کی بیٹی پہ بہت سجتا تھا، اس لیے وہ کیرن کو گلابی رنگ پہنائے رکھتی تھی۔ وہ دنیا میں چلتی تو صرف ایک ماں ہوتی۔ وہ سجدوں میں گری ہوتی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے مصلیٰ پر بیٹھی ہوتی تو صرف اللہ کی بندی ہوتی، صرف اور صرف ایک امتل (بندی) ہوتی۔

"پتا نہیں اس کی زندگی میں میں کہاں ہوں؟"

دائم نے اس لمحے کو کیمرے میں محفوظ کرتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

جو جہاں تھا جس زاویے پہ تھا، وہیں وہیں کا وہیں جم گیا۔ سب سے پہلے ہوش میں رومانہ آئی۔

"مبارک ہو آپ کو۔" وہ اس کی طرف پھولوں کا گلدستہ بڑھائے کہہ رہی تھی۔

رومانہ پھر سے سکتے میں۔ حدیقہ نے خود کشی کرنے کی جو کوشش کی تھی اور عالم نے انتہائی قدم اٹھانے کی اسے دھمکی دے ڈالی تھی۔ وہ تو جیسے مرنے جیسی ہو گئی۔ عالم اسے چھوڑ دیتے تو اس کی زندگی میں کیا

بچتا۔ پھر سے جا کر بھائیوں بھابھیوں کے درپہ بیٹھ جاتی۔ عالم نے جو کہا تھا وہ کر بھی ڈالتے‘ اگر حدیقہ انہیں منع نہ کرتی۔ کچھ بھی تھا‘ اس منہ پھٹ بدتمیز لڑکی کا یہ احسان تو اسے ماننا ہی تھا۔ اس لیے اس کے بعد سے یہ ہوا تھا کہ رومانہ کوشش کرتی کہ اب اس کے منہ نہ لگے تاکہ کوئی بدمزگی نہ پیدا ہو۔ حیرت انگیز طور پر اب حدیقہ بھی اس کا سامنا ہونے پر اسے نظر انداز کرکے آگے بڑھ جاتی یا اس جگہ سے اٹھ جاتی۔ لیکن آج اس طرح اول تو وہ اس کے اسپتال آنے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اب آگئی تھی تو یہ لہجہ‘ یہ انداز ناقابل یقین تھا۔ خود کو ہوش میں لاتے ہوئے اس نے پھول تھام لیے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ عالم مرتضیٰ کی طرف مڑگئی۔

”آپ کو بھی بہت مبارک ہو۔“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ آج جو خوشی ملی تھی‘ وہ مکمل اب ہوئی تھی۔ ان کو بھی کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر وہ گلابی کمبل میں لپٹے ننھے سے وجود کی طرف آئی جو عفت کے ہاتھوں میں تھا۔

”مجھے مبارک باد نہیں دو گی؟“ ماما نے کہا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر انہیں دیکھا اور نم آنکھوں کے ساتھ مبارک باد دے کر بچی کے ننھے ننھے ہاتھ تھامے۔

”حدیقہ! اس کی آنکھیں بالکل تمہارے جیسی ہیں۔“ رومانہ کہہ رہی تھی۔ اب اسے بھی اپنا ظرف بڑا کرنا تھا۔

”دراصل میں حدیقہ کی آنکھیں اپنے بابا جیسی جو ہیں۔“ ماما کے کہنے پہ اس کی نظریں بے اختیار باپ کی طرف اٹھیں۔ وہ بھی اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ وہ بچی کے ہاتھ چھوڑ کر جلدی سے باہر آ گئی۔

☼ ☼ ☼

وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا‘ جب اسے باہر پولیس کی گاڑیوں کی آواز سنائی دی اور پھر غیر معمولی شور کی۔ وہ کھڑکی کے سامنے آیا اور اس کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھنے لگا۔ وہاں پولیس کی گاڑیوں کے علاوہ ایک ایمبولینس بھی کھڑی تھی۔

وہ نیچے آیا تو اسے پتا چلا کہ رات یہاں کسی لڑکی کا قتل ہو گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے بتایا کہ اس لڑکی کے ساتھ زیادتی بھی کی گئی تھی۔ صبح صبح ایسی افسوس ناک خبر اسے بھی بے حد افسردہ کر گئی۔ اس نے اس لڑکی کیٹ کو آتے جاتے دیکھا ہوا تھا۔

دو دن بعد اسے اس قتل کا اصل سبب معلوم ہوا۔ دراصل کیٹ ایک قتل کی چشم دید گواہ تھی۔ اس کی گواہی کے بعد مجرم کیفر کردار تک پہنچا مگر اس کا گینگ کیٹ کو زبان کھولنے اور سچ بولنے کی ایسی سزا دینا چاہتا تھا کہ آئندہ کوئی ایسی جرات نہ کر پائے۔ تین بندوں نے رات اس کے اپارٹمنٹ میں آکر اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر اسے جان سے مار ڈالا۔

وہ کیٹ کے لیے بہت دکھی ہوا اور اس کی ماں سے افسوس بھی کیا۔ جو اس رات اپنی بیٹی پر بیتتی یہ قیامت اپنی آنکھوں سے دیکھ چکی تھی۔ اس کے لبوں پر تالا لگ چکا تھا۔ وہ ان چہروں کو پہچان سکتی تھی مگر اس نے پولیس کے سامنے یا کسی دوسرے بندے کے سامنے منہ نہ کھولا۔ وہ اپنی بیٹی کا حشر دیکھ چکی تھی۔

ذوناتا بھی اس وقت کیٹ کی ماں کے پاس کھڑی تھی۔ وہ اسے تسلی دینے آئی تھی مگر دے نہ پائی اور خاموشی سے واپس چلی گئی۔ چونکہ یہ حادثہ ابھی نیا تھا اور اس علاقے کے لوگ ابھی تک اسی پر بات کر رہے تھے مگر اس نے ذوناتا کروبی کو اس موضوع پر ایک دفعہ بھی بولتے نہ دیکھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کسی بڑے صدمے میں ہے۔ حالانکہ اس کی کیٹ سے کوئی ایسی دوستی بھی نہ تھی۔ کیٹ کی آخری رسومات کے دن وہ اسے اپنی مخصوص جگہ پر دکھائی دی۔ اس وقت موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور وہ بغیر کسی چھتری کے کھلے آسمان تلے بیٹھی تھی اور ہڈیوں کے اندر گھس جانے والی شدت کی سردی تھی آج اور اس تشویش سے بڑھ کر پریشانی اسے یہ ہوئی کہ وہ رو رہی تھی۔

دور سے دیکھ کر بھی صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ وہ جلدی سے اس کی طرف آیا اور اسے پکارا۔ اس نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے اور اس کی طرف ایک نظر دیکھ کر اپنے ناخنوں پہ ساری توجہ مبذول کر ڈالی۔

”یہاں کیوں بیٹھی ہو اتنی بارش اور سردی میں۔“ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ پھر سے بھیگنے لگا۔

”کیا تم نے کیٹ کی موت کا اتنا اثر لیا ہے؟“ وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر زور سے رو پڑی۔

”اگر وہ عدالت میں مائیکل کے خلاف گواہی نہ دیتی تو۔

اسی لیے...... اسی لیے اللہ نے عورت کی گواہی آدھی رکھی۔ اسی لیے اس کا بوجھ کم کیا‘ کیونکہ اللہ کو اپنی اس تخلیق سے پیار ہے۔ وہ جانتا ہے عورت کن امتحانوں سے گزر سکتی ہے۔ وہ جانتا ہے‘ یہ وحشی درندے اس کے ساتھ سچ بولنے پر کیا سلوک کر سکتے ہیں۔ وہ جانتا ہے‘ عورت کمزور ہے‘ ناتواں ہے‘ نادان ہے۔ اس نے اس کے کندھوں پہ کم بوجھ رکھا‘ اس کی ذمہ داری کم کی‘ اس کو سنبھالا اس کو اپنی حفاظت میں رکھا۔ اور ہم چیختے رہتے ہیں کہ عورت کی گواہی اور شہادت کو آدھا تسلیم کرکے اس کے پیچھے کر دیا۔“ اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔

”اللہ نے عورت کی گواہی کی حیثیت ختم نہیں کی کہ اس کی شہادت کو بالکل تسلیم کرنے سے انکار نہ کیا جاسکے مگر اس گواہی کو آدھا کرکے ان پیچیدہ اور تکلیف دہ معاملات سے دور کر دیا ہے۔“ دائم نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کی صورت دیکھی‘ جس کو موسم کی پروا تھی نہ ہی شدید سردی کا احساس۔

”دائم! یہ تو میری عقل اور سمجھ میں آنے والی بات ہے‘ ایک عام انسان کی سوچ جہاں تک جا سکتی ہے۔ حقیقت میں تو ہم اللہ کی مصلحتوں کو اس کے اسرار کو کبھی جان نہیں پاتے۔“

”ٹھیک کہتی ہو ذوناتا! ہم اللہ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرتے ہیں ناں اور محبت کا تقاضا تو یہ ہے ناں کہ محبوب کی ہر بات کو مان لیا جائے‘ بنا کسی تردد کسی حجت کے۔“

”مگر کچھ مجھ جیسے بدبخت‘ نافرمان اور سرکش بھی ہوتے ہیں دائم...... جو اللہ سے لڑائی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ نہیں سمجھتے کہ تمام معاملات‘ حیات و کائنات کا ہر ضابطہ‘ ہر مصلحت‘ ہر اصول اللہ نے اپنے طیب کلام میں بیان کر دیا اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہر نمونہ مل گیا۔

اللہ نے کہہ دیا کہ اس نے مرد اور عورت کو نفس واحدہ سے پیدا کیا۔ اگر اسے عورت کو کمتر بنانا ہوتا تو کیا اس کے پیغمبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سلوک اپنی بیٹیوں اور ازواج مطہرات کے ساتھ ایسا اعلا اور پیارا ہوتا؟ کیا دور جہالت کا بیٹی کو زندہ دفنانے والا قصہ سن کر ان کی آنکھیں بھر آتیں؟ کیا اپنے سے پندرہ سال بڑی رفیقہ حیات کو یاد کر کر کے آبدیدہ ہوتے؟ کیا عورت کے لیے رحمت بن کر آتے؟ کیا اس کو نازک آبگینہ کہتے...؟“ اس کی آنکھیں پھر سے بھرنے لگیں۔

”المیہ اصل میں یہ ہے ذوناتا! کہ ہم اسلام کی حقیقی تعلیمات سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ مثلاً ”عورت کی گواہی کن معاملات میں آدھی ہے‘ یہ کنڈیشنز بتا دی گئیں۔ عورت پہ کن حالات میں ہاتھ اٹھا سکتے ہیں‘ یہ صورت حال بتا دی ہیں۔ طلاق کیسے ہوتی ہے‘ یہ طریقہ کار بتا دیا گیا ہے‘ حلالہ اصل میں ہے کیا‘ یہ واضح کر دیا گیا ہے۔ ان سب حالات و معاملات کی غلط پریکٹس نے مرد کو اپنی فیور میں لے لیا اور وہ عورت کا اصل مقام اور تقدس بھول گیا۔ اس عورت کا جو ماں ہے تو جنت اس کے قدموں تلے ہے‘ جو نیک بیوی ہے تو بہترین متاع ہے‘ جو بیٹی ہے تو رحمت ہے۔“

وہ یک ٹک اس کی صورت دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔

یہ شخص بھی تو ایک مرد ہے' جو اپنی ماں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے چہرے پہ اتنی چمک اور رونق آجاتی ہے جیسے کسی جنت کی سیر کر رہا ہو۔ جو کہتا ہے کہ اس کی خواہش ہے' اللہ اس کو بیٹی جیسی رحمت ضرور عطا کرے۔ جو اپنی بہن سے بات نہ کرلے تو اس کا دن اچھا نہیں گزرتا۔

جو اپنی منکوحہ سے محبت کرتا ہے' اس کی عزت کرتا ہے' اس پہ اعتبار کرتا ہے اور جس عورت کو شوہر کی طرف یہ سب مل جائے' اس سے زیادہ بختوں والی اور کون ہوگی۔ اسے حدیقہ عالم پر بے تحاشا رشک آیا اور ساتھ ہی خود پر ترس۔

"اگر میری زندگی میں امیر کروبلی یا ماہ یار محسنی جیسے مردوں کے بجائے کوئی دائم منیب آیا ہوتا تو میں اتنی پستی میں نہ گرتی۔"

☼ ☼ ☼

وہ اسے دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ سفید شلوار قمیض میں دمک رہی تھی۔ اس لباس میں اسے دیکھنے کی کتنی آرزو تھی اس کی۔

"میں نے سوچا' اپنے جنم دن پر تمہارا دیا ہوا تحفہ ہی پہنوں۔" اس نے دودھیا سفید آنچل اس کے سامنے لہرایا۔

"شمابہ دنبال بسیار زیبا (تم بہت خوبصورت لگ رہی ہو)۔" اس نے پھولوں کا گلدستہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ شہد رنگی آنکھوں میں ڈھیروں حیرت لیے اسے دیکھتی چلی گئی۔

"تعجب کردید؟ (تمہیں حیرت ہوئی؟)" دائم نے اس کی حیران صورت دیکھ کر محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہنس دی۔ دائم منیب اس پر سے نگاہ نہیں ہٹا پایا۔

"تم نے فارسی کب سیکھی؟"

"تم سے ملنے کے بعد۔" اس کا لہجہ گھمبیر تھا۔

"تم سے مل کر اندازہ ہوا کہ ایرانی خواتین کتنی خوبصورت ہوتی ہیں' تو ان کو متوجہ کرنے کے لیے سیکھنی پڑی۔ اور اسی لیے سب سے پہلے تعریفی جملے ہی سیکھے۔" اس نے دانستہ اپنا لہجہ بدل لیا۔ وہ ہنس پڑی۔ اب مسکراہٹ اور ہنسی اس پر غیر نہیں لگتی تھی۔ اب دائم منیب ہر پل اسے اسی رنگ و روپ میں دیکھنا چاہتا تھا۔

دونوں نے ساتھ کھانا کھایا' تھیٹر میں ڈرامہ دیکھا اور پیدل ساتھ ساتھ چلتے ڈھیروں باتیں کیں۔ دونوں کو اپنی اپنی جگہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ لمحے ان کی زندگی کے حسین ترین لمحے ہیں' یہ دن ان کی زندگی کا بہترین دن ہے۔

"مجھے ایسا لگنے لگا تھا' اب میری زندگی میں اب کوئی رشتہ باقی نہیں رہا.... لیکن تم سے مل کر اب ایسا نہیں لگتا دائم!" وہ واپسی پہ اس کے اپارٹمنٹ کے دروازے کے سامنے الوداع کہنے والا تھا' جب وہ کہہ اٹھی۔

وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔ جو ان پھولوں کی تازگی کو ان کی خوبصورتی کو چھو کر محسوس کر رہی تھی۔

وہ کچھ دیر اسے تکتا رہا پھر عین اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"اب کیا لگتا ہے تمہیں؟" وہ گمبھیر لہجے میں اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"اب لگتا ہے.... ایک بہت اچھا دوست میرے پاس ہے۔ میں تہی داماں نہیں۔" وہ سادگی سے کہتی ہوئی مسکرائی اور دروازے کا لاک کھولنے لگی۔

"صرف دوست؟"

"ہاں تو صرف دوست۔ اور کیا" وہ ہلکا سا ہنسی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگی۔

"صرف دوست؟" دائم نے پیچھے سے اس کا بازو تھام لیا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

"ہاں' صرف دوست۔" اس نے اپنے لفظوں پر زور دینے کی کوشش کی۔

"مگر مجھے نہیں لگتا کہ ہم صرف دوست ہیں۔" اس کے بدلے ہوئے لہجے اور بدلی ہوئی نگاہوں سے وہ سرتاپا لرز گئی۔

"تم پاگل ہو رہے ہو۔" اس نے بات کو پھر ہلکا پھلکا رنگ دینے کی کوشش کی۔

"ہاں... پاگل ہو رہا ہوں۔ مجھے حدیقہ کا برتھ ڈے یاد نہیں رہا، تمہارا یاد رہا۔ مجھے حدیقہ کی آنکھوں کا اصل رنگ پتا ہی نہیں، تمہاری شہد رنگ آنکھیں مجھے بھولتی نہیں۔ مجھے حدیقہ کا پسندیدہ رنگ معلوم نہیں، تمہاری پسند کا سفید رنگ کا لباس لے لیا۔ یہ پھول پوری مارکیٹ میں ڈھونڈ کر تمہارے لیے چنے۔" اس نے اس کے ہاتھوں میں موجود گلابی گلابوں کے گل دستے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ششدر کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔

"ذواتا! تم میرے لیے محض دوست نہیں رہیں۔"

"دائم! تم پاگل ہو گئے ہو کیا... حدیقہ جان گئی تو..."

"حدیقہ جانتی ہے۔" وہ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے بول پڑا۔ اسے لگا وہ اپنی ٹانگوں پر کھڑی نہ رہ پائے گی۔

"دائم... تم اپنے ہوش و حواس میں نہیں۔"

"میں اپنے ہوش و حواس میں ہوں اور تم سے اقرار کر رہا ہوں ذواتا! کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" زمین اس کے پیروں تلے سے کھسک رہی تھی۔

"تم غلط کر رہے ہو حدیقہ کے ساتھ اور میرے ساتھ بھی۔"

"کیا غلط کر رہا ہوں۔ اگر میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں تو اس میں کیا غلط ہے؟؟"

"دوسری شادی... دوسری شادی مذاق نہیں ہوتی۔ کسوٹی ہوتی ہے مرد کے لیے۔ پل صراط ہے یہ... ایک سے زیادہ شادیاں مرد کے لیے ڈھیل نہیں، پکڑ ہیں۔ اس میں مرد کی آزادی نہیں، مرد کی آزمائش ہے۔ بہت بڑی آزمائش۔ مرد کو یہ یاد رہتا ہے کہ وہ چار شادیاں کر سکتا ہے، مگر اسے یہ بھول جاتا ہے کہ اسے بیویوں کے بیچ انصاف بھی رکھنا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر پورا اترنا نہایت مشکل کام ہے۔ اگر مرد یہ جان جائے ناں کہ یہ کتنا مشکل امر ہے تو وہ دوسری شادی کرتے ہوئے ہزار بار سوچے۔ تم بھی سوچو... کیا تم انصاف رکھ پاؤ گے اپنی دونوں بیویوں میں۔"

اب وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔ اور وہ نظریں جھکا گیا تھا۔ ننانوے فیصد مردوں کی طرح اس نے اس باریک نقطے کی طرف دھیان ہی نہ دیا تھا، جو سب سے اہم تھا اور وہ بہت مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"جاؤ، جا کر قرآن پاک کی تلاوت کرو۔ اس کا ترجمہ و تفسیر پڑھو، سمجھو۔ پھر شادی کا سوال لے کر میرے پاس آنا۔"

☼ ☼ ☼

جب سے اسے پتا چلا تھا کہ جو عورت اس کے برابر آکر کھڑی ہو گئی ہے وہ کوئی اور نہیں ذواتا کرونی ہی ہے، اس کے اندر بھانبھڑ جلنے لگے تھے۔

وہ دو ٹکے کی گھٹیا عورت... جس کے جانے کتنے شوہر، کتنے بوائے فرینڈز رہ چکے ہیں بدکردار... بدچلن... کافرہ... جو کہتی ہے مرد کا دل دوسری عورت کی طرف پھر سکتا ہے تو عورت کا دل بھی ایک مرد سے بھر سکتا ہے۔ ایسی غلیظ عورت کو دائم نے اس کے برابر لا کھڑا کیا۔ اس کے اندر آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کا بس نہ چلتا تھا کہ سب جلا کر بھسم کر ڈالے۔ ایسی عورتیں کب گھر بساتی ہیں، کب کسی ایک کی ہو کر رہتی ہیں۔ آجائے گا مزا دائم منیب کو بھی اس سے بے وفائی کرنے کا۔ اپنی پاک دامن بیوی کو چھوڑ کر ایک حرافہ کے پیچھے بھاگنے کا۔

"آؤ گے... لوٹ کر میری ہی طرف آؤ گے دائم منیب۔" اس نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا۔

اور جب دائم کا فون آیا، تب تک وہ اپنے آپ پر قابو پا چکی تھی۔ اس لیے بڑے آرام سے اس نے دو چار باتوں کے بعد اس سے پوچھا تھا۔

"پھر تم نے ذواتا کو پروپوز کیا؟"

دوسری طرف خاموشی رہی تھی۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

"نہیں۔" اس نے جھوٹ بول کر گہرا سانس لیا۔

ذواتا اس کے سامنے ہوتی تو وہ حدیقہ سے جڑا رشتہ بھولنے لگتا۔ مگر اس سے بات کرتے ہوئے وہ اس کا ذکر نہ کرتا۔ وہ دانستہ اسے تکلیف سے بچاتا۔

"کیوں... تم تو مرد کی ایک سے زیادہ شادیوں کو صحیح سمجھنے لگے تھے پھر اس کو پروپوز کیوں نہیں کیا ابھی تک؟"

"مجھے لگتا ہے، میں دونوں کے بیچ انصاف نہیں رکھ پاؤں گا۔"

حدیقہ کو لگا ایک بار پھر زمین اس کے قدموں تلے سے کھسک گئی ہے۔ ایک بار پھر طمانچہ اس کے منہ پر لگا ہے اور طمانچہ مارنے والا کون... اس کا محبوب شوہر۔

تو دائم منیب اب میں تمہاری پچاس فیصد محبت کی حقدار بھی نہیں رہی۔ اب میں اتنا پیچھے چلی گئی ہوں کہ تم ڈرتے ہو کہ انصاف نہیں کر پاؤ گے۔

اتنی ذلت اسے گوارا نہ تھی۔ اس نے پل بھر میں فیصلہ کر لیا۔

"تمہیں ڈر ہے ناں کہ تم میرے اور ذواتا کے بیچ انصاف نہیں رکھ پاؤ گے تو پھر خوش ہو جاؤ کہ تمہیں اس آزمائش سے گزرنا نہیں پڑے گا۔" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولی۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔

"کیا مطلب؟"

"مجھے طلاق دے دو۔"

اب کی بار دائم کو لگا تھا کہ اس کے قدموں کے نیچے سے کسی نے کھینچ لی ہو۔

"کہتے ہیں شادی اس سے کرو، جو تمہیں چاہتا ہو۔ تمہارے حصے میں یہ خوش بختی آئی، پر تم نے قدر نہ کی۔" وہ خاموشی سے سن رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اسے سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ وہ کہہ کیا رہی ہے۔

☼ ☼ ☼

رات ڈھل رہی تھی مگر اسے نیند نہ آرہی تھی۔ بے چینی سے ادھر ادھر چکر لگا رہی تھی۔ کسی پل قرار نہ تھا۔

"کہیں وہ مجھے سچ میں طلاق نہ دے دے۔" یہ ڈر اسے بھلا سونے دیتا؟ کہنے کو وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ چکی تھی۔ مگر اب اسے لگ رہا تھا کہ دائم نے اسے چھوڑا تو وہ مر جائے گی۔

"کیوں میں اس شخص کے پیچھے خوار ہوں، جس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں رہی۔ جو مجھ پر ایک گھٹیا عورت کو اہمیت دیتا ہے... میں اسے دکھاؤں گی کہ میں اس کے بغیر مر نہیں جاؤں گی۔" وہ کشمکش میں گھری کمرے سے باہر آگئی۔

"مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تو... تو باقی کیا رہ جائے گا میری زندگی میں۔" پھولوں بھرا باغیچہ آدھی رات کو اس کے قدم گن رہا تھا۔

"بے شک چھوڑ دے وہ مجھے... میں اس کو دکھا دوں گی کہ اس کے بغیر بھی میری زندگی میں رنگ ہیں، چاہت ہے، محبت ہے۔" موتیا کے پودے کے پاس کھڑی ہو کر اس نے اپنے اندر چھڑی جنگ کا فیصلہ سنا دیا۔

لیکن سر تھا کہ مسلسل نفی میں ہل رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

دائم منیب اپنے آپ کو جانتا تھا۔ اسے خبر تھی کہ توازن نہ رکھ پائے گا۔

حدیقہ اس کے سامنے ہوتی تو اسے ذواتا یاد رہتی، مگر جب ذواتا اس کے ساتھ ہوتی تو حدیقہ کو بھول جاتا۔ اس کا وجود یکسر فراموش ہو جاتا۔ اگر معاملہ یوں ہی رہتا تو وہ عمر بھر دونوں کے ساتھ برابری کا سلوک نہ کر پاتا۔ ذواتا نے صحیح کہا تھا۔

دوسری شادی مذاق نہیں ہوتی۔ کسوٹی ہوتی ہے مرد کے لیے۔ پل صراط ہے یہ... ایک سے زیادہ شادیاں

مرد کے لیے ڈھیل نہیں' پکڑ ہیں۔ اس میں مرد کی آزادی نہیں' مرد کی آزمائش ہے۔ بہت بڑی آزمائش۔

اسے آگہی تھی کہ وہ اس آزمائش پہ پورا نہ اتر سکتا تھا۔ جبکہ اللہ نے اپنے کلام کے ذریعے کھول کر بیان کردیا کہ یہ ایک مشکل امر ہے۔ وہ حدیقہ کا ہاتھ بیچ راہ میں چھوڑ کر ذوا تا کا ہاتھ تھام کر بے حسی سے آگے بھی بڑھ نہ سکتا تھا۔ اس لیے اس نے کئی راتوں کے رت جگے کے بعد فیصلہ کر لیا تھا۔ یہ اور بات کہ اس فیصلے کے بعد اسے مسکرانا مشکل لگ رہا تھا۔ سانس لینا بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اور اب جبکہ حدیقہ اس سے طلاق مانگ رہی تھی۔ اسے تو مطمئن ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ اپنی خواہش پہ طلاق مانگ رہی تھی۔ اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ رہتا اور وہ آرام سے اپنی چاہت کی طرف قدم بڑھا سکتا تھا۔ مگر یہ بے سکونی... بے قراری کیسی... وہ اپنا سر ہاتھوں میں تھام کر رہ گیا۔ اسے یہ ادراک ہوا تھا' پل بھر میں یہ بھید کھلا تھا۔

وہ حدیقہ کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ذوا تا کے بغیر رہ سکتا تھا۔ وہ کس موڑ پر آکھڑا ہوا تھا۔

موڑ پہ وقت آتا ہوگا۔ اسی لیے تو اللہ نے اسے اجازت دی کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھ سکتا ہے۔ اللہ کے ہر حکم میں' ہر فیصلے میں' ہر رعایت میں کیا مصلحت مضمر ہے۔ یہ ہر ایک پر اپنے وقت پر آشکارا ہوتی ہے۔ ہر ایک خود پہ بیتنے کے بعد سمجھتا ہے۔

"دائم! تم واقعی مجھے چھوڑ تو نہیں دو گے؟"

کئی گھنٹوں کی اندر کی جنگ کے بعد جب اس کی آنکھ لگی تو اس کو جگا کر وہ یہ سوال کر رہی تھی۔

اس کے جلتے وجود پہ ٹھنڈی پھوار پڑ گئی۔

"نہیں۔"

اس نے مطمئن ہو کر گہری سانس لیتے ہوئے نرمی سے جواب دیا تھا۔ حدیقہ نے فون رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

کرسٹوفر الیگزینڈر کے دیے گئے پروجیکٹ نے اس کو بہت مصروف کر ڈالا تھا۔ وہ بہت جوش و خروش سے یہ فلم تیار کر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ اس فلم کی تیاری نے اس کا دن رات کا آرام چھینا ہوا تھا۔ بہت دنوں سے ذوا تا سے اس کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

آج بھی آتے ہی وہ بیڈ پر گر گیا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔

رات کا جانے وہ کون سا پہر تھا جب اسے لگا کہ اس کے اپارٹمنٹ کا دروازہ دھڑ دھڑایا جا رہا ہے۔ کچھ دیر تو وہ گہری نیند سے جاگنے کی وجہ سے کچھ سمجھ نہ پایا۔ ڈور بیل پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا تھا۔ اس نے جلدی سے جا کر بنا پوچھے ہی دروازہ کھول دیا۔

سامنے ذوا تا تھی۔ ملگجے حلیے میں' سرخ آنکھوں کے ساتھ۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا' وہ بول پڑی۔

"دائم! میرے ساتھ چلو پلیز۔" آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھکنے لگے تھے۔ "وہاں... جہاں تازہ ہوا ہو' جہاں مجھے کھل کر سانس آئے۔ جہاں..."

"چلو۔"

دائم نے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے لے کر نیچے آگیا۔ وہ دونوں خاموشی سے ویران فٹ پاتھ پر چلتے رہے۔

اس دن کے بعد سے وہ اس سے کترانے لگی تھی۔ سامنا ہونے پہ اس کا رویہ نارمل ہوتا لیکن جو بے تکلفی ان دونوں کے بیچ پنپ چکی تھی' وہ مفقود ہو گئی تھی۔ آج وہ بہت دنوں بعد خود سے اس کے سامنے آئی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ یہ آنسو دائم کے دل پر گر رہے تھے۔ وہ ایک دم اس کی طرف مڑا۔

"پلیز مت روؤ... مجھے بہت تکلیف دیتے ہیں یہ آنسو۔" وہ اس کے چہرے پہ بکھرے موتیوں کو اپنے پوروں پہ چننے لگا۔ اس لمحے وہ پھر سے حدیقہ نام کی کسی بھی لڑکی کو بھول گیا۔ مر مر کر کیے گئے فیصلے کو بھول گیا۔

"دائم! تم چاہتے ہو کہ میں نہ روؤں تو مجھے اس تکلیف سے نجات دے دو' جو ان آنسوؤں کا سبب ہے... مجھے مار ڈالو۔"

"کیا؟" وہ ایک دم پیچھے ہوا۔

"پلیز دائم! مجھے مار ڈالو... تمہیں جنت مل جائے گی اور مجھے سکون۔"

"تمہیں کس نے کہا' اس طرح مجھے جنت ملے گی اور تمہیں سکون۔"

"تم ایک گستاخ کافرہ کو مار کر..."

"تم گستاخ نہیں رہیں' تم کافرہ بھی نہیں رہیں۔ تم توبہ کر چکی ہو۔"

"جو گناہ میں کر چکی ہوں۔ تمہیں لگتا ہے اللہ مجھے معاف کر دے گا...؟ میں نے اسے ظالم کہا۔" آنسو اس کی آنکھوں سے لڑھک رہے تھے۔

"وہ... وہ رحیم ہے' توبہ قبول کرنے والا ہے۔"

"وہ قہار بھی تو ہے۔"

"توبہ کرنے والے پہ وہ قہر نازل نہیں کرتا۔ اس کے بدلے میں اپنا رحم' اپنا کرم ڈالتا ہے۔"

"پھر مجھے قرار کیوں نہیں آتا۔" وہ بے بسی کی انتہا تھی۔ وہ کسی دہکتے الاؤ میں گری' تڑپ رہی تھی۔ اس کا عضو عضو جل رہا تھا۔ اس کی روح خاکستر ہوئی جا رہی تھی۔

"میں زندگی بھر یونہی پل پل جیوں گی' پل پل مروں گی۔ اور جب مر جاؤں گی تو لاوارثوں کی طرح' کسی سرد خانے میں پڑی رہوں گی۔ کوئی مجھے کندھا دینے نہیں آئے گا۔ کوئی میری مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگے گا۔ کوئی میری نماز جنازہ ادا نہ کرے گا..."

دائم غیب اس سے زیادہ خود کو بے بس پا رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اس الاؤ سے باہر نکالے۔ اس لیے اس کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔

"ذوا تا میری بات مانو گی؟؟" دائم نے اس کے پاس آ کر اس کے دونوں ہاتھ تھامے۔

"تم ایک بار پھر قلم اٹھاؤ۔"

اس نے نفی میں سر ہلاتے اپنے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی' جو دائم نے نہیں چھوڑے۔

"تم ایک بار پھر

women in islam Distinguished

(اسلام میں عورت کا درجہ) لکھو۔"

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی صورت دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

موسم نے اچانک اپنا مزاج بدلا۔ آسمان ایسا لال جیسے کسی کا خون منہ کو لگا آیا ہو۔ ایسی آندھی آئی کہ کچھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہر چیز مٹی مٹی ہو گئی۔ ہر شے اڑ کر آنکھوں میں پڑنے کو تیار تھی۔ اسے خبر ہوتی تو وہ اس وقت مامی کے گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ اس سے گاڑی چلانا دوبھر ہو گیا۔ اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مارتے ہوئے اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دادی کہتی تھیں' "ایسی لال آندھی تب آتی ہے' جب زمین پہ کسی بے گناہ کا' کسی معصوم کا خون ہوتا ہے تو آسمان ماتم کرتا ہے۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے ہلکا سا مسکرائی۔ اب تو ہر روز ہزاروں بے گناہوں کا خون ہوتا ہے۔ آسمان کس کس کا غم منائے۔ بڑی مشکل سے وہ گھر تک پہنچی۔ آنکھوں کو مسلتی ہوئی لاؤنج سے گزر رہی تھی جب اس کے کانوں میں آواز پڑی۔

"اسلام میں عورت کا درجہ۔" کی رائٹر ذوا تا کروبی پر انتہا پسند مسلمان کا جان لیوا حملہ۔ ذوا تا کروبی نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ قاتل گرفتار..."

اسے لگا' ساتوں آسمان اس کے سر پر آگرے ہوں۔ وہ اپنی جگہ سے ایک قدم بھی ہل نہ پائی۔

"حملہ کرنے والے شخص کا نام سجاد الحسین معلوم ہوا ہے' جو کہ پولیس کی حراست میں ہے..."

در و دیوار' چھت' زمین سب چکرانے لگے تھے۔ موبائل اور گاڑی کی چابی اس کے ہاتھ سے گر گئے۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ خود بھی دیوار کے ساتھ بیٹھتی چلی گئی۔

"ایرانی نژاد ذوا تا کروبی کو ان کی متنازعہ کتاب "اسلام میں عورت کا درجہ" کی اشاعت کے بعد ملک بدر کر دیا گیا تھا۔ وہ پچھلے پانچ سال سے مذہبی پناہ حاصل کرنے کے بعد امریکہ میں رہائش پذیر تھیں۔

مسلم فقہانے ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور بعض نے انہیں واجب القتل قرار دیا۔ جس کے بعد ان پر آج کے جان لیوا حملے سے پہلے بھی بھارت میں ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی ایک تقریب میں قاتلانہ حملہ ہوچکا تھا۔ انہوں نے امریکی سنگر جیمز وولف سے شادی بھی کی مگر یہ شادی زیادہ عرصہ چل نہ پائی۔" نیوز کاسٹر کی آواز اب تک آرہی تھی مگر اب وہ کچھ سننے کے قابل نہ رہی تھی۔

"میں نہیں چاہتی تھی.... میں نہیں چاہتی تھی ذوا تا! تم واقعی مرجاؤ۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ "میں نے دل سے بددعا نہیں دی تھی تمہیں.... میں تو.... میں تو بس...." وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ باہر لال آسمان ماتم کناں تھا۔

"حدیقہ!" عفت باہر آئیں تو اسے اس طرح روتے دیکھ کر پریشان ہو اٹھیں۔

"ماما...." وہ سسک اٹھی۔

"کیا ہوا میری جان۔" انہوں نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھاما۔

"ماما۔ میری بددعا اس کی جان لے گئی۔" وہ ان کے گلے لگ کر بلکنے لگی۔

"کیا کہہ رہی ہو بیٹا.... کیسی بددعا' کس کی جان؟" عفت پریشانی سے پوچھ رہی تھیں مگر اس کی نگاہوں کے آگے منت کرتا ہو دائم آکھڑا ہوا۔

"جو کہنا ہے مجھے کہو.... جو بددعا دینی ہے مجھے دو.... اسے کچھ مت کہو۔"

"دائم۔" اس کے منہ سے نکلا اور وہ ایک دم پیچھے ہو کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی۔ عفت پریشانی سے اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کے پیچھے گئیں' مگر وہ کمرا بند کرچکی تھی۔ وہ ایک دفعہ خودکشی کی کوشش کر چکی تھی' اس لیے اب وہ فوراً اس کی طرف سے پریشان ہو جاتیں۔ انہوں نے اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ دھڑانا شروع کردیا۔

"ماما! پلیز مجھے دائم سے بات کرنے دیں۔" دروازہ کھول کر وہ ان کے سامنے آئی۔ "وہ وہاں اکیلا ہے ماما...."

عفت کچھ نہ سمجھیں۔ وہ پھر سے اپنے کمرے میں بند ہو چکی تھی۔

وہ پریشان ہونے کے باوجود وہاں سے ہٹ گئیں۔

☼ ☼ ☼

کرسٹوفر الیگزینڈر کے دیے ہوئے پروجیکٹ کو مکمل کرنے کے لیے وہ پچھلے تین دنوں سے کھانا پینا' سونا جاگنا سب بھولا ہوا تھا۔ نیویارک میں کئی مذاہب سانس لیتے تھے۔ اس نے اور اس کے گروپ کے مائیکل اور سندھیا نے باہم مشورے سے ہر مذہب کی عبادت گاہ پہ ڈاکومنٹری فلم بنانے کا ارادہ کیا تھا۔ آج وہ مسجد الرحیم اور پھر سینٹ تھامس چرچ میں کام کرنے کا ارادہ لے کر گھر سے نکلا تھا اور کام کے دوران وہ صرف کام کرتا تھا۔ ہر وہ شے جو اس کے کام میں دھیان میں دخل انداز ہو' اسے پرے کردیتا تھا۔ اس لیے کام شروع کرنے سے پہلے موبائل کو بند کرنا بھی نہیں بھولتا تھا۔ جو وقت بے وقت بج اٹھتا تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد مائیکل اور سندھیا کو الوداع کہہ کر وہ بس اسٹاپ کی طرف چل پڑا۔ بس آنے میں ابھی پورے آٹھ منٹ باقی تھے۔ اس نے بینچ پر بیٹھ کر کیم کورڈر کا بیگ ساتھ رکھا اور تھکے سے انداز میں اس کی پشت سے ٹیک لگالی۔ اعصاب کو ذرا سکون ملا تو اس نے اپنا موبائل جیب سے نکالا اور آن کیا ہی تھا کہ حدیقہ کی کال آگئی۔

وہ حیران ہوا۔ بہت عرصہ ہوا' اس نے اب اسے خود سے کال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس پر اپنا حق جتانا چھوڑ دیا تھا۔ سو' اس وقت اس کا فون دیکھ کر اسے شدید حیرانی ہوئی۔ اس نے کال ریسیو کر کے کان سے لگایا ہی تھا کہ حدیقہ کی روتی ہوئی آواز آئی۔

"میں نے اسے بددعا نہیں دی تھی دائم.... یقین کرو میں نے اسے بددعا نہیں دی تھی۔" وہ بری طرح ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا' وہ بے حد پریشان ہو گیا۔

"حدیقہ کیا ہوا؟"

"دائم.... میں کبھی نہیں چاہتی تھی' وہ مرجائے.... میں نے تو بس یونہی.... یونہی.... کاش میں.... مرجاتی۔"

"حدیقہ۔"

"جیسے میں نے پاپا کے لیے کہا' جیسے ماموں کے لیے کہا.... حالانکہ میں کبھی نہیں چاہتی کہ وہ مرجائیں.... ایسے ہی میں نے اسے بھی کہہ دیا تھا۔ میری بددعا اسے مار گئی دائم! میری بددعا اسے مار گئی۔"

"کس کی بات کر رہی ہو حدیقہ!" وہ رات بھر جاگ کر اپنے پروجیکٹ کے حوالے سے کام کرتا رہا تھا۔ دن بھر بھی اسی میں لگا رہا۔ اس لیے اس وقت اسے اپنا ذہن چست اور تروتازہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آرہا تھا۔

"میری بددعا نے تم سے تمہاری خوشی چھین لی دائم!"

اس کے ذہن میں جھماکہ ہوا اور کچھ یاد آگیا۔ وہ اپنی جگہ جم سا گیا۔ پہلی بار اسے بہت غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس کا دل تیز تیز دھڑک کر رک سا گیا۔ حدیقہ کیا کہہ رہی تھی' اسے سنائی نہیں دے رہا تھا۔ حدیقہ کیا کہہ رہی تھی' اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

کب خبر تھی' تمہیں جانا ہی تھا
ہم سے دامن چھڑانا ہی تھا
تیرا غم سہہ جاتا' تو دو لفظ کہہ جاتا
جو سلسلہ تیرے میرے درمیاں رہا
وہ اک جینے کا ساماں رہا
تیرا غم سہہ جاتا' تو دو لفظ کہہ جاتا
خفا خفا بہار گئی ہجر کا موسم ٹھہر گیا
تیری یادوں میں بیت ہر پہر گیا
تیرا غم سہہ جاتا' تو دو لفظ کہہ جاتا
تجھے اکھیاں موند میٹھی نیند سونا تھا
ہمیں عمر بھر کو بے خواب ہونا تھا
تیرا غم سہہ جاتا' تو دو لفظ کہہ جاتا

سنگی بینچ پہ بیٹھ کر وہ بازو میں سر دیے بچوں کی طرح رودیا۔

کیسا عظیم نقصان ہو گیا اس کا' اور اس دکھ پہ کوئی اس کے آنسو پونچھنے والا نہ تھا۔ کوئی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کو سینے سے لگا کر دلاسا دینے والا نہ تھا۔ بس اک آسمان اس کا سنگی ساتھی بنا اس کا ساتھ نبھا رہا تھا۔ دونوں نے مل کر آنسو بہائے اور زمین نے ان دونوں کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

آج مسجد الرحیم میں شوٹ کرتے ہوئے اسے ایک دم سے ذوا تا کی یاد آئی تھی۔ اس کو یہاں کتنی بار اس نے آتے دیکھا تھا۔ سجدوں میں پڑے دیکھا تھا' سسکتے ہوئے اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے دیکھا تھا۔

"اے اللہ! ذوا تا کو معاف کردے۔" اس نے وہیں کھڑے کھڑے' بہت دل سے اس کے لیے دعا مانگی۔

سندھیا نے اس کا کندھا ہلا کر اسے متوجہ کیا کہ وہ کہاں کھو گیا ہے۔ وہ نفی میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

"مجھے پتا ہوتا تو میں آج تمہارے ساتھ رہتا' میں تمہیں آج گھر سے نکلنے ہی نہ دیتا۔ میں تمہیں مرنے نہ دیتا...." وہ بندہ بشر تھا۔ عالم دکھ میں عام آدمی کی طرح بھول گیا تھا کہ وہ حی و قیوم ہے' معید و مقیت ہے۔

ساری رات وہ سو نہیں پایا تھا۔ اسپتال کے اندر باہر چکر کاٹتے ہوئے' وہاں کے عملے اور پولیس کی منتیں کرتے ہوئے' سڑکوں کی خاک چھانتے ہوئے وہ سسک سسک کر روتا رہا تھا۔ اٹھارہ گھنٹوں کی خواری کے بعد وہ اسے دیکھ پایا تھا۔

"اب تو مجھے اللہ کے پاس جا کر ہی سکون ملے گا۔"

اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے تابوت میں چہرہ دیکھا۔ اس وقت اسے اس کے منہ سے اکثر نکلنے

والے یہ الفاظ یاد آئے۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس نے آخری بار اسے اسی رات دیکھا تھا۔ جس کے طلوع ہونے والے سورج نے اسے دائمی جدائی بخش دی تھی۔

اس رات جب وہ اپنے بستر پہ جانے لگا تھا تو جانے کیوں اس کا بہت جی چاہا کہ ذوا تا کو دیکھے' اس سے بات کرے۔ وہ اپنے فیصلوں سے پیچھے نہ ہٹتا تھا مگر ذوا تا کے معاملے میں اپنے فیصلے پہ قائم رہنا اس کے لیے مشکل ترین امر بن گیا تھا۔ اس معاملے میں دل سب سے بڑا باغی تھا۔ وہ نہ نہ کرتا ہوا اٹھ کر کھڑکی میں آکھڑا ہوا۔ یہ دیکھ کر اسے عجیب سا اطمینان ہوا کہ اس کی کھڑکی کھلی تھی۔ وہ آج بھی اسی حالت میں تھی' جس میں اس نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ سر تا پا چادر میں لپٹی ہوئی' سجدے سے اٹھتی ہوئی۔ اس کے پاس کیم کورڈر نہیں تھا۔ پھر بھی وہ جان گیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ اس لمحہ اس نے اپنے رب سے دعا مانگی تھی۔

"اے میرے رب! ذوا تا کو سکون عطا فرما۔"

اسے لگا تھا اس کی دونوں دعائیں مستجاب ہوئیں۔ جاتے جاتے ذوا تا کے چہرے پہ سکون تھا۔ اس کے لبوں پہ ہلکا سا تبسم ٹھہر گیا تھا۔ جانے اس نے آخری لمحے میں کیا سوچا ہو گا۔

دائم منیب کو اس کی زندگی میں اپنے مقام کا درست تعین نہ کل تھا' نہ ہی آج۔

میڈیا کے پاس ایک ہی موضوع بچا تھا۔

ذوا تا کروبی... ذوا تا کروبی۔

شاید سب اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا اگر ذوا تا کروبی کے ساتھ دائم منیب کا نام نہ جوڑا جا رہا ہوتا۔

میڈیا کے مطابق ذوا تا کروبی سے چھ سال چھوٹا دائم منیب اس کا وہ دوست تھا' جسے آخری دنوں میں اس کے ساتھ دیکھا گیا۔ وہ ایک پاکستانی جونیئر ڈائریکٹر تھا' جو نیویارک فلم اکیڈمی سے "ڈاکومنٹری فلم میکنگ" کا ایک سال کا پروگرام کرنے آیا تھا۔ جس کے کریڈٹ پہ ایک فلم تھی' جسے "تائیوان انٹرنیشنل ڈاکومنٹری فلم فیسٹیول" میں گرینڈ پرائز مل چکا تھا۔ فوٹیج میں ان دونوں کو اکٹھے پھولوں کی کسی نمائش میں دکھایا جا رہا تھا۔ ایک منظر میں وہ دونوں ایک فٹ پاتھ پہ ساتھ چلتے نظر آتے ہیں۔

دونوں گھروں میں اس کے سامنے یہ خبریں من گھڑت ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی جا رہی تھی۔ وہ مضمحل سا مسکرا دیتی۔ وہ اسے جس تکلیف سے بچانا چاہتے تھے' وہ اس کرب سے تین ماہ پہلے گزر چکی تھی۔ اب تو وہ اپنی شکل آئینے میں پہچاننے کی کوشش کرتی تھی۔

دائم نے اس کے بعد اس سے کوئی بات نہ کی تھی وہ بھی اس کا نمبر ملاتے ملاتے رک جاتی۔ وہ سوچتی اب ان کے بیچ بات کرنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔

ذوا تا کے جانے کا غم... اس پر سب کا رویہ...

امی اس سے بات ہی نہیں کر رہی تھیں۔ باپ نے عاق کرنے کا مژدہ سنا دیا تھا۔ بہن بھائی الگ خفا تھے۔ عائز تو تب سے ہی خفا تھا' جب اس نے اس سے حدیقہ کی خودکشی کی کوشش کی وجہ پوچھی تھی اور دائم نے پہلے تو ٹالنے کی کوشش کی' پھر اسے جھڑک دیا تھا کہ وہ ان دونوں کے نجی معاملے میں دخل نہ دے۔

حدیقہ نے بھی اس دن کے بعد سے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔ نہ ہی وہ کرنا چاہتا تھا۔ ایک ایک پل اس کا جیسے کوئی امتحان لینے کو کمر کس کر کھڑا تھا۔ اس دن وہ سرد خانے سے ہو کر آیا تو اس کے قدم خود بخود ہی جو اٹھے تو ذوا تا کے اپارٹمنٹ کے سامنے جا کر رکے۔ وہ بند تھا۔ اسے اس کے قتل کے دن سے سیل کر دیا گیا تھا۔

وہ کافی دیر وہاں کھڑا رہا۔

کھڑکی کی طرح یہ دروازہ بھی اس کے لیے ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا تھا۔

پندرہ دن ہو گئے تھے' ذوا تا کی نعش سرد خانے میں پڑی تھی۔ اس کی بہنوں یا بھائی میں سے کوئی اس کا وارث نہیں ہو کر آیا۔ ایرانی حکومت یا ایرانی سفارت

خانے کے کسی ترجمان کی طرف سے کوئی بیان جاری ہوا نہ ہی رابطہ ہوا۔ اس نے ان دو ہفتوں میں بہرنگ کروبی سے رابطہ کرنے کے ہر ممکن ذرائع استعمال کیے۔ آخر وہ کامیاب ہو گیا۔ فیس بک پر اس کا اور ذوا تا کا ایک مشترک ایرانی دوست تھا فردین۔ دائم نے اس سے درخواست کی کہ وہ بہرنگ کروبی یا ماہ یار کا نمبر حاصل کر کے اسے دے۔ فردین نے اس سلسلے میں اس کی کافی مدد کی' مگر بہرنگ نے اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر یہ کہہ کر فون رکھ دیا کہ۔

"ہمارے لیے وہ تب ہی مر گئی تھی۔ جب وہ امریکہ بھاگ گئی تھی اور جب وہ تم جیسوں کے ساتھ منہ کالا کرتی رہی۔"

پھر اس نے ماہ یار سے بات کی' اس نے خاموشی سے اس کی بات سنی تھی۔

"کس رشتے کی بنیاد پر اس کی نعش پر اپنا حق جتاؤں۔ میں صرف اس کے لیے دعا کر سکتا ہوں۔"

اس نے ایرانی سفارت خانے سے رابطہ کیا مگر کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا۔ کوئی امیر' کوئی امام یہاں تک کہ کوئی عام سا مولوی بھی اس کی نماز جنازہ پڑھانے کو تیار نہ تھا۔ لوگوں کی ایک بھیڑ ذوا تا کروبی کو دیکھنے کے لیے اسپتال کے باہر جمع رہتی' مگر ان میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کی فاتحہ پڑھنے آیا ہو' اس کے لیے دعائے مغفرت مانگنے آیا ہو۔ ان میں زیادہ تر پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے نمائندہ ہوتے یا وہ عیسائی اور یہودی ہوتے جو ہاتھوں میں گلدستے لیے ذوا تا کروبی کی بہ نظر' بہادری اور عظمت کو سلام پیش کرنے آتے۔

"میں زندگی بھر یونہی پل پل جیوں گی' پل پل مروں گی اور جب مر جاؤں گی تو لاوارثوں کی طرح' کسی سرد خانے میں پڑی رہوں گی۔ کوئی مجھے کندھا دینے نہیں آئے گا۔ کوئی میری مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا نہ کرے گا۔ کوئی میری نماز جنازہ ادا نہ کرے گا۔"

اس کے کانوں میں اس کی سسکیاں گونجتیں تو اس کی سانس رکنے لگتی۔ اسے لگتا اس کے سینے میں میخیں گاڑی جا رہی ہوں۔

"نہیں ذوا تا! میں تمہیں یوں رخصت نہیں ہونے دوں گا۔ میں تمہارے تمام خدشے' تمام اندیشے باطل کر دوں گا۔ ان شاء اللہ تم بڑی شان سے جاؤ گی۔" پھر وہ نفی میں سر ہلاتا چلا جاتا۔

جب وہ اپنی تمام دوسری کوششیں کر چکا اور پھر بھی ناکامی ہوئی تو اس نے سوچ لیا کہ اسے کیا کرنا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ ذوا تا کروبی تھی' جو ایئرپورٹ سے نکل رہی تھی۔ اس نے تنگ جینز کے ساتھ چست سی شرٹ پہن رکھی تھی۔ چہرے پر دھوپ کا چشمہ تھا۔ منظر بدلتا ہے۔

اب وہ کوئی پریس کانفرنس کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں اس کی متنازعہ تخلیق "اسلام میں عورت کا درجہ" تھی۔ منظر پھر بدل جاتا ہے۔

اب وہ جیمز وولف کے ہاتھ میں ہاتھ دیے کسی پارٹی میں نظر آ رہی تھی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں حرام مشروب کا گلاس تھا۔

"یہ ذوا تا کروبی ہے جسے آپ جانتے ہیں۔"

اب اسکرین پر دائم منیب نظر آ رہا تھا' ٹھہرے ہوئے دھیمے لہجے میں بات کرتا ہوا۔ "اور اب آپ دیکھیں' اس ذوا تا کروبی کو جسے میں جانتا ہوں۔"

کچھ تصویریں یکے بعد دیگرے دکھائی جاتی ہیں۔ پہلی تصویر میں وہ سر سے لے کر پاؤں تک سیاہ چادر میں چھپی دونوں ہاتھ اٹھائے دعا مانگ رہی تھی۔ دوسری تصویر میں وہ کسی مسجد کی صف میں بیٹھی نظر آ رہی تھی۔ تیسری تصویر میں وہ قرآن پاک تلاوت کرتی دکھائی دیتی ہے۔

پھر کچھ ویڈیو کلپس چلتے ہیں۔

"کاش! ہماری عورت جان جائے' یہ برابری عورت کو کتنا نیچا کر دیتی ہے..." یکتا کروبی کی آنکھیں نم اور لہجہ نمناک تھا۔

"مسلمان معاشرے میں ہر رشتہ حلال اور طیب

ہے....."

"اللہ نے تو عورت کو گھر کی ملکہ بنا دیا....."

"اسلام میں عورت کا درجہ ۔" کی رائٹر کو دیکھ کر میں بھی پہچان نہیں پائی کہ وہ میں ہی تھی۔"

اب دنیا ایک ہاری ہوئی، شکست خوردہ ذوا تا کروبی کو دیکھ رہی تھی۔

دائم منیب ایک بار پھر اسکرین پر نظر آتا ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ اس کی سامنے کھڑی تھی، نظریں جھکائے۔ وہ اس کے جھکے سر کو کچھ دیر دیکھتا رہا۔

"کیسی ہو؟"

اس نے جواب نہیں دیا، یونہی مجرموں کی طرح سر جھکائے رکھا۔ وہ جانتا تھا، وہ رو رہی ہے۔

ایک گہری سانس لے کر اس کے ہاتھ سے ٹرالی لے کر وہ چلنے لگا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ راستہ بھر وہ دونوں خاموش رہے۔ اپارٹمنٹ آکر اسے فریش ہونے کا مشورہ دے کر دائم نے اس کے لیے کھانا لگایا۔ وہ جانتا تھا سفر میں اس نے کچھ کھایا نہ ہوگا، اس لیے کھانا تیار کر لیا تھا۔ اس نے تو اپنے آنے کا بتایا بھی نہ تھا۔ وہ تو اس کی روانگی کے بعد عائز نے اسے فون کیا تھا۔ جانے عائز اس سے کس بات کی معافی مانگ رہا تھا۔ جب اس نے استفسار کیا تو اس نے "کچھ نہیں" کہہ کر فون رکھ دیا۔ دائم کو لگا وہ رو پڑا تھا۔

حدیقہ اسے ایرپورٹ دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ بہت دیر اس کے چہرے سے نظریں ہٹا نہ سکی اور جب نگاہیں جھکیں تو اٹھا نہ سکی تھی۔ اور جہاں تک بات تھی دائم کی، وہ نہیں جانتا تھا کہ اس وقت وہ حدیقہ کے لیے کیا محسوس کر رہا ہے۔ مگر یہ حقیقت تھی کہ بہت دنوں بعد کسی اپنے کو سامنے دیکھ کر اس کے اندر سکون کا ایک احساس جاگا تھا۔

وہ خاموشی سے کاؤنٹر کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اب وہ رو نہیں رہی تھی مگر اس کا سرخ ہوتا چہرہ اور سوجی آنکھیں اسے تکلیف دے رہی تھیں۔

دائم نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا اس نے چھڑا لیا، اس نے اس کے آنسو صاف کرنے چاہے اس نے چہرہ پھیر لیا۔

"مجھے ذوا تا کو دیکھنا ہے۔" یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے اب تک ادا کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ذوا تا کروبی کے بے جان سرد وجود پہ پہلی نظر پڑی تو بہت دیر تک وہ پلکیں جھپکا نہ پائی۔ اس کے لبوں پر ایک مبہم سی مسکراہٹ تھی۔ اس مسکان کو ابد تک یونہی سجے رہنا تھا۔ وہ اپنے گناہوں کا لبادہ اتار کر بڑی ہلکی پھلکی ہو کر دنیا سے گئی تھی۔

"اگر میں اس کا چہرہ پہلے دیکھ لیتی تو کبھی اسے یوں بددعا نہ دیتی۔" وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر سسک اٹھی۔

"تم اس گلٹ سے نکل آؤ کہ اسے تمہاری بددعا نے مارا ہے حدیقہ!" وہ اس کے قریب آکر بیٹھا۔ "جانتی ہو، وہ وہاں بڑے سکون میں ہوگی۔ زندگی اسے تکلیف دیتی تھی۔ موت نے اسے قرار بخشا ہوگا۔ تم نے دیکھا نہیں، اس سفر پہ جاتے ہوئے اس کے لبوں پہ کیسی مسکراہٹ ہے۔ وہ کتنی راحت میں ہے۔"

وہ چہرے سے ہاتھ ہٹا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں، اس کے چہرے پہ، اس کے لہجے میں کہیں نفرت نہیں تھی۔ جبکہ اسے اسی تصور سے خوف آتا تھا کہ دائم تنفر سے اس سے چہرہ پھیر لے گا، ساری عمر اس کی کالی زبان کو کوسے گا۔

"ہو سکے تو تم اتنا کرو کہ اللہ سے دامن پھیلا کر اس کے لیے مغفرت مانگو۔ اس کے لیے قبر کا سکون مانگو۔ اس کے لیے بہشت مانگو۔" اس نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے تر چہرے کو صاف کیا۔

"مانگو گی ناں تم اس کے لیے دعا؟"

اس نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے ذوا تا کروبی کو بددعا دی تھی۔ اب دعا دینی تھی۔

☼ ☼ ☼

حکومت ایران نے ذوا تا کی میت ایران لانے اور اس کی مٹی میں اس کی تدفین کی اجازت دے دی تھی۔

اس کی میت کو لے جانے کے لیے۔ بہر نگ کروبی آیا تھا، دائم اس کے تاثرات سے اندازہ نہیں کر پایا کہ وہ اپنی مرضی سے ایسا کر رہا ہے یا مجبوراً "دنیا دکھاوے کو"۔ جب ہر کوئی ذوا تا کو معاف کر چکا تھا تو اسے تو بھائی ہونے کی حیثیت سے اعلا ظرفی دکھانی ہی تھی۔ اس کے ساتھ روشنک بھی تھی۔ ماہ یار نے اسے بھیجا تھا۔ وہ ذوا تا کا عکس تھی۔ اس کے وجود کا حصہ تھی۔ وہ بے اختیار اسے پیار کرتا چلا گیا۔

"تم جانتی ہو تمہاری ماما بہت اچھی تھی۔" وہ ... ہی میں اس سے کہہ رہا تھا۔

وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر اسے دیکھنے لگی۔ اس نے تو اپنی ماں کے نام پر ہر ایک کو کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے، استغفار کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس کا یہ ماموں جو اس وقت کسی چینل کو انٹرویو دے رہا تھا، اس کو تو اس نے اپنی ماما کے نام پر تھوکتے ہی دیکھا تھا اور سامنے کھڑا یہ شخص کہہ رہا تھا کہ اس کی ماں بہت اچھی تھی۔

"وہ تم سے بہت پیار کرتی تھی۔"

وہ پھر سوچ میں پڑ گئی۔ لالے ماں تو کہتی تھی کہ اس کی ماں کو اس کی ذرا پروا نہ تھی۔ وہ اسے پھینک کر چلی گئی۔

"وہ دن رات تمہیں یاد کرتی تھی۔"

مگر میں تو انہیں یاد نہ کرتی تھی۔ بابا یاد کرتے ... تب ہی تو لالے ماں ہمیشہ چلاتی رہتی ہیں۔

"اپنی ماما کے لیے دعا کرنا۔"

اس کے باپ نے بھی اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا کہ اپنی ماں کے لیے دعا کرنا۔

"روشنک! تمہیں میری باتیں سمجھ میں آ رہی ہیں؟"

اس نے دھیرے سے سہلا دیا۔ وہ اس کے ہاتھوں کو تھام کر بے اختیار رو دیا۔

☼ ☼ ☼

اب جب ذوا تا کروبی اہل مسلم کے لیے قابل نفرت نہ رہی تھی' جب دل اس کے لیے نرم پڑ گئے تھے تو مسلمان تجزیہ نگاروں کی طرف سے ایک اور بحث سامنے آئی تھی کہ ذوا تا کروبی کا قتل محض کسی مذہبی شدت پسند کا وقتی اشتعال تھا یا باقاعدہ ایک سازش تیار کر کے اس کی جان لی گئی۔ دین اسلام کی طرف اس کا واپسی کا سفر یقینی طور پر اسلام دشمن دنیا سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ذوا تا کروبی اور اس کی کتاب "اسلام میں عورت کا درجہ" تو ان کی جیت تھی۔ دین اسلام کو بدنام کرنے کے لیے' اس سے متنفر کرنے کے لیے.... انہوں نے اسے مہرے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اب ذوا تا کروبی کی جس آنے والی کتاب کا ذکر دائم منیب نے کیا تھا۔ یقیناً" اس کی بھنک انہیں پڑ گئی تھی۔ اگر وہ اس کتاب کو مکمل کر لیتی تو ذوا تا کروبی اور اس کی دوسری آنے والی کتاب غیر مسلم دنیا کی عظیم ہار ہوتی۔ اس لیے یہ بات ثابت ہو گئی کہ باقاعدہ ایک سازش تیار کر کے ذوا تا کروبی کی جان لی گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے ایک گھنٹے سے کھڑکی میں کھڑا تھا۔
سامنے والی کھڑکی بند تھی اور اس کی نگاہیں تھیں کہ وہیں جمی تھیں۔
آج ذوا تا رخصت ہو گئی تھی۔ دائم نے اس کی بیٹی کو ایک تصویر دی تھی جس میں ذوا تا نے گلابی گلاب کی ایک کلی پہ اپنے لب رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے دائم نے ذوا تا سے وہی جملہ لکھوایا تھا جو اس نے پھولوں کی نمائش میں ادا کیا تھا۔
"من روشنک ازاین گل زیبا تراست" (میری روشنک اس پھول سے زیادہ پیاری ہے) نیچے ذوا تا کے دستخط تھے۔ اس نے یہ تصویر اپنی فلم کے لیے سنبھال لی تھی۔ وہ اسے بعد میں روشنک کو ہی دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ تاکہ ماں سے اگر وہ متنفر بھی ہے تو اس کی غلط فہمی دور ہو سکے۔ اسے خبر نہ تھی کہ وہ اسے یہ تحفہ کس موقع پر دے گا۔

"تم اور میں شاید آخری بار مل رہے ہیں روشنک! میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا' تمہاری ماما بہت اچھی تھی۔" اس نے اس کے ماتھے پہ بوسہ دے کر اسے اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا تھا۔
حدیقہ میز پر کھانا لگا کر اسے بلانے آئی تھی۔ وہ جب سے ذوا تا کی میت روانہ کر کے ایر پورٹ سے واپس آیا تھا' خاموش تھا۔ وہ آہستگی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ اس کے آنسو خاموشی سے بہہ رہے تھے۔ وہ اپنے لب کچلنے لگی۔ جس دن سے وہ آئی تھی اس نے اسے روتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بہت مضبوط رہا تھا۔ اس کے آنسو پونچھے تھے۔ اس کے احساس جرم کو مٹایا تھا۔ اور آج وہ خود رو رہا تھا۔
محبوب اگر آپ کے سامنے کسی اور کے لیے روئے تو اس کن لفظوں میں تسلی دی جائے' کن فقروں سے اس کا غم بانٹا جائے' اس کی سمجھ ابھی اسے نہ تھی۔ حدیقہ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔
"مجھے سمجھ میں نہیں آتا حدیقہ! اگر اسے یوں ہی جانا تھا تو وہ میری زندگی میں آئی کیوں۔" اس کی نگاہیں ابھی بھی اس کی کھڑکی پر تھیں۔
"تمہارا اس کی زندگی میں آنے کا ایک مقصد تھا اور وہ تم نے پورا کر دیا دائم!"
اس نے کھڑکی سے نگاہیں ہٹا کر اس کی جانب دیکھا۔
"تم نے لوگوں کو اس کی اصل صورت دکھا دی۔ لوگ اس کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے۔ توبہ توبہ کرتے تھے' ان تک تم نے ذوا تا کی توبہ پہنچا دی۔"
"توبہ کا تعلق براہ راست اللہ سے ہوتا ہے اور اللہ جانتا تھا وہ اپنے گناہ سے توبہ کر چکی تھی۔ لوگوں کا سب جاننا ضروری نہیں تھا حدیقہ!"

"ضروری تھا۔ اللہ اپنے بندوں سے پیار کرتا ہے دائم! جو ذلت ذوا تا نے چنی تھی' اس ذلت کو عزت میں ہی تو بدلنا تھا ناں۔ اس کی بیٹی کا جھکا ہوا سر بھی تو بلند کرنا تھا رب نے۔ اس کو اس کی مٹی میں واپس بھی پہنچانا تھا۔ رب نے تمہیں وسیلہ بنایا تھا دائم۔"
وقت نے حدیقہ کو بھی بہت کچھ سکھا دیا تھا ورنہ وہ پہلے بھی اتنی وسیع النظر نہ تھی۔
اور دائم سوچ رہا تھا اگر حدیقہ صحیح کہہ رہی ہے۔ اگر اس کی زندگی میں ذوا تا کے آنے کا مقصد یہ تھا تو پھر اس کے دل میں اللہ نے اس کی محبت کیوں ڈالی؟
کچھ سوال آپ خود سے کرتے رہ جاتے ہیں اور عمر بھر ان کا جواب نہیں ملتا۔

☼ ☼ ☼

حدیقہ واپس چلی گئی۔ دائم بھی اس کے ساتھ ہی جانا چاہتا تھا۔ اب وہ یہاں رہنا نہ چاہتا تھا مگر اس نے اسے کورس مکمل کرنے پہ اصرار کیا تھا۔ اسے لگتا تھا ابھی وہ اس کے ساتھ چلا بھی گیا تو ذوا تا کی یادیں اسے کبھی مکمل طور پر اس کا نہ ہونے دیں گی۔ اس کا خیال پلٹ پلٹ کر اس دریچے میں جاتا ہو گا۔ وہ اسے وقت دینا چاہتی تھی کہ وہ اس کی یادوں کے ساتھ وقت گزار لے اور اس حقیقت کو اچھی طرح قبول کر لے کہ اب وہ اس کی زندگی میں نہیں رہی۔ پھر شاید جب وہ لوٹے تو مکمل اسی کا ہو۔
ذوا تا کی تدفین ہو چکی ہے۔ اس کی نماز جنازہ لاکھوں لوگوں نے ادا کی۔ لاکھوں لوگوں نے اس کی مغفرت کی دعا مانگی۔ دائم منیب نے اس کے ہر خدشے کو زائل کر دیا تھا' لوگوں کے دلوں سے اس کی نفرت کو زائل کر دیا تھا۔
ایک ایرانی چینل پر روشنک نظر آئی تھی۔ اس سے اس کی ماں کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ جس کے جواب میں اس نے ایک ہی جملہ ادا کیا تھا۔
"من عاشق مادرم۔" (مجھے اپنی ماں سے پیار ہے۔)
دائم نم آنکھوں کے ساتھ مسکرا دیا۔ اسے لگا ذوا تا کے لبوں پہ سجی مبہم سی مسکراہٹ گہری ہو گئی ہو گی۔
دائم منیب اب بھی جب تھکا ہارا کیمپس یا اسٹوڈیو سے لوٹتا ہے تو اس کھڑکی کے آگے آ کھڑا ہوتا ہے۔ اس نے نیک نیتی سے زندگی حدیقہ کے سنگ گزارنی تھی۔ مگر یہ دل تھا جو وہ ذوا تا کو بھول نہیں پا رہا' نہ ہی اس نے ایسی کوئی کوشش کی بھی۔ وہ اسے یاد رہے گی تو اس کا ادھورا کام وہ مکمل کرے گا۔ وہ جانتا ہے اس کھڑکی کے پار اسٹڈی ٹیبل پر' یا شاید بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر یا پھر کونے پر پڑے فلور کشن کے نزدیک رکھے ریک پر اس کی دوسری ادھوری کتاب کے صفحات پھڑپھڑا رہے ہوں گے۔
وہ کتاب جس کو پھر لکھنے کا مشورہ اس نے ذوا تا کو دیا تھا۔ جس میں اسے اپنے ہر سوال کا جواب اسے خود دینا تھا' اپنے ہر اعتراض کو دلیل کے ساتھ خود رد کرنا تھا' وہ اپنا یہ عزم پورا نہ کر سکی۔
قوی امکان یہ تھا کہ یہ صفحات اب وہاں سرے سے موجود ہی نہ ہوں۔ مسلمان تجزیہ نگاروں نے جو بحث اٹھائی تھی وہ نکتہ اس کے ذہن میں سب سے پہلے آیا تھا۔ اسے بھی لگتا تھا کہ ذوا تا کافروں کی سازش کا شکار ہوئی ہے۔ وہ سوچ چکا ہے' اسے کیا کرنا ہے۔ اسے مسلمان دشمنوں کے ارادوں کو کامیاب نہیں ہونے دینا۔ اسے ذوا تا کے ادھورے پیغام کو لوگوں تک پہنچانا ہے۔ "اسلام میں عورت کا درجہ۔" بنانی ہے۔ اس فلم کو دیکھ کر کوئی ایک بھی عبرت حاصل کر گیا' کوئی ایک بھی بھٹکنے سے بچ گیا' کوئی ایک بھی راہ ہدیٰ پہ چل پڑا تو اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہو جاتی۔ اب اسے کسی تمغے' کسی ایوارڈ کا لالچ نہیں رہا۔ اسے یہ سب کچھ اس محبت کے صدقے کرنا ہے' جو اس کو شہد رنگ آنکھوں والی لڑکی سے ہو گئی تھی۔

☼

راحت جبیں

ساری غزل ہماری تھی

ناولٹ

عریشہ عادلہ کی بیٹی ہے۔ عادلہ بیوہ ہیں اور اسکول میں ملازمت کرتی ہیں' مکان کے دوسرے حصے میں ان کے جیٹھ اور جٹھانی اپنے بچوں نعمان ثوبان فرید' فاطمہ اور مریم کے ساتھ رہتے ہیں' بانو اور ساجدہ شادی شدہ بیٹیاں ہیں' عریشہ ثوبان کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتی ہے۔ ثوبان کو علم ہے مگر ابھی اس کی طرف سے اعتراف نہیں ہے۔ عادلہ کو یہ چیز پسند نہیں کیونکہ ان کے جیٹھ کا گھرانہ جاہل ہے۔

نبیلہ' عادلہ اور حمیدہ کی نند ہیں' ان کے دو بیٹے ہیں محسن اور جمال' جمال ملک سے باہر ہے مگر اس کی بد مزاج بیوی طیبہ یہیں رہتی ہے۔

ابرار جمیلہ کا بیٹا ہے شہر میں پڑھتا ہے' باپ کی وفات کے بعد چچا کے ساتھ رہتا ہے۔ چاچی کبریٰ کا سلوک اس کے اور اس کی ماں کے ساتھ ناروا ہے۔ اپنے شوہر اصغر سے اکثر ڈانٹ پڑواتی ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ اس کی بیٹی بشریٰ کی ابرار سے شادی ہو جائے۔

۲
دوسری قسط
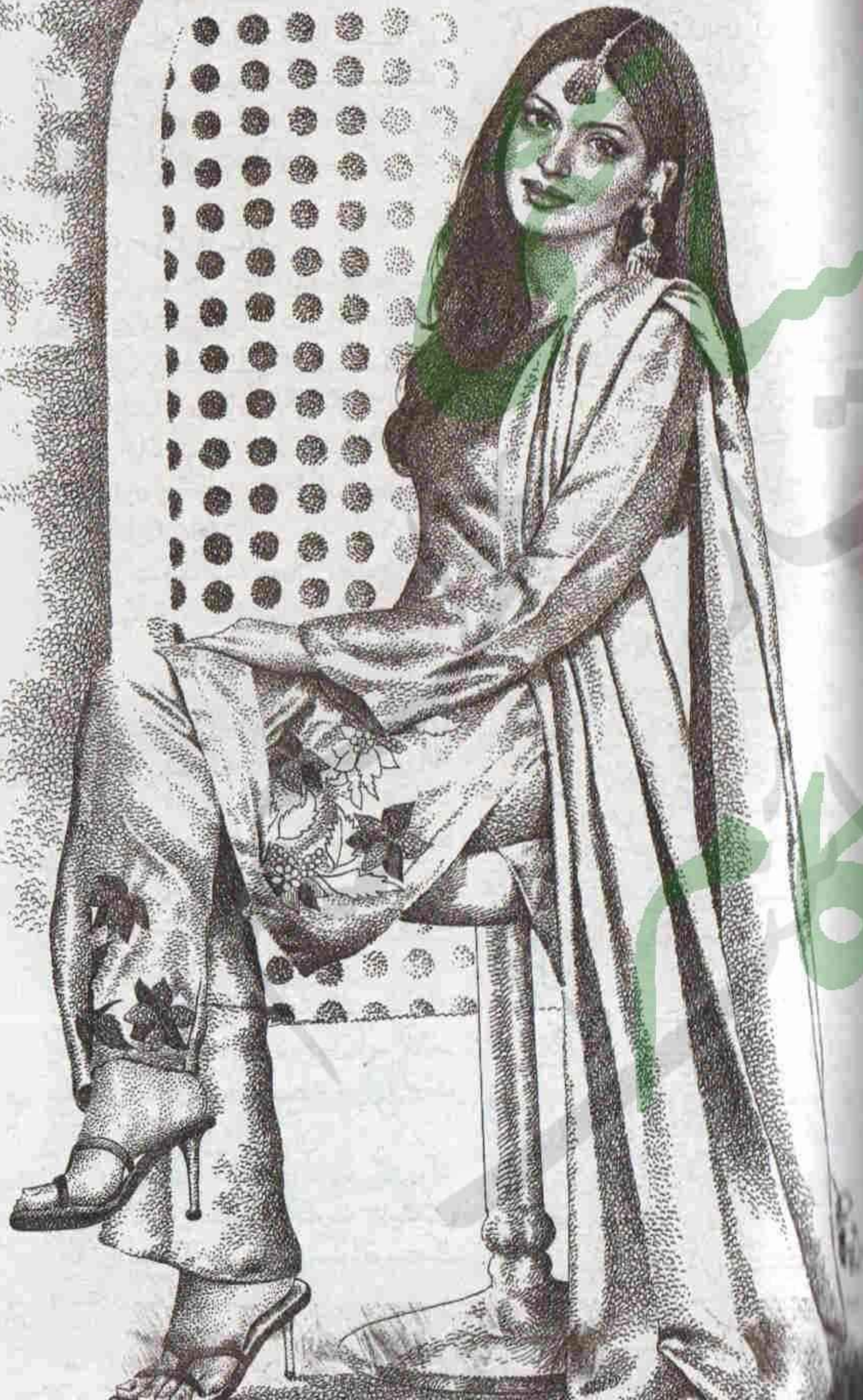
"کل تک وہ زمانے بھر کا آوارہ تھا۔ اب وہ تجھے بشریٰ کے لیے ٹھیک لگ رہا ہے۔"

"وہ تو اس لیے کہتی ہوں کہ تو اکیلا ہے... وہ بھی تھوڑا بہت ہاتھ بٹا دے... ماسٹر صاحب بتا رہے تھے، پڑھنے لکھنے میں اچھا ہے۔ کل کو کسی اچھی نوکری پر لگا تو فائدہ بھی تو اپنا ہی ہے۔" کبریٰ نے تحمل سے سمجھایا۔

اصغر کسی سوچ میں ڈوب گیا۔

"تو پھر میں جمیلاں سے ابھی بات کر لیتا ہوں۔ یہ نہ ہو کہ وہ کچھ اور سوچ لے۔"

"جلدی کس بات کی ہے... کر لیں گے۔ بس ذرا بلو سے نرم بات کیا کر... زیادہ سختی بھی اچھی نہیں۔"

"چل ٹھیک ہے... اس معاملے میں زنانیوں کی عقل کچھ زیادہ ہی چلتی ہے۔" اصغر کہہ کر لیٹ گیا۔

کبریٰ نے دل میں سوچا۔

"ابھی سے بات کر کے جمیلاں کو اپنے سر پر بٹھا لوں... پہلے ہی پتر پر بڑا مان کرتی ہے۔"

☆ ☆ ☆

نبیلہ کچن میں کھانا بنا رہی تھیں... صبح سے ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی... لیکن دوپہر تک جب کھانا بننے کے کوئی آثار نظر نہ آئے تو مجبوراً انہیں اٹھنا پڑا... ورنہ محسن نے آ کر شور مچا دینا تھا۔ طیبہ نے دیکھا مگر نظرانداز کر گئی...

"جب میرے ہاتھ کا بنا کھانا پسند ہی نہیں آتا تو مجھے کیا ضرورت ہے اتنا کھپنے کی۔"

"بیگم صاحبہ! جب طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو جا کر لیٹ جائیں۔ میں جیسا تیسا بنا ہی دوں گی۔" ملازمہ نے انہیں ہمدردی سے دیکھا... وہ بار بار پانی کا گھونٹ بھر رہی تھیں۔

"وہ جیسا تیسا کھانا محسن کو پسند نہیں آتا بتول... تمہیں تو پتا ہے۔ وہ کھانے کے معاملے میں کتنا نخریلا ہے۔" انہوں نے بتول کے ہاتھ سے کٹے ہوئے ٹماٹر لے کر ہنڈیا میں ڈالے۔

"اب آپ میں بھی تو دم خم نہیں رہا۔ سیدھے سیدھے محسن صاحب کی شادی کر دیں۔"

"ہاں... سوچ تو میں بھی یہی رہی تھی۔"

"ہاں پر یہ دیکھ لیجیے گا... لڑکی کو گھرداری کا بھی شوق ہو۔ ورنہ تو..." اندر آتی طیبہ نے بتول کا جملہ سن لیا تھا۔ کڑے تیوروں سے گھورا۔

"تمہیں صرف باتیں بنانی آتی ہیں۔ کب سے کہا تھا میرے کپڑے استری کر دو۔"

"وہ چھوٹی بی بی! تب لائٹ نہیں تھی... تو میں بیگم صاحبہ کی مدد..."

"ہو گئی مدد تو اب جا کر کپڑے استری کر دو... نکمے جاہل لوگ..." بتول نبیلہ کو دیکھتی چلی گئی۔

"بری بات ہے بیٹا! ملازموں کے ساتھ بھی ذرا..." انہوں نے رسانیت اور نرمی سے سمجھانا چاہا۔ طیبہ نے بات کاٹ دی۔

"مجھے تو آپ ہر وقت نصیحتیں کرتی رہتی ہیں... کہ گھر کی باتیں باہر نہیں کرتے اور خود ملازموں کے سامنے میری برائیاں کرتی رہتی ہیں۔"

نبیلہ ڈھکنا پتیلی پر دے کر حیرت سے مڑیں۔

"میں نے تمہاری کون سی برائیاں کی ہیں؟"

"بس رہنے دیں امی! میں سب جانتی ہوں... گھر کے کام نہیں کرتی، کروں تو بے دلی سے کرتی ہوں... آپ کا اور گھر کا خیال نہیں رکھتی... شوہر کی محنت کی کمائی شاپنگ میں اڑاتی ہوں... مجھے نظر آتا ہے اور سنائی بھی دیتا ہے..." طیبہ بدتہذیبی سے کہتی چلی گئی۔

"گو کہ ان میں سے کوئی ایک بات بھی جھوٹ نہیں... لیکن اتنی تہذیب ہے مجھ میں کہ گھر کی باتیں دوسروں پر خاص طور پر ملازمہ کے سامنے نہ کروں... اور دوسری بات اپنی فرسٹریشن نکالنے کا طریقہ انتہائی غلط ہے کہ تم بڑوں سے بات کرنے کی تمیز بھی بھول جاؤ۔"

انہوں نے ہلکی آواز لیکن سخت لہجے میں تنبیہ کی۔ طیبہ کا منہ کھل گیا۔

"آپ مجھے فرسٹریٹڈ کہہ رہی ہیں؟"

"طیبہ! اپنے کمرے میں جاؤ..." انہوں نے تحمل سے ٹالا۔

"میں اچھی طرح سمجھتی ہوں... یہی باتیں آپ بھائی سے بھی کہتی ہیں... تب ہی وہ مجھے اپنے پاس نہیں بلاتے..." وہ غصے سے پاؤں پٹختی چلی گئی۔ اندر آتے محسن نے حیرانی سے طیبہ کو دیکھا۔

"خیریت امی! بھابھی کو کیا ہوا؟ اندھے بیل کی طرح ٹکریں مارتی پھر رہی ہیں۔"

"محسن..." نبیلہ نے سہارے کے لیے ہاتھ پھیلایا۔ محسن نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں سنبھالا۔

"امی! کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں، چکر سا آ گیا... مجھے میرے کمرے تک لے جاؤ۔" وہ چاہتیں تو بھی محسن کو کچھ نہیں بتا سکتی تھیں۔ وہ جذباتی سا لڑکا تھا۔ خوامخواہ طیبہ سے الجھنے کھڑا ہو جاتا۔

"کتنی بار کہا ہے... طبیعت ٹھیک نہیں ہے تو مت کام کریں کچن میں... لیکن آپ ہیں کہ سنتی ہی نہیں۔" انہیں سہارا دے کر کمرے تک لایا اور آرام سے لٹا دیا۔ نبیلہ نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دل بہت ہی گھبرا رہا تھا۔

"امی! کیا بات ہے؟" محسن نے آہستگی سے پوچھا۔

نبیلہ کو اپنے حساس سے بیٹے پر ٹوٹ کر پیار آیا... تو آنکھیں کھول دیں، ہلکی سی مسکراہٹ ان کے لبوں پر بکھر گئی۔

"جاؤ بیٹا! کھانا تقریباً تیار ہی تھا۔ بتول سے کہو، اس میں روٹی ڈال دے۔"

"امی! میں بچہ نہیں ہوں، جو آپ میرے کھانے کے لیے اتنی پریشان ہوتی ہیں... کھا لوں گا... آپ ابھی آرام سے لیٹی رہیں... بلکہ ایسا کرتا ہوں... یہیں لے آتا ہوں... اکٹھے مل کر کھائیں گے۔" وہ پہلے کچھ خیال آنے پر لہجہ بدل کر بولا تھا۔

"بیٹا! مجھے بالکل بھوک نہیں لگ رہی۔ تم..."

"او کے..." وہ آرام سے مان گیا۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ طیبہ کے دل میں میرے خلاف اتنی کدورت اور بغض ہے۔ لیکن کیوں...؟ میں نے تو کبھی اسے بہو نہیں سمجھا۔ ہمیشہ بیٹی ہی جانا... اور وہ... نجانے جمال سے کیا کچھ کہتی ہو گی۔" جمال کا خیال آتے ہی وہ بے چین ہو گئیں۔

☆ ☆ ☆

عادلہ اسکول سے گھر آئیں تو عریشہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ انہوں نے پریشان ہو کر تیز برستی بارش کو دیکھا اور جٹھانی کی طرف آ گئیں۔ جہاں فاطمہ پکوڑے بنا رہی تھی اور مریم مزے سے چٹنی میں ڈبو ڈبو کر کھا رہی تھی۔

"تم کالج نہیں گئیں؟" وہ مریم کو دیکھ کر کچھ پریشان ہو گئیں۔ اس کا مطلب تھا عریشہ کالج میں اکیلی ہے۔

"صبح سے موسم خراب تھا، میں نے تو عریشہ سے بھی کہا تھا چھٹی کر لے۔ مگر وہ مانی نہیں۔" مریم نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"مجھے تو لگتا ہے، وین والا نہیں گیا... موسم بھی اتنا خراب ہے۔" وہ قدرتی طور پر پریشان ہو گئیں۔

"چچی! آپ ثوبان کو فون کریں، وہ عریشہ کو پک کر لے گا۔" فاطمہ نے مشورہ دیا تو وہ سر ہلاتی فون کی طرف آ گئیں۔ ثوبان نے تسلی دی کہ وہ عریشہ کو لے لے گا۔

"اب خدا کرے وہ کالج سے نہ نکلی ہو۔" عادلہ نے زیر لب کہا۔ فاطمہ ان کے لیے وہیں چائے لے آئی۔

"ارے، عریشہ آ جائے تو اکٹھے پی لیں گے۔"

"چچی! آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں... ثوبان لے آئے گا۔ آپ آرام سے بیٹھ کر چائے پئیں اور گرما گرم پکوڑے کھائیں۔" فاطمہ نے تسلی دی۔

"آپا کہاں ہیں؟"

"باتھ روم میں ہیں۔" تب ہی باہر کے دروازے پر زور کی دستک ہوئی۔

"ابا ہوں گے۔ وہ بھی صبح کے نکلے ہیں۔" فاطمہ نے ٹرے ان کے سامنے رکھی اور دوپٹہ سر پر رکھتی بھاگتی ہوئی صحن عبور کر گئی۔ بارش کا پانی ڈیوڑھی میں بھی اکٹھا ہونے لگا تھا۔ فاطمہ نے دروازہ کھول دیا' پھر محسن کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"آپ.....!"

"اللہ کی بندی اندر آنے دو گی' میں بارش میں کھڑا ہوں۔"

"اوہ سوری..... آجائیں۔" فاطمہ نے کھسیا کر رستہ دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ کب سے شیڈ کے نیچے کھڑی برستی بارش کو دیکھ رہی تھی۔ رکشے' ویگنیں اس کے سامنے آتے اور گزرتے رہے۔ تب ہی ایک گاڑی اس کے پاس آرکی..... ثوبان کو دیکھ کر وہ اندر تک پرسکون ہو گئی۔

"آج تو کچھ اور بھی مانگتی تو..... لیکن کچھ اور کیوں مانگتی بھلا۔" وہ بھاگتی ہوئی گاڑی میں آبیٹھی۔

"آپ کیسے آگئے.....؟"

"پھپی کا فون آیا تھا۔"

"بہت اچھا ہو گیا۔ میں کب سے وین کا انتظار کر رہی تھی۔"

"وین والے کا دماغ خراب ہے' جو اس موسم میں روڈ پر نکلے گا۔" ثوبان نے گاڑی بڑھائی۔ "اور موسم تو صبح سے خراب تھا۔ جب مریم نے چھٹی کی تو تم کیوں آئیں۔"

عریشہ کو اس کی ڈانٹ خاصی بری لگی۔ "میرا بہت ضروری ٹیسٹ تھا۔"

"ہو گیا؟"

"نہیں..... مس آئیں ہی نہیں۔"

ثوبان نے بے ساختہ اسے دیکھا اور ہنس دیا۔

"آپ کو اتنا برا لگا ہے تو نہ آتے۔ میں پہنچ ہی جاتی گھر۔" وہ منہ بنا کر بیٹھ گئی۔ تب ہی گاڑی میں کسی خوشبو کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر ثوبان کو' پھر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں سرخ گلابوں کا گلدستہ پڑا مہک رہا تھا۔

"یہ کس کے لیے ہے؟"

"ایک دوست کی عیادت کو جا رہا تھا۔"

"اچھا۔" دل خوش فہم کو ٹھیس سی لگی۔ "میں سمجھی' شاید کسی دوست سے میرے لیے گاڑی ادھار مانگی ہے۔"

"بہت خوش فہم ہو' ویسے یہ گاڑی بھی اسی کی ہے جس کی عیادت کو جا رہا ہوں۔"

"تو آپ کے پاس کیوں ہے؟"

"ورکشاپ میں تھی' اس نے کہا آتے ہوئے لیتا آؤں۔"

"کوئی خاص دوست ہی ہو گا۔" عریشہ کے لہجے میں ہلکی سی جلن تھی۔

ثوبان مسکرا کر خاموش ہو گیا۔ عریشہ کچھ لمحے خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پھر پیچھے مڑ کر بوکے سے ایک بڑا سا گلاب کھینچ لیا۔

"ارے..... ارے..... یہ کیا کر رہی ہو' سارا بوکے خراب ہو جائے گا۔"

"ہو جائے۔"

"بہت ہی اوٹ پٹانگ لڑکی ہو۔" ثوبان گھور کر رہ گیا۔ عریشہ گلاب کو انگلیوں میں گھمانے لگی۔

"مجھے گلاب بہت پسند ہیں۔" کچھ دیر کے بعد عریشہ نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میرا دل چاہتا ہے' کوئی مجھے بھی سرخ گلاب دے۔" عریشہ کے لہجے اور آنکھوں سے اس کی خواہش مترشح تھی۔

"تمہارا دل ایکسیڈنٹ کروانے کو چاہ رہا ہے۔"

"اللہ نہ کرے۔"

"میں جس کے لیے لے جا رہا ہوں' وہ کسی ایکسیڈنٹ کے بعد ہی اسپتال پہنچا ہے۔"

"غالباً" آپ جانتے نہیں' سرخ گلاب محبت کی علامت ہوتا ہے۔"

"سوری' مجھے پھولوں کے بارے میں انفارمیشن نہیں۔"

"شاعرانہ مزاج رکھنے والا بندہ پھولوں کے بارے میں نہیں جانتا؟"

"شاعرانہ مزاج؟ کم آن عریشہ! میں تو اچھا خاصا پریکٹیکل بندہ ہوں..... ہاں تم! لگتا ہے خواب بہت دیکھتی ہو۔" وہ ہنسا۔

"اچھا..... اور وہ جو مجھے نظم سنائی تھی؟"

"کون سی؟" ثوبان کے سرسری لہجہ پر عریشہ نے حیرت سے اسے دیکھا..... جو لمحہ اس کی ساری زندگی پر محیط ہو گیا تھا..... ثوبان کے خیال سے بالکل محو ہو چکا تھا۔

تو کیا وہ صرف اک وقتی سی اٹریکشن تھی..... صرف ایک پل کے جذبات..... اور میں..... خواب نگری میں اس ایک لمحے کو تھامے ان لفظوں کی پائل چھنکاتی اب تک محو رقص ہوں۔

اس نے ثوبان کو دیکھا۔ وہ انہماک سے گاڑی چلا رہا تھا۔

عریشہ نے ہاتھ میں پکڑے گلاب کو دیکھا..... اور اس سے اپنی محبت کی تصدیق چاہی۔

ایک ایک پتی پھول سے الگ ہو کر امید و ناامیدی کے درمیان ڈولتی اس کی گود میں گرنے لگی۔

محبت ہے.....

محبت نہیں ہے.....

محبت ہے.....

گاڑی آہستگی سے گھر کے سامنے رک گئی اور عریشہ کے ہاتھ میں پکڑے گلاب کی آخری پتی پر اٹک گئی جو "نہیں ہے" پر جا کر رک گئی تھی۔ اس نے جھلا کر اسے باہر اچھال دیا اور خود تیزی سے اتر کر اندر بھاگ گئی۔ ثوبان وہیں سے واپس چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نبیلہ کو بھی لے آتے۔" عادلہ نے تیسری بار محسن سے کہا تو حمیداں منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئیں۔

"نبیلہ باجی! امی کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں تھی۔ اسی لیے انہوں نے فاطمہ کو بلایا ہے۔"

"کیوں؟ تمہاری بھابھی کہاں گئی۔ دو دن ساس کی دیکھ بھال بھی نہیں کر سکتی۔" حمیداں چمک کر بولیں۔

"وہ کرتیں تو مسئلہ کس بات کا تھا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا' پھر براہ راست فاطمہ سے پوچھنے لگا۔

"کیوں فاطمہ! چل رہی ہو؟"

فاطمہ گھبرا کر ماں کو دیکھنے لگی..... تو مریم فوراً" بول اٹھی۔

"محسن بھائی! میں چلوں.....؟"

"میں فاطمہ کو امی کی دیکھ بھال کے لیے لے جا رہا ہوں..... تمہاری دیکھ بھال کون کرے گا۔" مریم منہ بنا کر اٹھ گئی۔

"ارے..... مگر فاطمہ کے بغیر میں....."

حمیداں نے کچھ کہنا چاہا' مگر اس سے قبل ہی برکت صاحب کی آمد ہو گئی' شومئی قسمت کہ انہوں نے سن بھی لیا تھا۔

"ہاں..... ابھی تمہارے میکے سے بلاوا آجائے تو فوراً" بھیج دو گی..... اب میری بہن کو ضرورت ہے' تو آنا کانی کر رہی ہے۔ اٹھو فاطمہ..... جاؤ..... بارش بھی رک گئی ہے۔ کل میں پتا کرنے آؤں گا تو تمہیں لے آؤں گا۔" انہوں نے ساری بات ہی ختم کر دی۔ سب کے سامنے کچھ کہنا اپنی بے عزتی کروانے کے مترادف تھا' سو حمیداں دل ہی دل میں کلس کر رہ گئیں۔ عادلہ بھی کھڑی ہو گئیں۔

"چچی! عریشہ کے لیے پکوڑے لے جائیں' کہہ رہی تھی' کپڑے بدل کر آتی ہوں' آئی ہی نہیں۔" فاطمہ نے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

نعمان اپنے اسٹور کے دروازے میں کھڑا برستی بارش کو دیکھ رہا تھا۔ جس کے اوپر "نعمان سپر اسٹور اینڈ پی سی او" کا بورڈ لگا تھا۔ چچا جب فوت ہوئے تو یہ اسٹور اتنی اچھی حالت میں نہ تھا۔ نعمان نے اس میں بہت سی تبدیلیاں کی تھیں اب یہ علاقے کا صاف ستھرا

اور خوب چلتا ہوا اسٹور تھا۔ برستی بارش میں کسی گاہک کے آنے کی تو امید نہ تھی' سو وہ اطمینان سے کھڑا موسم کے تیور دیکھ رہا تھا۔

"نومی بھائی! اگر ما گرم جلیبیاں اور سموسے لے کر آؤں..." اس کے ساتھ کام کرنے والا لڑکا سر پر آ کھڑا ہوا۔

"جانے دے یار! بارش تیز ہے۔"

"اب اتنی بھی تیز نہیں۔ دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔" وہ مسمسی شکل بنا کر بولا تو نعمان ہنس دیا۔

"تیرا ندیدہ پن نہیں جائے گا۔ چل جا' لے آ۔" نعمان نے پیسے نکال کر دیے تو وہ بھاگ گیا۔

نعمان نے سی ڈی پلیئر کی آواز اونچی کی اور شیڈ کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ بے رنگ سا منظر تھا۔

تواتر سے برستی بارش۔ بھیگتی ٹوٹی' پھوٹی سڑک اور سڑک پر جمع ہوتا پانی۔

اسی پانی میں ایکدم رنگ سے ابھر آئے۔ نعمان کا دل اسی ٹوٹی پھوٹی سڑک کے کھڑے پانی میں دھمال سا ڈالنے لگا۔

چند منٹ تھے اور اسے یہاں سے گزر جانا تھا۔ اور یہی چند منٹ نعمان کی زندگی کا حاصل تھے' مگر خود پر چھتری تانے' سیاہ چادر میں لپٹی لڑکی وہاں سے گزری نہیں بلکہ اس کے عین سامنے آ کھڑی ہوئی۔

نعمان دم بخود رہ گیا۔ اک خواب مجسم ہو کر اس کے سامنے ٹھہر گیا تھا۔

اس نے بوکھلا کر رستہ دیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی۔ اور چھتری بند کردی۔ چھتری کے باوجود اس کی سیاہ چادر کہیں کہیں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"مجھے فون کرنا ہے۔"

نعمان نے بوکھلا کر فون سیٹ اس کی طرف بڑھایا۔

وہ تیزی سے نمبر ڈال رہی تھی اور نعمان چپکے چپکے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ عام سے خدوخال کی عام سی لڑکی... اس کے لیے کتنی خاص تھی یہ صرف نعمان کا دل جانتا تھا۔ وہ ہر روز یہیں سے گزرتی اور نعمان ہر روز اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ اسے وہ اچھی لگتی تھی۔ اچھی نہیں بہت ہی اچھی۔

ہیڈ ماسٹر افتخار حسین کی اکلوتی بیٹی۔

استانی عائشہ بی اے بی ایڈ۔

"جی ابو! السلام علیکم' میں عائشہ..."

"جی' موبائل میں بیلنس ختم ہو گیا تھا۔ اس لیے خراب موسم میں گھر سے نکلنا پڑا۔"

"ایمرجنسی ہی تھی' امی کی طبیعت بہت خراب ہے۔"

"گھر میں جو کر سکتی تھی کر چکی' مجھے لگتا ہے انہیں فوراً" اسپتال لے جانا ہوگا۔" اس کے لہجے اور چہرے سے پریشانی ہویدا تھی... بظاہر رجسٹر میں گم نعمان چوکنا ہو گیا۔

"اتنی دور... آپ کو تو پہنچنے میں ہی گھنٹہ لگ جائے گا۔ ٹیکسی کہاں سے ملے گی۔ بارش رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ میں کیا کروں۔"

"میں کچھ..." نعمان بنا سوچے سمجھے بول اٹھا۔

عائشہ نے حیران ہو کر دیکھا۔ وہ ریسیور لینے کے لیے ہاتھ بڑھا رہا تھا۔ عائشہ نے ریسیور دے دیا۔

"جی... ماسٹر صاحب! میں نعمان بول رہا ہوں... سپر اسٹور والا... آپ کہیں تو میں مدد کردوں؟ جی ٹھیک ہے۔"

"اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی... تمہاری بڑی مہربانی بیٹا... اگر کسی طرح انہیں اسپتال پہنچا دو... میں بھی فوراً" پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔" ماسٹر صاحب اس کے مودب لہجے پر شکر گزار لہجے میں بولے۔

نعمان کی یوں بھی ان کے ساتھ سلام دعا تھی۔ وہ اکثر یہیں سے گھر کا سودا سلف لیتے۔

"عائشہ کو فون دو۔"

نعمان نے ریسیور عائشہ کی طرف بڑھایا۔

"ولیکن ابو..." وہ بات سن کر کچھ کہنے لگی۔

"عاشی! ضرورت کے وقت کسی سے مدد لینے میں کوئی حرج نہیں... یہ وقت اگر مگر کرنے کا وقت نہیں۔" انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔ تو اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا۔

"آپ گھر جائیں اپنی والدہ کے پاس' میں ٹیکسی لے کر آتا ہوں۔" نعمان نے عجلت میں کہا۔

☼ ☼ ☼

"حد کرتے ہو محسن! مجھ سے تو پوچھ لیتے... خواہ مخواہ فاطمہ کو تکلیف دی۔" نبیلہ نے پیار سے پاس بیٹھی فاطمہ کو دیکھا جو خجل سی ہو رہی تھی۔ محسن ہنستا ہوا اماں کے قریب بیٹھا۔

"آپ نے تو کبھی زندگی میں تسلیم نہیں کیا کہ آپ بیمار ہیں۔"

"چھوٹی موٹی بیماریاں تو زندگی کے ساتھ چلتی رہتی ہیں... اب ان کو کیا ہوا بنایا جائے۔"

"اور جو میں بتا دیتا کہ فاطمہ کو لینے جا رہا ہوں تو آپ ... دے دیتیں۔ اور نہ ہی ممانی اسے بھیجتیں۔"

"آپ کو ایسے نہیں کرنا چاہیے تھا۔" فاطمہ نے ... آواز میں کہا۔

"اصغری بی بی! میں آپ کو یہاں نصیحتیں کرنے نہیں لایا۔ اب جلدی سے کچن میں جا کر دو چار اچھی ڈشز بنا کر فریز کر دیں اور ہاں... رات کے لیے ... ضرور بنانا۔"

"... اٹھو یہاں سے' جاؤ اپنے کمرے میں' ... اپنی بیٹی کے ساتھ بہت سے باتیں کرنا ..." نبیلہ نے ڈانٹا تو وہ آرام سے اٹھ گیا۔

"... مرضی کریں... بس کھانا وقت پر تیار ہونا ..."

"... میرے لڑکے بھی انوکھے ہی ہیں... گھر کے کھانے کے سوا کچھ اچھا ہی نہیں لگتا۔ جمال بھی بالکل اسی طرح کیا کرتا تھا۔ تم اتنی دور کیوں بیٹھی ہو۔ یہاں ..."

فاطمہ اٹھ کر ان کے قریب آ گئی۔

"... اچھا ہی ہو گیا... میں بھی سارا دن کسی سے بات کرنے کے لیے ترس جاتی تھی۔"

فاطمہ نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ بھی اس کی نظروں میں سوال پڑھ گئی تھیں۔

"طیبہ کی اپنی مصروفیات ہیں... جمال کے جانے کے بعد اداس بھی رہنے لگی ہے۔ لو طیبہ بھی آ گئی۔"

طیبہ خوبصورت میرون سوٹ میں بالکل تیار تھی۔

"فاطمہ آئی ہے۔"

"السلام علیکم بھابھی!"

"اچھا ہو گیا۔ آنٹی کو بھی کمپنی مل جائے گی۔ میں بھی ان کی وجہ سے کئی دنوں سے امی کے گھر نہیں جا سکی۔ آنٹی! میں ذرا ہو کر آتی ہوں۔"

فاطمہ ہکا بکا پھپھو کی شکل دیکھنے لگی۔ وہ نظریں چرا گئیں۔

ایسی شان بے نیازی' نہ بیمار ساس کا خیال' نہ گھر آئے مہمان کا خیال... دو گھڑی پاس بیٹھنا تو ایک طرف' چائے پانی پوچھنا بھی گوارا نہیں... اور پھپھو نے تو کبھی آدھا لفظ نہیں بتایا کہ بہو رانی کے مزاج آسمان پر ہوتے ہیں۔ اب اندازہ ہوا' محسن مجھے کیوں لایا ہے۔

"ارے بھئی... تم کس سوچ میں ڈوب گئی ہو۔ جلدی سے چائے بنا کر لاؤ۔ پھوپھو بھتیجی مل کر پئیں گے۔ اور ہاں کباب بھی فرائی کر لینا۔" پھپھو کی آواز پر وہ چونک گئی اور مسکرا کر کچن میں آ گئی۔ سجا سجایا' خوبصورت کھلا سا کچن جس میں زندگی کی ہر سہولت موجود تھی۔

"لوگ بھی کتنے ناشکرے ہوتے ہیں۔" اس نے طویل سانس لے کر سوچا۔

☼ ☼ ☼

"توبہ' بال دیکھو' اتنے بے جان اور روکھے..." وہ تو آئی تھی کہ مریم کے ساتھ مل کر اپنا فیورٹ ڈرامہ دیکھ لے۔ کہ تائی نے دبوچ لیا۔ اور ان کی محبت کے سامنے عریشہ کی کہاں چلتی تھی۔ سو اب آرام سے بیٹھی تیل لگوا رہی تھی۔

"ایک اکلوتی اولاد ہو تم اور تمہاری ماں کو اتنی بھی

فکر نہیں ہے... ارے دماغ کمزور ہوتا ہے۔ بال جھڑنے لگتے ہیں۔"

"اماں! تمہیں بھی تو ساری فکریں عریشہ کی ہی رہتی ہیں۔ کبھی اتنے پیار سے میرے سر میں تو تیل لگایا نہیں۔" مریم نے چڑ کر کہا۔ حمیدہ نے آنکھیں نکالیں تو منہ بناتی پاس بیٹھ گئی۔

"تم کیوں جیلس ہوتی ہو۔" عریشہ نے ناز سے کہا۔

"جیلس ہوتی ہے میری جوتی۔"

"زیادہ بک بک نہ کر... چل... ہنڈیا میں ڈوئی چلا کے آ... ایک فاطمہ وہاں جاکر بیٹھ گئی ہے۔" مریم غصے سے دھپ دھپ کرتی کچن میں چلی گئی۔

"پاگل، خوامخواہ جلنے لگتی ہے۔ تو تو مجھے بچپن ہی سے پیاری ہے۔ یاد ہے جب تیری ماں تجھے کھینچ کر اسکول لے جایا کرتی تھی تو تو بھاگ کر میری گود میں آچھپتی تھی۔" تائی کی زبان پھر سے شہد ٹپکانے لگی۔

عریشہ کی یادداشت میں ایسا کوئی لمحہ نہیں تھا۔ ہاں یہ یاد تھا کہ ابا کی وفات کے بعد تائی اس سے کچھ زیادہ ہی محبت کرنے لگی تھیں... کرنے لگی تھیں کہ جتانے لگی تھیں۔ عریشہ کا ذہن ان گتھیوں کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوا تھا۔ ہاں کبھی کبھی یہ محبت ماں کی محبت کے مقابل کھڑی ہو جاتی۔ یہ صورت حال عریشہ کے لیے تو نہیں، البتہ عادلہ کے لیے ضرور تکلیف دہ ہو جاتی تھی۔

"تمہاری ماں اور پھوپھی نے ہمیشہ مجھے کمتر ہی جانا۔ میں ان پڑھ جاہل، وہ پڑھی لکھی عورتیں میرا ان کا مقابلہ کیا؟"

"تائی جان! ایسی بات کیوں کر رہی ہیں۔"

"بات تو یہی سچ ہے... میں تو ساری زندگی ان کی عقل کا مقابلہ نہیں کر سکی... میں گھنی، میسنی نہیں ہوں، جو دل میں وہی زبان پہ... تیری ماں نے بڑی کوشش کی کہ تجھے مجھ سے دور رکھ سکے۔ تجھے کھینچ کر لے جاتی تھی، پابندیاں لگاتی تھی... اور میں ایسی پاگل... جب تک تیرے منہ میں نوالہ نہ ڈال دوں... اپنے حلق سے کھانا نہیں اترتا تھا۔"

انہوں نے اک طویل سانس بھری۔ عریشہ ان کے لہجے سے بری طرح متاثر ہو چکی تھی... تب ہی پلٹ کر ان کا تیل والا ہاتھ پکڑ لیا۔

"جانتی ہوں تائی جان! کہ آپ مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں۔"

"لے پگلی! اپنا ہاتھ کیوں خراب کرلیا۔"

"کچھ نہیں ہوتا... تیل ہی تو ہے۔"

"ایسے مخمل جیسے ہاتھ ہیں تیرے، ان کی حفاظت کیا کر۔"

"او کے... اب جلدی سے بال سمیٹ دیں۔ امی کی آواز آجائے گی۔"

"اچھا عرشی! اپنی ماں سے پوچھنا، دو ہزار ہوں گے۔ مہینے کے آخری دن ہیں۔ پہلے ہی شادی پر اتنا خرچ ہوا ہے۔ نعمان سے مانگے تو جان کھا لے گا... گھر میں ایک بوٹی نہیں اور تمہارے تایا کے حلق سے دال سبزی اترتی نہیں۔"

"ہاں، امی کے پاس پڑے ہیں... میں ابھی لاتی ہوں۔"

"ذرا جلدی لانا۔" انہوں نے عجلت میں اس کے بال سمیٹے۔ تو وہ اپنے گھر کی طرف آگئی۔ عادلہ سبزی بنا رہی تھیں، اسے ڈانٹنے لگیں۔

"نہ اسٹڈیز کی فکر ہے، نہ گھر کے کسی کام کی۔ وہاں ہو تو بیٹھ ہی جاتی ہو۔"

"اچھا میں آکر کرتی ہوں... ابھی تو دو ہزار دیں۔"

"وہ کیوں؟" عادلہ نے حیران ہو کر دیکھا۔

"تائی کو ضرورت ہے۔"

"کس لیے؟" عادلہ نے غصہ دباتے تحمل سے پوچھا۔

"پتا نہیں... اب دے بھی دیں۔ پرس میں سے میں نکال لوں؟" وہ جھنجلائی

"تمہارا دماغ خراب ہے۔ مہینے کے آخری دن ہیں۔ میں نے اپنے خرچے کے لیے رکھے ہیں۔ انہوں نے بتا دیا ہوگا کہ ماں کے پاس ہیں۔"

"ہاں... ل..." اس نے کان کھجایا۔ "امی ہمارا کون سا خرچا ہے۔"

"ہاں... ہم تو ہوا کھا کر اور پانی پی کر زندہ ہیں... اگر ہمیں ضرورت پڑ گئی تو..." انہیں غصہ آ گیا۔

"تو انہیں بھی تو ضرورت ہے۔"

"دے دیتی، اگر مجھے یقین ہوتا کہ انہیں واقعی ضرورت ہے۔"

"امی! پلیز... اب تو میں ان سے کہہ آئی ہوں۔ بعد میں طعنے مت دیجیے گا۔" وہ منتوں پر اتر آئی۔

"عرشی! تم سچ مچ بہت بے وقوف ہو... دو بول محبت کے سن کر پگھل جاتی ہو... اچھا جاؤ... ایک لینا۔" انہیں بادل نخواستہ اجازت دینا پڑی۔

"کیا کروں؟ نبیلہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ مجھے کوئی ڈھال لینی چاہیے۔ شاید اسی طرح بچت ہو سکے۔ لیکن... کیا کروں اس کا... خوبصورت لہجوں کے پیچھے رویوں کو پہچان ہی نہیں پاتی۔" وہ واقعی الجھن کا شکار ہو گئی تھیں۔

"اچھا سنو! جلدی واپس آؤ اور آکر برتن دھو دو۔"

"ایک تو پتا نہیں، یہ امی کو میرے مخمل جیسے ہاتھ کیوں نہیں آتے۔" عریشہ جھنجلا کر دروازہ پار کر گئی۔

☼ ☼ ☼

نعمان نے بے چینی سے پہلو بدلتے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ کب سے آیا بیٹھا تھا۔ مگر اس کی ایک جھلک بھی دکھائی نہ دی تھی۔

"تمہاری بڑی مہربانی بیٹا! اگر اس دن تم مدد نہ کرتے۔ اس طوفانی بارش میں عائشہ اکیلی کہاں کہاں ہوتی۔" ماسٹر صاحب کی آواز پر اس نے چونک کر دیکھا۔

"میرا فرض تھا۔ آخر برسوں کی محلے داری ہے۔" اس نے مودب لہجے میں کہا۔

"اور سناؤ، کاروبار ٹھیک جا رہا ہے۔"

"جی... اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

"ثوبان تو ایم بی اے کر رہا ہے غالباً"۔

ثوبان کے ذکر پر وہ بدمزا ہو گیا۔ ثوبان اور اس کی تعلیم خاصا ناگوار موضوع تھا۔

"بس ماسٹر صاحب، ابا بیمار ہو گئے تو مجھے کاروبار سنبھالنا پڑ گیا۔ بی اے میں پڑھ رہا تھا... پھر سوچا... کسی ایک کو تو قربانی دینا ہی ہے۔ چھوٹے بہن بھائی کسی منزل تک پہنچ جائیں۔ تو یہی کافی ہے۔" اس نے حتی الامکان خود پر انکساری طاری کی۔ ظاہر ہے اب انہیں یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ شروع سے ہی پڑھائی میں دل نہیں لگتا تھا۔

"ماشاء اللہ، ورنہ آج کل کون کسی کے بارے میں سوچتا ہے۔"

"ابو..." دروازے کے دوسری طرف سے عائشہ کی آواز پر اس نے بے ساختہ دیکھا۔ وہ ذرا اوٹ میں کھڑی تھی۔

"لے آؤ بیٹا! اندر ہی لے آؤ۔"

نعمان کا دل چاہا، ماسٹر صاحب کا منہ چوم لے۔

عائشہ نے اندر آکر سلام کیا اور درمیانی میز پر ٹرے رکھ دی، جس میں چائے کے ساتھ بسکٹ اور نمکو وغیرہ موجود تھے۔ اس نے سبز دوپٹہ ماتھے تک اوڑھ رکھا تھا۔ نعمان نے چور نگاہوں سے دیکھ کر چہرہ جھکا لیا۔ محبت میں پہلی شرط احترام ہے۔ اس کے دل و دماغ نے پہلی بار سر تسلیم خم کیا تھا۔ وہ معطر ہوا کے جھونکے کی طرح آئی اور گزر گئی۔ وہ سر جھکائے چائے کے گھونٹ بھرتا ماسٹر صاحب کے سوالوں کے جواب دینے لگا۔ ماسٹر صاحب کو یہ لڑکا اچھا لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

فاطمہ کچن میں مصروف تھی۔ ارد گرد انواع و اقسام کے کھانے اور ڈبے بکھرے تھے۔ اس کا ارادہ آج واپس جانے کا تھا سو کچھ کھانے بنا کر فریز کر رہی تھی۔

"کمال ہے، آج گھر میں دعوت ہے اور مجھے خبر ہی نہیں۔"

طیبہ کی آواز پر فاطمہ پلٹی اور مسکرادی۔ وہ بظاہر

فریج کھولے۔ اس کا جائزہ لے رہی تھی۔
"دعوت کہاں بھابھی! وہ تو آج مجھے واپس جانا تھا تو سوچا' کچھ کھانے بنا کر فریز کردیتی ہوں۔"
"ہاں بھئی' اب تمہارے ہاتھ جیسا ذائقہ ہمارے ہاتھ میں کہاں ؟" اس کا لہجہ سراسر طنزیہ تھا۔
"نہیں' وہ محسن کہہ رہا تھا تو..." فاطمہ ٹھٹک سی گئی۔ وہ سیدھی سادی لڑکی تھی۔ طیبہ کے مزاج کی وجہ سے ویسے ہی اس سے دور رہتی۔
"محسن کی بڑی مانتی ہو۔"
فاطمہ تیزی سے پلٹی۔ طیبہ مسکرا کر باہر نکل گئی۔
"بھابھی نے ایسے کیوں کہا۔"
"فاطمہ بیٹا! بس کرو... تھک جاؤگی' صبح سے لگی ہو۔" نبیلہ پھپھو نے آکر اسے چونکا دیا۔
"جی پھپھو! ہوگیا ہے۔"
"چلو پھر بازار چلتے ہیں۔ تمہارے لیے اچھا سا سوٹ لے کر آتے ہیں۔"
"اس کی ضرورت نہیں۔ میرے پاس بہت کپڑے ہیں۔"
"کچھ باتیں ضرورت کے لیے نہیں' دل کی خوشی کے لیے کی جاتی ہیں ڈیر کزن۔" محسن کو غالباً" نبیلہ نے اسی مقصد کے لیے بلایا تھا۔
نبیلہ رخ موڑ کر ڈبے فریزر میں رکھنے لگی۔ وہ ابھی تک طیبہ کی کہی بات میں الجھی تھی۔ محسن اور نبیلہ کے اصرار پر اسے جانا ہی پڑا۔
طیبہ نے انہیں جاتے دیکھا تو کلس کر رہ گئی۔
"بہت ناز اٹھائے جارہے ہیں' بھتیجی کے۔ اور وہ بھی کتنی گھنی اور میسنی ہے۔ پھپھو' پھپھو کہتی آگے پیچھے پھرتی ہے... کوئی غرض ہے تب ہی اتنی جان ماری ہورہی ہے۔ ورنہ کون اتنا کرتا ہے۔"
طیبہ کی خود غرض فطرت اس کے دماغ میں خناس بھرنے لگی... حالانکہ فاطمہ کی فطرت میں ہی خدمت گزاری اور خلوص شامل تھا۔ مگر طیبہ کو عادت تھی ہر کسی کو اپنی عینک سے دیکھنے کی۔ اور عینک بھی وہ' جس کے شیشے بے حد دھندلے تھے۔

☆ ☆ ☆

بانو آئی تھی۔ مریم کے لیے اپنے دیور کا رشتہ لے کر...
"لیکن مریم کیوں؟ فاطمہ اس سے بڑی ہے۔" حمیدہ نے اعتراض کیا۔
"میں کیا کروں' اسے تو مریم ہی پسند ہے حالانکہ میں نے کہا بھی کہ فاطمہ سے کروا دیتی ہوں۔ اب مریم کو دیورانی بنانے کا مطلب ہے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لوں۔" بانو نے مزے سے کہا۔ مریم کو تو آگ لگ گئی۔
"مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے۔ تمہاری دیورانی بننے کا اور تمہیں میرے لیے وہی ملا ہے۔ پختہ عمر کلرک... جس کے دانت چوبیس گھنٹے منہ سے باہر رہتے ہیں... کیا کرے اسٹرکچر ہی ایسا ہے۔"
"اپنا چوکھٹا دیکھا ہے... ہر نقش فریم سے باہر... اور منہ پر یہ کھلے ہوئے گل بوٹے... ایسی حور پری نہیں ہو' جو کوئی شہزادہ تمہیں بیاہنے آئے گا۔ ہمارے جیسے گھروں میں یہی دکان دار کلرک ہی جھانکتے ہیں۔"
"تمہارا دیور اگر دنیا کا آخری مرد بھی ہوا تو میری طرف سے صاف انکار ہے اور اماں! اگر آپ نے ہاں کرنے کی کوشش کی' تو میں کچھ کھالوں گی' بتا رہی ہوں۔" وہ تن فن کرتی اندر کمرے میں گھس گئی۔
"دیکھا اماں! اس کی زبان دیکھی ہے۔ اور اسے کالج میں پڑھاؤ۔" بانو نے ماتھا پیٹ لیا۔
"تھوڑا تحمل رکھ بانو! تجھے بھی بس ہل ہل کرنے کا شوق ہے۔ ضرورت کیا تھی اس کے سامنے بات کرنے کی... اور ویسے بھی جب تک فاطمہ کی شادی نہیں ہوجاتی' میں تو مریم کے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں۔" حمیدہ نے صاف کہہ دیا۔
"اچھا مریم کی رہنے دو ابھی... نعمان کی خیر کرنی۔"
حمیدہ نے ہاتھ میں پکڑا کپ ٹرے میں پٹخا۔

"جب تک دونوں لڑکیوں کی نہیں ہو جاتی۔ میں تو لڑکوں کا نام بھی نہیں لوں گی اور اگر تو اپنی وہ موٹی بھینس جیسی نند میرے سر تھوپنے کا سوچ رہی ہے۔ تو مریم کی طرح میری طرف سے بھی صاف انکار ہے۔"

"ہو تو میری ماں، پر کام اور ارادے سارے دشمنوں والے ہیں۔ کوئی ایک بلا تو میرے سر سے ٹلے گی۔"

"اپنی بلائیں میرے سر ڈالنے کی ضرورت نہیں ہے... معاف کرو بی بی۔" حمیدہ نے دونوں ہاتھ پٹاخ سے اس کے سامنے جوڑے... مارے غصے کے بانو کو رونا ہی آگیا۔

"ٹھیک ہے جا رہی ہوں میں... اب نہیں آؤں گی... ابا سے سلام کہہ دینا... اس گھر میں میری یہی عزت ہے..." جوتا پہن کر چادر اوڑھتی بولتی بولتی دروازے سے نکل گئی۔

"عزت کروانے والے کام بھی تو ہوں۔" حمیدہ بڑبڑائی۔ پھر ٹرے پر نظر گئی۔ "ایک نمبر کی بھوکی ہے۔ اس غصے میں بھی سارے بسکٹ چبا گئی۔"

☼ ☼ ☼

"جاؤ بیٹا! طیبہ کو بھی بلا لاؤ۔" جب سے وہ لوگ بازار سے آئے تھے۔ طیبہ کمرے سے باہر ہی نہیں نکلی تھی۔ اب رات کا کھانا کھایا تو نبیلہ نے فاطمہ سے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ فاطمہ ملازمہ نہیں ہے۔" محسن نے سختی سے کہا۔ "بھابھی کو خود تو احساس ہی نہیں۔ سارا دن اپنے کمرے میں بند... دو گھڑی مہمان کے پاس بیٹھنے کی بھی توفیق نہیں۔"

نبیلہ چپ سی ہو گئیں۔ وہ کہہ تو ٹھیک ہی رہا تھا۔

"چھوڑیں۔ اب اتنی سی بات کے لیے بدمزگی کیوں کروائیں۔" فاطمہ اٹھ گئی۔ نبیلہ نے توصیفی نگاہوں سے اسے جاتے دیکھا۔

"ماشاءاللہ بہت ہی سمجھ دار بچی ہے۔"

"جی۔ بڑی مامی کی تو نہیں لگتی۔" محسن نے معصومیت سے کہا۔

"بہت بدتمیز ہوتے جا رہے ہو۔"

"اچھا میں ہاتھ دھو آؤں۔" وہ ہنستے ہوئے چلا گیا... مگر واپسی پر راہداری سے گزرتے ہوئے رک گیا۔ فاطمہ طیبہ کے کمرے کے سامنے کھڑی تھی۔ ہاتھ ہینڈل پر تھا۔ مگر بت کی مانند ساکت و صامت... کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوتے ہی وہ آہستگی سے اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا... ادھ کھلے دروازے سے طیبہ کی سسکیاں باہر آ رہی تھیں۔

"جمال! اب میری بس ہو گئی ہے۔ کسی فالتو سامان کی طرح گھر کے کونے میں پڑی ہوں۔ نہ کوئی حیثیت ہے، نہ اہمیت... اور کل جب آنٹی ملازمہ کے سامنے میری برائیاں کر رہی تھیں۔ کچھ نہ پوچھو میرے دل پر کیا گزری۔ مجھے نہیں پتا، آنٹی نے مجھ سے کس بات کا بیر باندھا ہے۔ کیا صرف اس لیے کہ میں آپ کی پسند ہوں۔"

محسن کو فاطمہ کا تو نہیں پتا چلا لیکن خود غصے سے برا حال ہو گیا۔ لیکن طیبہ کی اگلی بات نے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی۔

"اور وہ فاطمہ... سارے گھر میں یوں دندناتی پھر رہی ہے۔ گویا وہ اس گھر کی بہو ہو... اور جمال! تم یقین کرو نہ کرو... محسن کا کوئی نہ کوئی چکر فاطمہ کے ساتھ..."

فاطمہ لڑکھڑائی... عقب سے محسن نے اسے تھام لیا... فاطمہ نے تڑپ کر دیکھا۔ اس کی آنکھیں لبالب پانیوں سے بھری تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے محسن کے ہاتھ ہٹائے اور بھاگتی چلی گئی... محسن کا ضبط جواب دے گیا تھا... اس نے تیزی سے پورا دروازہ کھول دیا۔

طیبہ نے بوکھلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ طیبہ کا رنگ ایک لمحے کو زرد پڑ گیا۔

"میں نے آپ جیسی گھٹیا عورت ساری زندگی نہیں دیکھی۔"

اس کی آواز اتنی بلند تھی کہ دوسری طرف جمال نے بخوبی سنی۔

"ڈرامہ باز عورت..." محسن نے نفرت سے کہا اور مڑ گیا... کچھ لمحے اور کھڑا رہتا تو شاید اس کا گلا دبا دیتا۔

"طیبہ... طیبہ، کیا ہوا؟"

جمال کی آواز پر وہ ہوش میں آئی۔

"تم نے... تم نے سنا جمال... یہ اوقات ہے میری اس گھر میں... مجھے اس طرح گالیاں دی جاتی ہیں۔" محسن آندھی و طوفان کی طرح کھانے کی میز تک آیا۔ جہاں فاطمہ روتی جا رہی تھی۔ اور نبیلہ پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔ "کیا ہوا ہے؟"

"اٹھو فاطمہ! تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔" محسن نے کہا۔

"کیا ہوا محسن؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ... فاطمہ رو کیوں رہی ہے۔"

"واپس آ کر بتاتا ہوں... اٹھو فاطمہ..." وہ سختی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ اپنا چہرہ صاف کرتی فاطمہ اس کے پیچھے تھی۔

☼ ☼ ☼

"میری ہی غلطی ہے، مجھے فاطمہ کو لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ کیسی کینہ پرور عورت ہے... آپ کے بارے میں کیسی کیسی باتیں جمال بھائی سے کہہ رہی تھی۔" وہ غصے میں پورے کمرے میں چکرا رہا تھا۔ نبیلہ سر پکڑے بیٹھی تھیں۔

"اب پتا چلا، جمال بھائی مجھے فون کیوں نہیں کرتے... ایسا ہی کچھ میرے بارے میں بھی کہتی ہو گی۔"

"محسن! بیٹھ جاؤ۔" نبیلہ نے ہارے ہوئے انداز میں کہا۔ "مجھے تو فاطمہ کی فکر ہے۔ نجانے کیا سوچتی ہو گی۔ طیبہ کو ذرا شرم نہیں آئی ایسی تہمت لگاتے... کیسی شرم لحاظ اور رکھ رکھاؤ والی لڑکی ہے... اس نے تو کبھی تم سے کھل کر بات بھی نہیں کی۔"

"گھٹیا سوچ رکھنے والوں کو بات بڑھانے کے لیے رائی کی ضرورت بھی نہیں پڑتی... پہاڑ کھڑا کر لیتے ہیں۔" محسن تھک کر ان کے قریب بیٹھا۔

"ایسے کون سے پہاڑ کھڑے کر دیے میں نے..." طیبہ دروازے میں آ کھڑی ہوئی۔ بالکل بدلے ہوئے تیور کے ساتھ... نہ کوئی خوف نہ جھجک۔

"کچھ دیکھا ہے، کچھ محسوس کیا ہے تو ہی بات کی ہے۔"

"امی! اس سے کہہ دیں کہ یہاں سے چلی جائے۔" محسن نے دانت پیس کر کہا۔

"جا رہی ہوں... اس گھر سے... میں نے شادی جمال سے کی تھی... جب وہی یہاں نہیں۔ تو یہاں رک کر آپ کے طعنے سننے کا فائدہ..." وہ کھٹ کھٹ کرتی چلی گئی۔

"خس کم جہاں پاک..." محسن نے کہہ کر ماں کو دیکھا... وہ گم صم بیٹھی تھیں۔

"آپ کو زیادہ ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ جمال بھائی سے بات کریں۔"

نبیلہ نے اک طویل سانس لے کر بیٹے کو دیکھا جو اس پچویشن پر بوکھلایا ہوا بھی تھا اور غصے میں بھی تھا۔ وہ بولیں تو لہجہ خلاف معمول پرسکون تھا۔

"میں ٹینشن نہیں لے رہی... میں جانتی ہوں، مجھے اس مسئلے کو کیسے ہینڈل کرنا ہے... اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ طیبہ یہ سب کیوں کر رہی ہے... جب تک بات لحاظ کے پردے میں چھپی تھی چل رہا تھا... اب فیصلہ تو کرنا پڑے گا... تم جاؤ... آرام کرو... صبح آفس کے لیے نکلنا ہے۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا۔" محسن نے تشویش سے ماں کو دیکھا۔

"فکر نہ کرو۔ تمہاری ماں اتنی کمزور نہیں ہے۔" وہ قصداً" مسکرائیں... محسن کو ان کی مسکراہٹ سے وہی تشفی ہوئی جو ننھے بچے کو چوٹ کھانے کے بعد ماں کی حوصلہ بڑھاتی مسکان سے ہوتی ہے۔

☼ ☼ ☼

ثوبان نے رائٹنگ ٹیبل پر پڑی پرچی اٹھا کر دیکھی۔

اک ذرا ہاتھ بڑھا میری طرف

خود کو میرا تو ہم سفر کردے
تم میری زیست کا حاصل ہو
اتنا کہہ اور معتبر کردے

ثوبان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اسے اک ٹین ایجر کی جسارت سمجھ کر نظر انداز کرنے کو تھا۔ اس سے قبل کہ اسے ڈسٹ بن میں پھینکتا... اس نے دروازے میں کھڑی عریشہ کو دیکھ لیا تھا۔ جس کے ہاتھ میں دو سفید مگ تھے۔ جن پر سرخ اسٹرابری بنی تھیں... یہ عریشہ کے فیورٹ مگ تھے۔

"آؤ عریشہ..." اس نے پرچی سائڈ پر رکھ دی۔

"کافی..."

"شکر ہے اس گھر میں کسی کو تو کافی بنانا آتی ہے۔" ثوبان نے ہاتھ بڑھا کر مگ پکڑا اور ریلیکس سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔ یونہی موڈ ہو رہا تھا... آپ کے ساتھ کافی پیتے باتیں کرنے کا۔" وہ کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی... جہاں ڈھلتی دوپہر کی زردی بکھری تھی۔

"آپ کا دوست کیسا ہے؟"

"کون سا"

"وہی، جس کے لیے سرخ گلاب لے کر گئے تھے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی رقابت در آئی۔

"تم سرخ گلابوں سے اتنا الرجک کیوں ہو؟" ثوبان مسکرایا... اب تو اسے بھی اس آنکھ مچولی میں مزا آنے لگا تھا۔

"میں کیوں پھولوں سے الرجک ہوں گی۔" عریشہ نے کندھے اچکائے۔

"تو پھر میری دوست سے جیلس ہو۔"

"میری دوست" عریشہ نے ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

"وہ لڑکی تھی؟"

"میری یونیورسٹی فیلو۔"

"آپ کی لڑکیوں سے دوستی ہے؟"

"ہاں بھئی، ساتھ پڑھتے ہیں۔ تو دوستی بھی ہو ہی جاتی ہے" ثوبان نے لاپروائی سے کہا... عریشہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے مگ جھپٹ لیا۔

"ارے... ارے کافی تو پینے دو"

"اسی کے ساتھ پئیں، جس کے لیے پھول لے کر گئے تھے۔" عریشہ نے چبا چبا کر کہا اور تیزی سے نکل گئی۔

"اسے کس بات پر غصہ آگیا۔ حد ہو گئی... یہ کوئی بات تھی خفا ہونے والی... نجانے کب میچیور ہوگی۔" عریشہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی... چارپائی پر بیٹھی حمیدہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"کیا ہوا عرشی؟"

"تائی جان! یہ ثوبان ہے نا بالکل بھی اچھا نہیں ہے... بہت برا ہے۔" اس کی آنکھیں چھلکنے کو بے تاب تھیں۔

"کیا کہہ دیا میری بچی کو؟ ابھی بلا کر پوچھتی ہوں۔" انہوں نے پیار سے کہتے بازو سے پکڑ کر قریب بٹھالیا۔

"وہاں یونیورسٹی میں پڑھنے تھوڑی جاتا ہے، لڑکیوں سے دوستی کرنے جاتا ہے۔ اور وہ بیمار ہو جائیں تو پھول لے کر عیادت کے لیے اسپتال پہنچ جاتا ہے۔"

"تو تو کیوں پریشان ہو رہی ہے... وہاں دس ہزار لڑکیاں ہوں... میری عرشی جیسی تو ایک بھی نہیں ہوگی۔"

(یہ بات وہ کیوں نہیں کہتا)

"آنے دے نیچے، ابھی اس کے لتے لوں گی... اسے کہ تجھے رلا دیا۔"

☼ ☼ ☼

عائشہ ابھی ابھی اسکول سے لوٹی تھی... سیدھی ماں کے کمرے میں آئی، مگر دروازے میں ٹھٹک کر رک گئی۔ آمنہ خاتون کے پاس نعمان بیٹھا تھا۔

"موصوف روز ہی چلے آتے ہیں۔"

نعمان نے اسے دیکھا تو آنکھوں میں چار سو چالیس والٹ کا بلب روشن ہو گیا۔ مگر دوسرے پل وہ سر جھکا چکا تھا۔

"السلام علیکم!" اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ آمنہ خاتون مسکرا دیں... سلام کا جواب دے کر کہنے لگیں۔

"عاشی! کھانا کھا کر نعمان کے لیے ایک کپ چائے تو بنا دو۔ مجھے تو اس نے اٹھنے نہیں دیا۔"

"نہیں خالہ! چائے کی ضرورت نہیں ہے۔"

عائشہ سر ہلا کر چادر اور بیگ کمرے میں رکھ کر کچن میں آگئی۔ کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ چائے بھی بنالی۔ کپ لے کر اندر آئی تو آمنہ خاتون بے حد سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

"ایک ہی حسرت ہے میری، عاشی کا رشتہ اچھی جگہ ہو جائے تو میں سکون سے مر سکوں۔ پتا نہیں کیا بات ہے کہ کہیں بات آگے بڑھتی ہی نہیں۔"

عاشی کو دیکھتے ہی وہ فوراً خاموش ہو گئیں۔

عاشی نے بڑے ضبط سے کپ نعمان کو تھمایا اور کمرے میں آگئی۔

"وہ فرید اور اکرم..." نعمان نے ان کے بیٹوں کے بارے میں پوچھنا چاہا۔

"اللہ کا شکر ہے... فرید تو پچھلے سال دوبئی چلا گیا تھا۔ اکرم ابھی ایف ایس سی کر رہا ہے۔ بہاولنگر اپنے ماموں کے پاس رہتا ہے... میرے بھائی کی اولاد نہیں ہے۔ بچپن سے اسے گود لے لیا تھا... کہتا ہے وہاں کوئی نہیں ہے... واپس آجاؤں گا... مگر اس کے ابو نے منع کر دیا... وہاں اس کا ماموں بھی تو تنہا ہے۔ ہمارے پاس تو عاشی ہے... ہمارا ارادہ تو یہی ہے کہ عاشی کی شادی کے بعد وہیں بہاولنگر چلے جائیں گے... عاشی کے ابو کی ریٹائرمنٹ بھی قریب ہے... اس کرایے کے گھر سے بھی جان چھوٹے گی۔"

آمنہ خاتون کو بھی بڑے عرصے کے بعد سامع ملا تھا۔ سو نعمان بہت جلد ان کے گھر کے تمام حالات سے بخوبی واقف ہو گیا تھا۔

"اچھا خالہ! اب اجازت دیں... کوئی کام ہوا تو مجھے ضرور کہیے گا۔" آمنہ خاتون اسے دعائیں دینے لگیں۔

اس کے جانے کے بعد عاشی شیر کی طرح کمرے میں آئی۔

"امی! آپ بھی حد کرتی ہیں۔ کیا ضرورت تھی، ایک اجنبی شخص کے سامنے میرے رشتے کی بات کرنے کی۔"

آمنہ خاتون نے دیکھا اس کا چہرہ غصے اور خجالت سے سرخ ہو رہا تھا۔

"مجھے کس قدر انسلٹ فیل ہوئی۔ میں اتنی گئی گزری ہوں کہ مجھے کوئی پوچھنے ہی نہیں آرہا... ہزاروں لڑکیاں ہیں، جن کی شادیاں نہیں ہوئیں... تو وہ کیا زندہ نہیں رہتیں... ہر آئے گئے کے سامنے یہی ذکر... آپ تھکتی نہیں میری بے عزتی کرواتے کرواتے۔"

"عائشہ! تو کتنی تلخ ہونے لگی ہے" انہوں نے حیرت اور دکھ سے اسے دیکھا۔

عائشہ کو اپنے لہجے کی تیزی کا احساس ہوا۔ تو جیسے تھک کر ان کے قریب بیٹھ گئی۔

"جانتی ہوں، میں اک معمولی شکل و صورت کی لڑکی ہوں... میرا باپ کوئی بڑا جہیز بھی نہیں دے سکتا... تو کیا فرق پڑتا ہے... میں کسی پر بوجھ تو نہیں... اپنا کماتی، اپنا کھاتی ہوں اللہ نے کسی کا محتاج تو نہیں کیا۔"

"عاشی! مجھے یہ لڑکا بہت اچھا لگتا ہے۔ گھرانا بھی ہمارے جیسا ہے۔ اور مجھے لگتا ہے، وہ بھی تجھے پسند کرتا ہے۔"

عاشی نے حیرت سے ماں کی شکل دیکھی۔

"چوک میں کھڑا کر کے نیلامی لگا دیں... جس کا جی چاہے لے جائے۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر چلی گئی... آمنہ خاتون ششدر سی اسے دیکھتی رہ گئیں۔

"یہ تو نہیں، وقت کی تلخیاں بول رہی ہیں، میری بچی۔" انہوں نے آنکھوں پر دوپٹہ رکھ لیا۔

☼ ☼ ☼

پڑھتے پڑھتے اس کا دماغ بوجھل ہونے لگا۔ اس

نے گردن موڑ کر ماں کو دیکھا۔ سارے دن کی تھکی ہاری سو رہی تھیں... وہ چائے بنانے کے ارادے سے کچن میں آگیا۔ شکر تھا کچن میں سلنڈر گیس موجود تھی۔ ورنہ وہ کہاں آگ سلگاتا۔ چائے بنا کر پیالی میں ڈال رہا تھا۔ جب کبری چلی آئی۔

"اچھا تو ہے۔ میں سمجھی بلی ہے۔"

"چاچی! بڑی خبردار نیند ہے تیری" وہ ہنسا... خیال تھا وہ ابھی کوئی نہ کوئی طعنہ مارے گی...

"اچھا دودھ اچھی طرح ڈھک کے اور دروازہ بند کرکے جانا۔" وہ جمائی لیتی چلی گئی۔

"حیرت ہے، آج تو راوی چین ہی چین لکھ رہا ہے۔" وہ پیالی اٹھا کر اندر آگیا۔ چارپائی پر بیٹھا تو وہ چرچرانے لگی۔ جمیلاں نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

"کیا ہوا بلو...؟"

"کچھ نہیں اماں..."

"اب سو جا بلو، ساری رات پڑھتا رہے گا۔"

"اماں! پرچے ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی میرے اس جاگنے پر میرے مستقبل کا انحصار ہے۔"

"اللہ ڈھیر ساری کامیابیاں دے... تیری راہیں آسان کرے" وہ دعائیں دیتے دیتے سو گئیں۔ ابرار نے اس کے سوئے ہوئے چہرے کو پیار سے دیکھا۔

"ماں! سفر تو تم نے کیا ہے... لیکن اب تھوڑا ہی عرصہ ہے... اللہ نے چاہا تو تمہاری مشقت ختم ہونے کو ہے۔"

اس نے چائے کا گھونٹ بھرا اور کتابیں کھول لیں... دھیرے دھیرے بیتتی رات میں وہ مستقبل کے چراغ جلاتا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میری سمجھ میں نہیں آرہا، آپ کچھ کہتی ہیں، طیبہ کچھ اور کہہ رہی ہے۔"

جمال سخت الجھا ہوا تھا، کئی ماہ سے طیبہ روٹھ کر میکے بیٹھی تھی۔

"جمال! میں یہ نہیں کہتی کہ مجھ پر اعتبار کرو، جو کچھ ہوا؟ میں اسے بھول جانا چاہتی ہوں۔ غلطی تمہاری بھی ہے، تم نے ابھی تک اسے اپنے پاس بلانے کے لیے کوئی کوشش نہیں کی۔ ایک بیوی کا حق ہے کہ وہ شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ رہے۔"

نبیلہ کی یہی اچھی عادت تھی۔ وہ کبھی بات کو بڑھاتی نہیں تھیں۔ اس وجہ کو ختم کرنے کی کوشش کرتیں، جو فساد کا باعث بنی ہو۔

"امی! میں تو آپ کی وجہ..."

"میری فکر نہ کرو، بس تم کاغذات بنواؤ، اور اسے اپنے پاس بلالو، طیبہ کے یہاں رکنے سے صرف قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ بھلا کسی کا نہیں ہو رہا۔ میں زبردستی اسے یہاں اپنی خدمت کے لیے نہیں روکنا چاہتی۔" انہوں نے رسانیت سے سمجھایا۔

"تو پھر ایسی عورت کا فائدہ، جو کسی کو فیض نہیں پہنچا سکتی۔" جمال نے تلخی سے کہا۔

"یوں مت کہو، جو کچھ اس نے کیا غلط تھا۔ لیکن میں نے معاف کیا۔ تم سے پیار کرتی ہے، تم سے مخلص ہے، میرے لیے یہی بہت ہے۔"

"آپ اکیلی رہیں گی؟"

"میری فکر مت کرو، میرے پاس محسن ہے، اور میں جلد اس کی شادی کردوں گی۔"

انہوں نے قطعی لہجے میں کہا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد فون بند کردیا۔ ٹانگیں دباتی بتول نے حیرت آمیز توصیفی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔

"بڑا دل گردہ ہے بیگم صاحبہ! میری بہو ایسی ہوتی تو چوٹی سے پکڑ کر گھر سے نکال دیتی... بلکہ بیٹے سے کہہ کر فارغ بھی کروادیتی۔"

"ایسے مت کہو بتول... غلطیاں چھوٹوں سے ہو جاتی ہیں۔ ہمارا کام انہیں سمجھانا اور معاف کرنا ہے۔ طیبہ سمجھانے کی حد سے نکل گئی ہے، سو میں نے اسے معاف کردیا۔" انہوں نے تحمل اور بردباری سے کہا۔

"اچھا... محسن کو میرے پاس بھیجو، مجھے اس سے ضروری بات کرنا ہے۔"

☼ ☼ ☼

حسب معمول وہ کالج سے سیدھی تائی کے پاس آئی تھی۔

"آجا میری بچی! فاطمہ نے آلو چنے کی چاٹ بنائی ہے، چائے بھی دم پر ہے۔"

عریشہ کچن میں چلی گئی، فاطمہ اس کے لیے چاٹ نکال رہی تھی۔

"لے جاؤ، میں چائے لاتی ہوں۔"

وہ چائے لے کر تائی کے پاس آگئی۔

"بات سن عرشی! یہ تیری ماں پیسے کو چھپانے لگی ہے۔" تھوڑی دیر کے بعد حمیداں نے رازداری سے پوچھا۔

"کیوں؟"

"ابھی تنخواہ آئی کو دیر ہی کتنی ہوئی ہے، کل پانچ سو مانگے تو صاف انکار کردیا کہ ختم ہوگئے۔ اتنی جلدی کیسے ختم ہوگئے۔" انہیں یہ بات ہضم ہی نہیں ہو رہی تھی کہ عادلہ نے انکار کیسے کردیا۔

"پتا نہیں... کسی کو ادھار دیے ہوں گے۔" عریشہ نے لاپروائی سے چاٹ کھاتے کہا۔

"ہاں... ہمیں ادھار دیتے تو جان نکلتی ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔

"ہو رہی ہیں، شہزادی کی ناز برداریاں، اماں! میں بھی کالج سے آئی ہوں۔" مریم حسب عادت چڑ گئی۔

"مریم! تو عریشہ سے نہ جلا کر، یہ تو مجھے شروع ہی سے بہت پیاری ہے۔" حمیداں نے دلار سے عریشہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "ابھی پاؤں پاؤں چلتی تھی، تب ہی سوچ لیا تھا، اسے اپنی بیٹی بناؤں گی۔"

"کیوں اپنی چار بیٹیوں سے جی نہیں بھرا تھا۔" مریم جل کر بولی۔

"ارے پگلی بہو کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

پانی پیتی عریشہ کو اچھو لگ گیا۔ ایسا واضح اظہار حمیداں کی طرف سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔

"ارے کیا ہوا؟ سنبھل کر کھاؤ۔" حمیداں گھبرا کر اس کی پیٹھ سہلانے لگیں۔

"نوالہ نہیں، آپ کی بات حلق میں پھنسی ہے۔" مریم ہنسی۔

"ہاں تو اس کی ماں نے کون سا اسے بتایا ہوگا۔ اس کے باپ کی بھی یہی خواہش تھی۔ اب نہ باپ رہا، نہ اس کی خواہش۔"

عریشہ نے سٹپٹا کر تائی کو دیکھا۔

"اب تو سب کچھ اس کی ماں کے ہاتھ میں ہے، میں تو اب بھی ذکر نہ کرتی، بس دل بھر آیا، سنا ہے بالا ہی بالا اس کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہے۔"

"نہیں تائی جان۔" عریشہ نے گلاس ہاتھ سے رکھ دیا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔"

"تو بچی ہے، تمہیں نہیں۔"

عریشہ کا دل ایک دم ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ بہت اچھے ہیں نعمان صاحب! لیکن میں نے اب تک کی زندگی بہت احتیاط سے گزاری ہے۔ آپ کا اس طرح بار بار اس دروازے تک آنا لوگوں کو چونکا سکتا ہے اور لوگوں کو باتیں بنانے کے لیے زیادہ کچھ کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

دروازے کے دوسری طرف کھڑی عائشہ کی مدھم آواز اور مضبوط لہجہ نعمان کو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

"عائشہ! میں... میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

عائشہ نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ اچھے قد کاٹھ اور اچھی شکل و صورت کا نوجوان تھا۔ سنا تھا کاروبار بھی اچھا چل رہا ہے۔ اگر اس کی ماں نے آس لگائی تھی تو یہ کچھ ایسا غلط تو نہ تھا۔

"تو اس کے لیے آپ کو نہیں، آپ کے والدین کو آنا چاہیے۔" عائشہ نے کہہ کر ایکدم دروازہ بند کردیا۔ نعمان نے بے یقینی سے بند دروازے کو دیکھا۔

"کیا واقعی عائشہ نے یہ کہا ہے' کیا واقعی اسے میرا ساتھ قبول ہے۔"

بے یقینی کا پل گزرا۔ تو دل خوشی سے بھر گیا۔ اس کا دل چاہا' گلی میں ایک ایک کو روک کر خوش خبری سنائے۔

☼ ☼ ☼
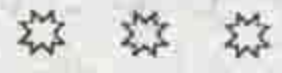
نبیلہ نے فاطمہ کا رشتہ مانگا تھا۔ جہاں حمیداں کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہیں برکت حسین نے سینہ پھلا لیا۔

"دیکھا... آخر بہن تھی میری' بھائی کا احساس کیا' کیسا لائق فائق لڑکا ہے' محسن اور کیسی اچھی نوکری...."

"ارے رہنے دو' غیروں سے بھولا کر دل بھر گیا' تو اپنوں کا خیال آیا۔" حمیداں سے شوہر کی جتاتی ہوئی خوشی ایک آنکھ نہ بھائی تھی۔

"ہائے فاطمہ! تیری تو لاٹری نکل آئی۔" مریم بے حد خوش تھی۔

نبیلہ نے کوئی ہنگامہ کرنے ہی نہیں دیا۔ بس اپنے ہاتھ سے انگوٹھی اتار کر فاطمہ کو پہنا دی' فاطمہ گم صم تھی۔

"پھوپھو! آپ نے تو طیبہ کی بات پر تصدیق کی مہر لگا دی۔" انگوٹھی دیکھتے ہوئے فاطمہ نے آہستگی سے کہا تو نبیلہ نے اس کی پیشانی چوم لی۔

"صرف اچھی اچھی باتیں سوچو' محسن نے کہا ہے' ہمارے گھر کو فاطمہ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے' اب کسی کی فضول سی بات پر میں ایسی ہیرا لڑکی کو کھو نہیں سکتی تھی۔"

"جمال بھائی کیا سوچیں گے۔"

"وہ میرا بیٹا ہے' اور فکر نہ کرو' سب کچھ اس کے مشورے سے ہو رہا ہے' اب جلدی سے مسکرا دو' محسن پوچھے گا' فاطمہ خوش تھی تو میں کیا جواب دوں گی۔"

ان کے شرارت بھرے انداز پر فاطمہ جھینپ کر مسکرا دی۔

"آجائیں' کھانا تیار ہے۔" عادلہ نے جھٹ پٹ کھانے کی تیاری کر لی تھی۔ کباب' چکن' پلاؤ' قورمہ۔

"پھوپھو.... بھتیجیوں کی بڑی فکر ہے آپ کو' بھتیجوں کے بارے میں کچھ نہیں سوچا۔"

نعمان نے کان میں انگلی چلاتے کہا' سب نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ آج پہلی بار اس کے منہ سے ایسی کوئی بات سنی تھی۔ ورنہ وہ من موجی اور مست سا بندہ تھا۔

"لڑکا اپنے منہ سے بول رہا ہے۔ بھائی صاحب سوچ لیں۔" نبیلہ نے مسکرا کر کہا۔

"صبر کرو.... صبر.... دو بہنیں گھر بیٹھی ہیں.... پہلے انہیں تو رخصت کر لے.... اپنی پڑ گئی ہے۔" حمیداں نے حسب عادت چمک کر کہا۔

"مطلب' بہنوں کو بیاہتا بیاہتا بوڑھا ہو جاؤں۔" بظاہر اس نے ہنستے ہنستے کہا۔ مگر لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ نبیلہ اور عادلہ نے بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھا۔

"نہیں بھئی۔ ہم تو نعمان کے لیے لڑکی ڈھونڈنا شروع کر دیں گے۔ فاطمہ اور نعمان کی شادی ایک ساتھ کریں گے۔" عادلہ نے کہا۔

"کیوں بھائی جان...." نبیلہ نے بھائی کو ساتھ ملا لیا۔

(ہاں میرا دماغ خراب ہے۔ اکلوتا اس گھر کا کمانے والا.... میں بیاہ کے ہاتھ سے گنوا دوں مریم کے بعد ہی کروں گی' کرتے رہو صلاح مشورے)

حمیداں نعمان کو دیکھتے سوچ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"امی! اچھا ہو گیا نا۔ محسن بھائی اور فاطمہ کی منگنی۔" سارے کام سمیٹ کر وہ دونوں گھر آئی تھیں۔

"ہاں بہت اچھا ہو گیا۔ فاطمہ کے لیے ایسا ہی اچھا شریک حیات ہونا چاہیے تھا۔" وہ اپنے بستر پر دراز ہو گئیں۔ وہ بھی ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

"بلکہ میرا تو دل چاہتا ہے' اب جلدی سے کوئی اچھا سا لڑکا ملے اور میں بھی اپنی بیٹی کی منگنی کروں۔"

(اچھا لڑکا آس پاس ہی تو ہے۔ اب آپ کو دکھائی نہیں دیتا تو میں کیا کروں۔)

"کس سوچ میں ڈوب گئیں؟"

"کچھ نہیں' میں تو سوچ رہی تھی۔ فاطمہ آپی کی شادی پر کپڑے کیسے بنواؤں گی۔" عریشہ ہنس دی۔

"ایک کام تو کرو۔" کچھ لمحے اسے دیکھنے کے بعد عادلہ کے دل میں خواہش سی پیدا ہوئی تو تکیے کے نیچے سے چابی نکال کر اسے تھمائی۔

"الماری کے لاکر میں ایک ڈبہ ہے.... وہ نکال لاؤ۔"

"کیسا ڈبہ....؟"

"لاؤ تو...."

عریشہ نے وہیں کونے میں رکھی الماری کا لاک کھول کر اندر سے ایک سرخ مخملیں بڑا سا ڈبہ نکالا۔

"امی! یہ تو زیور لگتا ہے۔"

عادلہ اٹھ کر بیٹھ گئیں.... ڈبہ اس کے ہاتھ سے لے کر کھولنے لگیں۔

"وائے.... کتنا خوبصورت ہے۔" مکمل گولڈ کا سیٹ کڑوں کے ساتھ جگر جگر کر رہا تھا۔

"امی! کس کا ہے؟"

"تمہارا۔" عادلہ نے پیار سے بیٹی کو دیکھا۔

"کیا مطلب؟ یہ تو بالکل نیا ہے۔" اس نے حیران ہو کر جھمکا اٹھایا۔

"میں نے کمیٹی ڈالی تھی۔ پچھلے ماہ نکلی تو فوراً بنوا لیا۔"

"اسی لیے آپ تائی کو پیسے نہیں دے رہی تھیں۔"

"ہاں.... مجھے اب کچھ تمہارے لیے بھی تو جمع کرنا ہے۔"

عریشہ کبھی انگوٹھی پہن کر دیکھ رہی تھی' تو کبھی جھمکا کان سے لگا کر.... نازک کلائی کڑوں سے سج گئی۔ عادلہ تصور ہی تصور میں اسے دلہن کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔

"اچھا بات سنو عرشی! ابھی کسی کو...."

لیکن عادلہ کی بات درمیان میں رہ گئی۔

"عادلہ چچی! وہ امی پوچھ رہی ہیں۔"

"مریم! دیکھو' امی نے میرے لیے کتنا خوبصورت سیٹ بنوایا ہے۔"

"کمال ہے چچی! اتنا زیور بنا لیا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔"

"ابھی کچھ دن قبل ہی لائی ہوں.... میں...."

"میں امی کو بلا کر لاتی ہوں۔"

"تائی کو یہاں کیوں بلانا ہے.... میں وہیں دکھا لاتی ہوں۔" عریشہ جوش میں اٹھی۔ عادلہ اپنا سر تھام کر رہ گئیں۔ وہ تصور میں حمیداں کے تاثرات کا اندازہ لگا سکتی تھی۔

☼ ☼ ☼

جمیلہ نے نم آنکھوں کے ساتھ بیٹے کی پیشانی چومی' پھر اس کے گلے میں پڑے گولڈ میڈل کو' پورا گاؤں امڈ پڑا تھا.... اصغر بھی سینہ تانے سب کی مبارک باد وصول کر رہا ہے۔ آج پہلی بار اسے ابرار پر فخر محسوس ہوا تھا۔ اخبار میں ابرار کی تصویر اور انٹرویو آیا تھا۔ جمیلہ کا بس نہ چلتا تھا اسے فریم کروا کے دیوار پر ٹانگ دے۔

"آج تو تو نے پورے گاؤں کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے بیٹا جی۔" ماسٹر صاحب نے اسے سینے سے لگا کر بھینچ لیا تھا۔

"اصغر! میں نے تجھ سے کہا تھا نا' معمولی لڑکا نہیں ہے۔ اسے تو بہت آگے جانا ہے۔"

"آہو ماسٹر صاحب.... بات تو آپ نے ٹھیک کہی تھی۔"

رات تک مٹھائی بٹتی رہی۔ لوگ آتے جاتے رہے۔ اور بہت رات گئے جب وہ کھری چارپائی پر بازوؤں کا تکیہ بنائے روشن تاروں بھرے آسمان کو تکتے مستقبل کی پلاننگ کر رہا تھا۔ تو جمیلہ اس کے لیے دودھ

کا پیالا لے کر آئی۔
"پتر! اب تو نوکری کرے گا؟"
ابرار مسکرا دیا۔ "اماں! ابھی تو سفر باقی ہے۔"
"ابھی اور پڑھائی کرے گا؟"
"ہاں اماں! میں نے سی اے کرنا ہے۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا ہے۔ سفر لمبا بھی ہے اور مہنگا بھی۔"
"اچھا۔" ابرار کو اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی محسوس ہوئی۔ دوسرے پل وہ جوش سے بولی۔
"تو فکر نہ کر' زیادہ پیسوں کی ضرورت پڑی تو میں بھینس بیچ دوں گی۔" اسے ماں کی معصومیت پر پیار بھی آیا اور رونا بھی۔
"بھینس بیچ دی تو اماں تمہارا گزارا کیسے ہو گا؟"
"اللہ وارث ہے۔"
"اماں! تو فکر نہ کر... مجھے اسکالر شپ بھی ملے گا اور میں کوئی چھوٹی موٹی ملازمت بھی ڈھونڈ لوں گا۔ میرا گزارا ہو جائے گا۔ بس یہ ہے کہ اب مجھے شہر میں رہنا پڑے گا۔"
"اچھا۔" وہ افسردہ سی ہو گئی۔ "خیر۔ تو دودھ پی۔"

☼ ☼ ☼

"سچی بات ہے کبری۔ لڑکا تو بہت ہی لائق نکلا۔" اصغراب تک متاثر تھا۔
"پتا ہے' ماسٹر جی بتا رہے تھے۔ اب وہ یونیورسٹی میں پڑھے گا اور بہت بڑا افسر بنے گا۔"
"بس اب اس کے قصیدے نہ پڑھتے رہو۔ ایک بار افسر بن گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔" کبری نے ہاتھ نچا کر کہا۔
"کیوں بھئی...."
"اصغر! میں کہتی ہوں' اب وقت آگیا ہے تو جمیلہ سے بات کر... میں تو کہتی ہوں' نکاح ہی کر دیتے ہیں... پاؤں میں نکاح کی بیڑی ہو گی تو مڑ کر ادھر ہی آئے گا۔"
"ہوں' کہتی تو تو ٹھیک ہے۔" اصغر نے پر سوچ انداز میں گردن ہلائی۔ "لے فر۔ میں صبح ہی جمیلہ سے بات کرتا ہوں۔ گھر کی بات ہے۔ چند دنوں میں دو بول نکاح کے پڑھا دیں گے۔"

☼ ☼ ☼

مرغیوں کو دانہ ڈالتے ابرار کے ہاتھ سے سارے دانے ایک ساتھ گرے... ساری مرغیاں پر پھڑپھڑاتی ایک ساتھ لپکیں۔ ابرار نے بے یقینی سے ماں کو دیکھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔
"بشری سے؟"
"ہاں' تیرا تایا کہتا ہے۔" جمیلہ کے لہجے سے صاف لگتا تھا۔ کہ وہ بھی دل سے راضی نہیں۔
"تایا جو مرضی کہتا رہے۔ لیکن ابھی مجھے ان جھنجھٹوں میں نہیں پڑنا۔"
"تیرا تایا ناراض ہو گا بلو۔"
"تو ہوتا رہے... وہ کون ہوتا ہے میرے بارے میں فیصلہ کرنے والا... اور اماں تجھے ان کے پریشر میں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے ابھی پڑھنا ہے' بہت کچھ کرنا ہے۔ اور بشری سے شادی... جس لڑکی نے ساری عمر میری ماں کی عزت نہیں کی۔ اسے اپنی بیوی بنالوں... وہ تجھے چارپائی پر بٹھا کر نہیں کھلائے گی... ساری زندگی چاچی نے تجھے اور مجھے دو کوڑی کی حیثیت نہیں دی... اب بیٹی کا رشتہ دے رہی ہے... تو دے... کسی صورت نہیں۔ میری طرف سے صاف انکار ہے۔"
وہ تن فن کرتا باہر نکل گیا۔
جمیلہ نے تھکے تھکے انداز میں اسے جاتے دیکھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ گھر میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ وہ کبری اور اصغر کے رد عمل کا سوچ کر اندر ہی اندر سہم گئی۔

☼ ☼ ☼

"دیکھ خالہ! صاف صاف کہہ رہا ہوں۔ میرا یہ کام کروانا ہے۔ لیکن اگر گھر جا کر میرا نام لیا تو سچ کہتا ہوں میں تجھے چھوڑوں گا نہیں۔"
ماسی زبیدہ ہنس دی... نعمان کی بے تابی وہ ایک نظر میں بھانپ گئی تھی۔ رشتے کروانے کے سلسلے میں ماسی زبیدہ کا نام اس محلے میں خاصا معتبر جانا جاتا تھا۔
"لڑکی والوں کی طرف سے انکار نہیں ہو گا۔ یہ تو گارنٹی ہے۔ ماشٹنی کئی دفعہ مجھے عائشہ کے رشتے کے لیے کہہ چکی ہے۔ اچھی بھلی لڑکی ہے۔ پھر بھی دیر ہوتی جا رہی ہے۔ اب تیرے گھر والوں کا کیا ارادہ ہے۔"
"خالہ! اسی لیے تو تجھ سے بات کی ہے۔ میں خود گھر میں عائشہ کا نام لوں تو اماں تو کسی اور طرف ہی لے جائے گی۔ اسی لیے کسی بہانے اس کی توجہ اس طرف دلا۔"
"ٹھیک' میں کل عائشہ کے لیے کچھ لوگوں کو لے کر جا رہی تھی...." اس نے دانستہ جھوٹ بولا۔
"خبردار... خبردار خالہ! جو وہاں کسی کو لے کر گئی۔" نعمان نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کی۔ پھر جیب سے پانچ سو نکال کر اسے تھمائے۔
"بس...؟ ان سے کیا ہو گا؟"
"تو رشتہ تو کروا' تیرے گھر سودا مفت ڈال دیا کروں گا۔"
"چل پھر ٹھیک ہے... ابھی تو ایک کلو چینی اور ایک کلو چاول دے دے۔" خالہ نے بھی موقع سے فائدہ اٹھایا۔
"بس شروع ہو گئی۔" نعمان ہنسا۔ "اوئے چھوٹے! خالہ کو چینی اور چاول نکال دے' ایک ایک کلو۔"
تب ہی حمیداں سر پر چادر ڈالے کچھ سودا ہاتھ میں لیے اندر داخل ہوئی۔
"خالہ! کھسک لے' سودا تیرے گھر پہنچا دوں گا۔" نعمان نے آہستگی سے کہا... تو وہ حمیداں کو سلام کرتی چلی گئی۔
"یہ تمہارے پاس کھڑی کیا کر رہی تھی؟" حمیداں نے حیرت سے پوچھا۔
"رات والے ڈرامے کی اسٹوری سنا رہی تھی۔ حد کرتی ہو اماں! اسٹور چلاتا ہوں' لوگ یہاں سامان لینے آتے ہیں... تو بتا کیسے آئی؟"
"میں تو بازار سے آ رہی تھی... سوچا... گھر میں کچھ سامان ختم تھا' تجھ سے کہتی جاؤں۔"

☼ ☼ ☼

عریشہ نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ اور مطمئن ہو کر مسکرا دی۔ ڈھکی ہوئی پلیٹ اٹھائی۔ دال صاف کرتی عادلہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"کدھر؟"
"ثوبان کو کھیر دینے۔" وہ ذرا دیر کو رکی۔
"صرف ثوبان کو۔" عادلہ کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھا کہ وہ ایک لمحے کو ٹھٹک گئی۔
"جی۔ اسے آپ کے ہاتھ کی کھیر بہت پسند ہے نا اس لیے۔"
"ہاں... جاؤ..." عادلہ نے کہا تو وہ تیزی سے کھسک گئی۔ عادلہ نے دال کا تھال ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ماتھے پر تفکر کی لکیریں بہت گہری ہوئی تھیں۔
"یہ کس راہ پر قدم رکھ دیا ہے عرشی۔" انہوں نے دیوار سے سر ٹکا دیا۔ ذہن مختلف سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔ بیتی ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ تنگ نظر' تنگ ذہن اور خود غرض لوگوں میں زندگی گزارنا گویا دنیا میں پل صراط سے گزرنے کے مترادف ہے۔ وہ اس پل صراط سے گزر رہی تھیں۔
"لیکن عریشہ... نہیں... وہ نہیں...." وہ فیصلہ کر کے اٹھیں اور فون کی طرف بڑھ گئیں۔ ان کی انگلیاں نبیلہ کا نمبر ڈائل کر رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

پلیٹ تقریباً "پٹخنے والے انداز میں رکھی گئی تھی۔ ثوبان سر اٹھا کر اسے دیکھا۔
"یہ کیا ہے؟"
"کھیر ہے۔"
ثوبان نے پلیٹ اٹھا کر دیکھا۔
"کھیر تو میٹھی ہوتی ہے اور تم تو یوں کھڑی ہو گویا

کریلے چبا کر آئی ہو۔"
"آپ کو تو اتنا بھی یاد نہیں ہوگا کہ کسی کو منانا ہے۔" وہ روٹھے روٹھے انداز میں بولی
"کس کو....؟" ثوبان کے اس قدر انجان انداز پر عریشہ کو غصہ آگیا۔
"میں آپ سے ناراض تھی۔"
"اوہ... اور اب خود ہی منانے چلی آئیں۔"
"آپ کو کوئی حق نہیں، میری انسلٹ کرنے کا۔" ثوبان کے مذاق اڑاتے انداز پر عریشہ کی آنکھوں میں پانی آگیا۔ وہ تیزی سے پلٹنے کو تھی۔ ثوبان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"بالکل پاگل ہو۔"
"مجھے جانے دیں۔"
"جاؤ... ویسے یہ گلابی رنگ تمہیں بہت سوٹ کرتا ہے۔"
عریشہ نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر مسکراہٹ چھپانے کو رخ موڑ گئی۔
"چلتی ہوں۔"
ثوبان نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ عریشہ دروازے تک جا کر پلٹی۔
"ویسے... یہ گلابی نہیں، کاسنی رنگ ہے۔"
وہ شرارت سے کہہ کر چلی گئی۔ ثوبان نے ہنس کر اپنے سر پر چپت لگائی۔

✲ ✲ ✲

ابرار بیرونی دروازے سے ابھی اندر آیا ہی تھا جب بشریٰ تیر کی طرح اس کے سامنے آئی۔ ابرار کو رکنا پڑا۔ وہ سامنے کھڑی خونخوار تیوروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔
"رستہ چھوڑو۔" ابرار نے سنجیدہ انداز میں کہا۔
"تم نے مجھ سے شادی سے انکار کیا ہے۔"
"ہاں...." وہ جو چند قدم آگے چلا گیا تھا۔ طویل سانس لے کر پلٹا۔
"اگر مجھے اتنی سی امید ہی ہوتی کہ تم کل کو میری ماں کو چارپائی پر بٹھا کر اس کی خدمت کرو گی.... یا میری عزت کرو گی.... تو میں اقرار کرنے میں ایک منٹ نہیں لگاتا۔"
"خدمت.... خدمت کرتی ہے میری جوتی.... تمہاری اوقات کیا ہے؟"
ابرار نے بڑے تحمل سے سامنے کھڑی غصے میں بھڑکتی آگ کو دیکھا۔
"وہی جو تمہاری ہے، ہم دونوں ایک ہی دادا کی اولاد ہیں۔"
"میں بھی تم سے شادی کے لیے مری نہیں جارہی۔ اس گاؤں میں دس گھر ایسے ہیں۔ جو مجھے بہو بنانا چاہتے ہیں۔" وہ ترخ کر بولی۔
"تو ان ہی میں سے کوئی انتخاب کرلو اور میری جان چھوڑو۔" وہ قطعی لہجے میں کہہ کر صحن اور برآمدہ عبور کرکے اندر آیا۔ اور ٹھٹک کر رک گیا۔
کمرے میں موجود تینوں افراد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہاں اک مانوس سی خاموشی بکھری تھی وہی خاموشی جو کسی طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ابرار کے لیے نہ یہ خاموشی نئی تھی اور نہ اس کے بعد اٹھنے والا طوفان۔
"کیسے احسان فراموش ہو تم ماں پتر۔" اصغر کی سرسراتی آواز خاموشی کو چیرتی چلی گئی۔
"اچھا... کون کون سے احسان کیے ہیں، آپ نے؟" ابرار کی ہلکی سی طنزیہ ہنسی نے اصغر کو بھڑکا دیا۔
"بکواس بند کراؤ ئے۔"
"بکواس نہیں کررہا۔ ان احسانات کی فہرست دریافت کررہا ہوں۔ جو اب تک آپ نے ہم ماں بیٹوں پر کیے۔" ابرار نے چبا چبا کر کہا۔ جمیلہ بے اختیار اٹھ کر اس کے قریب آئی۔
"بلو...."
"دیکھ... دیکھ اس کے تیور.... چار جماعتیں کیا پڑھ لیں.... چاچے کے منہ کو آرہا ہے۔ دفع دور... ہم ایسے بے دید، بے لحاظ کو کیا کرنا ہے۔" کبری نے حسب عادت واویلا شروع کیا۔ جب مقصد ہی پورا نہیں ہورہا تو مصلحت سے کام لینے کا فائدہ کیا؟
"میں بے دید، بے لحاظ ہوں۔ تم لوگ کیا ہو....؟ اور چاچا! تم جو احسانات گنوا رہے ہو۔ آج اس کا حساب بھی ہوجائے۔ میری ماں اس گھر میں نوکرانیوں کی طرح کام کرتی ہے.... دودھ بیچ کر اپنا گزارا کرتی ہے.... میری فیس جمع ہونی ہوتو گاؤں کی اس گلی سے شروع ہوتی تھی ادھار مانگنا.... تو نے آج تک میرے لیے کیا ہی کیا ہے؟ اس زمین میں میرے باپ کا بھی حصہ ہے.... حق ہے میرا... اور یہی حق نہ مانگ لوں.... تم نے آج تک یتیم سمجھ کر بھی میرے سر پر ہاتھ نہیں رکھا۔"
"میں تیرا منہ توڑ دوں گا.... بے غیرت....." اصغر لپکا... جمیلہ لپک کر دونوں کے بیچ آگئی۔
"نہ بھائی اصغر... یہ تو ایسے ہی بول گیا... پھر اس نے انکار تو نہیں کیا۔ بس وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"
"اماں! تو آس کیوں دلا رہی ہے.... آج نہ کل، مجھے بشریٰ سے شادی کرنا ہی نہیں۔" ابرار کا لہجہ دوٹوک اور صاف تھا۔ اصغر کا ہاتھ اٹھ گیا... پہلا تھپڑ ابرار نے بے دھیانی میں کھایا تھا۔ دوسری بار اصغر کا ہاتھ پکڑ لیا۔
"بس چاچا! اور نہیں...."
"نکل... ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل۔"
"ٹھیک ہے، جارہا ہوں...."
وہ ایک جھٹکے سے باہر نکل گیا۔ جمیلہ جہاں کھڑی تھی وہیں بیٹھ گئی۔ کبری نے اسے نفرت سے دیکھا۔
"تیری کرنی کا پھل ہے.... بیٹے کو کتابیں تو پڑھا دیں.... دو لفظ تمیز کے بھی سکھا دیتی۔"
اصغر باہر نکل گیا تھا... کچھ لمحوں کے بعد وہ بیگ میں اپنے ڈاکومنٹس اور کپڑے ڈالے آیا۔ تو جمیلہ اسی جگہ بت بنی تنہا بیٹھی تھی۔ وہ اس کے سامنے بیٹھ گیا۔
"اماں۔" ابرار کی پکار پر وہ یوں چونکی جیسے کسی خواب سے جاگی ہو۔
"اماں! میں مصلحت سے کام لیتے لیتے تھک گیا ہوں.... اس لیے جارہا ہوں.... لیکن بہت جلد واپس آؤں گا۔"
"بہت اندھیرا ہے بلو۔" اس کے لب تھرتھرائے۔
"چھٹ جائے گا... میں جانتا ہوں اماں، تمہیں مشکل حالات میں چھوڑ کر جارہا ہوں.... مگر تم ہمت نہ ہارنا...."
"اسے کیوں چھوڑ کے جارہا ہے، اسے بھی ساتھ لے کر جا...." کبری دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ ابرار نے اسے سلگتی آنکھوں سے دیکھا اور جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔
"اماں یہیں رہے گی۔ تب تک جب تک میں کوئی ٹھکانا نہیں بنالیتا۔ کیونکہ جتنا حق تیرا اس گھر پر ہے اتنا ہی میری ماں کا بھی ہے.... اماں! حوصلے سے رہنا۔" اس نے ماں کے سر پر ہاتھ رکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا.... روتے روتے جمیلہ بے حال ہوگئی۔ اس کے لبوں پر ایک ہی جملہ بار بار ٹوٹ رہا تھا۔
"باہر بہت اندھیرا ہے پتر۔"

✲ ✲ ✲

حمیداں نے سرتاپا ماسی زبیدہ کا جائزہ لیا۔
"نہ تجھ سے کس نے کہا۔ تو میرے نعمان کے لیے رشتہ ڈھونڈتی پھر۔ مجھے رشتہ کرنا ہوتا تو خود تجھ سے کہتی۔"
"ارے، مجھ سے کس نے کہنا ہے۔ وہ ماسٹرنی صاحبہ نے کہا کہ بیٹی کے لیے رشتہ دیکھ لو۔ میرے ذہن میں نعمان کا خیال آیا تو تمہاری صلاح لینے آگئی۔ آخر تم نے بیٹوں کی شادیاں کرنا ہیں کہ نہیں۔"
"نہ میں ان کی شادی کروں نہ کروں، تجھے کیا تکلیف ہے؟" وہ چمک کر بولیں۔
"حمیداں! ایک تو تو غصہ بہت کرتی ہے۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ استانی ہے، بیس ہزار تنخواہ...."
"بات سن زبیدہ! میں ایک استانی سے بھر چکی.... دوسری سر پر لانے کا میرا کوئی ارادہ نہیں.... ماسٹرنی سے کہو اپنی بیٹی کے لیے کوئی اور گھر

دیکھے۔ میرا دماغ خراب ہے۔۔۔ ابھی سے لڑکے بیاہ دوں' وہ لگ جائیں' اپنی بیویوں کے چونچلوں میں۔۔۔ اور حمیداں ہاتھ ملتی رہ جائے۔ اور یہ نعمان' یہ تو پہلے ہی قابو نہیں آتا۔"

زبیدہ مایوس سی ہو کر بیٹھ گئی۔۔۔ یہاں تو کوئی لفٹ ہی نہ تھی۔ نعمان کا ڈر نہ ہوتا تو صاف بتا دیتی' لڑکے کی مرضی ہے۔

"اچھا سن زبیدہ۔ !نعمان کی تو میں بعد میں کروں گی' پہلے تو میری مریم کے لیے کوئی رشتہ دیکھ۔"

"حمیداں بیگم! میں کہاں سے دیکھوں۔ تیری طرح سب اپنے اپنے لڑکے بغل میں دبائے بیٹھی ہیں۔۔۔ رشتہ دیکھ۔۔۔" زبیدہ نے ناک کر وار کیا اور بکتی جھکتی چلی گئی۔

حمیداں ہیں۔۔۔ ہیں کرتی رہ گئیں۔

☼ ☼ ☼

"سچ سچ بتا رہی ہوں۔ تمہاری ماں کا کوئی ارادہ نہیں۔ اگلے چار پانچ سال تک تمہاری شادی کا۔" زبیدہ پھر سے دکان پر آئی بیٹھی تھی۔

"تم نے بات چھیڑی تھی؟"

"ہاں تو اور کیا؟ پر وہ تو کوئی بات سننے کو ہی تیار نہیں۔ اب ایک کام کر' خود بات کرلے۔" نعمان نے پریشانی سے سر ہلایا۔

"میں اماں کو تجھ سے زیادہ جانتا ہوں خالہ۔۔۔ عائشہ میری پسند ہے' یہ سن کر وہ ویسے ہی ہتھے سے اکھڑ جائے گی۔ اچھا خالہ! مجھ سے وعدہ کر۔ تو عائشہ کے لیے ابھی کوئی رشتہ نہیں دیکھے گی۔۔۔ میں کچھ کرتا ہوں۔"

"دیکھ بیٹا! میری اپنی پانچ بیٹیاں ہیں۔ کسی کی بیٹی کے ساتھ زیادتی نہیں کرسکتی۔۔۔" زبیدہ نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ نعمان نے جیب میں ہاتھ ڈالا ہزار کا نوٹ نکال کر زبردستی اس کی مٹھی میں تھما دیا۔

"چل۔۔۔ تیری خاطر کچھ عرصہ رک جاتی ہوں" پیسے دیکھ کر وہ اپنی پانچ بیٹیاں بھول گئی۔ "پر زیادہ دیر نہ کرنا۔ ماسٹر صاحب ریٹائرڈ ہو رہے ہیں۔ اور اس سے پہلے پہلے لڑکی کی شادی کر کے جانا چاہتے ہیں۔"

"خالہ! کرتا ہوں کچھ۔۔۔ تو گھر جا' میں کچھ راشن بھی بھجواتا ہوں۔"

خالہ سر ہلا کر چلی گئی۔۔۔ نعمان کچھ دیر بیٹھا رہا۔ لیکن پھر اسٹور میں دل نہیں لگا تو اٹھ گیا۔۔۔ قدم خود بخود عائشہ کے گھر کی طرف بڑھے تھے۔ مگر پھر عائشہ کی بات یاد آگئی۔۔۔ تو مایوسی سے پلٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

"بس نبیلہ! لڑکا ہی نہیں' اس کی فیملی بھی پڑھی لکھی اور روشن خیال ہو۔۔۔ اس سے زیادہ کی ہوس نہیں۔ روپیہ پیسہ نصیب میں ہو تو مل ہی جاتا ہے۔"

حمیدہ دروازے میں ہی رک گئیں۔ عادلہ کی دروازے کی طرف پشت تھی۔

"وہ بہت بے وقوف ہے۔۔۔ خوبصورت لہجوں میں چھپے تصنع اور بناوٹ کو محسوس ہی نہیں کرپاتی۔۔۔ ظاہر کو دیکھتی ہے۔ باطن میں جھانکنے کی صلاحیت نہیں ہے اس میں۔۔۔"

(اچھا۔۔۔ تو یہاں یہ چل رہا ہے۔۔۔ دیکھتی ہوں' کیسی کرتی ہو عریشہ کی شادی کہیں اور) حمیدہ بھول گئیں کہ وہ یہاں کس کام سے آئی تھیں۔ منہ پر ہاتھ پھیرتی پلٹ گئیں۔

"ٹھیک کہا۔۔۔ کم عمر ہے۔۔۔ اور ان باتوں کو سمجھنے کے لیے اک عمر درکار ہوتی ہے۔"

"سنا تم نے برکت حسین! وہ تمہاری بھاوج کیا کرتی پھر رہی ہے۔" انہوں نے سیدھا بیٹھک میں انٹری دی۔ برکت حسین نے کھا جانے والی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"صبح سے نہ چائے کا پوچھا' نہ روٹی پانی کا۔ اور آئی ہے بھاوج کی شکایت لے کر۔"

"اس عمر میں بھی جھوٹ بولنے سے باز نہ آنا۔ تیری پیالیاں تو ابھی تک تمہاری چارپائی کے نیچے پڑی ہیں۔"

"ہاں تو اس گھر کی عورتیں ہی نحوست ماری ہیں۔ مجال ہے جو کبھی گندے برتن اٹھا کر لے جائیں۔" انہوں نے کھسیا کر کہا۔

"صاف کہو حمیدہ بیگم ساری نحوست تیری ہے۔۔۔ مجھے گھر سے نکال دو اس گھر میں برکت ہی برکت بچے گی۔"

"ہر وقت چخ چخ' کل کل۔۔۔ کبھی آپ لوگ تحمل سے بات نہیں کرسکتے۔" نعمان ابھی ابھی لوٹا تھا۔۔۔ ان کی تکرار سن کر مزاج برہم ہو گیا۔ "باہر تک آوازیں آرہی ہیں۔"

"ایسا کر ایک ایک سیخ ہم دونوں کے گلے میں ٹھونک دے۔۔۔ ہمیں کھلا رہا ہے نا کما کے' اسی لیے رعب دکھا رہا ہے۔" وہ حمیدہ ہی کیا جو کسی سے دب جائیں۔

"یہاں تو بات کرنا ہی فضول ہے۔" وہ تن فن کرتا اندر گھس گیا۔

"میرا تو ساری زندگی نہیں کیا۔ کم از کم بیٹے کا لحاظ تو کرلیا کر۔۔۔ جوان خون ہے۔" برکت حسین نے سمجھانا چاہا۔

"سب پتا ہے۔۔۔ یہ جوان خون کیوں ابل رہا ہے۔ شادی کی ہڑک اٹھی ہے۔"

"ہاں تو کردے۔ اٹھائیس انتیس کا تو ہو ہی گیا ہے۔"

"جس کا ابھی سے یہ حال ہے۔ بعد میں ہمارے ساتھ کیا کرے گا۔"

"اچھا۔۔۔ تو آئی کیا کرنے تھی" برکت حسین نے بے زاری سے پوچھا۔ تو حمیدہ کو یاد آیا۔ قدرے قریب کھسکیں۔

"اوں ہوں۔۔۔ کیا اوپر چڑھی آرہی ہے۔ ذرا دور ہو کے بیٹھ۔"

"تیرے قریب بیٹھنے کو تو کبھی جوانی میں دل نہیں کیا۔ اب کیا خاک بیٹھوں گی۔"

"کام کی بات کر۔"

"تیری بھاوج عریشہ کا رشتہ ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔"

"ہاں تو اس کی لڑکی ہے۔۔۔ رشتہ نہیں کرے گی۔"

"بڈھا سٹھیا گیا ہے۔۔۔ عریشہ باہر نہیں جائے گی' یہ مکان اور دکان باہر جائے گی۔ اور وہ مال بھی اس کی ماں نے جمع کر رکھا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے۔۔۔"

"نقصان ہی نقصان ہے برکت حسین!"

"ہاں تو اسے گھر میں دو جوان جہان لڑکے نظر نہیں آتے۔۔۔ کہو تو عادلہ کو بلا کر بات کروں۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بڑی اونچی ہواؤں میں ہے۔ اور تمہاری بہن بھی اس کے ساتھ ملی ہے' وہی عریشہ کا رشتہ ڈھونڈ رہی ہے۔"

"سچ کہو۔"

"قسم سے۔۔۔ لیکن تم فکر نہ کرو' میرا نام بھی حمیدہ ہے۔۔۔ ہمارے ہاتھ عادلہ آئے گی نہیں لیکن میں یہ بات خود عریشہ کے منہ سے کہلواؤں گی۔ گھر کی جائیداد باہر نہیں جانے دوں گی' تمہارے مرحوم بھائی کی کمائی ہے۔ کوئی اپنے میکے سے نہیں لائی تھی۔ پہلا حق میرے بیٹوں کا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ سازشی تو تو پہلے ہی ہے۔۔۔ کچھ نہ کچھ کر ہی لے گی۔"

برکت حسین نے تعریف بھی یوں کی کہ وہ غصے سے دیکھتی اٹھ گئیں۔

"ارے۔۔۔ یہ پیالیاں تو لیتی جا۔۔۔"

☼ ☼ ☼

"ویسے مام! میں دیکھ رہا ہوں جب سے طیبہ بھابھی گئی ہیں۔ آپ اچھی خاصی فٹ فاٹ ہو گئی ہیں۔" محسن نے عقب سے انہیں کندھوں سے تھاما۔

"فضول مت بولو۔" نبیلہ ہنس دیں۔ آج اس کی فرمائش پر چائنیز بنا رہی تھیں۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ گھر سے ٹینشن رخصت ہو جائے تو انسان بالکل ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔" وہ شرارت سے کہتا گاجر اٹھا کر کھانے لگا۔

"محسن! تم مار کھاؤ گے۔"

"آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں۔ آپ دوسری ٹینشن گھر لے آئیں۔"
"تم فاطمہ کو ٹینشن کہہ رہے ہو؟"
"کیا کہہ سکتے ہیں... یہ تو اس کے آنے کے بعد ہی پتا چلے گا رحمت ہے یا زحمت۔"
"خیریت، آج بہانے بہانے سے فاطمہ کو کیوں یاد کیا جا رہا ہے۔"
"کیونکہ آپ منگنی کر کے بھول گئی ہیں۔ اور مجھ سے آپ کا اکیلا پن دیکھا نہیں جا رہا۔"
"میرا یا اپنا..." وہ ہنس دیں۔
"دونوں کا..."
"بے وقوف، ابھی منگنی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔" انہوں نے شملہ مرچ اٹھائی۔
"کیا شرط ہے کہ سال پورا ہونے سے قبل شادی کی بات نہیں ہو سکتی؟" محسن نے کان کھجاتے ہوئے کہا۔ نبیلہ نے اسے گھورنا چاہا۔ پھر مسکرا دیں۔
"تم خوش ہو محسن! میں نے تمہارے ساتھ کوئی زیادتی تو نہیں کر دی۔"
"ایسی کوئی بات نہیں... آئی ایم ہیپی..."
"تو ٹھیک ہے... میں جلد ہی جا کر شادی کی تاریخ طے کر دیتی ہوں اور فاطمہ کو بتاؤں گی کہ میرے بیٹے سے اب صبر نہیں ہو رہا۔"
محسن ہنس کر اپنی پیشانی رگڑنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"تم تو عجیب بات کر رہے ہو نعمان بیٹا۔" آمنہ خاتون نے پریشان ہو کر نعمان کو دیکھا... عائشہ دروازے میں ہی رک گئی۔
"مجھے صرف تھوڑا سا وقت چاہیے۔ خالہ... فاطمہ کی تو بات طے ہے۔ چند ماہ میں شادی بھی ہو جائے گی۔ بس مریم رہ جاتی ہے... میں آپ کو بہت لمبا انتظار کرنے کو نہیں کہہ رہا۔ ایک دو سال کی بات ہے..." اس نے بے حد آس سے آمنہ خاتون کو دیکھا۔
"جوان بیٹی کے ماں باپ پر ایک ایک دن بھاری ہوتا ہے۔ بیٹا! تم سالوں کی بات کرتے ہو۔" انہوں نے اک طویل سانس لے کر کہا۔
"خالہ..." نعمان کھڑا ہو گیا۔ "میں آپ کو مجبور نہیں کر سکتا۔ عائشہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ لوگ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتے ہیں... صرف اک آس کی ڈور تھام کر آپ کے پاس آیا تھا۔"
"بیٹا! زندگی مفروضوں پر تو نہیں گزرتی... اگر دو سال تک تمہارا ذہن بدل جائے... یا تمہارے گھر والوں کی مرضی کہیں اور ہو تو..."
"خالہ! میں نے زندگی میں کبھی کسی لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔" خالہ کی طرف بغیر دیکھے نعمان نے ٹھوس لہجے میں کہا۔ "لیکن میں عائشہ کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا... ٹھیک ہے... میں آپ کو انتظار کرنے کو نہیں کہوں گا۔ اگر وہ میرے نصیب میں ہوئی تو دنیا کی کوئی طاقت اس راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔" اس کا مدھم لہجہ عائشہ کے دل میں گھر کر گیا۔
(اور اللہ کرے، وہ تمہارا ہی نصیب ہو...)
آمنہ خاتون کے دل سے دعا نکلی۔
نعمان تیزی سے باہر نکلا... عائشہ کو ہٹنے کا موقع نہیں ملا... دونوں کی نگاہ ایک دوسرے سے ٹکرائی۔
"میرا انتظار نہیں کر سکتیں، دعا تو کر سکتی ہو... یا اس قابل بھی نہیں؟" عائشہ کی نگاہ جھک گئی۔ ہلکا سا مسکرا کر بے اختیار اثبات میں گردن ہلا دی۔
نعمان کو گویا دونوں جہاں کی دولت مل گئی... مسرور سا گھر سے نکل گیا۔
ہمسائیوں کے گھر سے نکلتی حمیداں کے قدم اپنی جگہ پر جم کر رہ گئے... نعمان تو اپنی دھن میں آگے چلا گیا... مگر حمیداں کی نگاہ نے دور تک پیچھا کیا۔ اس کی چال کی سرشاری حمیدہ سے چھپی نہیں رہی تھی۔
انہوں نے آگ برساتی نظروں سے ماسٹر صاحب کے گھر کی طرف دیکھا۔
"اچھا تو یہ چکر چل رہا ہے۔"
(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عتیقہ محمد بیگ

"یہ کہاں سے آیا جناب..." فرحی نے مونا کو پڑا کھاتے دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔ فرحی، مونا کی تایا زاد [illegible]۔ اس کے والدین ایک ماہ کے لیے کراچی گئے [illegible] تھے، سو وہ فرحی کے گھر رہنے آئی ہوئی تھی۔ وہ [illegible] کا سارا کام سمیٹ کر کمرے میں آئی تھی۔ مونا کو [illegible] پشت سے ٹیک لگائے واک مین کے مزے لیتے [illegible] ساتھ پڑا کھاتے دیکھا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی [illegible] رہ گئیں۔
مونا کے کانوں میں ہیڈ فون گھسے ہوئے تھے۔ وہ فلم [illegible] گارڈ کا گانا "تیری میری، میری تیری پریم کہانی" [illegible] رہی تھی، جو اسے بہت پسند تھا۔ اس نے مسکراہٹ کے علاوہ کوئی جواب نہ دیا اور مزے سے پڑے کا پیس ہڑپ کرتی رہی۔
فرحی اس کے ساتھ بستر پر آ بیٹھی۔ اس نے پڑے کا ڈبا کھولا۔ اس میں دو پیس پڑے تھے۔ اس نے ایک پیس حیرانی سے اٹھایا اور اونچی آواز سے بولی۔
"یہ پڑا کہاں سے آیا؟ نہ تو کوئی گھر سے باہر گیا اور نہ ہی اندر آیا۔ تو پھر یہ پڑا کیسے آیا؟"
مونا نے ہیڈ فون کانوں سے ہٹائے اور فخر سے بولی۔
"میرے قدم اس گھر میں جب تک رہیں گے۔ تمہاری روز ہی عید رہے گی۔" اس نے فرحی کی جانب فخریہ مسکراہٹ اچھالی اور پھر سے ہیڈ فون کانوں میں

سیٹ کرنے لگی۔

فرحی نے پزا واپس رکھ کر اس سے واک مین چھینا اور گھبرا کر بولی۔

"سچ بتاؤ! یہ پزا تم نے کیسے منگوایا اور کب؟"

مونا نے منہ بسور کر کہا۔ "یار! گانا ختم ہی ہونے والا تھا۔ تم نے سب مزا خراب کر دیا۔" یہ کہہ کر وہ لیٹ گئی۔

فرحی نے دیکھا' مونا جمائی لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نیند تھی۔ فرحی اسے دیکھ کر بولی

"سونا بعد میں..... پہلے مجھے ساری بات بتاؤ۔" مونا ہنس پڑی۔

"نہیں سوتی' فکر مت کرو' تمہیں سارا ماجرا سنا کر ہی بندی آرام فرمائے گی۔ پہلے پیزے سے انجوائے تو کرو۔"

مونا نے پزے کا ڈبا اس کی طرف بڑھایا۔ فرحی نے پزے کا آدھا پیس اٹھایا اور پھر کھاتے ہوئے بولی۔

"اب بتاؤ بھی۔" مونا بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور مسکرا کر بولی۔

"وہ عمر....." اس نے مسکرا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"عمر؟ کون عمر؟" فرحی نے حیرت سے پوچھا۔

"اوہو! عمر جو بقول تمہارے محلے کا سب سے شریف لڑکا تھا۔" اس نے ہنستے ہنستے پھر بات ادھوری چھوڑی۔

"تمہارا کیا مطلب ہے وہ عمر..... ؟ ہاشم صاحب کا بیٹا عمر..... ؟ یہ پزا اس نے دیا ہے؟" اس نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ عمر کو پسند کرتی تھی..... اپنی کزن کے منہ سے اس کا نام سن کر پیلی پڑ گئی۔

"ہاں جی..... وہ جو سب سے شریف ہے نا..... وہ میرا دوست بن گیا ہے۔ اس نے شہزادی صاحبہ کی خدمت میں چھوٹا سا تحفہ پیش کیا ہے....." مونا نے فخریہ بتایا تو وہ اچھل پڑی۔

"وہی عمر ناں' جو ہمارے گھر کے ساتھ رہتا ہے؟ تم اسی عمر کی بات کر رہی ہو؟" فرحی کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ پزے کا ٹکڑا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"ہاں فرحی! سچ میں عمر ہی پزا دے کر گیا ہے۔ ہفتے سے اس کی تعریفیں سن رہی تھی۔ سوچا چیک کروں۔ پرسوں جب میں چھت پر سے کپڑے اتار[نے] گئی تھی تو وہ مجھے اپنی چھت پر ملا۔ میں نے مسکرا[ہٹ] اچھالی تو جواباً" وہ بھی مسکرایا۔ میں نے فون نمبر پھین[کا] اس نے جھٹ سے پکڑا اور پندرہ منٹ کے بعد [کال] بھی کر لی۔..... یوں ہماری دوستی کی گاڑی چل پڑی۔" اس نے تمام قصہ سنایا۔

"تو کیا کل رات تم فون پر اسی کے ساتھ کھسر پھسر کر رہی تھیں؟" فرحی نے غصے سے پوچھا۔

"جی جناب!" اس نے ہنس کر اعتراف کیا۔

فرحی کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے نازک دل [کو] چھری کے ساتھ بے دردی سے کاٹ ڈالا ہو اور وہ ٹکڑوں میں بکھر گیا ہو۔ تھوڑی دیر وہ گم صم رہی' [پھر] ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

"یہ دوستی ہے یا پھر..... پھر کچھ اور؟" اس میں [آگے] سننے کی ہمت نہ تھی۔

"ایسے ہزار دوست ہیں میرے..... بس کتنے [دن] سے دال سبزی کھا رہی تھی تو عمر سے دوستی کر لی۔ محبت کا لفظ میری ڈکشنری میں نہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" فرحی نے افسردگی [سے] کہا۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی آ گئی تھی۔

مونا ہنس دی۔ "جناب! سب مرد خوب صورتی [کے] قائل ہوتے ہیں اور تمہاری کزن مونا..... مونا لیزا [سے] کم ہے کیا۔" اس نے شوخی سے کہا اور پزے کا [ڈبا] فرحی کو تھما دیا۔

فرحی بجھے دل سے پزا کھانے لگی۔ "اماں ابا [کو یا] محلے میں کسی کو یہ خبر مل گئی تو میری شامت آ جا[ئے گی]۔ تم تو یہاں سے چلی جاؤ گی' مگر محلے والوں کے [طعنے] میرے لیے رہ جائیں گے۔ اب پلیز! عمر سے با[ت]

[نہ کرنا] اور نہ ہی کوئی تحفہ قبول کرنا۔" اس نے آہستگی [سے] سمجھایا۔

"یار! بے وقوف مت بنو! یہی تو انجوائے کرنے [کے د]ن ہیں۔ پھر ہماری شادیاں ہو جائیں گی۔ چولہے [چوکے اور برتن] دھوتے دھوتے زندگی گزر جائے گی۔ اس لیے [چھوٹے] چھوٹے واقعات کو سر پر سوار کر کے ڈرو مت۔" [مونا] نے فرحی کا ہاتھ تھام لیا' جس کے چہرے پر [ہوائیاں اڑ ر]ہے تھے۔

"[نہ]یں یار! بس تم عمر کے ساتھ کوئی سین مت کرو۔ [مجھے] ڈر لگ رہا ہے۔" اس نے فکر مندی سے منع [کیا]۔

"[ی]ار! کچھ نہیں ہوتا اور اتنی اپ سیٹ نہ ہو میری [جان]..... وہ میری کلاس فیلو صنم ہے ناں..... وہ تو لڑکوں [سے دو]ستی ہی صرف کھانے پینے اور تحفے تحائف کے [لیے کرتی] ہے۔ یونیورسٹی میں روز نئے سوٹ میں نئے [موبائل] کے ساتھ نظر آتی ہے۔ سب کچھ لڑکوں کا تحفہ [ہوتا] ہے' مگر وہ پرسکون ہوتی ہے اور اپنی حالت دیکھو! [ایسا] لگ رہا ہے جیسے تمہارے ہاتھوں کسی کا قتل ہو گیا [ہو۔]" مونا نے ہنس کر اسے دلاسا دیا۔

"اس لڑکی کی بات چھوڑو۔ وہ جو مرضی کرتی رہے۔ [وعدہ ک]رو کچھ ایسا ویسا نہیں کرو گی..... اور میں کل [عمر] کو پزے کے پیسے دے کر آؤں گی۔" اب کے [اس نے] رعب سے بات کی۔

مونا نے منہ بسور لیا اور دوسری طرف کروٹ لے [کر لیٹ] گئی۔ فرحی بھی اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی' مگر نیند [اس سے] کوسوں دور تھی۔

☼ ☼ ☼

[صبح] فرحی کی آنکھ دیر سے کھلی۔ مونا اپنے بستر پر نہ [تھی]۔ اس نے جھٹ سے دوپٹہ سنبھالا' پاؤں میں چپل [ڈالی] اور افراتفری میں باہر نکلی۔ باورچی خانے میں سے [آوازیں] سنائی دیں۔ وہ باورچی خانے میں آئی تو [مونا کو ام]اں کے ساتھ حلوہ پوری کھاتے دیکھا۔

"[آ]و فرحی! دیکھو تو مونا صبح صبح ہمارے لیے حلوہ پوری لے آئی۔ اب یہ یہاں مہمان ہے۔ اس کی خاطر مدارات ہمیں کرنی چاہیے' جبکہ یہ اپنے پیسے خرچ کر رہی ہے۔" کلثوم بی بی نے شرمندگی سے بتایا۔

فرحی کے ابا درزی تھے۔ وہ روز روز عیاشی نہیں کروا سکتے تھے۔ اس نے مونا پر ایک گہری نظر ڈالی۔ وہ مسکرائی اور آنکھوں کے اشارے سے بتایا کہ عمر نے حلوہ پوری کا انتظام کیا ہے۔

"اماں..... میرے لیے روٹی بنا دیں۔ مجھے حلوہ پوری نہیں کھانا۔" وہ ماں کے پاس آ بیٹھی۔

اس کے گھر کے حالات بھی اچھے نہ تھے' مگر اس نے مادی چیزوں کی ہوس میں خود کو کسی منفی راستے پر نہیں ڈالا تھا' جس پر مونا چل پڑی تھی۔ وہ فرحی سے دو سال چھوٹی تھی۔ اس کے ابا قیوم دین ایک ہوٹل میں بطور چوکیدار ملازم تھے۔ مونا ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ ان کی آمدنی کم تھی اور مونا کی خواہشات زیادہ۔ اپنی سہیلیوں کو دیکھ دیکھ کر اس نے یہ رنگ سیکھے تھے۔ جس پر اسے کوئی شرمندگی نہ تھی۔

"روٹی کیوں..... دیکھ تو! کتنے پیار سے حلوہ پوری خرید کر لائی ہے۔" کلثوم بی بی نے پیار سے مونا کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مونا مسکرائی اور حلوہ کھانے لگی۔ فرحی نے افسردگی سے اسے دیکھا۔

"اماں! رات سے پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔ پلیز! مجھے سادہ روٹی بنا دیں۔" اس کی آواز رندھ سی گئی۔

"اچھا' اچھا! ہاتھ منہ دھو لو۔ میں بنا دیتی ہوں۔" کلثوم نے فکر مندی سے توا چولہے پر رکھا اور چولہا جلایا۔

مونا مزے سے حلوہ پوری کھانے لگی۔ فرحی نے اس کو گھورنا شروع کر دیا' مگر اس نے نظرانداز کر دیا..... جیسے اس کے نزدیک یہ سب فن ہو..... کسی کو بیوقوف بنا کر اس کے پیسوں پر عیاشی کرنا۔

☼ ☼ ☼

جب وہ ناشتا کر کے کمرے میں جھاڑو لگانے آئی' مونا فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے سنا' وہ رات میں

شوربا کھانے کی فرمائش کر رہی تھی۔ دوسری طرف عمر نے کیا جواب دیا تھا۔ اس سے وہ انجان تھی۔ مونا نے اس کی آمد پر فون بند کر دیا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

"کزن! ابھی تک خفا ہو کیا؟"

وہ جھاڑو لگاتے لگاتے بولی۔ "کزن کے کام ہی برے ہیں..... اس لیے خفا ہونے کا حق بھی رکھتی ہوں۔" اس نے غصے میں ہاتھ تیزی سے چلانے شروع کر دیے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر اس کے اماں ابا کو یہ خبر مل گئی تو اس کا اعتبار بھی ان کے دلوں سے اٹھ جائے گا۔ اب وہ اپنی کزن کو گھر سے نکال کر باہر پھینک بھی تو نہیں سکتی تھی اور نہ ہی مونا اپنے گھر جا سکتی تھی۔ اس کے گھر میں ابھی کوئی نہیں تھا' سو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھیں۔

"یار..... غصہ چھوڑو..... مل کر مزے کرتے ہیں۔" اس نے فرحی سے جھاڑو چھین لی اور خود دینے لگی۔ وہ فرحی کی ناراضی زیادہ دیر تک نہیں برداشت کر سکتی تھی۔ فرحی نے بستر کی چادر بدلی اور خفگی سے بولی۔

"دیکھو مونا! اب شوربا مت منگوانا اور اگر تمہیں منگوانا ہی ہے' تو صرف اپنے لیے ہی منگوانا..... مجھے یہ سب بالکل بھی پسند نہیں۔ تم اپنی عزت کے ساتھ میری عزت بھی رسوا مت کرو۔" فرحی نے خفگی کے ساتھ پھر اسے سمجھایا۔

مونا نے جھاڑو زمین پر پٹخی اور غصے سے بولی۔ "کل رات سے تمہارے نخرے دیکھ رہی ہوں..... اور میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا' جس کی وجہ سے تم نے میری عزت پر انگلی اٹھا دی..... سب ماڈرن لڑکیاں' لڑکوں سے دوستی کر کے کھانے پینے کے مزے لیتی ہیں اور یہ سب خوب صورت لڑکیوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ اب تمہارے نصیب میں ایسی کوئی بات نہیں تو اسے دوسرا رنگ دے کر مجھے ذلیل نہ کرو۔" مونا یہ کہہ کر سیل فون اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اور فرحی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ مونا اسے کم صورت ہونے کا طعنہ دے گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رات کو وہ مزے سے اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ کا[نوں] میں ہیڈ فون گھسے ہوئے تھے اور گرما گرم شوربا کھا[تے] ہوئے وہ گنگنا بھی رہی تھی۔

"منڈے یاں نوں ٹھگ لے..... ٹھگ لے' ٹھگ لے۔" مونا اپنا سر بھی ہلا رہی تھی۔

"تمہیں شرم آنی چاہیے۔" فرحی اپنے بستر پر [لیٹ] کر غصے سے بولی۔

مونا نے کوئی جواب نہ دیا۔ پتا نہیں' اس کے کا[نوں] تک یہ بات گئی بھی تھی کہ نہیں۔ اب سر کے سا[تھ] اس کے پاؤں بھی رقص کر رہے تھے۔

فرحی نے دوسری طرف کروٹ لی اور سوچا کہ یہ اس کی باتوں کو نہیں سمجھے گی۔ اسے عمر سے بات [کرنی] چاہیے' مگر پھر وہ سوچ میں پڑ گئی کہ وہ کیا بات کرے۔ کہیں وہ اس کو بھی مونا کے جیسا نہ سمجھ لے کہ...

ابھی وہ یہ سب سوچ ہی رہی تھی۔ کہ مونا کا سیل فون بج اٹھا۔ مونا نے پیار سے فون اٹھایا اور شائستگی سے بولی۔

"ہیلو! آپ کیسے ہیں..... شوربا کا بہت مزا آیا۔" پھر وہ سیل فون سمیت کمرے سے باہر نکل گئی۔

فرحی نے دوپٹہ سنبھالا اور مونا کی باتیں سننے اس کے پیچھے گئی..... مونا کہہ رہی تھی۔

"نہیں! میں ہوٹل میں نہیں آ سکتی۔"

فرحی نے اپنے دل کو تھام لیا۔ عمر اس قدر برا [نکلا] ہے۔ وہ حیران سی رہ گئی۔ وہ تو اپنے دل میں اس کے خواب سجا بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو [بہنے] لگے۔

مونا اب مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"سوچ کے بتاؤں گی..... مگر اس ماہ نہیں مل [سکتی]۔ جب اپنے گھر جاؤں گی تو آسانی سے مل لوں [گی]۔" مونا نے ہنستے ہنستے بات ختم کی۔

فرحی جلدی سے اپنے بستر پر آ لیٹی..... مونا [تو] لیٹتے ہی بے خبر سو گئی' مگر فرحی کے ذہن میں بر[ے] [خی]الات اڑنے لگے کہ کہیں عمر مونا کے ساتھ کچھ برا نہ [کر] دے..... یہ خیال آتے ہی اس کا دل دہل گیا۔ آخر کو وہ اس کی چچا زاد بہن تھی۔ اس نے مونا کے سیل فون سے کال کی..... دوسری طرف سے فون فوراً" اٹھا لیا گیا۔

فرحی نے آہستگی سے کہا۔ "ہیلو! میں فرحی۔ عمر! مجھے تم سے ملنا ہے۔ ابھی اسی وقت۔" عمر' فرحی کی آواز سن کر گھبرا سا گیا۔ وہ تو مونا کی آواز کا منتظر تھا۔ وہ گھبرا کر بولا۔

"او کے! ابھی؟ مگر کہاں؟"

فرحی نے پھر آہستگی سے کہا۔ "میں چھت پر آتی ہوں۔ تم بھی آ جاؤ۔" اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ عمر فون کو تکتا رہ گیا۔ وہ اپنے دل میں فرحی کے لیے [عزت] رکھتا تھا۔ اس کے یوں بلانے پر فوراً" اپنی چھت پر پہنچا۔ اس نے سفید چادر میں لپٹی فرحی کو دیکھا۔ [اس] کے چہرے پر خفگی تھی اور وہ ٹہل رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

وہ تھوڑا گھبرائی' مگر پھر اس نے خود پر قابو پا کر بات شروع کی۔

"عمر! مونا میری کزن ہے۔ اگر تم نے اسے کوئی نقصان پہنچایا تو' تو....." اس نے خفگی سے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"اچھا جی..... کیا کر لو گی تم؟ اور جہاں تک نقصان کی بات ہے' تو اپنی کزن کو لگام ڈالو..... میرے دوست حیدر کو محبت کے نام پر لوٹتی رہی۔ وہ [بے چار]ا تو اس کی محبت میں سچ مچ گرفتار ہو گیا ہے۔ اب وہ اس کو صاف انکار کر رہی ہے..... میں اسے اپنے لیے نہیں' بلکہ حیدر کے لیے ہوٹل بلوا رہا تھا تاکہ اس سے پوچھا جائے کہ وہ چند مادی چیزوں کے لیے کسی کے دل سے کھیل لیتی ہے۔ میں تو اس کے دل سے کھیلنا چاہتا تھا' مگر تمہاری وجہ سے خاموش ہوں....." اس نے فرحی پر گہری نظر ڈال کر بات ختم کی..... اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ تھا۔

فرحی کی آنکھیں پُرنم ہو گئیں..... اس کے دل میں عمر کے لیے جو نفرت تھی' وہ پھر سے محبت کے رنگ میں بدل گئی۔

"تم رو رہی ہو کیا؟" اس نے افسردگی سے پوچھا۔

"نہیں تو۔" اس نے خود پر قابو پایا اور گہری سانس لی۔ پچھلے دو دن سے وہ اندر ہی اندر لڑ رہی تھی کہ اس نے عمر کی آنکھوں میں اپنے لیے واقعی محبت محسوس کی تھی یا وہ دھوکا تھا؟

"تم..... تم کیا یہ سمجھ رہی تھیں کہ میں مونا کے ساتھ....." اس نے افسردگی سے اسے دیکھا اور دانستہ بات ادھوری چھوڑ دی۔

"نہیں' نہیں' بس..... کچھ نہیں..... پلیز! حیدر سے کہو' مونا کو معاف کر دے اور اس کا پیچھا چھوڑ دے۔" فرحی نے اس کی منّت کی۔

عمر نے آہستگی سے کہا۔ "حیدر تو اس کے گھر رشتہ بھیجنا چاہتا ہے' مگر وہ کسی اور ہی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ ہمارے محلے میں بھی آ کر اس نے وہی رنگ دکھائے' وہی کچھ کر رہی ہے' جو وہ حیدر کے ساتھ کر چکی ہے۔ میں ہوٹل بلا کر اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ حیدر اس سے سچی محبت کرتا ہے۔ وہ اس سے شادی کر لے۔" عمر نے نظریں جھکا کر بات کی۔

فرحی کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔ وہ رونے لگی۔

"ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا..... تمہاری کزن ابھی بھی اس منفی راستے سے واپس آ سکتی ہے..... اگر اسے سزا دی جائے تو....." وہ خفگی سے بولا۔

"سزا' کیسی سزا؟" فرحی نے سسکیاں لیتے پوچھا۔

"ایسی سزا..... جس کے بعد وہ کبھی کسی کے ساتھ یہ سب کچھ نہ کرے۔"

"ہاں! تم نے درست کہا۔ مونا کو سزا ملے گی..... تو وہ یہ سب کام چھوڑ سکتی ہے۔" فرحی نے افسردگی سے کہا اور سوچنے لگی کہ ایسی کیا سزا کیا ہو' جس کے ڈر سے وہ پھر کبھی کسی کو بیوقوف نہ بنائے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد وہ اچھل پڑی۔

"آئیڈیا۔"

عمر نے اس کو پُرجوش دیکھا تو تجسس سے پوچھا "کیا؟"

اس سے پہلے کہ فرحی کچھ بولتی..... اسے صحن میں آہٹ سنائی دی۔ اس نے عمر کو جانے کے لیے کہہ دیا اور خود بھی دبے پاؤں کمرے میں آکر لیٹ گئی..... مگر اب اس کے چہرے پر چھائے فکر مندی کے آثار چھٹ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

شام کو وہ چائے بنا کر کمرے میں پہنچی۔ مونا بال بنا رہی تھی۔ اس نے چائے کا کپ اسے تھمایا۔ اس نے مسکراتے ہوئے پکڑ لیا۔

فرحی نے مسکرا کر کہا۔ "ہمارے نصیب میں خالی چائے ہے۔ اگر تم اس کو رنگین بنا دو تو....." اس نے مسکرا کر مونا پر معنی خیز نگاہ ڈالی۔

"سچ؟" مونا نے چائے کا سِپ لے کر قہقہہ لگایا۔

"ہاں! تم درست کہہ رہی تھیں۔ کسی کو بیوقوف بنا کر اس کے پیسوں سے تھوڑا بہت کھا لینا ایک فن ہی ہے۔ اس میں کوئی بری بات تھوڑی ہے۔" فرحی نے پُراعتماد ہو کر اس کی بات کو دہرایا۔

"تو میری پیاری کزن! کیا کھانے کو دل کر رہا ہے؟" مونا نے شوخی سے پوچھا۔

"پزا....." اس نے بھی قہقہہ لگایا۔

"ابھی حاضر ہوتا ہے جناب!" اس نے سیل فون اٹھایا اور پھر عمر کو کال ملائی۔

دوسری طرف عمر نے فوراً فون ریسیو کیا۔ مونا نے شوخی سے کہا۔

"عمر جی..... آج میری سالگرہ ہے اور مجھے اپنی کزن کو ٹریٹ دینی ہے..... پزا آسکتا ہے؟"

عمر خوش دلی سے بولا..... "کیوں نہیں، ابھی چاہیے کیا؟"

"نہیں نہیں، ابھی نہیں، تایا جی ابھی گھر پہ ہیں..... آج انہیں پھوپھو کے گھر جانا ہے۔ رات کے آٹھ بجے بھیج دینا۔"

"او کے جناب! اور کوئی حکم؟" اس نے مسکرا کر پوچھا..... وہ جانتا تھا کہ فرحی نے ضرور کچھ سوچ کر دعوت قبول کی ہے۔

"نہیں..... اچھا! پھر بات کرتے ہیں۔ شاید کمرے میں کوئی آرہا ہے۔" اس نے فون بند کیا اور فرحی کو دیکھ کر مسکرانے لگی..... فرحی نے چائے کا سِپ لے کر لمبی آہ بھری۔

☼ ☼ ☼

"تم کمرے میں جا کر پزا کھاؤ..... میں دودھ ابال کر آتی ہوں..... کہیں اماں آگئیں تو میری شامت آجائے گی۔" عمر اس کو پزا دے گیا تھا۔ وہ فرحی کے ساتھ کچن میں کھڑی تھی۔ وہ بے صبری سے پزا کھانے لگی۔

"کمال کا پزا ہے..... بہت ہی مزے کا ہے۔ جلدی سے کمرے میں آجاؤ۔" وہ کھاتے کھاتے کچن سے باہر نکل گئی۔

اس کے جانے کے فوراً بعد فرحی نے گھر کے فون سے عمر کو کال کی۔

دوسری طرف عمر نے جھٹ سے فون اٹھا لیا۔ فرحی نے آہستگی سے کہا۔

"عمر! مونا کے سیل پر تھوڑی دیر کے بعد ایک میسج کرنا۔"

"کیسا میسج.....؟ کیا لکھ کر بھیجوں؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

فرحی نے آہستگی سے کہا۔ "میسج میں لکھنا کہ پزے میں زہر ملا ہوا ہے اور اسے بتانا کہ وہ جو دوسروں کو بیوقوف سمجھتی ہے، آج اس کی انجوائے منٹ نے اس کی جان لے لی....." اس نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔

عمر نے فوراً میسج ٹائپ کرنا شروع کر دیا۔

وہ وہیں کھڑے ہو کر انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد مونا کی آواز آئی۔ وہ زور زور سے فرحی کو پکار رہی تھی۔ فرحی کو اندازہ ہو گیا کہ عمر نے مونا کو میسج کر دیا ہے۔

فرحی فوراً کمرے میں پہنچی..... مونا نے اپنا گلا پکڑا ہوا تھا اور وہ زور زور سے کھانس رہی تھی..... اس کی آنکھوں میں موت کا ڈر تھا..... اس کی سانس بُری طرح پھول رہی تھی۔

"کیا ہوا..... کیا ہوا....." وہ گھبرا کر اس کے پاس آئی۔

مونا نے کھانستے کھانستے کہا۔ "عمر نے پزے میں زہر ملایا ہوا تھا..... وہ میری اصلیت سے پہلے ہی واقف تھا..... پلیز! مجھے بچالو..... میں مرنا نہیں چاہتی۔ پلیز!" فرحی کا ہاتھ تھام کر چیخی۔

"اف خدایا! اب میں کیا کروں....." فرحی نے فکر مندی ظاہر کی۔ دل ہی دل میں وہ مسکرا بھی رہی تھی کہ مونا پر ایک میسج کا کیسا نفسیاتی اثر پڑا تھا۔

وہ بستر پر لیٹ گئی..... کیونکہ نفسیاتی اثر کے تحت وہ سمجھ رہی تھی کہ اس نے زہر کھا لیا ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ موت کی آغوش میں چلی جائے گی۔ اس نے روتے روتے خدا تعالیٰ سے معافی مانگنی شروع کر دی۔

اس کے چہرے کا ڈر دیکھ کر فرحی کو احساس ہوا کہ شاید وہ کبھی بھی کسی کو دھوکا نہیں دے پائے گی۔ اس کی حالت کو درست کرنے کے لیے اس نے حکیم صاحب کے پاس جانے کی اطلاع دی۔

"مونا! میں حکیم صاحب کے پاس جا رہی ہوں..... گھبرانا مت..... تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ مونا کو تسلی دے کر کمرے سے باہر آگئی اور کچن کا رخ کیا۔ اس نے جلدی سے ایک گلاس پانی میں تھوڑی سی کٹی ہوئی کالی مرچ ڈال دی۔ گلاس لے کر وہ کمرے میں آئی۔

دوسری طرف مونا فون پر رو رو کر حیدر سے معافی مانگ رہی تھی کہ وہ اسے معاف کر دے۔

حیدر تمام باتوں سے انجان تھا..... وہ گھبرا گیا..... وہ مونا کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ ابھی اس کے تایا کے گھر آتا ہے اور اسے ہسپتال لے جائے گا۔ وہ اسے کچھ نہیں ہونے دے گا۔

فرحی نے جھٹ سے اسے کٹی ہوئی کالی مرچوں کا پانی پلا دیا اور بولی۔

"یہ زہر کا توڑ ہے۔ حکیم صاحب نے دیا ہے..... فکر مت کرو! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔" فرحی نے اس کا ہاتھ تھام لیا..... مونا روتے ہوئے بولی۔

"فرحی! مجھے بچالو..... خدا سے دعا کرو..... وہ مجھے بخش دے۔"

وہ پھر خدا سے رو رو کر معافی مانگنے لگی۔ فرحی اسے تسلیاں دیتی رہی۔ مونا آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگی اور پھر روتے روتے نیند کی آغوش میں چلی گئی۔

اس کے سونے کے بعد فرحی نے مونا کا سیل فون اٹھایا اور عمر کو کال کی۔ عمر نے فوراً کال ریسیو کی۔ فرحی نے آہستگی سے کہا۔

"مونا سدھر گئی ہے۔"

"شکر ہے خدا کا..... میں نے حیدر کو بھی تمام بات بتا دی ہے۔ اس نے حیدر سے بھی معافی مانگ لی ہے اس واقعے کے بعد اب وہ کسی سے پزا نہیں کھائے گی..... اور نہ ہی کوئی تحفہ قبول کرے گی۔"

"ہاں! مگر حیدر کی کمائی سے وہ ہر چیز لے گی..... اور انجوائے بھی کرے گی..... شادی کے بعد۔" فرحی نے شوخی سے کہا۔

"تو پھر تمہارے لیے اماں کو کب گھر بھیجوں؟" اس نے جھٹ اپنے دل کی بات بھی کر دی۔

فرحی نے مسکرا کر شریر لہجے میں کہا۔ "پہلے پزا بھیجو، پھر سوچتی ہوں۔"

عمر نے قہقہہ لگایا اور بولا۔ "بندہ حاضر ہے۔ ہمیشہ کے لیے۔"

وہ شرما گئی..... وہ مطمئن تھی کہ اس نے اپنی کزن کو اور اپنے خاندان کی عزت کو بچا لیا تھا..... فون بند کر کے اس نے مونا کے ماتھے پر بوسہ دیا اور پیار سے بولی۔

"لڑکی کی عزت ہی اس کے لیے سب سے بڑی دولت ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم دونوں کے پاس وہ دولت موجود ہے۔ اس دولت کی ہر کوئی قدر کرتا ہے۔"

☼

نگہت عبداللہ

میرے خواب لوٹا دو

توصیف احمد اور یاسمین کا ایک بیٹا حماد اور دو بیٹیاں، سارہ اور اریبہ ہیں۔ یاسمین کی مستقبل بدمزاجی اور بدزبانی سے تنگ آکر توصیف احمد نے اپنے بڑے بھائی کی سالی خالدہ سے دوسری شادی کرلی۔ یاسمین اس پر اپنے جیٹھ، جٹھانی سے شاکی ہے۔ اریبہ ماں سے قریب ہے، جب کہ سارہ اپنے باپ سے محبت کرتی ہے۔ اریبہ کی منگنی اس کے تایا زاد اجلال رازی سے ہوچکی ہے، جو اعلا تعلیم کے لیے امریکا گیا ہوا ہے۔ یاسمین، اریبہ کو باپ اور ددھیالی رشتے داروں کے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔ اریبہ کو جب باپ کی دوسری شادی کا پتا چلا تو وہ اپنے تایا اور تائی سے بھی بدظن ہوگئی اور اس نے اجلال سے منگنی توڑ دی۔ اجلال تعلیم مکمل کر کے واپس آیا تو اسے منگنی ٹوٹنے کا پتا چلا۔ وہ اریبہ سے محبت کرتا ہے اور یہ رشتہ ختم نہیں کرنا چاہتا۔

اجلال رازی اس بارے میں اریبہ سے بات کرتا ہے، مگر وہ خاصی رکھائی سے پیش آتی ہے، تاہم وہ تحمل سے کام لیتا ہے کیونکہ وہ یہ مسئلہ بردباری کے ساتھ حل کرنا چاہتا ہے۔ اریبہ بے حد خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ وہ ماں کی شہ پر باپ کی مرضی کے خلاف موٹر سائیکل لے لیتی ہے۔ توصیف احمد کو اریبہ کے منگنی توڑ دینے کا بھی علم ہو جاتا ہے۔ وہ ساجدہ سے بات کرتے ہیں تو وہ انہیں کچھ دن یاسمین کے گھر میں رہنے کا مشورہ دیتی ہیں۔ سارہ کا کزن سمیر اس سے اظہار محبت کرتا ہے۔ سارہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔

شمشیر علی شہر میں ملازمت کرتا ہے۔ اسے گاؤں میں مقیم اپنی بہن تاجور کی فکر رہتی ہے کیونکہ وہ وہاں سوتیلی ماں کے ظلم و ستم اور باپ کی عدم توجہ کا شکار ہے۔ وہ تاباں کو پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے باپ کو فون کرتا ہے کہ تاباں کے باپ سے رشتے کی بات کرے تاکہ وہ شادی کے بعد تاجور کو اپنے ساتھ رکھ سکے۔
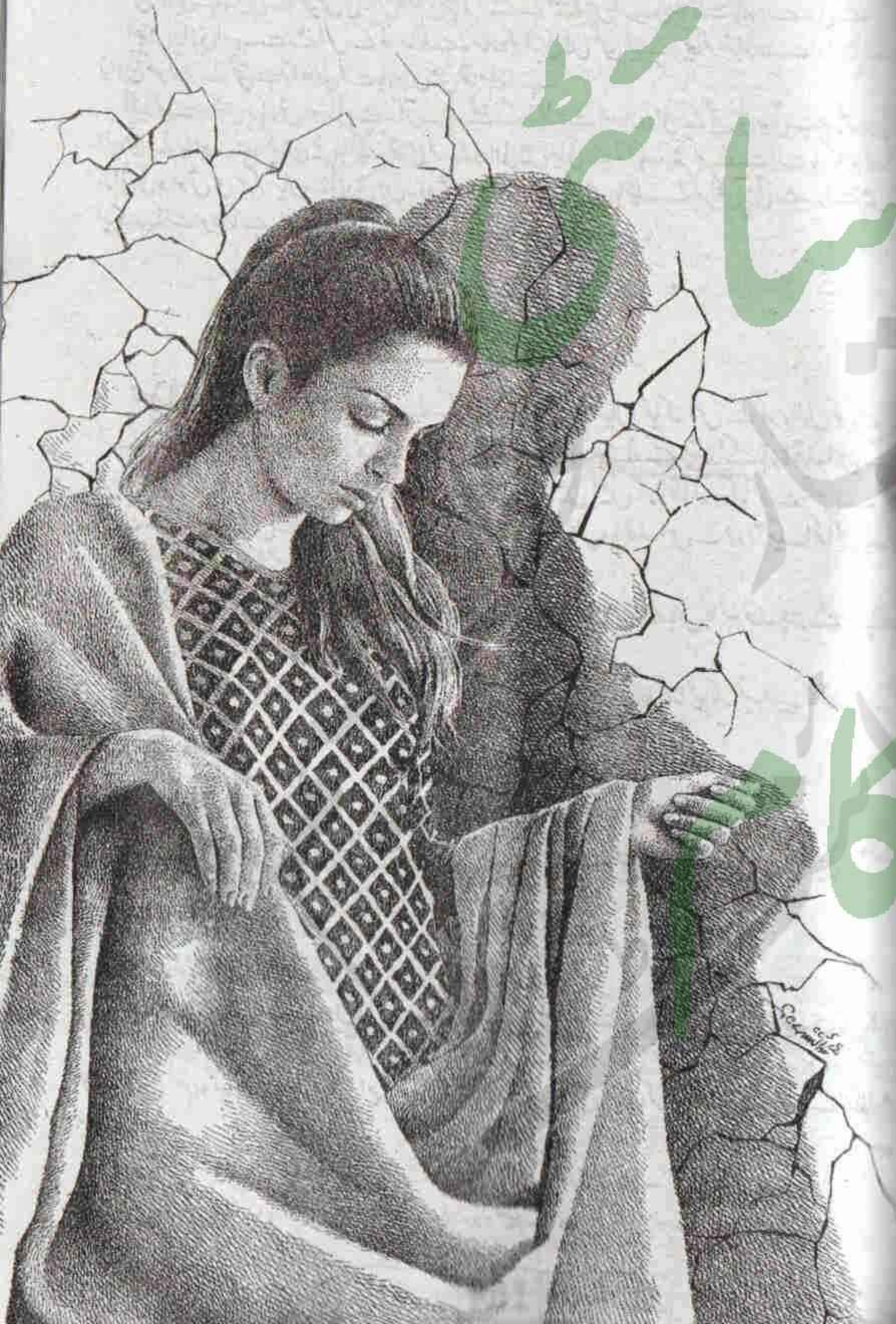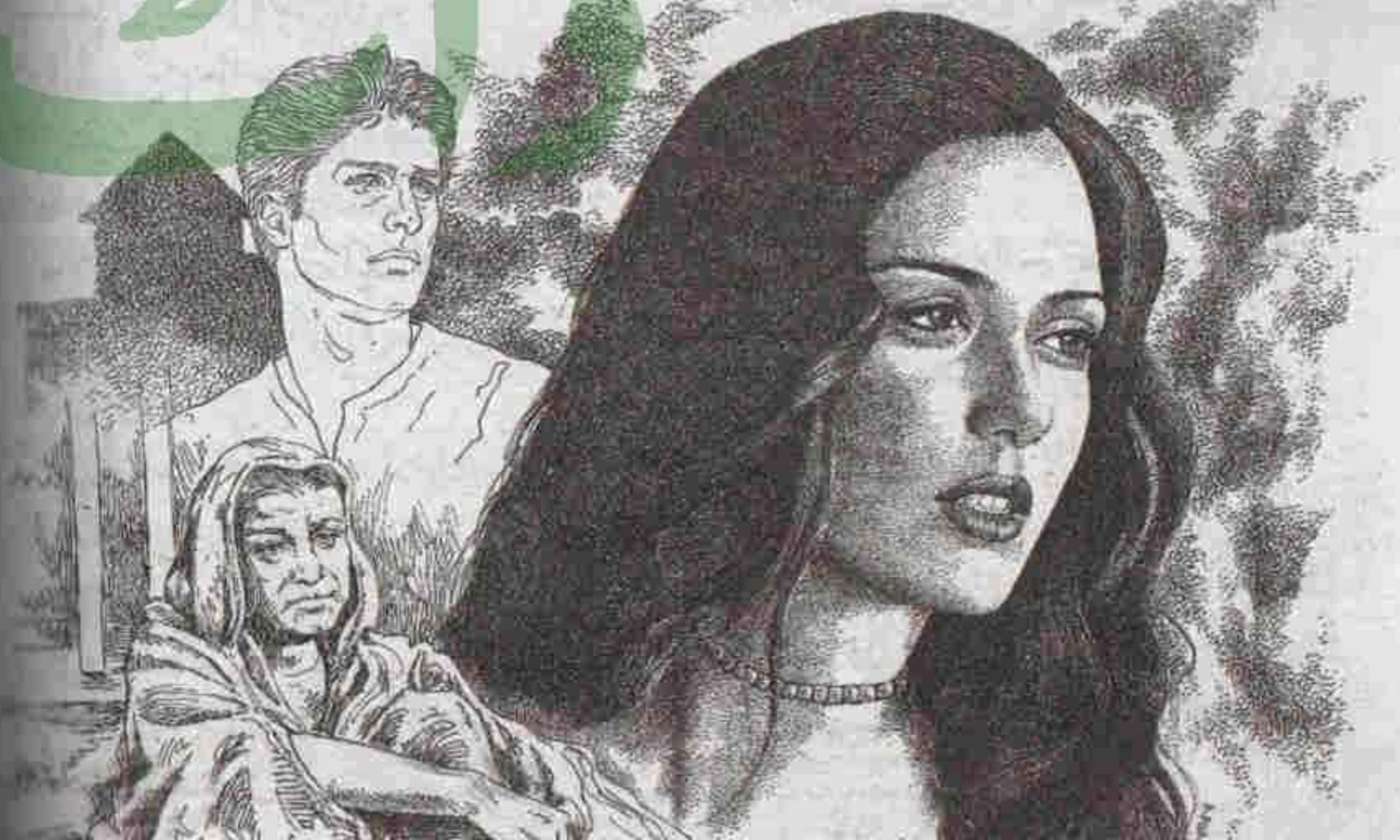
تاباں کا باپ بدلے میں اپنے لیے تاجور کا رشتہ مانگ لیتا ہے۔ شمشیر غصہ میں تاباں سے اپنا راستہ الگ کر لیتا ہے۔ شمشیر تاجور کو اپنے ساتھ شہر لے آتا ہے۔ تاجور کو ٹی بی ہوتی ہے۔ وہ اسے ہسپتال داخل کروا دیتا ہے۔

اریبہ یاسمین کو شہباز درانی کے ساتھ گاڑی میں دیکھ لیتی ہے۔ اسے ناگوار لگتا ہے مگر یاسمین جھوٹی کہانی سنا کر اسے مطمئن کر دیتی ہے۔ ٹی بی کے مریض کی کیس ہسٹری تیار کرنے کے سلسلے میں اریبہ کی ملاقات تاجور سے ہوتی ہے۔

اجلال رازی اریبہ سے ملنے اس کے گھر جاتا ہے۔ سارہ کو کھڑکی میں مگن کھڑے دیکھ کر شرارت سے ڈرا دیتا ہے۔ وہ توازن کھو کر گرنے لگتی ہے تو اجلال اسے بازوؤں میں تھام لیتا ہے۔

اکیڈمی سے واپسی پر بارش ہو جاتی ہے۔ اریبہ پناہ لینے کے خیال سے شہباز درانی کے گھر چلی جاتی ہے جو کچھ دن پہلے انہوں نے لیا ہوتا ہے۔ پورچ میں بائیک کھڑی کر کے وہ لابی میں جاتی ہے تو ایک بند کمرے سے اسے یاسمین اور شہباز درانی کی مدہوش سی سرگوشیاں سنائی دیتی ہیں۔ وہ غصے میں دوبارہ بارش میں بائیک لے کر نکل پڑتی ہے۔ راستے میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص اسے بچانے کے لیے آگے بڑھتا ہے۔

ساتویں قسط

ہسپتال کے ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد شمشیر علی کو خیال آیا کہ اس کے گھر والوں کو کیسے مطلع کرے۔ وہ تو ایمر جنسی میں تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان اور جانے کسے جیتنا، کسے ہارنا تھا۔ اس کے لیے بہر حال اس کے گھر والوں کو مطلع کرنا ضروری تھا۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، کس سے معلوم کرے۔ تب اچانک اس کے بیگ پر نظر پڑی جسے اس نے بینچ پر ڈال دیا تھا۔ اس نے فوراً بیگ اٹھا کر چیک کیا۔ اس کا سیل فون ہاتھ آ گیا جس پر پہلا نمبر توصیف احمد کا تھا۔

"توصیف احمد!" وہ نام سے چونکا اور نمبر دیکھ کر تو پریشان ہو گیا۔ یہ اس کے باس کا نمبر تھا۔ چند لمحے سوچنے کے بعد آخر اس نے نمبر پش کر دیا تھا۔

"لیس اریبہ! ہاؤ آر یو بیٹا؟" ادھر توصیف احمد نے فوراً کال ریسیو کرتے ہی کہا کیونکہ نمبر اریبہ کا تھا۔ جبکہ شمشیر علی گڑبڑا گیا۔

"سر! میں شمشیر علی۔"

"شمشیر علی!" توصیف احمد غالباً سوچ میں پڑ گئے تھے۔

"جی سر! یہ سیل فون اگر آپ کی بیٹی کا ہے تو میں افسوس سے کہوں گا کہ وہ اس وقت ہسپتال میں ہیں۔" شمشیر علی نے سنبھل کر کہا تو ادھر توصیف احمد پریشان ہو گئے۔

"ہسپتال! کیا ہوا ہے؟"

"ایکسیڈنٹ سر!"

"اوہ! تم ہسپتال بتاؤ میں آ رہا ہوں۔" توصیف احمد نے تفصیل جاننے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ ہسپتال کا نام سن کر فون بند کر دیا تھا۔ جس کا مطلب تھا۔ وہ فوراً پہنچ جائیں گے اور اگر کسی انجان شخص کا معاملہ ہوتا تو شمشیر علی کا کام یہاں ختم ہو گیا تھا لیکن توصیف احمد اس کے باس تھے اور وہ اپنی پہچان کرا چکا تھا جب ہی ان کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد توصیف احمد آئے تھے۔ وہ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کہاں ہے اریبہ؟ کیسی ہے؟" بہت ضبط کے باوجود توصیف احمد کی پریشانی چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"جی، وہ ایمر جنسی میں ہیں۔"

"کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹرز؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں کہا۔ آپ پلیز بیٹھیں سر!" اس نے بے اختیار توصیف احمد کا بازو تھام کر انہیں بٹھایا پھر تسلی دینے لگا۔ "آپ پریشان نہ ہوں سر! وہ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"کیسے، کہاں ہوا ایکسیڈنٹ اور تم، تم تو غالباً شہر سے باہر تھے؟" توصیف احمد بے ربط ہو رہے تھے۔

"جی سر! میں آج ہی واپس آیا ہوں۔ اور ابھی ہسپتال آ رہا تھا کہ راستے میں بائیک سلپ ہوتے دیکھی پھر میں انہیں اٹھا کر یہاں لے آیا۔ فوری طور پر میں یہی کر سکتا تھا۔ پھر ان کے سیل فون پر آپ کا نمبر دیکھ کر میں نے آپ کو مطلع کیا۔" اس نے روانی سے بتا دیا۔

"زیادہ چوٹیں تو نہیں آئیں؟" توصیف احمد نے پوچھا تو وہ جواب نہیں دے سکا جس کا مطلب ظاہر تھا۔ توصیف احمد نے سر جھکا لیا۔ چند لمحے اسی حالت میں بیٹھے رہے پھر جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر پش کر کے کان سے لگا لیا۔

"ہاں، یاسمین کہاں ہے؟"

"اور سارہ۔"

"نہیں رہنے دو۔" انہوں نے سیل آف کیا پھر شمشیر علی کو دیکھ کر بولے۔

"او کے جنٹل مین۔ تھینک یو ویری مچ۔ تم نے بڑا احسان کیا۔"

"نو سر۔"

"تم نہ سمجھو لیکن میں ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" انہوں نے اسے بولنے ہی نہیں دیا۔ تب وہ ان سے اجازت لے کر وہاں سے چلا آیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ساجدہ بیگم کے ہاتھ پیر پھول گئے تھے۔ رازی گھر پر تھا نہ بلال۔ ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو ثنا کو پکارنے لگیں۔

"ثنا! ثنا!" ان کی آواز سے پریشانی ظاہر تھی۔ جب ہی ثنا بھاگی چلی آئی۔

"جی امی!"

"رازی کہاں ہے، اور بلال؟ فون کرو انہیں اور جلدی بلاؤ۔" وہ کہتے ہوئے اپنے پیچھے صوفے پر ڈھے سی گئیں۔

"کیا ہوا ہے امی، سب ٹھیک تو ہے ناں؟" ثنا نے ٹھٹک کر پوچھا، ساتھ ہی ٹیلی فون کا ریسیور بھی اٹھا لیا۔

"تم پہلے بھائی کو فون کرو۔ رازی سے کہو، جلدی آئے۔" انہوں نے کہا تو ثنا جلدی جلدی نمبر ڈائل کرنے لگی۔ پھر ادھر بیل جاتی رہی۔ اس کے بعد ناٹ رسپونڈنگ کا ٹیپ بجنے لگا۔ ثنا نے دوبارہ ڈائل کیا تب بھی یہی ہوا تو ریسیور رکھ کر ساجدہ بیگم کے پاس آ بیٹھی۔

"بھائی فون نہیں اٹھا رہے۔ آپ بتائیں تو کیا ہوا ہے۔ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں؟"

"پریشانی کی بات ہی ہے۔ اریبہ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ ہسپتال میں ہے۔" ساجدہ بیگم نے بتایا تو ثنا سنبھل کر

پوچھنے لگی۔

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"ابھی تمہارے چچا جان کا فون آیا تھا۔ وہی ہیں اریبہ کے پاس۔ مجھے بھی بلا رہے ہیں۔ کہاں رہ گیا رازی؟ اس کا فون نہیں مل رہا تو بلال کو ملاؤ۔ کوئی تو آئے۔"

وہ جواب کے ساتھ بولی تھیں۔ ثنا بادل نخواستہ اٹھی تھی۔ بلال کو فون کر کے پھر ان کے پاس آبیٹھی۔

"بلال آ رہا ہے۔ لیکن امی! اتنی سردی اور بارش بھی ہو رہی ہے۔ آپ کیسے جائیں گی' میرا مطلب ہے آپ کی اپنی طبیعت۔ کہیں گھٹنوں کی تکلیف بڑھ نہ جائے۔" ثنا نے اس وقت طریقے سے انہیں روکنے کی کوشش کی۔ ورنہ عام حالات میں کہہ دیتی کہ مرتی ہے تو مرے ہمیں کیا۔

"اب جو بھی ہو' جانا تو ہے۔ توصیف بہت پریشان تھا اور پتا نہیں بچی کس حال میں ہے۔ تم جاؤ' جلدی سے میری گرم شال لے آؤ۔" وہ ثنا کو جواب ضرور دے رہی تھیں لیکن ان کا سارا دھیان توصیف احمد اور اریبہ کی طرف تھا' بس نہیں چل رہا تھا فوراً" وہاں پہنچ جائیں۔

"بلال کو تو آنے دیں۔"

ثنا کہتے ہوئے اٹھ کر چلی بھی گئی اور جب شال لے کر واپس آئی تب بلال بھی آگیا تھا۔ ساجدہ بیگم نے اسے بیٹھنے بھی نہیں دیا بس ایکسیڈنٹ کا بتا کر ہسپتال چلنے کو کہا اور فوراً" اس کے ساتھ نکل آئی تھیں۔

سڑکوں پر پانی جمع ہونے کے باعث بمشکل پندرہ منٹ کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں طے ہوا تھا۔ وہ جب پہنچیں' اس وقت اریبہ کو کمرے میں منتقل کیا جا رہا تھا اور توصیف احمد کمرے سے باہر گم صم کھڑے تھے۔ بلال نے سلام کیا تب انہوں نے چونک کر اسے دیکھا پھر بے اختیار ساجدہ بیگم کے کندھے پر سر رکھ دیا تھا۔

"بھابھی جان! اریبہ!"

"حوصلہ رکھو۔ کچھ نہیں ہوگا اریبہ کو۔" انہوں نے توصیف احمد کا سر تھپکا پھر بلال کو اشارا کیا تو وہ انہیں تھام کر کمرے میں لے آیا۔ اریبہ کو دیکھ کر ساجدہ بیگم کو بھی چکر آگیا تھا۔ وہ مکمل پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر صرف آنکھوں کی جگہ خالی تھی۔

"امی! چچا جان پلیز' آپ دونوں بیٹھ جائیں۔" بلال کو اریبہ سے زیادہ ماں اور چچا کی حالت پریشان کر گئی۔ دونوں ہی یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ڈھے جائیں گے۔

"کیسے ہوا یہ؟ تم ساتھ تھے؟" ساجدہ بیگم نے توصیف احمد کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں' مجھے کچھ پتا نہیں' ہمیں ہسپتال سے فون آیا تھا تو میں بھاگا چلا آیا۔"

"گھر میں خبر ہے یاسمین کو؟" ساجدہ بیگم نے کچھ رک کر پوچھا تھا۔

"نہیں' میں نے فون کیا تھا۔ یاسمین گھر پر نہیں تھی اور سارہ کو میں نے خود نہیں بتایا۔" توصیف احمد کے لہجے میں عجیب سی بے بسی تھی۔

"اچھا کیا۔ سارہ پریشان ہی ہوتی۔"

"جی' مجھے یہی خیال تھا اور میں آپ کو بھی تکلیف نہیں دینا چاہتا تھا لیکن۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔" ساجدہ بیگم فوراً" ٹوک کر کہنے لگیں۔ "اریبہ میری اپنی بچی ہے۔ میں دیکھ بھال کروں گی اس کی۔ تم اس طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔"

میں آپ کی محبت کی دل سے قدر کرتا ہوں بھابھی جان! ورنہ اس کی ماں۔"

"بس خاموش ہو جاؤ اور جاؤ بلال کے ساتھ ڈاکٹر سے معلوم کرو' بچی کو کب ہوش آئے گا اور کھانے پینے کو کیا ...۔" ساجدہ بیگم نے ان کے ساتھ بلال کو بھی اٹھا دیا تھا۔ پھر اریبہ کو دیکھتے ہوئے اپنے پرس میں سے تسبیح ... تھی۔

☼ ☼ ☼

رات تقریباً" دس بجے جب آسمان نیر بہا کر شانت ہو چکا تھا تب یاسمین گھر آئی تھی۔ وہ اتنی مطمئن اور مگن ... سیدھی اپنے کمرے میں چلی آئی اور کیونکہ سیر ہو کر آئی تھی۔ اس لیے اب اسے کسی چیز کی طلب نہیں تھی ... کپڑے تبدیل کر کے سو جانا چاہتی تھی۔ اسی ارادے سے وہ ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی تھی کہ دروازے پر ... سن کر رک گئی۔ پھر دوسری دستک کے بعد بی بی اندر آئی تھیں۔

"کیا بات ہے؟" یاسمین نے بی بی کو دیکھتے ہی بلا ارادہ پوچھا تھا۔

"بیٹا! اریبہ ابھی تک نہیں آئی۔" بی بی کے لہجے میں حد درجہ تشویش تھی۔ یاسمین کا سارا نشہ ہرن ہو گیا ...

"... اریبہ کہاں گئی ہے؟ آپ کا مطلب ہے اکیڈمی سے نہیں آئی۔"

"... جب سے گئی ہوئی ہے۔ کوئی فون بھی نہیں آیا۔" بی بی نے بتایا تو یاسمین جھنجلا گئی۔

"... آپ نے۔ میرا مطلب ہے' سارہ نے فون کیا اسے؟"

"سارہ تو آپ روتی رہی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے اسے۔"

"کچھ نہیں ہوتا اسے۔" یاسمین چیخ کر بولی تھی۔ "پاگل ہے وہ۔ آپ کو پتا تو ہے بارش میں روتی ہے۔ پتا نہیں ... کی دنیا میں رہتی ہے۔ نان سینس۔"

"اور اریبہ!"

"... میں فون کرتی ہوں اسے۔ بارش کی وجہ سے کہیں رک گئی ہو گی۔" یاسمین کہتے ہوئے پرس میں سے فون نکالنے لگی۔

"توصیف میاں کا فون آیا تھا۔" بی بی نے بتایا تو سیل فون تلاش کرتا یاسمین کا ہاتھ رک گیا۔

"کیا کہہ رہے تھے؟"

"کچھ نہیں۔ بس آپ کا پوچھا پھر سارہ کا۔ میں نے کہا سارہ کو اٹھا دیتی ہوں تو "نہیں رہنے دو" کہہ کر فون بند کر ...۔" بی بی ایک ایک بات اس کے گوش گزار کر رہی تھیں۔

"اور حماد کہاں ہے؟" یاسمین اب کچھ خفیف تھی۔

"وہ اپنے کمرے میں ہے۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ آپ چائے بناؤ' میں دیکھتی ہوں سب کو۔" یاسمین بی بی کو بھیج کر متحرک ہو گئی۔ پہلے اریبہ ... کیا۔ اس کے سیل پر بیل جاتی رہی لیکن کال ریسیو نہیں ہوئی۔ وہ دوبارہ ٹرائی کرتے ہوئے اٹھ کر سارہ کے ... میں آگئی۔

سارہ کمبل میں منہ چھپائے پڑی تھی۔

"سارہ!" یاسمین نے پکارنے کے ساتھ کمبل کھینچا تھا اور ٹھٹک گئی۔ ہچکیوں کے باعث سارہ کا وجود جھٹکے کھا رہا

تھا۔
"سارہ!" یاسمین نے قریب بیٹھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔
"مما، مما! آپ کہاں چلی گئی تھیں۔ میں نے آپ کو بہت پکارا۔ آپ کہاں تھیں اتنا مینہ برسا، سب بہا لے گیا۔ مما! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔" سارہ روتے ہوئے جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی۔ یاسمین کو اس سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔
"بیٹا! بیٹا! میری بات سنو۔ میں کہیں نہیں گئی۔ یہیں تمہارے پاس ہوں۔ تم رونا بند کرو اور مجھے بتاؤ۔ ار کہاں ہے؟"
"مجھے نہیں پتا۔" سارہ کے آنسو تھم رہے تھے نہ ہچکیاں۔
"تو بتاؤ۔ کہاں پتا کروں۔ فون بھی نہیں اٹھا رہی۔" یاسمین نے ایک دم اسے جھنجھوڑ ڈالا تو وہ خائف ہو گئی۔
"ک۔ کیا ہوا ہے مما؟"
"میں اریبہ کا پوچھ رہی ہوں۔ اکیڈمی گئی تھی۔ واپس نہیں آئی اور اب فون بھی نہیں اٹھا رہی۔ کچھ بتا کر تھی؟" یاسمین نے بہت ضبط کرتے ہوئے اسے صورت حال بتا کر پوچھا تو وہ نفی میں سر ہلا کر بولی۔
"نہیں۔ مجھے کچھ نہیں بتایا۔"
"انتہائی احمق لڑکی ہے۔ اگر بارش میں کہیں پھنس گئی ہے تو فون تو کر لے۔"
یاسمین اب واقعی پریشان ہو گئی تھی۔ تم ایسا کرو اس کی فرینڈز کو فون کرو..... معلوم کرو کہاں ہے۔"
"لیکن مما! میرے پاس تو کسی کا نمبر نہیں ہے۔" سارہ کہنے کے ساتھ اٹھ کر اریبہ کی رائٹنگ ٹیبل پر آ گئی اس کی کتابیں اور ڈائریاں کھنگالنے لگی، اس کے ہاتھ بری طرح کانپ رہے تھے۔ پھر مایوس ہو کر یاسمین کو د لگی۔

"شٹ!" یاسمین اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب اس وقت میں کہاں جاؤں۔"
"مما! ڈیڈی کو فون کریں۔" سارہ نے کہا تو یاسمین اچھل پڑی۔
"نہیں، انہیں تو پتا بھی نہیں چلنا چاہیے۔ خیر تم آرام کرو۔ میں دیکھتی ہوں۔"
"آپ کہاں دیکھیں گی؟"
"کہیں نہیں۔ میں کہیں جا نہیں رہی۔ آرام سے سوچنا چاہتی ہوں۔" یاسمین پہلے جھنجلائی تھی پھر ایک دم نرم پڑ گئی۔ "بیٹا! پریشانی میں کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ویسے میرا خیال ہے، اریبہ کسی سہیلی کے ہاں رک گئی گی۔"
"تو مما! اسے فون تو کرنا چاہیے۔" سارہ پھر رو دینے کو ہو گئی تھی۔
"ہو سکتا ہے سو گئی ہو۔ ایسا ہی ہو گا۔ اٹھے گی تو ضرور فون کرے گی۔ تم پریشان مت ہو۔" یاسمین نے اس سے کہتے ہوئے اس کا گال تھپکا تو ٹھٹک گئی۔ "مائی گاڈ! تمہیں تو اتنا تیز بخار ہو رہا ہے۔ کیا بارش میں بھیگی تھیں؟"
سارہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں گرم پانیوں سے بھر گئی تھیں۔
"اچھا چلو تم کمبل میں لیٹو۔ میں چائے کے ساتھ ٹیبلٹ لاتی ہوں۔" یاسمین کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

✲ ✲ ✲

سے اب تک وہ کتنی چائے پی چکا تھا بلکہ صرف چائے ہی پیتا رہا تھا۔ پھر بھی اب چائے کی طلب تھی۔
نہیں کہ وہ سرد موسم میں بارش میں بھیگتا رہا تھا گو کہ اس کا بدن کپکپا رہا تھا لیکن اسے سردی کا احساس تھا اور صرف یہی نہیں سارے احساسات منجمد ہو گئے تھے صرف ذہن چیخ رہا تھا۔ کنپٹیوں میں درد کی ٹیسیں تھیں۔ بمشکل تمام اس نے گیلے کپڑوں سے نجات حاصل کی پھر کمرے سے نکل آیا اور پہلے احتیاط سے بیگم کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا تو صرف ثنا سوئی ہوئی نظر آئی۔ ساجدہ بیگم کا بستر خالی اور بے تھا۔ فوری طور پر وہ کچھ سمجھ نہیں پایا۔ اسی احتیاط سے دروازہ بند کر کے واپس پلٹا، تب اچانک ٹھٹکا تھا۔
"امی کہاں گئیں؟" سوچتے ہوئے دوبارہ کمرے میں جانا چاہتا تھا کہ بلال کو آتے دیکھ کر رک گیا۔
"آپ کہاں تھے بھائی؟ فون بھی نہیں اٹھا رہے تھے۔" بلال نے کہا تو وہ اپنے آپ میں الجھ گیا۔
"میں..... وہ امی..... ہاں امی کہاں ہیں؟"
"امی ہسپتال۔" بلال نے ابھی اسی قدر کہا تھا کہ وہ پریشان ہو گیا۔
"کیوں کیا ہوا ہے انہیں؟"
"انہیں کچھ نہیں ہوا۔ وہ اصل میں..... آپ آئیں، یہاں بیٹھیں۔" بلال بتاتے ہوئے رک گیا اور اسے بازو تھام کر لاؤنج میں لے آیا تو وہ چیخ گیا۔
"مجھے بتاؤ۔ کیا ہوا ہے۔ کون ہے ہسپتال میں؟"
"اریبہ۔" بلال ایک دم بتا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"اریبہ۔" اس کا دل کسی اتھاہ میں اتر رہا تھا۔
"جی اس کی بائیک سلپ ہوئی تھی۔ بھلا کیا ضرورت تھی بارش میں بائیک پر نکلنے کی۔ یقیناً" بہت دور تک گھسٹتی گئی ہے۔ بہت زخمی ہے۔ وہ تو شکر ہے ہیلمٹ کی وجہ سے سر کی بچت ہو گئی ورنہ اس کا بچنا مشکل تھا۔ میں اس وقت سے آپ کو فون کر رہا ہوں۔ آپ کہاں تھے؟" بلال روانی سے بتا کر پوچھ رہا تھا۔

"میں!" اس کا ذہن مفلوج ہو رہا تھا "پتا نہیں۔ہاں میں اریبہ سے ملنے گیا تھا۔وہ نہیں تھی پھر مینہ برسنے لگا برستا چلا گیا اور میں مینہ کے ساتھ۔"

"بھائی!" بلال کو اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہوا۔گھبرا کر اسے تھام لیا۔

"بھائی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آئیے اپنے کمرے میں چلیں۔ آرام کریں۔"

"نہیں۔" اس نے ایک دم بلال کو پرے دھکیل دیا۔ "میں آرام کیسے کر سکتا ہوں۔" "میرا مقدر مجھ سے روٹھ گیا ہے۔میں کیسے آرام سے ہو سکتا ہوں۔"

"کچھ نہیں ہوا بھائی۔اسے کچھ نہیں ہو گا۔چند دنوں میں دیکھیے گا پھر پہلے جیسی ہو جائے گی۔ آپ پلیز خود کو سنبھالیں۔" بلال کے لہجے میں عاجزی سمٹ آئی تھی۔جس سے اسے دھچکا لگا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بلال! تم جاؤ سوؤ۔"

"میں تو سو جاؤں گا آپ چلیں اپنے کمرے میں اور کچھ چاہیے تو مجھے بتائیں۔میرا مطلب ہے۔کھانا، چائے"

"نہیں کچھ نہیں۔" وہ اب چائے بھی بھول گیا تھا۔"میرا خیال ہے سونا چاہیے۔صبح چلیں گے ہسپتال۔"

"جی.....!" اس کے انداز سے بلال کی پریشانی کچھ کم ہوئی تھی۔

"اریبہ کے پاس صرف امی ہیں یا کوئی اور بھی ہے؟" اس نے جاتے جاتے رک کر پوچھا۔

"جب میں آرہا تھا 'اس وقت چچا جان تھے۔اب پتا نہیں۔" بلال نے بتایا تو وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"اور یاسمین آنٹی؟"

"ان کا مجھے پتا نہیں ہے۔ہو سکتا ہے 'اب آگئی ہوں۔" بلال کے پاس کوئی واضح جواب نہیں تھا۔تب وہ اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

سرد رات اپنے اوراق پر جانے کتنے فسانے رقم کرتی گزر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس کی زندگی میں کبھی ایسی سیاہ ترین رات آئے گی۔یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔وہ ایک پل کے لیے نہیں سوئی تھی۔نصف شب تک یاسمین اس کے ساتھ تھی۔پھر اسے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور اس کی آنکھیں تو جیسے ساکت ہو گئی تھیں۔پلکیں تک نہیں جھپک رہی تھیں۔کارڈلیس ہاتھ میں لیے مسلسل اریبہ کا نمبر ملاتی رہی تھی۔اس کا دل بری طرح سہما ہوا تھا۔اس کے باوجود جہاں کھٹکا محسوس ہوتا وہ اٹھ کر گیٹ تک بھاگی تھی۔پھر صبح سورج کی پہلی کرن اترتے ہی وہ برآمدے کی سیڑھیوں پہ آ بیٹھی تھی۔اسے اپنا ہوش نہیں تھا یا اس نے اپنا آپ بھلا دیا تھا۔بس صرف اریبہ یاد تھی۔کہیں سے وہ آجائے بائیک لہراتی ہوئی پھر اسے اکیلے بیٹھے دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں ٹوکے۔

"یہاں کیوں بیٹھی ہو اکیلی؟"

"بی بی اپنے کاموں میں مصروف رہتی ہیں۔انہیں کیا پتا' یہاں کیا ہو رہا ہے۔"

"اریبہ!" وہ گھٹنوں پر پیشانی رکھ کر سسکنے لگی۔ آنسو ایک تواتر سے بہہ نکلے تھے اور اپنی سسکیوں میں اسے کچھ سنائی ہی نہیں دیا۔نہ گاڑی کا ہارن نہ چوکیدار کے بھاگتے قدموں کی آواز اور نہ گیٹ کھلنے کی۔البتہ جب کندھے پر ہاتھ ٹھہرا تو وہ تڑپ کر اٹھی تھی۔

"ڈیڈی!" توصیف احمد کے سینے میں منہ چھپا کر وہ مچل گئی۔ "ڈیڈی! میں مر جاؤں گی۔مجھ سے اب برداشت نہیں ہو رہا۔میرا دل پھٹ جائے گا۔"

"اللہ نہ کرے۔کیسی باتیں کرتی ہو بیٹا۔" توصیف احمد نے اسے بازوؤں میں بھینچ کر ٹوکا پھر پوچھنے لگے۔ "کیا ہوا ہے۔کیا برداشت نہیں ہو رہا آپ سے؟"

"وہ۔" وہ رکی، سنبھلی پھر رو پڑی۔ "اریبہ پتا نہیں کہاں ہے۔میں ساری رات اسے فون کرتی رہی ہوں مگر۔"

"او گاڈ!" توصیف احمد جانے کیا سوچ کر آئے تھے "آپ روؤ نہیں بیٹا! میں پتا کرتا ہوں اور آپ نے مجھے رات ہی کیوں نہیں بتایا۔ آپ مجھے کال کرتیں۔"

"جی میں۔" سارہ گڑبڑا گئی۔ان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ اسے یاسمین نے روکا تھا۔ "مجھے، مجھے خیال آیا تھا پھر آپ کی پریشانی کا سوچ کر۔"

"اور جو آپ پریشان ہوئیں۔" توصیف احمد نے اس کا چہرہ دیکھا۔شدت گریہ سے اس کی آنکھیں سرخ اور پپوٹے بھاری ہو گئے تھے۔ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔

"میرے بچے! ابھی میں زندہ ہوں آپ کو رونے کی' پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" انہوں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا' تسلی دی۔پھر اپنے ساتھ لگائے ہوئے اندر لے کر آئے تو پوچھنے لگے۔

"آپ کی مما کہاں ہیں؟"

"مما! بہت پریشان تھیں ڈیڈی۔میں نے انہیں زبردستی سُلایا تھا۔" سارہ ہمیشہ کی مصلحت پسند تھی۔

"اوکے۔ آپ اپنے کمرے میں جاؤ۔میں دیکھتا ہوں۔" توصیف احمد نے اس کا گال تھپک کر کہا تو وہ ست روی سے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

توصیف احمد کچھ دیر وہیں کھڑے رہے پھر بیڈ روم میں آئے تو ان کی توقع کے عین مطابق یاسمین بے خبر سو رہی تھی۔انہوں نے خاصے جارحانہ انداز میں اس پر سے کمبل کھینچ لیا۔

"کون؟" یاسمین ہڑبڑا کر اٹھی اور انہیں دیکھ کر تیوری چڑھا کر بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے؟"

"اریبہ کہاں ہے؟" ان کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا۔

"اریبہ!" یاسمین ایک دم بیڈ سے اتر گئی۔ "اریبہ کا تو مجھے نہیں معلوم 'اس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔پتا نہیں کہاں رہ گئی۔"

"کہاں رہ گئی۔ایسی غیر ذمہ دار تو نہیں ہے وہ اور تمہیں تو اسپیشلی اس پر بہت بھروسا ہے۔پھر تمہیں بتائے بغیر وہ کہاں چلی گئی۔" توصیف احمد کی چبھتی نظریں یاسمین کو اپنے آرپار ہوتی محسوس ہو رہی تھیں پھر بھی جی کڑا کر کے بولی تھی۔

"کہیں نہیں گئی وہ۔بارش کی وجہ سے اپنی کسی دوست کے ہاں رک گئی ہے۔"

"بکواس کر رہی ہو تم۔" وہ یکدم پھٹ پڑے تھے۔ "تمہیں اپنی آوارگیوں سے ہی فرصت نہیں' گھر پر ہوتیں تو پتا چلتا۔وہ کہاں کس حال میں ہے۔"

"کیا مطلب 'کہاں ہے اریبہ؟" یاسمین تیزی سے ان کے قریب آئی تھی کہ انہوں نے زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا جس سے وہ اسی رفتار سے پیچھے گری تھی۔

"اریبہ تو جہاں بھی ہے۔تم کہاں تھیں۔رات جب میں نے فون کیا تم۔"

"ہاں۔میں گھر پر نہیں تھی۔" یاسمین عادت کے مطابق اب چیخنے لگی تھی۔

"میں ایک پارٹی میں گئی تھی اور تم کون ہوتے ہو پوچھنے والے۔تم نے اپنی دنیا بسا لی پھر مجھ پر کیوں حق جتاتے ہو۔"

"نہیں جتاؤں گا۔ چھوڑ دو میرا گھر۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ میں اب مزید تمہیں برداشت نہیں کر سکتا۔"
توصیف احمد نے صرف کہا ہی نہیں اسے کلائی سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئے تھے۔
یاسمین نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔
"سارہ! حماد! چھوڑو مجھے۔ میں نہیں جاؤں گی' میرے بچے۔ میں یہاں۔ سارہ۔"
"بچے اب تمہاری ڈھال نہیں بنیں گے۔" توصیف احمد نے ٹھوکر مار کر اسے لاؤنج سے باہر دھکیلا تھا۔
تب ہی سارہ اور حماد بھاگتے آئے تھے۔ لیکن کچھ سمجھ نہیں پائے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔
"سارہ! دیکھو اپنے باپ کو۔ مجھے گھر سے نکل رہا ہے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی بیٹا!" یاسمین فوراً" پینترا بدل کر بچوں کے سامنے گڑگڑانے لگی تھی۔
"ڈیڈی پلیز..... سارہ بھاگ کر توصیف احمد سے لپٹ گئی۔ "مما کو کچھ نہ کہیں۔"
"بیٹا! آپ ہٹ جاؤ۔" توصیف احمد آپے میں نہیں تھے۔ انہوں نے سارہ کو پرے ہٹانا چاہا لیکن وہ ان کے گرد اپنے بازوؤں کی مضبوط گرفت بنا کر مچل گئی تھی۔
اور حماد نے بڑھ کر یاسمین کو تھام لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ ڈاکٹر سے ملنے کے بعد تاجور کے پاس آیا تھا۔ وہ اس کی راہ دیکھ رہی تھی اور پریشان بھی تھی۔ کیونکہ وہ دو دن کا کہہ کر گیا تھا اور چوتھے دن آ رہا تھا۔
"بھائی! اتنے دن لگا دیے۔" تاجور شکوے کے ساتھ رونے لگی تھی۔
"ارے رو کیوں رہی ہو؟" وہ پریشان ہو گیا۔ "میں کل ہی آ گیا تھا اور اسی وقت تمہارے پاس آ رہا تھا لیکن بارش میں پھنس گیا تھا۔ پھر بڑی مشکل سے گھر پہنچا۔"
"مجھے ڈر لگ رہا تھا۔ میں اس شہر میں اکیلی تھی ناں۔" تاجور نے اپنے ڈر کی وجہ بھی بتا ڈالی۔
"بے وقوف ہو تم۔ یہاں تمہارے آس پاس کتنے لوگ ہیں۔ خیر اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ سارے کام ختم ہو گئے۔ شاید زندگی بھی۔" وہ اچانک کھو گیا تھا۔ تاجور سہم گئی۔
"بھائی!"
"ہاں۔" وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
"آپ پریشان ہو؟" تاجور نے پوچھا تو نفی میں سر ہلاتے ہوئے اس کے سینے سے گہری سانس خارج ہوئی پھر اس کا دھیان بٹانے کی خاطر پوچھنے لگا۔
"تم بتاؤ۔ تمہیں وقت پر کھانا مل جاتا ہے کہ نہیں؟"
"مل جاتا ہے۔"
"اور کچھ کھانے کو دل چاہ رہا ہو تو لا دوں۔"
"نہیں۔ ابھی کچھ نہیں۔" تاجور نے جس انداز سے منع کیا اس سے وہ سمجھ گیا کہ وہ نہیں چاہتی کہ وہ اس کے پاس سے اٹھ کر جائے۔ تب اس نے جیب سے کچھ نوٹ نکالے اور اسے دے کر بولا۔
"اچھا یہ پیسے رکھ لو۔ میں چوکیدار سے کہہ دوں گا۔ دن میں ایک دوبار آ کر تم سے پوچھ لے گا۔ جو دل چاہے اس سے منگوا لیا کرنا۔"
"آپ نہیں آئیں گے۔؟" تاجور کے اندر عجیب خوف تھا۔

"بیٹا! میں تو زیادہ تر رات میں ہی آتا ہوں ناں۔ اس وقت کچھ ملے نہ ملے۔ اس لیے میں نے چوکیدار کا کہا ہے۔" وہ زچ انداز میں بولا تھا۔ تاجور خاموش ہو گئی۔ پھر اچانک خیال آنے پر پوچھنے لگی۔
"بھائی۔ ابا کا فون آیا تھا۔؟"
"ہیں۔!" وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا تھا۔ "ہاں آیا تھا ان کا فون۔"
"کیا کہہ رہے تھے۔ میرا پوچھا تھا۔؟" تاجور بڑی آس سے اسے دیکھنے لگی تھی۔ اس کا دل بھر آیا لیکن اس معصوم لڑکی کا دل نہیں توڑ سکا۔
"ہاں۔ تمہارا ہی پوچھتے رہے تھے۔ پریشان ہو رہے تھے پھر میں نے انہیں تسلی دی کہ یہاں تمہارا اچھا علاج ہو رہا ہے۔"
"میں ٹھیک ہو جاؤں گی تو جاؤں گی ابا کے پاس۔ مجھے ابا بہت یاد آتے ہیں۔" تاجور آزردگی سے کہہ رہی تھی۔
"کیوں۔ وہ تمہیں کیوں یاد آتے ہیں۔ کبھی انہوں نے تمہارا خیال تو رکھا نہیں۔" وہ ٹوکنے سے باز نہیں رہ سکا۔
"میں تو ان کا خیال رکھتی تھی۔ خالہ تو ہر وقت لڑتی رہتی تھیں۔ مجھے ابا پر بہت ترس آتا تھا۔ بے چارے اتنے تھکے ہوئے آتے تھے۔" تاجور ابا کی محبت میں بول رہی تھی وہ پھر ٹوکنا چاہتا تھا کہ نرس کے آنے پر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اس سے کہہ رہی تھی
"بڑے دنوں بعد آئے۔"
"ہاں بس۔ ایک کام سے شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔" اس نے جواب دیتے ہوئے اپنی ریسٹ واچ پر ٹائم بھی دیکھا کیونکہ وہ آفس سے لنچ ٹائم پر آیا تھا۔
"ہاں بتایا تھا تاجور نے۔ پریشان بھی ہو رہی تھی۔" نرس کہہ کر تاجور کو دوا دینے لگی تو وہ اٹھ کھڑا ہوا۔
"اچھا تاج! میں چلتا ہوں۔ اب کل آؤں گا۔ کیونکہ شام میں میری کلاس ہے پھر رات میں کچھ پتا نہیں بارش ہو جائے۔"
"ٹھیک ہے بھائی۔"
"اللہ حافظ۔!" وہ تاجور کا سر تھپک کر وارڈ سے نکل آیا۔ اب اسے آفس پہنچنے کی جلدی تھی جب ہی کوریڈور سے نکلتے ہی وہ تقریباً" بھاگنے لگا تھا کہ اپنے نام کی پکار پر یک دم رک گیا۔
"شمشیر علی۔!" دوسری پکار پر وہ فوراً" پلٹا تھا۔
"جی سر۔!"
"تم آج آفس نہیں گئے۔؟" توصیف احمد کو جانے اس کی یہاں موجودگی کھٹکی تھی یا آفس سے غیر حاضری۔ ان کے لہجے میں بہرحال واضح شبہ تھا۔
"آفس میں ہی ہوں سر۔ آئی مین لنچ ٹائم پر یہاں آیا تھا۔ یہاں میری سسٹر ایڈمٹ ہے۔" اس نے سہولت سے جواب دیا تھا۔
"اوہ۔!" توصیف احمد گویا مطمئن ہوئے پھر پوچھنے لگے۔ "ابھی کہاں جا رہے ہو۔؟"
"آفس۔!"
"ہوں۔!" توصیف احمد جانے کیا سوچنے لگے اس نے کچھ انتظار کے بعد پوچھا۔
"میں جاؤں سر۔!"
"ہاں۔ ایک کام ہے۔" توصیف احمد نے کہتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے چابی نکالی اور اس کی طرف بڑھا

کر کہنے لگے۔ "میرے سیف میں ایک بلو کلر کی فائل ہوگی' وہ نکال کر جیلانی صاحب کو دے دینا۔"

"جی۔"

"ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں جیلانی صاحب کو فون کردوں گا۔" توصیف احمد نے کہا تو اس کا دل چاہا ان کی بیٹی کی خیریت پوچھے لیکن پھر مناسب خیال نہ کرتے ہوئے گیٹ کی طرف بڑھ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

یاسمین' سارہ اور حماد کے ساتھ اریبہ کے پاس آئی تھی۔ روم میں داخل ہوتے ہی اسے ساجدہ بیگم بیٹھی نظر آئیں تو اس کی تیوری چڑھ گئی لیکن یہ وقت کسی پر کچھ جتانے کا نہیں تھا۔ اسے صرف اریبہ کی فکر تھی اور یہ خیال کہ اسے ہر پل اریبہ کے ساتھ ہونا چاہیے کیونکہ اس کے اندر یہ خدشہ تھا کہ کہیں توصیف احمد یا ان کے خاندان کا کوئی فرد اریبہ کو اس کے خلاف بہکا نہ دے۔ وہ اپنی اس ڈھال کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ جب ہی ساجدہ بیگم کو نظر انداز کرکے فوراً" اریبہ پر جھک گئی۔

"اریبہ! میری جان۔ یہ تمہاری کیا حالت ہوگئی ہے۔" اریبہ کی بند پلکوں میں ذرا سی جنبش ہوئی تھی لیکن اس نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ وہ اس عورت کو جو اس کی ماں تھی' دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔

"مما! ابھی آپی کو ڈسٹرب نہ کریں۔" حماد نے آہستہ سے یاسمین کا بازو چھو کر کہا تو ساجدہ بیگم اس کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔

"ہاں یاسمین! بچی کو سونے دو۔ تم یہاں آکے بیٹھو۔" یاسمین بل کھا کر اٹھی تھی۔

"کیا بیٹھوں' میری بچی کل سے اس حال میں پڑی ہے' کسی کو توفیق ہی نہیں ہوئی مجھے اطلاع دینے کی۔ پوری رات تڑپ تڑپ کر کیسے گزاری ہے' یہ آپ نہیں سمجھ سکتیں۔ مزید صبح توصیف الٹا مجھ پر چیختے چنگھاڑتے آگئے۔ مارا ابھی مجھے۔ میں جانتی ہوں' یہ سب کی ملی بھگت ہے۔ مجھ سے میرے بچوں کو دور کرنا چاہتے ہیں آپ سب۔"

ساجدہ بیگم کی پیشانی پر بے شمار شکنیں نمودار ہوگئیں' لیکن قصداً" کچھ کہنے سے گریز کیا تھا۔

"آخر آپ کو بھی الہام تو نہیں ہوا ہوگا' خود سے تو نہیں آگئیں یہاں' باقاعدہ اطلاع دی گئی ہوگی پھر مجھے...."

"بس کرو یاسمین! یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔" ساجدہ بیگم نے نہ چاہتے ہوئے بھی ٹوک دیا۔

"ہاں تو میں کیا بھول جاؤں گی۔ ایک ایک کی خبر لوں گی۔ اور ذرا اریبہ کو ٹھیک ہونے دیں۔ باپ سے تو یہ پوچھے گی۔"

"مما پلیز چپ ہوجائیں۔" سارہ نے عاجزی سے ٹوکا۔ وہ مسلسل روئے جارہی تھی۔

"یہ اس کی حالت دیکھ رہی ہیں آپ؟ ایک پل کو جو اس کے آنسو رکے ہوں' بخار میں الگ تپ رہی ہے۔"

"پھر بھی تمہیں احساس نہیں ہے۔" ساجدہ بیگم نے تاسف سے کہہ کر سارہ کو اپنے ساتھ لگالیا۔ "بیٹا! رو نہیں' دعا کرو۔" "اللہ اریبہ کو شفا دے' صحت دے۔"

"اسے میری عمر لگ جائے۔" سارہ نے سسکتے ہوئے ان کی دعا میں اضافہ کیا تھا۔

"دہشت پنکی!" ساجدہ بیگم نے پیار سے ٹوکا تو یاسمین سے یہ لاڈ برداشت نہیں ہوا۔ تلملا کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ توصیف احمد کو آتے دیکھ کر ہونٹ بھینچ گئی۔

"آپ سب باہر جائیں۔ ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔" توصیف احمد نے اندر آتے ہی کہا تو سارہ اور حماد کے ساتھ ساجدہ بیگم بھی اٹھنے لگیں جبکہ یاسمین نے کوئی حرکت نہیں کی۔

"آپ بیٹھیں بھابھی جان! باقی آپ سب باہر بیٹھیں۔" توصیف احمد کا واضح اشارہ یاسمین کی طرف تھا، جس سے وہ بری طرح ہرٹ ہوئی تھی کوئی اور جگہ ہوتی تو وہ ساجدہ بیگم کو خود پر فوقیت حاصل ہونے پر ضرور واویلا مچاتی لیکن یہاں اپنی پوزیشن مزید خراب ہونے کا اندیشہ تھا، جب ہی فوراً سارہ اور حماد کے ساتھ روم سے ہی نہیں ہسپتال سے بھی نکل آئی تھی۔ سارہ نے بہت روکنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک نہیں سنی، الٹا تمام راستہ اسے سناتی آئی تھی۔

"دیکھ لیا تم نے اپنے باپ کو۔ بہت فیور کرتی ہو ناں تم ان کی۔ کیسے اپنوں کے سامنے مجھے ذلیل کرتے ہیں۔ میں ماں ہوں اریبہ کی، ماں مجھ سے زیادہ کوئی اس کی کیئر نہیں کر سکتا۔ یہ بات تمہارے ڈیڈی بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہ بوڑھی عورت خود اپنے آپ کو نہیں سنبھال سکتی، میری بچی کو کیا دیکھے گی۔"

"مما! آپ بوڑھی عورت کسے کہہ رہی ہیں؟" حماد جانے سمجھا نہیں تھا یا اس کا دھیان کہیں اور تھا۔

"تمہاری تائی اماں کو اور کس کو؟" یاسمین دھاڑی پھر کہنے لگی۔ "اریبہ ہوش میں آجائے، پھر دیکھوں گی کیسے رکتی ہے، وہ تو ان کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"مما۔ اریبہ ٹھیک ہو جائے گی ناں۔" سارہ سہمی ہوئی اور فکر مند تھی۔

"مجھے لگتا ہے آپی کو سزا ملی ہے ڈیڈی کی بات نہیں مانی تھی ناں۔" حماد نے کہا تو یاسمین بگڑ گئی۔

"فضول باتیں مت کرو۔ یہ کیوں نہیں کہتے اس کا بائیک چلانا سب کو کھل رہا تھا۔ جانے کس کی نظر لگ گئی اور سارہ! تم اب رونا دھونا بند کرو۔ میں ایک وقت میں اتنی ٹینشنز برداشت نہیں کر سکتی۔" اس نے حماد کے ساتھ سارہ کو بھی تنبیہہ کی، پھر گھر آتے ہی شہباز ربانی کو فون کیا تو وہ اس کی آواز سنتے ہی بولے تھے۔

"میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

"نہیں شبی! میں ابھی نہیں آسکتی اور ابھی کچھ دن تم مجھے کال مت کرنا۔ اصل میں..." پھر وہ اریبہ کے ایکسیڈنٹ کا بتانے لگی۔

☼ ☼ ☼

خنک شام ڈوب رہی تھی۔ اس نے احتیاط سے دروازہ کھولا تو سامنے ساجدہ بیگم مغرب کی نماز پڑھتی نظر آئیں۔ وہ شش و پنج میں پڑ گیا اندر جائے یا باہر انتظار کرے۔ ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ساجدہ بیگم نے سلام پھیرتے ہوئے اسے دیکھا اور اشارے سے اندر بلا لیا۔ اس نے جس احتیاط سے دروازہ کھولا تھا، اسی احتیاط سے قدم اٹھاتا اریبہ کے بیڈ کے قریب رک گیا اور بہت خاموش نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

اریبہ ساکت سی تھی۔ اب اس کے چہرے پر بینڈیج نہیں تھی۔ جابجا خراشوں پر ہلکی ٹیوب لگی تھی۔ کمبل میں چھپا جسم جانے کتنا گھائل تھا، اسے بالکل اندازہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ سوچنے سے باز نہیں رہ سکا۔

"سب گھاؤ بھر جاتے ہیں۔ نہیں بھرتے تو روح کے گھاؤ۔"

"رازی...!" ساجدہ بیگم کی پکار بہت دھیمی تھی۔ وہ نہ صرف چونکا بلکہ پلٹ کر ان کے پاس آگیا۔

"اب آرہے ہو۔ صبح سے کہاں تھے، بلکہ تمہیں تو رات ہی آجانا چاہیے تھا۔" ساجدہ بیگم نے ٹوکنے کے ساتھ جتایا بھی تھا۔

"چچا جان چلے گئے...؟" وہ ان کی بات کا جواب گول کر گیا۔

"ہاں۔ ابھی میں نے زبردستی اسے گھر بھیجا ہے۔ رات سے ایک پیر پر کھڑا تھا، ابھی بھی جانے کو تیار نہیں تھا۔ اس طرح تو بیمار پڑ جاتا۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ انہیں دیکھ کر بولا۔

"اور آپ۔ میرا مطلب ہے آپ اپنا بھی خیال کریں۔ آپ کو بھی آرام کی ضرورت ہے۔"

"میں آرام سے ہوں۔ گھر میں بھی بیٹھی رہتی ہوں۔ یہاں بھی بیٹھی ہوں۔ پھر سونے کے لیے بیڈ بھی ہے۔"

"اور کھانا...؟"

"کھانے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ خالدہ بھیج دیتی ہے۔ تم بتاؤ۔ ثنا اکیلی پریشان تو نہیں ہے؟" ساجدہ بیگم نے اپنی طرف سے اطمینان دلا کر پوچھا۔

"نہیں۔ صبح ہی اس نے سنبل کو بلا لیا تھا۔"

"یہ اچھا کیا اس نے۔ اور سنبل کی مہربانی ہے جو بلانے پر آجاتی ہے۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ خاموش ہو کر اریبہ کو دیکھنے لگا، وہ ہنوز ساکت تھی۔

"ہوش بھی آیا اسے یا نہیں؟" وہ اریبہ کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"آیا تھا۔ صبح ہوش آیا تھا۔ پھر ڈاکٹر نے نیند کا انجکشن دے کر سلا دیا۔" ساجدہ بیگم نے جو دیکھا سنا تھا وہی دہرا دیا۔

"اور زخم کیسے ہیں۔ کہیں گہرا زخم تو نہیں لگا؟" کسی گہرے زخم کے خیال سے اس کا اپنا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ توصیف نے بتایا بھی نہیں۔ تم ڈاکٹر سے معلوم کرلو۔"

"وہ تو میں جاتے ہوئے معلوم کرلوں گا۔ آپ بتائیں آپ کا کیا پروگرام ہے۔ گھر چلیں گی یا ابھی یہیں رکنا ہے۔؟" اس نے پوچھا تو ساجدہ بیگم فوراً بولی تھیں۔

"میں اسے اکیلا چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔"

"اکیلا کیوں۔ اس کے گھر سے کوئی نہیں آئے گا کیا؟"

"آئے تھے، دوپہر میں سب آئے تھے۔ لیکن توصیف نے واپس بھیج دیا اس کا مطلب ہے وہ نہیں چاہتا کہ یاسمین اس کے پاس رکے اور سارہ کی تو اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ بہت رو رہی تھی، مجھے اس کی فکر ہو رہی ہے۔" ساجدہ بیگم تشویش سے بول رہی تھیں۔

"سارہ...!" وہ پریشان ہو گیا اور خائف بھی۔

"ظاہر ہے۔ بہن ہے۔ پھر اسے اریبہ کا بڑا سہارا ہے۔ ماں تو خیال کرتی نہیں، لیکن شکر ہے اریبہ بہن بھائی کے معاملے میں ذمہ دار ہے۔ میں دعا کرتی ہوں اللہ توصیف کے بچوں پر رحم کرے۔"

"اپنے بچوں کے لیے بھی دعا کیا کریں۔ خصوصاً مجھے آپ کی دعاؤں کی زیادہ ضرورت ہے۔" وہ اچانک دل گرفتہ نظر آنے لگا تھا۔

"یہ تم نے کیا بات کی۔ میری ہر سانس تمہارے لیے دعا گو ہے۔ اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی امان میں رکھے۔ ہر برائی سے بچائے۔"

"بس امی!" وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"کیا ہوا؟" ساجدہ بیگم حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کچھ نہیں۔ میں ذرا باہر جا رہا ہوں۔"

"کہیں دور مت چلے جانا۔ توصیف آتا ہو گا، اس سے مل کر جانا۔ کئی بار تمہارا پوچھ چکا ہے۔" ساجدہ بیگم نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل آیا۔

کوریڈور کے سناٹے میں کسی کے موبائل کی بیپ گونج رہی تھی۔

"یہ زندگی کبھی کبھی اجنبی سی لگتی ہے۔"

"واقعی۔" اس کا دل چاہا وہ چیخ چیخ کر روئے پھر اتنی زور سے چیخے کہ اس کا دل پھٹ جائے۔ جو اسے اس مقام پر لے آیا تھا جہاں اسے اپنا آپ پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کہیں دور نکل جائے یا بستر مرگ پر پڑی اریبہ کی منتیں کرے کہ وہ اسے ٹوٹنے سے بچالے۔ اور فی الفور کچھ بھی ممکن نہیں تھا۔ اس نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تھے کہ توصیف احمد سامنے آگئے۔

"کہاں ہو میاں؟"

"جی... !" اسے فوری جواب نہیں سوجھا۔

"ابھی کہاں جا رہے ہو؟"

"کہیں نہیں۔ کینٹین پتا نہیں کہاں ہے۔ امی کے لیے چائے..." اس نے بات بنانے کی کوشش کی۔

"چائے آرہی ہے۔ میرا مطلب ہے ڈرائیور کھانا، چائے سب لا رہا ہے۔ آؤ اندر چلو۔" توصیف احمد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا تو وہ ناچار ان کے ساتھ چل پڑا۔

ساجدہ بیگم لابی میں بنچ پر بیٹھی تھیں۔ جس کا مطلب تھا اندر اریبہ کی بینڈیج چینج ہو رہی تھی۔

"اریبہ اٹھ گئی؟" توصیف احمد نے ساجدہ بیگم کے ساتھ بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، لیکن ابھی غنودگی میں ہے۔ ذرا دیر کو آنکھیں کھولتی ہے، پھر سو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہی تھی، کل صبح تک پوری طرح جاگ جائے گی۔"

ساجدہ بیگم نے بتایا تو توصیف احمد پر سوچ انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے دیکھنے لگے۔ یہ بالکل غیر ارادی عمل تھا، پھر بھی وہ پریشان ہو گیا۔ یوں جیسے اس سارے واقعے کا ذمہ دار وہ ہو۔

"چچا جان! آپ رکیں گے...؟" وہ ان کے دیکھنے سے گھبرا کر پوچھ رہا تھا۔ مقصد ان کا دھیان ہٹانا تھا۔

"ہاں بیٹا! جب تک میری بیٹی صحت یاب نہیں ہو جاتی۔ میں اس کے پاس رہوں گا۔" توصیف احمد سہولت سے بولے۔

"لیکن چچا جان! رات میں آپ کو یہاں تکلیف ہوگی۔"

"جو تکلیف مجھے اریبہ کو دیکھ کر ہوئی تھی۔ اس سے بڑھ کر کوئی تکلیف نہیں۔ تم میری فکر مت کرو۔" توصیف احمد کہتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ خاموش ہو رہا، پھر سوچنے کے بعد بولا تھا۔

"چچا جان! آفس کا کوئی کام وغیرہ ہو تو مجھے بتائیں۔"

"ابھی تو کوئی نہیں۔ ہاں کل ایک ارجنٹ کام تھا تو آفس کا ایک لڑکا یہاں نظر آگیا۔ اس سے کہہ دیا تھا۔ پھر کوئی معاملہ ہوا تو تمہیں فون کروں گا یا ایسا کرو، کل دن میں کسی وقت میرے آفس کا چکر لگا لینا۔"

"جی بہتر۔ آپ کے جی ایم سے بھی مل لوں گا۔" وہ توصیف احمد کا دھیان ہٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور کسی حد تک اپنا بھی۔

✵ ✵ ✵

وہ طویل نیند سے بیدار ہوئی تھی اور جانے یہ گہری نیند لینے کا نتیجہ تھا یا دواؤں کا اثر کہ وہ ذہنی طور پر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ اریبہ فوری طور پر سمجھ نہیں پائی کہ وہ کہاں ہے۔ نہ کوئی ایسی سوچ تھی۔ زیرو پاور کی مدھم نیلگوں روشنی میں اس کی نظریں دیواروں سے بھٹکتی ہوئی دوسرے بیڈ پر ٹھہر گئیں اور۔ ساجدہ بیگم کے چہرے پر نظر پڑی تو وہ نہ صرف چونکی بلکہ جھٹکے سے ان کی طرف کروٹ لینا چاہی تھی کہ اس کے وجود میں درد کی ایسی لہر اٹھی کہ یکلخت سارے درد جگا گئی تھی۔

وہ بارش میں بھیگ رہی تھی۔

پھر اسے پناہ گاہ کی تلاش تھی۔

اور پناہ گاہ میں اسے امان تو کیا ملتی، الٹا اس کی ہستی کا غرور چھن گیا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے جانے کب کب کے مناظر گھومنے لگے تھے، جو اس پر ایسے حقائق واضح کر رہے تھے، جن سے صرف وہ بے خبر تھی۔ باقی سب جانتے تھے۔ سارا خاندان اور سب سے تکلیف وہ بات یہ تھی کہ باقی سب جانتے تھے اور وہ ایسی بے خبر کہ خاندانی تقریبات میں خصوصاً" اکڑی گردن کے ساتھ سر اٹھا کر چلتی تھی۔ اس عورت کی شہہ پر جو اس کی سامنے مظلومیت کا ڈھونگ رچا کر اسے اپنے لیے ڈھال بنا چکی تھی اور یہی نہیں اسے خاندان بھر سے متنفر بھی کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی محبت سے بھی....

"رازی... !" اس کا دل دھڑک کر ڈوبا تھا اور آنکھوں میں یوں طغیانی اتری کہ سارے بند توڑ ڈالے۔ کتنے جتن کیے تھے اجلال رازی نے اسے منانے کے لیکن وہ مسلسل اسے دھتکار رہی تھی اور اسے یہ بھی غرور تھا کہ وہ اپنی ماں پر سب کچھ قربان کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس کی نظر میں "ماں" کائنات کا حسن تھی۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ بعض عورتیں بچے صرف اپنے مفاد کے لیے پیدا کرتی ہیں۔ وہ "ماں" نہیں بنتیں۔ ان میں مامتا نہیں ہوتی اور اس نے ایسی ہی عورت کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔ اس میں اس کا قصور نہیں تھا شاید اسی لیے کسی نے اس کی اکڑی گردن اور اٹھے سر کو نشانہ نہیں بنایا تھا یا پھر توصیف احمد کا احترام ملحوظ خاطر تھا۔ کچھ بھی تھا وہ، بہر حال دھڑلے سے ماں کو عظیم تر اور باپ کو بلکہ پورے خاندان کو کم تر ثابت کرنے کی سعی میں مصروف تھی اور جانے کب تک وہ اپنا یہ مشن جاری رکھتی کہ قدرت کو شاید اس پر رحم آگیا تھا کہ اس کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھل گئی۔ ورنہ جو گڑھے وہ دوسروں کے لیے کھود رہی تھی، اسی میں اوندھے منہ جا گرتی۔ اور گری تو وہ اب بھی تھی اپنی ہی نظروں میں۔ حقیقتاً" وہ اب کسی کا سامنا نہیں کر سکتی تھی۔

رازی جانتا ہے کہ میری ماں ایک بد کردار عورت ہے۔

تائی امی کو بھی پتا ہے۔

پھوپھو کو بھی۔

اور ڈیڈی بھی۔

"کیا سارہ اور حماد بھی؟" اس کی سانسیں رک گئی تھیں۔ "نہیں سارہ اور حماد کو پتا نہیں چلنا چاہیے ورنہ وہ بھی ٹوٹ جائیں گے۔ میری طرح کرچی کرچی ہو جائیں گے۔

"یا اللہ! میں کیا کروں، کہاں جاؤں، مجھے اپنے وجود سے گھن آرہی ہے۔ کس دھڑلے سے میں سب کو جھٹلاتی رہی۔ اس کے اندر احتساب کا عمل شروع ہوا تو رکنے کا نام نہیں لے رہا تھا اسی طرح اس کے آنسو رواں تھے۔ صرف آنکھوں سے ہی نہیں حلق میں جمع ہو کر اندر بھی گر رہے تھے۔ اچانک دوسرے بیڈ پر حرکت محسوس کر کے اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دور کہیں سے اذان کی آواز آرہی تھی۔

ساجدہ بیگم کلمہ پڑھتے ہوئے اٹھ رہی تھیں، پھر وہ وضو کرنے چلی گئیں تو اس نے بمشکل کروٹ بدل کر کمبل سر تک کھینچ لیا۔ اپنے تئیں وہ چھپ گئی تھی لیکن کب تک۔ ساجدہ بیگم نے نماز کے بعد اس پر دم کرنے کے لیے آہستہ سے اس کے چہرے پر سے کمبل ہٹایا اور پہلے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر دم کر کے اس کی پیشانی چوم رہی تھیں کہ وہ بے اختیار سسک پڑی۔ ابھی تک تو اس نے اپنی ہر آہ کا گلا گھونٹا ہوا تھا لیکن اب شاید برداشت کی حد ختم ہو گئی تھی۔

"ارے۔!" ساجدہ بیگم نے فوراً" اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیا تو پریشان ہو گئیں۔ "رو کیوں رہی ہو بیٹا! کیا درد ہو رہا

ہے؟"

"درد!" وہ کیا بتائے کہ درد کہاں ہے۔ بلکہ کہاں نہیں ہے۔

"روؤ مت۔ میں توصیف کو بلاتی ہوں۔" ساجدہ بیگم نے اپنے دوپٹے کے پلو سے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا تو کوشش کے باوجود وہ کچھ بول نہیں پائی۔ حلق میں گولہ سا اٹکا ہوا تھا۔ تب اس نے ساجدہ بیگم کا ہاتھ تھام لیا۔

"توصیف یہیں لابی میں ہے۔ گھر سے نہیں بلا رہی۔" ساجدہ بیگم نے سمجھ کر اسے تسلی دی پھر دروازہ کھول کر توصیف احمد کو اندر آنے کو کہا تو وہ فوراً" اٹھ کر آ گئے۔

"کچھ چاہیے بھابھی جان....؟"

"نہیں۔ یہ اریبہ کو دیکھو' رو رہی ہے۔"

"رو رہی ہے؟" توصیف احمد تیزی سے اس کے قریب آئے تھے۔ "کیا ہوا بیٹا! کہیں درد کوئی تکلیف۔ ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

اس کا دل چاہا توصیف احمد کے سینے میں چھپ کر پھوٹ پھوٹ کر روئے ایسا نہیں کر سکی تو اس کے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے تھے۔

توصیف احمد اس کے باپ تھے۔ سمجھ گئے نادم ہو کر رو رہی ہے۔ قدرے مطمئن ہو کر انہوں نے اشارے سے ساجدہ بیگم کو اطمینان دلایا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دس دن ہسپتال رہی تھی۔ ظاہری زخم بھر گئے تھے۔ روح کے زخم بھرنے والے نہیں تھے لیکن اسے فی الحال ان زخموں سے نمٹنا نہیں تھا اور اس دوران وہ خود کو یہی باور کراتی رہی تھی اور کافی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی۔ اسے سارہ اور حماد کا خیال تھا۔ ان دونوں کے لیے بہت کچھ سوچ کر ہی اس نے خود کو سنبھالا تھا۔ اور ان ہی کی وجہ سے وہ ہسپتال سے ڈسچارج ہو کر گھر آئی تھی۔ ورنہ توصیف احمد کا اصرار اور خود اس کا دل بھی یہی چاہا تھا کہ وہ ان کے ساتھ چلی جائے۔ بہرحال توصیف احمد اس کے ساتھ آئے تھے۔ بہت دیر بیٹھے رہے۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران بار بار اسے اپنا خیال رکھنے کی عاجزانہ تاکید کرتے رہے۔ سارہ سے بھی اس کا خیال رکھنے کو کہا تب وہ تشویش سے بولی تھی۔

"یہ تو خود بیمار لگ رہی ہے ڈیڈی!"

"ہاں۔ میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" توصیف احمد نے اس کی تائید کرتے ہوئے سارہ کو دیکھا پھر اسے پاس بٹھا کر نرمی سے پوچھنے لگے۔

"کیا بات ہے بیٹا! کوئی پرابلم ہے؟"

"نہیں ڈیڈی! بس اریبہ کی وجہ سے۔" سارہ اسی قدر کہہ سکی تھی۔ "میں اب ٹھیک ہوں۔" اریبہ فوراً" بولی تھی۔

"کہاں ٹھیک ہو۔ اتنی کمزور ہو گئی ہو۔ ڈیڈی اس سے کہیں۔ ابھی اسے آرام کرنا ہے۔ کالج نہیں جانا۔"

"ڈیڈی ایسا کچھ نہیں کہیں گے' انہیں پتا ہے میرا بہت امپورٹنٹ سال ہے۔" اریبہ نے پھر فوراً" مداخلت کی تھی۔

"ہاں لیکن پہلے صحت۔" توصیف احمد نے اریبہ کو دیکھ کر کہا۔

"جی.... !" اریبہ نے سر جھکا لیا۔ توصیف احمد سارہ کو دیکھ کر مسکرائے پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اوکے بیٹا! میں اب چلوں گا۔ آپ بھی آرام کرو۔"

"جی!" سارہ ان کے ساتھ جانے لگی کہ وہ ایکدم پکار کر بولی۔

"ڈیڈی! آپ نے مجھے معاف کر دیا ناں؟"

"بیٹا! آپ کیوں بار بار ایسی بات کرتی ہو۔ بھول جاؤ سب اور ہاں مجھے خوشی ہے کہ آپ نے بھابھی جان سے ایکسکیوز کر لیا' اب آپ اپنے دل پر کوئی بوجھ نہ رکھو۔ اوکے!"

توصیف احمد نے اسے ساتھ لگا کر اس کے سر پر بوسہ دیا پھر سارہ کو اس کے پاس رکنے کا کہہ کر چلے گئے۔

"چلو' اب تم آرام کرو۔" سارہ نے اس کے پیچھے تکیہ سیدھا کرتے ہوئے کہا تو وہ پوچھنے لگی۔

"تم کہاں جا رہی ہو؟"

"میں کہاں جاؤں گی۔ مجھے تو...." سارہ جانے کیا کہنے جا رہی تھی کہ یاسمین کے آنے پر اس کی بات ادھوری رہ گئی۔

"اریبہ' میری بچی!" یاسمین سیدھی اریبہ کی طرف بڑھی تھی اور بہت بے تاب انداز میں۔ یوں جیسے توصیف احمد کی وجہ سے وہ اس کے پاس آنے سے قاصر تھی۔

"کتنا تڑپی ہوں میں تمہارے لیے لیکن کسی کو مجھ پر رحم نہیں آیا۔ چند گھڑی تمہارے پاس نہیں بیٹھنے دیا' اف کتنی کمزور ہو گئی ہو۔"

یاسمین کبھی اسے لپٹانے کی کوشش کرتی' کبھی اس کا چہرہ ہاتھوں میں لیتی بس نہیں چل رہا تھا کیسے اسے اپنے شکنجے میں لے لے۔ مگر وہ اب بے خبری سے نکل آئی تھی جب ہی اسے الجھن ہونے لگی تھی۔

"میں تھک گئی ہوں۔ نیند بھی آ رہی ہے۔" وہ یاسمین کو مخاطب کیے بغیر بولی تھی۔

"ہاں ہاں بیٹا!" یاسمین بوکھلا گئی۔ "مجھے اندازہ ہے' تم کتنی بے آرام رہی ہو' سو جاؤ۔ میں یہیں تمہارے پاس ہوں۔"

اس نے بمشکل خود کو کچھ کہنے سے روکا پھر سارہ سے مخاطب ہو گئی۔

"سارہ! تائی امی کو فون کر لینا' وہ تمہاری بہت فکر کر رہی تھیں۔"

"میری کیوں؟" سارہ جانے کیوں خائف ہو گئی تھی۔ شاید یاسمین کی وجہ سے۔

"تم اس روز بہت رو رہی تھیں ناں۔ مجھے بتایا تھا تائی امی نے اور تمہیں پتا ہے' جب تک وہ تمہیں ہنستے ہوئے نہیں دیکھ لیں گی' انہیں چین نہیں آئے گا۔"

وہ بہت محبت سے تائی امی کا ذکر کر رہی تھی۔ یاسمین کھول کر رہ گئی۔ فوری طور پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اٹھ کر چلی گئی۔ اس نے نوٹس نہیں لیا جبکہ سارہ پریشان ہو گئی تھی۔

"عجیب ہو تم' مما کے سامنے یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیوں کیا ہوا؟" وہ ان جان بن گئی۔

"یا اللہ! لگتا ہے تمہارے دماغ پر بھی چوٹ لگی ہے۔ یادداشت جاتی رہی ہے۔ اور اسی بات کو مما پتا ہے کیا کہیں گی۔ تائی امی کے تعویذوں کا اثر ہے۔"

سارہ جھنجلا کر بول رہی تھی اور اس نے اس خیال سے کہ کہیں اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس کی وضاحت میں اسے یاسمین کا پردہ چاک کرنا پڑے' تکیے پر سر رکھتے ہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ سارہ سے بہت ناراض تھا کہ وہ اریبہ اور رازی کی فکر میں باقی سب کو فراموش کر دیتی ہے اور اب تو اس نے حد کر دی تھی' جب سے اریبہ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا وہ اس کا فون تک اٹینڈ نہیں کر رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا وہ مستقل اریبہ کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔ گو کہ ایسا نہیں تھا لیکن سمیر یہی سمجھ رہا تھا' حالانکہ وہ اپنی امی کے ساتھ اریبہ کو دیکھنے ہسپتال گیا تھا اور اس وقت سارہ وہاں موجود نہیں تھی' پھر بھی وہ اپنی بات پر قائم تھا کہ وہ لڑکی صرف اریبہ اور رازی کی فکر کرتی ہے۔ اس کی کوئی پروا نہیں' جو اس سے محبت کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔ بہر حال ناراضی کے باوجود اس وقت وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر چلا آیا تھا۔ وہ جانتا تھا اریبہ آج ڈسچارج ہو کر گھر آئی ہے اور اس کے خیال میں سارہ اسے دیکھتے ہی خوشی سے یہ خبر سنائے گی لیکن اس کے برعکس اسے خود ہی کہنا پڑا تھا۔

"اریبہ آگئی۔"

"ہاں اللہ کا شکر ہے۔" سارہ کا لیا دیا انداز اسے سلگا گیا تھا۔

"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ کیوں ایسے بی ہیو کر رہی ہو' بات نہیں کرنا چاہتیں مجھ سے تو صاف کہو۔ یہ دھوپ چھاؤں مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔"

"دھوپ چھاؤں!" سارہ کے چہرے پر بے بسی پھیل گئی تھی۔

"ہاں' کبھی اتنی مہربان کہ بھاگی چلی آتی ہو اور کبھی میرے آنے پر بھی..."

"بس کرو سمیر! مت ایسی باتیں کرو۔ وہ ٹوک کر کہنے لگی' تمہیں خود احساس ہونا چاہیے۔ یہاں ہم کتنے کرائسز سے گزرے ہیں' قیامت ٹوٹی تھی مجھ پر لیکن تم کہاں سمجھو گے۔"

"کیوں نہیں سمجھوں گا' تم مجھ سے شیئر تو کرو۔ تم تو الٹا اجنبی بن گئیں۔ فون بھی ریسیو نہیں کیا اور میں دو تین بار آیا بھی لیکن تم کمرے سے نہیں نکلیں۔ کیوں؟"

"میں سو رہی تھی۔" وہ روٹھے انداز میں بولی تھی۔

"ٹھیک ہے سو رہی تھیں' پھر اٹھی ہو گی تو پتا بھی تو چلا ہو گا کہ میں آیا تھا' پھر کیا مجھے فون نہیں کر سکتی تھیں۔" وہ حد درجہ خفا تھا۔

"نہیں' کیونکہ ڈیڈی بار بار فون کر رہے تھے۔ اس لیے میں فون بزی نہیں رکھ سکتی تھی۔" وہ اس کا کوئی شکوہ تسلیم ہی نہیں کر رہی تھی۔

"اچھا بابا! معاف کر دو' مجھے یہ ساری باتیں از خود سمجھ لینی چاہیے تھیں۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا' پھر منہ پھلا کر بیٹھ گیا تھا۔

"چائے پیو گے؟" سارہ نے خاصی تاخیر سے پوچھا تھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"موڈ نہیں ہے۔"

"موڈ بنالو میں چائے لاتی ہوں۔" سارہ کہہ کر جانے لگی کہ اس نے ایکدم اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور ایسا کوئی پہلی بار نہیں ہوا تھا مگر جانے کیوں وہ یکدم بپھر گئی تھی۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔ چھوڑو میرا ہاتھ اور آئندہ خبردار مجھے چھونے کی کوشش مت کرنا۔"

"سارہ...!" وہ سناٹے میں آگیا تھا۔

"جاؤ چلے جاؤ۔ مجھے بات نہیں کرنی' کسی سے بات نہیں کرنی۔ میں فالتو نہیں ہوں جو سب اپنے اپنے لاوے مجھ پر انڈیلنے چلے آتے ہیں۔" اسے خود پتا نہیں تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ہذیانی انداز میں چلا رہی تھی۔

سمیر کا دل چاہا' طمانچہ مار کر اس کا منہ بند کر دے۔ لیکن کس حق سے' وہ تو ہاتھ تھامنے سے ہی بپھر گئی تھی۔ بمشکل خود پر ضبط کرتے ہوئے وہ وہاں سے نکل آیا تھا۔ لیکن اس کا ناقابل فہم رویہ اسے الجھا رہا تھا۔ جیسے اس نے سارہ سے کہا تھا کہ میرا تم سے ناتا صرف تسلی دینے والا نہیں ہے۔ اس طرح اب وہ "مجھے کیا" سوچ کر سر نہیں جھٹک سکتا تھا۔ وہ لڑکی جو اریبہ کے غلط رویے پر نادم ہوتی اور تلافی کی کوشش کرتی تھی وہ خود ایسی کیسے ہو سکتی تھی۔ وہ سوچ سوچ کر الجھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ لنچ ٹائم میں تاجور کے پاس آیا تو آج اسے ہسپتال کی پارکنگ میں توصیف احمد کی گاڑی نظر نہیں آئی تھی۔ ورنہ پچھلے دس دنوں سے وہ انہیں یہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ آفس بھی نہیں آ رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا وہ مستقل اپنی بیٹی کے ساتھ ہیں۔

"خوش قسمت ہے وہ لڑکی جس کے باپ کو اس کی فکر ہے۔ سارے کام چھوڑ کر اس کی پٹی سے لگا بیٹھا ہے۔"

وہ یہی سوچ سکتا تھا اور آج جب توصیف احمد کی گاڑی نظر نہیں آئی تو وہ سمجھ گیا کہ ان کی بیٹی یہاں سے رخصت ہو گئی ہے۔ اور اب یقیناً توصیف احمد آفس آئیں گے۔ ظاہر ہے ان کی غیر موجودگی کے باعث کتنے کام رکے ہوئے تھے۔ اور اب شامت تو ورکرز کی آئے گی' وہ یہ سوچ کر تاجور کے پاس تھوڑی دیر رکا تھا' پھر اسے شام میں آنے کا کہہ کر واپس آفس آیا تو واقعی توصیف احمد آچکے تھے۔ اسٹاف میں ایک کھلبلی مچی ہوئی تھی' جانے کس کس کو کیا کیا آرڈر جاری ہوئے تھے کہ ہر ایک متحرک نظر آ رہا تھا' وہ تیزی سے اپنی ٹیبل کی طرف بڑھا تھا کہ ایک کولیگ اسے پکار کر بولا۔

"شمشیر! باس تمہیں یاد کر رہے ہیں۔"

"کب آئے باس؟" اس نے پوچھا ضرور لیکن جواب سننے کے لیے رکا نہیں' فوراً توصیف احمد کے کمرے کا رخ کیا تھا۔

توصیف احمد سیف کھولے کھڑے تھے۔ اس کی آمد محسوس کر کے انہوں نے سیف یونہی کھلا چھوڑ دیا پھر اپنی کرسی پر بیٹھ کر اسے دیکھا تو وہ چوکنا ہو گیا۔

"جی سر!"

"میں نے تمہیں ایک کام کہا تھا کہ سیف میں سے بلو فائل نکال کر جیلانی صاحب کو دے دینا۔" توصیف احمد نظریں اس پر جمائے ٹھہر ٹھہر کر بولے تھے۔

"جی سر! وہ تو میں نے اسی دن دے دی تھی۔ اور اگلے دن میں نے آپ کو بتایا بھی تھا' کیا جیلانی صاحب کچھ اور کہہ رہے ہیں۔" آخری بات اس نے اچنبھے میں کہی تھی۔

"جیلانی صاحب تو نہیں' سیف بہت کچھ کہہ رہا ہے۔" انہوں نے کہا تو وہ سمجھا نہیں۔

"جی...!"

"مسٹر شمشیر علی!" توصیف احمد یکلخت سخت ہو گئے تھے۔ "میری سیف میں ستر لاکھ بھی تھے جو کہ اب نہیں ہیں۔"

"جی..." ایک پل کو اسے اپنے پیروں تلے سے زمین کھسکتی محسوس ہوئی تھی۔

"ستر لاکھ؟"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فرحت اشتیاق

جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو

شہریار خان ایک نہایت معزز اور اعلا خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ ذہانت میں بھی بے مثال اور نہایت سحر انگیز شخصیت کے مالک ہیں۔ اسی وجہ سے وہ خاصے مغرور ہو گئے ہیں۔ ورلڈ بینک میں ایک اعلا عہدے پر فائز ہونے کی وجہ سے شہریار خان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ واشنگٹن (امریکا) میں مقیم ہیں۔ ان کی بیوی بھی نہایت خوب صورت اور اعلا تعلیم یافتہ ہیں۔ گھر اور بچوں کی نگہداشت کی خاطر ایم بی بی ایس ڈاکٹر ہونے کے باوجود وہ ایک گھریلو خاتون ہیں۔ ان کے دو بیٹے ہیں۔ بڑا بیٹا سکندر اپنے باپ کا عکس ہے۔ گو چھوٹا بیٹا زین بھی ذہین اور خوب صورت ہے مگر سکندر، باپ کا عکس ہونے کی وجہ سے شہریار خان کی تمام تر توجہ اور امیدوں کا مرکز ہے۔ باپ کے اس امتیازی سلوک کی وجہ سے زین بچپن سے ہی بے حد حساس اور کم گو ہو گیا ہے۔ وہ اپنے بھائی سے نفرت کرنے لگا ہے۔

لیزا، لندن میں رہتی ہے، مگر اس کا وطن روم ہے۔ اسے اپنے وطن سے بے حد محبت اور انسیت ہے، چنانچہ وہ ہر سال اپنی چھٹیاں روم میں گزارتی ہے۔ روم میں اس کی ملاقات ایک لڑکے سے ہوتی ہے جو اپنا تعارف "سکندر" کے نام سے کرواتا ہے۔ وہ اپنی ملازمت کے سلسلے میں روم آیا ہوا ہے۔ مغرور اور ہینڈسم سا سکندر، لیزا کو بے حد اچھا لگا۔ وہ اس سے دوستی کی خواہاں ہے۔

لیزا ایک مصورہ ہے۔ سکندر کی مکمل، شاہانہ شخصیت اور اس کے تیکھے، مغرور نقوش لیزا کو بہت متاثر کرتے ہیں۔ وہ

مکمل ناول
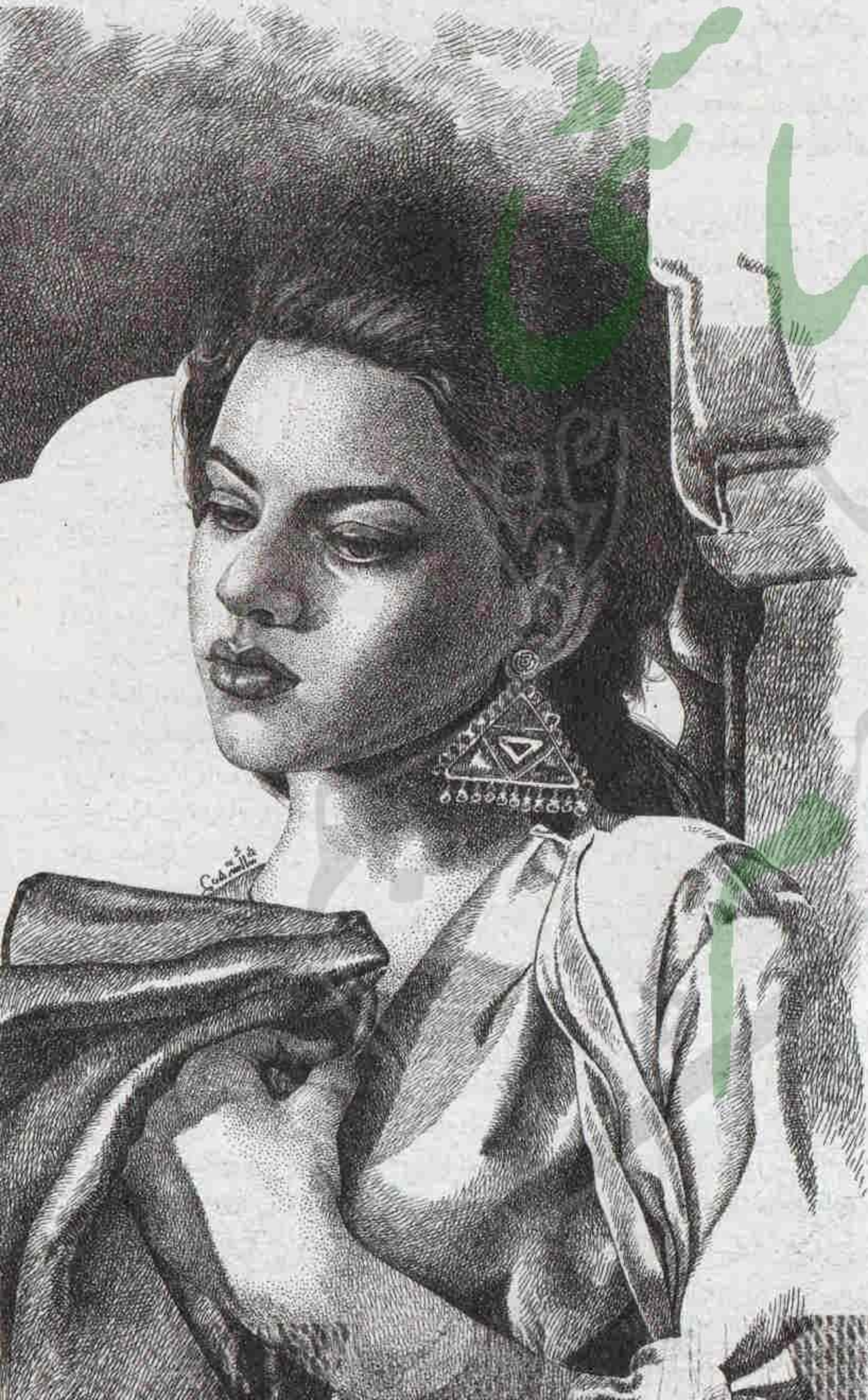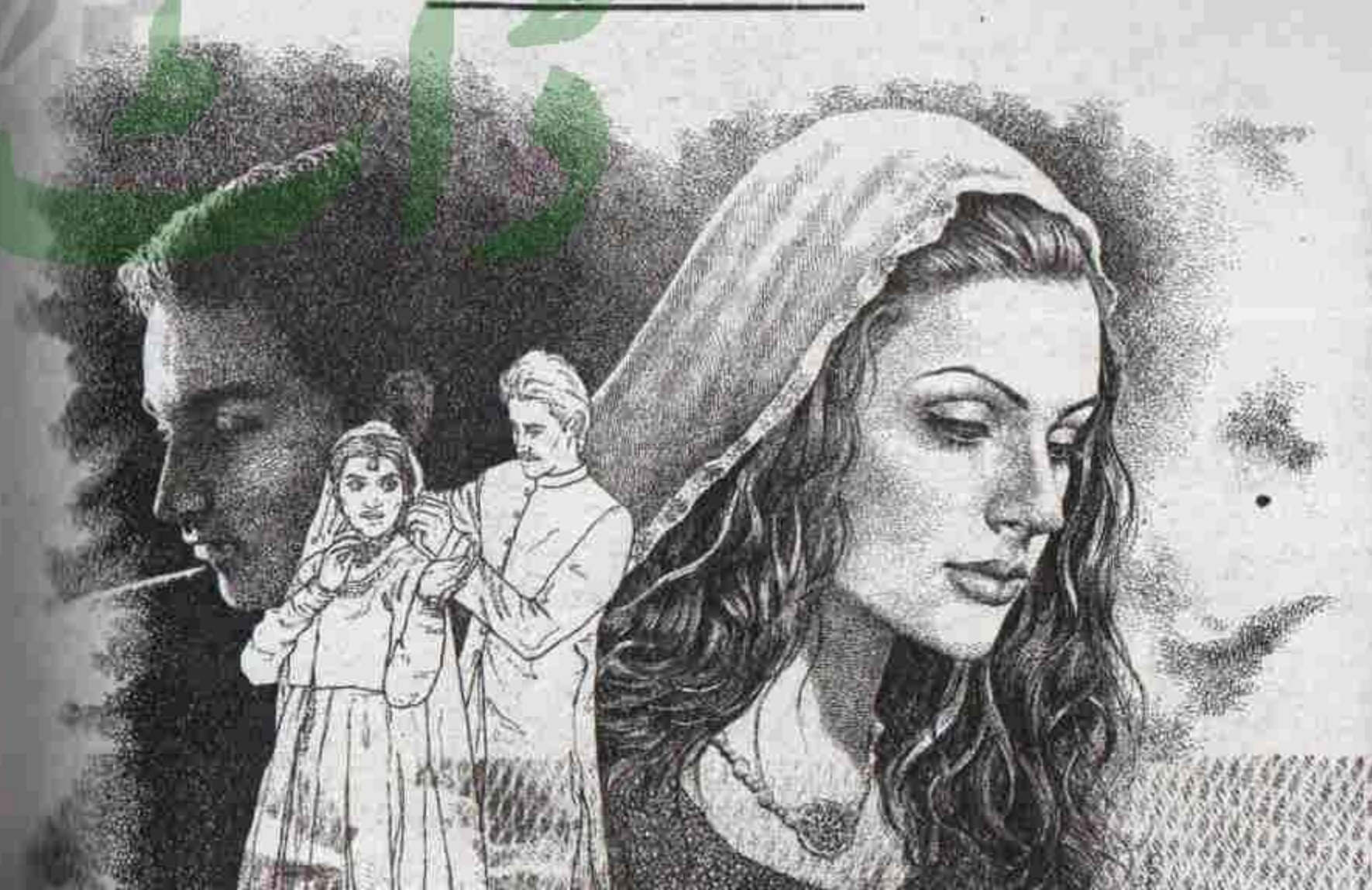
اس کو پینٹ کرنا چاہتی ہے لیکن سکندر صاف انکار کردیتا ہے۔

لیزا کے والد محمود خالد نے ایک مغربی عورت سے شادی کی تھی لیکن وہ اس کو ایک مشرقی ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے جو ظاہر ہے ممکن نہیں تھا۔ اوپر تلے دو بیٹیوں لیزا اور سیم کی پیدائش بھی اس کو نہ بدل سکی۔

وکٹوریا (لیزا کی ماں) کو لیزا اور سیم سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سیم ذہانت اور شکل وصورت میں محمود خالد جیسی تھی۔ بے تحاشا حسین اور بے حد ذہین جبکہ لیزا اپنی ماں پر گئی تھی۔ صورت اور ذہانت میں اوردرمیانہ درجہ کی تھی۔

والدین کی علیحدگی کے بعد معاہدہ کے مطابق سیم کو وکٹوریا کے ساتھ رہنا تھا اور لیزا' محمود خالد کے ساتھ لندن آگئی تھی۔ وکٹوریا جو ظاہری طور پر مسلمان ہوئی تھی۔ علیحدگی کے بعد وہ اپنے اصل مذہب پر آگئی اور ایک ارب پتی بزنس مین سے شادی کرلی۔ اس کے ساتھ میلان چلی گئی۔

لیزا اپنی بہن سیم سے بہت قریب تھی اسے اپنے روما سے بھی بہت پیار تھا' ان دونوں کی جدائی اسے بہت شاق گزری۔ محمود خالد' سیم کے اخراجات کے لیے رقم بھجواتے تھے' اس کے باوجود وکٹوریا کا شوہر اسے بوجھ سمجھتا تھا۔ ایک دن وہ نشہ کی حالت میں سیم کے کمرے میں آگیا۔ مگر اس کے شور مچانے پر اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا۔

یہ واقعہ جان کر لیزا کو اپنے والدین سے نفرت محسوس ہوئی وہ اپنے والدین سے مزید دور ہوگئی۔ محمود خالد نے دوسری شادی کرلی تھی۔ لیکن لیزا اپنی سوتیلی ماں کے بھی قریب نہ ہوسکی' وہ اپنے والد کی کوئی بات یا مشورہ قبول کرنے کو تیار نہ تھی۔ وہ اسے پاکستان لے جانا چاہتے تھے۔ لیزا نے صاف انکار کردیا۔ مایوس ہوکر وہ اپنی بیوی عائشہ کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔

محمود خالد نے سیم کی شادی اپنے ایک کاروباری واقف ہاشم اسد سے کرادی تھی جو اس سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑا تھا۔ انہوں نے اپنا کاروبار بچانے کے لیے' یہ شادی کی تھی۔

لیزا نے عیسائی ماں ہونے کے باوجود خود مطالعہ کرکے اسلام کا انتخاب کیا ہے۔ لیکن اپنے باپ اور بہنوئی کی وجہ سے وہ پاکستانی مردوں کو اچھا نہیں سمجھتی۔

سکندر کے بھائی زین شہریار کی زندگی میں ایک لڑکی ام مریم آجاتی ہے۔ ام مریم غیر معمولی ذہانت کی مالک ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی دونوں طرح کی سرگرمیوں میں شان دار ریکارڈ رکھتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ بے حد حسین بھی ہے۔ ام مریم نے زین شہریار کو اہمیت دی تو اس نے ام مریم کو پرپوز کیا۔ ام مریم نے اس کا پرپوزل بہت خوش دلی سے قبول کرلیا۔ زین شہریار نے اپنی والدہ کو فون کرکے بتادیا۔

لیزا نے اسے فون کیا تو پتا چلا کہ سکندر اسپتال میں ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہوچکا ہے۔ لیزا فوراً" ہی اسپتال پہنچی۔ سکندر کے پیر میں چوٹ آئی تھی' لیزا دو دن اس کے ساتھ اسپتال میں رہی۔ ڈسچارج ہونے پر لیزا سکندر کو اپنے گھر لے آئی۔

زین کے والد کو جب زین کی ام مریم سے وابستگی کا پتا چلا تو انہوں ام مریم کے والدین اور اس سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہریار خان' ام مریم کے والدین سے ملے تو انہیں ام مریم اپنی بہو کی حیثیت سے بہت پسند آئی زین کی منگنی ام مریم کے ساتھ ہوگئی۔ ام مریم چھٹیاں گزارنے کے لیے زین کے ساتھ شہریار خان کے گھر آئی۔

سکندر کچھ دن لیزا کے گھر رہ کر اپنے ہوٹل آگیا۔ نینی کو سکندر بہت پسند آیا تھا اور انہوں نے بھی اس کا بہت خیال رکھا تھا۔

ام مریم اور زین واشنگٹن میں آمنہ اور شہریار کے ساتھ بہت خوش ہوتے ہیں۔ شہریار خان کو اپنی ہونے والی بہو ام مریم بہت پسند آتی ہے۔ ان دنوں سکندر بھی واشنگٹن آجاتا ہے۔ ام مریم اور سکندر کی ملاقات ہوتی ہے۔ ام مریم' سکندر کو بہت عزت دیتی ہے اور خوش اخلاقی سے پیش آتی ہے مگر سکندر اس سے بدتمیزی کی حد تک بداخلاقی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ام مریم سکندر کی ہر بدتمیزی کو نظر انداز کرتی رہتی ہے۔ زین ان دونوں کے مابین اس سرد رویے کو محسوس کرتا ہے اور اسے سکندر پر غصہ آتا ہے۔

سکندر لیزا کو اپنی پورٹریٹ بنانے کی اجازت دے دیتا ہے۔ لیزا بہت خوش ہوتی ہے۔ سکندر شہریار خان سے کہتا ہے کہ مریم اچھی لڑکی نہیں ہے۔ اس کی زین سے منگنی توڑدیں۔ زین سن لیتا ہے اور مزید برگشتہ ہوجاتا ہے۔ وہ سکندر سے [illegible] کا اظہار کرتا ہے۔

شہریار خان کے جرمن ایمبیسڈر دوست کے گھر نئے سال کی دعوت میں شہریار خان اور ان کی پوری فیملی نے شرکت [illegible] ہے مگر ام مریم طبیعت خراب ہونے اور سکندر ضروری اسائنمنٹ مکمل کرنے کی وجہ سے نہیں جاپاتے۔ مجبوراً" زین کو جانا پڑتا ہے۔ وہ پارٹی میں لے جانے کے لیے گفٹس بھول جاتے ہیں۔ آدھے راستے میں پلٹ کر واپس گھر آتے [illegible] دیکھتے ہیں کہ لونگ روم میں سکندر ام مریم پر مجرمانہ حملہ کررہا ہے۔ ام مریم روتے ہوئے خود کو چھڑانے کی کوشش کر [illegible] ہے۔

۵
پانچویں قسط

اس کا ایزل اور پلیٹس وغیرہ سب کچھ پورٹیبل تھا [illegible]گ' برشز' کینوس' پینٹنگ میں استعمال کی جانے [illegible] تمام چیزیں بڑی آسانی سے فولڈ ہوکر اس کے ایزل [illegible] مختلف خانوں میں سمائی ہوئی تھیں۔ ایک ہی جگہ [illegible] ان تمام چیزوں کو با آسانی لے کر چلا جاسکتا تھا۔ یہ [illegible] سامان وہ اپنے ساتھ آؤٹ ڈور پینٹنگ کے لیے [illegible] کرتی تھی۔ پینٹنگ بنالینے کے بعد اس کی رنگوں [illegible] گیلی پینٹنگ کو بحفاظت رکھنے کے لیے بڑا محفوظ [illegible] خانہ بھی ایزل میں موجود تھا۔

"اس وقت سے لے کر شام تک جتنا کام ہوسکے گا' [illegible] اس کی' میری کوشش یہ ہے کہ پینٹنگ کے [illegible] آؤٹ ڈور میں واضح کرلوں' باقی پھر فنشنگ کا [illegible] اسٹوڈیو میں بھی ہوسکتا ہے۔"

[illegible] داخل ہوتے ہوئے وہ اس سے بولی تھی۔

"صبح سے شام تک لگ کر بھی پینٹنگ مکمل نہیں [illegible]؟"

"[illegible] پکنک باسکٹ اور ایک دوسرا بیگ' جس میں لیزا [illegible] نے کیا بھر کرلائی تھی' لے کر چل رہا تھا جبکہ لیزا [illegible] ہاتھ میں اپنا پورٹیبل ایزل تھا اور کندھے پر بیگ [illegible]

"پینٹنگ کو کیا بچوں کا کھیل سمجھ رکھا ہے سینیور [illegible]" لیزا نے اسے گھورا۔

"اوکے' اوکے سوری' یہ ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ کام ہے اور وہ بھی آؤٹ ڈور پینٹنگ بنانا۔"

"اور وہ بھی اتنے مشکل بندے کی۔ تمہاری آنکھوں کے تمام تاثر میں کینوس پر اتار پائی تو سمجھوں گی' میں ایک کامیاب آرٹسٹ ہوں۔"

اس کی بات کاٹ کر لیزا نے فوراً" ٹکڑا جوڑا تھا۔ وہ دھیمے سے مسکرادیا۔

"تمہیں پتا ہے' سینیور سکندر! تم بہت ہینڈسم ہو۔ معلوم نہیں کیوں' مگر ہر بار تمہیں دیکھ کر اپالو کا خیال آتا ہے۔"

وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھی مگر وہ بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

"یہ جوابی تعریف اس لیے ہورہی ہے کہ ابھی راستے میں آتے ہوئے میں نے تمہارے لیے لفظ bella (خوبصورت) بولا تھا؟"

"نہیں' میں سچے دل سے تمہاری تعریف کررہی ہوں اور زیادہ بنو مت۔ تمہیں یہ بات خود بھی بہت اچھی طرح پتا ہے۔ صبح سے شام تک کتنی عورتیں اور لڑکیاں تمہاری تعریف کرتی ہوں گی' تم پر فدا ہوتی ہوں گی۔ کیا تمہیں پتا نہیں چلتا؟"

"نہیں' مجھے یہ بات ابھی ابھی لیزا محمود نے کہی' تب زندگی میں پہلی بار اس بات کا یقین آیا ہے۔"

بہت دھیمے لہجے میں کہی سکندر کی اس بات میں سچائی تھی' جذب تھا۔

اس نے سکندر کی آنکھوں میں دیکھا۔ اسے اس کی آنکھیں سچ بولتی ہوئی لگیں، جیسے وہ اندر باہر ظاہر اور چھپی ہر بات ان آنکھوں کی پڑھ سکتی ہے۔ ایسا لگا۔ لمحہ بھر کے لیے ان آنکھوں میں آیا وہ تاثر لمحے بھر میں ہی کہیں پھر سے چھپا لیا گیا تھا۔ وہ اپنے لہجے کی سچائی اور سنجیدگی کو فوراً ہی غیر سنجیدگی اور مزاح کے رنگ میں ڈھال رہا تھا۔

"میں ہینڈسم اور خوب صورت ہوں۔ تب ہی تو مشہور مصورہ لیزا محمود کے ماڈل کے طور پر منتخب کیا گیا ہوں۔ ایسوں ویسوں کو تو وہ پینٹ کرتی بھی نہیں ہوں گی۔"

وہ جواباً ہولے سے مسکرا کر چپ رہی۔

"تمہیں کیسے لگ رہے ہیں Villa d este کے یہ باغات فوارے اور آبشار؟"

اندر آنے کے بعد وہ دونوں پتھروں سے بنے ایک خوب صورت راستے پر چل رہے تھے، جس کے ایک طرف سبزہ ہی سبزہ اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے سو فوارے تھے۔ ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اوپر نیچے تین قطاروں میں بنے فواروں کے درمیان میں بھی سبزہ تھا اور اس سبزے کے ساتھ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر للهز اور عقاب کی اشکال آرکیٹکٹس نے پتھروں سے تراش کر بنائی تھیں۔

ان جانوروں اور پھولوں کے منہ سے پانی بڑے خوب صورت انداز میں گر رہا تھا۔ اوپر والی قطار سے پانی نیچے والی قطار میں لگے فواروں پر گر رہا تھا، پھر اس سے نیچے والی قطار میں اور پھر وہاں سے یہ سارا پانی ایک خوب صورت سے نالے میں جا کر گر رہا تھا۔ بہت سے سیاح وہاں کھڑے ہو کر اور مختلف انداز میں بیٹھ کر تصویریں کھنچوا رہے تھے۔

ان کے بیچ خاموشی جب زیادہ طویل ہونے لگی تو اس نے سکندر کو مخاطب کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ چلتا ان کے دائیں طرف موجود ان سو فواروں اور وہاں موجود سیاحوں کو توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سوال پر اس نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

"تمہارے روما کی طرح تمہارا Tivoli بھی بہت خوب صورت ہے لیزا! اس قدر سبزہ اور اس قدر ہریالی جس طرف نگاہ اٹھاؤ سبزہ، ارد گرد دور دور تک دیکھو سرسبز پہاڑ نظر آ رہے ہیں اور اپنے اطراف نگاہیں دوڑاؤ تو رومن آرکیٹکچر کا شاہکار یہ باغات، فوارے اور آبشار، ایسا لگ رہا ہے ہم پندرہویں سولہویں صدی کے رومن دور میں چلے گئے ہیں۔"

"مجھے بھی یہاں آ کر ہمیشہ یہی لگتا ہے کہ میں رومن دور میں چلی گئی ہوں۔"

وہ دونوں مضبوط پتھروں سے بنے اونچے نیچے راستے پر جو کہیں کہیں ڈھلان میں اترتا لگ رہا تھا، چل رہے تھے۔ وہاں ارد گرد نظریں دوڑانے پر باغات، ان میں بنے فوارے، آبشار، خوب صورت داخلی راستوں والے غار، کہیں ڈھلان کی طرف جاتے نظر آ رہے تھے اور کہیں چڑھائی کی طرف۔ گویا کبھی آپ کو لگے گا کہ آپ ڈھلان کی طرف جا رہے ہیں اور کبھی اوپر چڑھائی کی طرف۔

وہ ایک آرٹسٹ کی نگاہوں سے اطراف میں دیکھتی اس مناسب ترین جگہ کی تلاش میں تھی جسے اس کی پینٹنگ کا بیک گراؤنڈ بننا تھا۔

"ہم راستے میں اتنے سارے خوب صورت فوارے چھوڑ آئے ہیں۔ تم نے ان میں سے کسی کو بھی سلیکٹ نہیں کیا۔ کیا کسی خاص جگہ کی تلاش ہے تمہیں؟"

"فوارے تو مجھے بھی بہت سارے اچھے لگے ہیں، وہاں سیاحوں کا ہجوم تھا۔ جہاں زیادہ لوگ آ جا رہے ہوتے ہیں، وہاں سکون سے پینٹنگ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لوگ بلاوجہ جھانک کر دیکھتے ہیں کہ آپ کیا کر رہے ہیں، کیا بنا رہے ہیں اور پھر اس پر اپنے کمنٹس دینے کا بہت شوق ہوتا ہے۔ ایک لینڈ اسکیپ آرٹسٹ کے طور پر یہ چیز میں بہت مرتبہ فیس کر چکی ہوں۔ ایسی دخل اندازی میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ میرے پاس ضائع کرنے کے لیے بالکل بھی وقت نہیں ہے۔ سینیور سکندر بڑی مشکلوں سے ہاتھ لگے ہیں۔ دوبارہ تو یہ موقع نہیں ملے گا مجھے۔ ہے ناں؟"

اس نے مسکرا کر کہتے ہوئے سوالیہ نگاہیں اٹھا کر سکندر کو دیکھا۔

"اگر آج تمہارا کام پورا نہ ہو سکا تو ہم دوبارہ بھی آ جائیں گے۔ سینوریتا! جو وعدہ کیا ہے، اسے نبھانا تو ہے۔"

وہ لیزا کی سوالیہ نگاہوں کے جواب میں مسکرا کر بولا تھا۔ وہ دونوں چلتے چلتے بہت دور آ چکے تھے۔ کئی ڈھلانی راستوں سے گزرتے، کئی چڑھائیوں پر سے چڑھتے، وہ دونوں اب باغات میں ایسی جگہ پر تھے، جہاں فی الحال ان دونوں کے سوا دور دور تک کوئی بھی نہیں تھا۔ وہاں خاموشی اور سکون تھا اور اس خاموشی اور سکون کو سامنے نظر آتے بلند و خوب صورت فوارے سے گرتے پانی کی آواز توڑ رہی تھی۔ ان کے بالکل سامنے ایک بیضوی شکل کا فوارہ تھا۔ اس کے پیچھے پہاڑ اور سبزہ نظر آ رہا تھا۔ بیضوی شکل کے اس فوارے کا پانی بہت اوپر تک جا رہا تھا، اتنا اوپر جانے کے بعد جب پانی نیچے گر رہا تھا تو ایک آبشار کی سی شکل اختیار کر رہا تھا۔ یہ اس کی پینٹنگ بنانے کے لیے آئیڈیل جگہ تھی۔ جس کی اسے تلاش تھی۔

"یہ جگہ پرفیکٹ ہے۔ ہم یہاں پینٹنگ بنائیں گے۔" وہ رک گئی تھی۔ اسے رکتا دیکھ کر سکندر بھی رک گیا تھا۔ وہ واقعی اپنے کہے لفظوں کے مطابق خود کو اس کی منشا پر چھوڑے ہوئے تھا۔

"تم یہاں بیٹھ جاؤ سکندر! مجھے یہاں پانی کی وہ اسراریت اور طاقت نظر آ رہی ہے جو مجھے اپنی پینٹنگ میں پیش کرنی ہے۔" اس نے پول کے آگے کی چوڑی سی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

"جو آپ کا حکم مصورہ!" وہ مسکرا کر کہتے ہوئے فوراً ہی سامنے دیوار پر جا کر بیٹھ گیا۔ پول کی دیوار اتنی چوڑی تھی کہ وہ آرام سے اس پر بیٹھ سکے۔ پکنک باسکٹ اور اس کا بیگ سکندر نے ایک طرف رکھ دیا تھا۔ بڑی مہارت اور تیز رفتاری سے اس نے اپنا پورٹیبل ایزل کھولا، اس پر کینوس کو سیٹ کیا، رنگوں اور برشز کا خانہ کھول کر فولڈ ہوئی پلیٹ باہر نکالی۔ چند منٹوں میں اس کام سے فارغ ہونے کے بعد رنگوں کے مکس کرنے سے پہلے اس نے بیگ میں سے اپنا کیمرا باہر نکالا۔ پروفیشنل فوٹو گرافرز والا جدید ماڈل کا کیمرا، جو کوئی بھی لینڈ اسکیپ بناتے وقت ہمیشہ اس کے ساتھ رہا کرتا تھا۔

"اس پینٹنگ پر جب اسٹوڈیو میں کام کروں گی تب مجھے اس نیچرل تاثر کو لانے کے لیے ان تصویروں کی ضرورت پڑے گی۔ مجھے صبح کی اس روشنی میں تمہاری پینٹنگ بنانی ہے، میری پینٹنگ میں لائٹ میرے سبجیکٹ اور بیک گراؤنڈ میں کہاں کس جگہ اور کس طرف سے پڑنی چاہیے، اس کے لیے مجھے صبح کے وقت کھینچی ان تصویروں سے مدد لینی پڑے گی۔ ابھی پھر جیسے جیسے دوپہر اور شام ہو گی تو پھر روشنی تم پر اور بیک گراؤنڈ پر کسی اور انداز میں پڑنے لگے گی جبکہ مجھے اپنی پینٹنگ میں سن لائٹ ایسی ہی دکھانی ہے جیسی ابھی ہے۔"

"مجھے تو یہ باتیں سمجھ میں آتی نہیں ہیں مصورہ! جو تم مناسب سمجھو۔" وہ جواباً مسکرا کر بولا۔ وہ پہلے بیک گراؤنڈ کی تصویریں کھینچ رہی تھی۔ اس نے کئی تصاویر ہر ہر زاویے سے فواروں اور آس پاس کی جگہوں کی کھینچ لی تھیں۔

"اب مجھے تمہاری تصویریں کھینچنی ہیں۔ بس ایسے سیدھے بیٹھ جاؤ۔ میری طرف مت دیکھو، تھوڑا سا دائیں طرف جیسے کسی سوچ میں کھوئے ہو، اپنے ارد گرد سے بے نیاز سے ہو۔"

تصویر کھینچنے کے لیے کیمرا ہاتھ میں لیے وہ سکندر کو ہدایات دے رہی تھی، ہاتھوں کے استعمال کے ساتھ۔ سکندر نے اس کی ہدایت پر عمل کیا تھا مگر وہ مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

"اتنا زیادہ دائیں طرف گردن مت کرو۔ بس تھوڑا سا' بہت ہلکا سا۔" اس نے سکندر کی ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرے کو ہلکا سا دائیں جانب کیا' چہرے کو تھوڑا سا نیچے کیا' اس کے ایک ہاتھ کو دیوار پر رکھا اور دوسرے ہاتھ کو پکڑ کر سوچنے لگی کہ اسے کس طرح رکھا ہونا چاہیے کہ خوب صورت لگے' تب یک دم ہی اسے احساس ہوا سکندر اسے بے حد خاموشی سے بغور دیکھ رہا ہے۔

"کیا ہوا؟" اس نے حیرانی سے پوچھا۔ وہ جیسے اسے دیکھتا ہوا کسی گہری سوچ میں کھویا تھا' اس کے سوال پر چونک کر سیدھا ہوا۔ جیسے یک دم کسی خیال سے جاگا ہو۔

"کچھ نہیں۔" ایک گہری سانس لے کر وہ سنجیدگی سے بولا۔

"پھر بھی بتاؤ ناں!" وہ بضد ہوئی۔

"حیران ہو رہا ہوں اپنے آپ پر' جولائی کی اس صبح میں یہاں Tivoli میں ایک رومن آرٹسٹ سے اپنی تصویر بنوا رہا ہوں' وہ بھی اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے' جیسے زندگی میں اس سے اہم اور اس سے سنجیدہ کام کوئی ہو ہی نہیں سکتا؟" اس کے لہجے میں واقعی حیرانی تھی جیسے اسے خود پر یقین نہ آرہا ہو' سکندر کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

"سچ پوچھو تو حیران میں بھی ہوں۔ تمہارے وعدہ کر لینے کے باوجود مجھے لگ رہا تھا تم لاسٹ مومینٹس پر بے نیازی اور خود پسندی کا تاثر لیا کوئی بھی بہانہ بنا کر مجھے انکار کر دو گے۔"

وہ سنجیدگی سے اپنے دل کی بات زبان پر لائی اور سکندر جواب میں قہقہہ لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"باتوں باتوں میں تم میری برائی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔"

ایک پل وہ اتنا قریب لگتا تھا جیسے بس اب اس پر کھل جائے گا اور اگلے پل پھر اتنا ہی دور' اتنا ہی ناقابل رسائی۔

"تصویریں کھینچو مصورہ! پھر تم نے ابھی پینٹنگ بھی بنانی ہے۔ باتیں کرنے میں تمہاری یہ صبح کی روشنی جو تمہیں چاہیے' رخصت ہو جائے گی۔"

اسے پتا تھا سکندر نے پھر سے خود پر لاپروائی اور بے نیازی کا خول چڑھا لیا ہے' جیسے وہ اس پر اور ساری دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہتا ہے کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے کسی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس نے بنا کچھ کہے سر اثبات میں ہلایا اور قریب سے اور دور سے ہر ہر زاویے سے سکندر کی تصویریں کھینچنے لگی۔ کئی تصاویر کھینچنے کے بعد وہ ایزل کے سامنے آگئی تھی۔

"جب تم بیٹھے بیٹھے تھکنے لگو تو مجھے بتا دینا۔ ویسے میرا ارادہ یہ ہے کہ ہم ہر ایک گھنٹہ بعد پندرہ منٹ بریک لیں گے تاکہ تم کمر سیدھی کر سکو۔" کام کرنے کے دوران اس نے خاموش بیٹھے سکندر سے کہا۔

"میں نہیں تھک رہا' تم آرام سے اپنا کام کرو۔" اس نے اسے اطمینان دلایا۔

بجائے ایک گھنٹے کے' انہوں نے پہلا وقفہ ڈھائی گھنٹوں بعد لیا تھا۔ وہ بھی اس نے کہا تھا کہ اب بریک لیتے ہیں تب۔ سکندر تو کسی تھکاوٹ کا اظہار کر ہی نہیں رہا تھا۔

"بس اب بریک لے لیتے ہیں۔ ڈھائی گھنٹے اسی طرح بیٹھے بیٹھے تمہاری کمر اکڑ گئی ہو گی۔" وہ پیلٹ اور برش کھلے خانے میں رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نہیں تھکا لیزا! تمہیں کام کرنا ہے تو اور لو۔"

"تم واقعی تھکتے نہیں ہو کیا؟" وہ حیرانی سے بولی۔ دیوار پر سکندر کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔

وہ جواباً یوں مسکرایا تھا' جیسے اتنی معمولی چیزوں سے وہ تھک نہیں سکتا۔ وہ متاثر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

"پتا ہے سکندر! تم مجھے بہت اسٹرانگ لگتے ہو۔ لگتے کیا ہو' تم ہو بہت بہادر' جتنا سیریس تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا تھا ناں' تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو

گھبرا گیا ہوتا جبکہ تم ہنس رہے تھے۔ تم سے زیادہ پریشان تو میں تھی۔ ایک بھرپور مرد کا جو تصور ہوتا ہے ناں۔ نڈر' بہادر' دلیر' وہ سب تم ہو۔ میں نے پانی کو اپنے بیک گراؤنڈ کے طور پر لیا ہی اس لیے ہے کہ پانی میں تمہاری جیسی پراسراریت تو ہے ہی' ساتھ ہی پانی طاقت کا سمبل بھی ہے ناں۔"

اس کی سنجیدگی اور سچائی سے کی بات کے جواب میں سکندر ہنسا تھا۔

"بہادر اور دلیر سے ملتے جلتے دو لفظ سخت جان اور ڈھیٹ بھی ہوتے ہیں۔" ہنس کر بولتا وہ دیوار پر سے اٹھا تھا۔ وہ حیرت سے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ سکندر کی اس کی طرف پشت تھی۔ وہ دونوں ہاتھ دائیں بائیں پھیلا کر اپنے جسم کا تناؤ کم کر رہا تھا۔ کیا وہ خود سے ناراض تھا؟ کیا وہ خود کو سزا دیا کرتا تھا؟ وہ خود سے ناراض تھا یا دنیا سے؟ کیا زندگی نے اسے اتنے دکھ دیے تھے کہ وہ زندگی ہی سے نفرت میں مبتلا ہو گیا تھا؟

سکندر نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"بریک لیا ہی ہے تو مجھے کچھ کھلا پلا ہی دو۔ یہ باسکٹ تمہاری نینی نے یقیناً" سجانے کے لیے تو ہرگز نہیں دی ہو گی۔" وہ ہنس کر بولا۔

وہ خاموشی سے سر ہلا کر دیوار پر سے اٹھی تھی۔ اس نے بیگ میں سے فولڈ ہوا غالیچہ نما باہر نکالا۔ وہ فولڈ کرنے کے بعد ایک ہینڈ بیگ جیسا بن جاتا تھا' سامنے کی طرف بٹن تھا۔ اس نے بٹن کھول کر تہیں کھولیں اور سامنے گھاس پر درختوں کی چھاؤں میں بچھانے کے لیے آگئی۔ اس کے پیچھے پیچھے سکندر بھی باسکٹ اٹھا کر وہاں آگیا تھا۔ وہاں ابھی بھی صرف وہ دونوں ہی تھے' اردگرد کوئی اور سیاح نظر نہیں آرہا تھا۔ سکندر نے غالیچہ نما نمدہ کا دوسرا کونا پکڑ کر اس کے ساتھ اسے بچھوایا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا تھا۔ وہ بھی وہاں بیٹھ کر باسکٹ کھولنے لگی تھی۔ کچھ چیزیں نینی نے رات میں بنا لی تھیں' کچھ انہوں نے صبح اٹھ کر تیار کی تھیں باوجود اس کے منع کرنے کے کہ وہ لوگ کسی بھی ریسٹورنٹ میں کھا پی لیں گے۔ مختلف باکس کھولتے ہوئے وہ نینی کی خود سے محبت پر مسکرا رہی تھی۔ ایک باکس میں مشروم پاستا تھا' ایک میں بھاپ میں پکی چکن لیگز' ایک میں چیز سینڈوچز ایک میں نینی کا خود بیک کیا فروٹ کیک اور براؤنیز' ساتھ میں جوس کے کین اور تھرموس میں چائے۔ اس نے پیپر پلیٹ سکندر کے ہاتھ میں پکڑائی تھی۔

"مزا آگیا' یہ تو واقعی پکنک ہو گئی۔" سکندر اپنی پلیٹ میں پاستا ڈالتے ہوئے بولا تھا۔

"یہاں کی زیادہ تر جگہیں heritage sites World (عالمی ورثہ) قرار دی جا چکی ہیں۔ اس لیے آج یہاں پینٹنگ بنانے اور اس طرح بیٹھ کر کھانے پینے کے لیے میں خاص طور پر اجازت نامہ لے کر آئی ہوں کہ کہیں کسی کو کوئی اعتراض نہ ہو جائے۔ یہاں آرٹسٹوں کی بہت قدر کی جاتی ہے' اس لیے مجھے صرف ایک دن نہیں بلکہ پورے ایک ہفتے کے لیے اجازت مل گئی ہے کہ یہاں جہاں دل چاہے' پینٹنگ بناؤں۔" اس نے اپنی پلیٹ میں چکن لیگ ڈالتے ہوئے سکندر کو بتایا۔

"یہ جگہ اچھی کتنی لگ رہی ہے لیزا۔ کتنا سکون ہے یہاں۔"

"پتا ہے ہم چلتے چلتے کتنی دور آگئے ہیں؟ سمجھو ہم Villa d este سے باہر آچکے ہیں۔ تب ہی یہاں ہمیں ٹورسٹ نظر نہیں آرہے۔"

سکندر کی بات کے جواب میں وہ بولی۔ ساتھ ہی اس کی بھی پلیٹ میں چکن لیگ رکھا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں سب سمیٹ کر واپس اپنی پینٹنگ بنانے کی جگہ پر تھے۔ "اب تم بغیر رکے تین' چار گھنٹے کام کرو۔ میں کوئی تھک وک نہیں رہا۔ اتنی جلدی جلدی بریک لیتے رہے تو تمہارا کام پورا نہیں ہو سکے گا۔"

وہ پلیٹ اور برش ہاتھ میں اٹھا رہی تھی تب سکندر اس سے بولا تھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

ان ہی کی طرح کا خاموشی اور سکون کا متلاشی ایک جوڑا وہاں سے گزرا۔ چلتے چلتے وہ دونوں اس کے پاس آکر رک گئے تھے۔ وہ اس کی پینٹنگ کو شوق اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ شوہر اٹالین میں اس سے اس کی پینٹنگ کی تعریف کر رہا تھا اور بیوی اسے اور اپنے میاں کو نظر انداز کیے بغور سامنے بیٹھے سکندر کو دیکھ رہی تھی۔ چند منٹوں کے بعد وہ دونوں میاں بیوی وہاں سے آگے بڑھ گئے تب سکندر نے اس سے پوچھا۔

"کیا فرما رہے تھے یہ صاحب؟"

"میرے آرٹ کو سراہ رہے تھے۔ ویسے ان کی مسز میری پینٹنگ کو نہیں، بلکہ میرے ماڈل کو سراہ رہی تھیں۔"

وہ کہتے ہوئے کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ سکندر جواباً" مدھم سا مسکرایا۔

"ایک اتنی حسین عورت اپنے میاں کی بغل میں کھڑی تمہیں سراہ رہی تھی، تم پر نظریں جمائے کھڑی تھی۔ کم از کم تھوڑا تو خوش ہو لو۔"

"میرے خوش ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ مجھے پینٹ کرنے کے لیے بطور اپنا ماڈل مشہور و معروف مصورہ لیزا محمود نے منتخب کیا ہے۔ جو صرف اٹلی ہی نہیں بلکہ دنیا بھر میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ کسی اور کی تعریف سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا۔"

وہ اس سے بات کرنے کے دوران بھی اپنی بیٹھنے کی پوزیشن اور اپنے چہرے کا رخ ویسے ہی رکھے ہوئے تھا جیسا پینٹنگ بنانے کے لیے اس نے سکندر کا کروایا تھا۔ اس بار بغیر کسی وقفے کے اس نے شام کے چار بجے تک کام کیا تھا۔ اب اس کی تصویر کے خدوخال واضح تھے۔ اس نے سکندر سے بریک لینے کے لیے کہا تو وہ اٹھ کر اس کے پاس آگیا۔

"مائی گاڈ لیزا! تم نے تو واقعی مجھے بہت خوب صورت پینٹ کیا ہے۔ سچ مچ یہ میں ہوں؟" وہ مزاح لیے انداز میں بول رہا تھا۔

"خوامخواہ مذاق مت اڑاؤ۔ تمہیں پتا ہے، تمہیں پینٹ کرنے کا کام میں بہت دل سے کر رہی ہوں اور اپنی اس تصویر سے میں بہت مطمئن ہوں ابھی تک۔ ان شاء اللہ ایگزیبیشن میں یہ میری سب سے بہترین تصویر ہو گی۔" وہ تصویر پر نظریں جمائے بول رہی تھی۔ اس نے برش سے دو ایک جگہ پھر اسٹروکس لگائے تھے۔ سکندر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اور جو اس کی بہت اچھی قیمت دے گا۔ تم یہ اسے بیچ دو گی؟"

"میرا ایسا تو کوئی ارادہ نہیں ہے۔ سکندر! میں اس پر بہت دل سے کام کر رہی ہوں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا ہے اسے بیچنے کے لیے۔" اس نے سکندر کی طرف دیکھا۔

"پھر تم یہ مجھے بطور تحفہ دے دینا۔" وہ ہنس کر بولا۔

"تمہیں تحفے میں دے دوں گی تو اپنے سولو شو میں کیا اسے نہیں رکھوں گی؟ اسے تو مجھے لازمی وہاں رکھنا ہے۔ تم آؤ گے میرے شو میں؟"

وہ دو ٹوک سے انداز میں تصویر دینے سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگی۔

"میں..... تمہارا سولو شو تو اگلے ماہ ہے ناں؟ تب تک تو میں دوبارہ واپس جا چکا ہوں گا۔ اگر اٹلی میں ہوتا تو ضرور آجاتا۔"

وہ معذرت خواہانہ سے انداز میں بولا۔ ہاں! تب تک تو وہ جا چکا ہو گا۔ اسے کیوں یاد نہیں رہی تھی یہ بات کہ چند دنوں کے لیے ملا یہ شخص چند دنوں یا چند ہفتوں میں واپس چلا جائے گا۔ پتا نہیں، اس کا دل یک دم ہی اداسیوں کی لپیٹ میں کیوں آگیا تھا۔ وہ جواباً" کچھ بول پائی تھی نہ اخلاقاً" مسکرا سکی تھی۔

"کیا ہوا؟" سکندر اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، اس کی سوچوں سے یکسر لاعلم اور لاتعلق۔

"کچھ نہیں۔ میں سوچ رہی تھی۔ بریک لی ہے تو جوس وغیرہ پی لیتے ہیں مگر یہ میرے ہاتھ تو دیکھو۔"

وہ تصاویر بناتے وقت جتنا کام برشز اور اپنی نائف سے لیتی تھی اتنا ہی بے دریغ استعمال اپنے ہاتھوں کا

بھی کیا کرتی تھی۔ اس کی دائیں ہاتھ کی انگلیاں مختلف رنگوں سے بھری تھیں۔ وہ لوگ اتنی دور آچکے تھے یہاں کوئی واش رومز وغیرہ نہیں تھے۔ سکندر نے باسکٹ سے پانی کی بوتل نکالی تھی۔

"لاؤ، میں تمہارے ہاتھ دھلوا دوں۔"

اردگرد کی جگہ خراب نہ ہو، اس لیے وہ ایک بڑے سے ویسٹ بن کے پاس آکر اس پر ہاتھ کر کے کھڑی ہوئی تھی، سکندر نے بوتل سے پانی ڈال کر اس کے ہاتھ دھلوا دیے تھے۔ جوس لیتے ہوئے انہوں نے کچھ دیر وہاں چہل قدمی کی، پندرہ منٹ بعد وہ دونوں واپس اپنی اپنی سابقہ پوزیشن پر آگئے تھے۔

☼ ☼ ☼

سورج دیر سے غروب ہونے کے سبب انہیں شام کا بھی کافی ٹائم روشنی میں مل گیا تھا۔ وہ اپنی تصویر کا پچاس فیصد کام یہیں پر کر چکی تھی۔ سامان سمیٹ کر ان دونوں نے واپسی کا راستہ اختیار کیا تو وہ دونوں وہاں سے نکلنے والے چند آخری ٹورسٹس میں سے تھے۔ زیادہ تر سیاح شام ہوتے ہی وہاں سے لوٹ چکے تھے۔ وہ دونوں باہر نکل آئے۔ سیاحوں کی اکثریت چونکہ لوٹ چکی تھی اس لیے اس وقت وہاں مکمل سناٹا تھا۔ وہ اپنی گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔

وہ گاڑی کی پچھلی نشست پر سامان واپس رکھ رہی تھی، اس کے پیچھے سکندر کھڑا تھا جس نے سارا سامان پکڑ رکھا تھا۔ وہ ایک ایک کر کے اسے چیزیں پکڑا رہا تھا اور وہ چیزیں اندر رکھ رہی تھی۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر جھکی ہوئی تھی۔ تب ہی سکندر کے پاس ایک جپسی (خانہ بدوش) لڑکا تیئس، چوبیس سال کا سکندر سے ٹکرایا تھا اور اب رک کر اس سے اٹالین میں معذرت کر رہا تھا۔ وہ چونکہ گاڑی کی طرف جھکی ہوئی تھی اس لیے فوراً" اس لڑکے کو دیکھ نہیں سکی تھی ورنہ سکندر کو خبردار کرتی کہ اس لڑکے سے ہوشیار رہے۔ پورے

یورپ میں اٹلی سے زیادہ ماہر جیب کترے کہیں نہیں ہوتے اور عموماً" یہ گروپ کی شکل میں ہوتے ہیں۔ واردات میں ایک یا دو افراد حصہ لیتے ہیں جبکہ بقیہ ساتھی آس پاس ہی کہیں ہوتے ہیں۔

سکندر انگریزی میں خوش اخلاقی سے اس لڑکے سے کہہ رہا تھا "کوئی بات نہیں" وہ اس وقت گاڑی کی پچھلی سیٹ پر باسکٹ رکھ کر سیدھی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سکندر کو خبردار کرپاتی۔ پیچھے سے ایک اور جپسی لڑکا آیا اور اس نے جھپٹ کر اس کے کندھے پر سے اس کا شولڈر بیگ کھینچا۔ بے اختیار اس کے لبوں سے چیخ نکلی۔ سکندر نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ بیگ لے کر وہ دونوں چور مخالف سمتوں میں بھاگ رہے تھے۔

"سکندر! چھوڑ دو' رہنے دو پلیز۔"

اس نے چلا کر اسے روکنا چاہا تھا۔ مگر اس نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ وہ خود بھی بھاگی تھی تاکہ اسے روک سکے۔ تب تک سکندر اس تیز رفتاری سے بھاگتے جپسی لڑکے تک پہنچ چکا تھا۔ وہ بھاگنے میں اس لڑکے سے کہیں زیادہ تیز رفتار ثابت ہوا تھا۔ وہ لڑکا مڑا تو سکندر نے اس کے منہ پر ایک بھرپور پنچ مارا تھا۔ سکندر کے زوردار پنچ سے وہ لڑکا سنبھل نہیں سکا تھا' سکندر نے اس سے بیگ چھین کر اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے بیگ فوراً" اٹھالیا تھا۔

"سکندر!" وہ بے اختیار خوف کے عالم میں چلائی تھی جب اس نے اس جپسی لڑکے کو جیب سے چاقو نکالتے دیکھا۔ سکندر کے پنچ سے اس کے ہونٹوں سے خون نکل آیا تھا' وہ انتہائی تیز دھار چاقو بڑی مہارت سے تھامے سکندر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کا دوسری سمت بھاگا ساتھی بھی اسی وقت اس کی مدد کے لیے وہاں پہنچا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی خنجر نما ایک چاقو تھا۔

"سکندر پلیز' انہیں بیگ واپس دے دو اور بھی انہیں جو چاہیے دے دو۔"

وہ خوف سے کانپتی چلائی تھی۔ اس نے فوراً" ہی اپنا بیگ واپس اس جپسی کی طرف اچھال دیا تھا۔ اس کا بیگ زمین پر ان لوگوں کے پیروں کے پاس جا کر گرا تھا۔

سکندر نے جیسے اس کی آواز سنی ہی نہ ہو' اس نے ایک جپسی کا چاقو والا ہاتھ پکڑ کر زور سے مروڑا تھا' ساتھ ہی اس کے پیٹ میں بہت زور سے لات ماری تھی۔ جپسی درد سے چلاتا زمین پر گرا تھا' چاقو اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی نے عین اسی وقت پیچھے سے سکندر پر چاقو سے وار کیا تھا۔ کہنی سے اوپر کی جگہ سکندر کے بازو میں چاقو لگا تھا۔ سکندر بڑی برق رفتاری سے فوراً" گھوما اور اس نے اسی طرح ایک زوردار لات اس دوسرے جپسی لڑکے کے بھی پیٹ پر ماری تھی۔ سکندر کے بازو سے خون نکلتا دیکھ کر وہ رو پڑی تھی۔

"سکندر پلیز' انہیں چھوڑ دو' پلیز' یہ جو مانگ رہے ہیں' انہیں دے دو۔"

سکندر کا اس طرح اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اسے خوف اور دہشت میں مبتلا کر گیا تھا۔

مگر سکندر کو جیسے اس کا چیخنا' روکنا اور رونا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک جنون اور خون سا اترا ہوا تھا۔ اس کی چوٹ لگی ٹانگ جو ابھی بھی پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی' نہ وہ اسے ان بدمعاشوں سے لڑنے سے روک رہی تھی نہ اس کے بازو سے بہتا خون۔ اسے سکندر نارمل نہیں لگ رہا تھا۔

وہ ایک ہی وقت میں ان دونوں سے مقابلہ کر رہا تھا' ان دونوں پر وار کر رہا تھا اور ان کے ہر وار سے بڑی مہارت سے خود کو یوں بچا رہا تھا جیسے زندگی کے تمام برسوں میں یہی کام کرتا آیا ہو۔ سکندر اس پل ایک پڑھا لکھا لائر' ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا لیگل ایڈوائزر نہیں لگ رہا تھا بلکہ انہیں جپسیوں کی طرح سڑکوں پر پلنے بڑھنے والا ایک غنڈہ اور بدمعاش لگ رہا تھا۔

ان دونوں کے چاقو کب کے ان کے ہاتھوں سے نکل چکے تھے' اب وہ دونوں چاقو سکندر کے ہاتھوں میں تھے۔ اس نے چاقو سے ان پر وار نہیں کیا تھا۔ وہ صرف ٹانگوں کا استعمال کر کے ہی ان دونوں کو نڈھال ہو کر زمین پر گر جانے پر مجبور کر چکا تھا۔

وہ دونوں زمین پر زخمی پڑے کراہ رہے تھے۔

"بس کرو سکندر! پلیز' بس کرو۔" وہ روتے ہوئے اس کے پاس آئی' جو پے درپے ان دونوں کو لاتیں مار رہا تھا اور وہ دونوں تکلیف سے چلا رہے تھے۔ سکندر جیسے اب اس کی آواز پر چونکا تھا۔

"باسٹرڈ۔" اپنے ہونٹوں کے پاس سے خون صاف کرتے ہوئے سکندر نے انہیں گالی دی اور پھر ان دونوں کے پاس سے پیچھے ہٹا۔ یہ وہ سکندر شہریار نہیں تھا جسے وہ جانتی تھی' یہ ایک دوسرا شخص تھا جس سے وہ ابھی ابھی متعارف ہوئی تھی۔ بے حد جنونی' طاقت ور اور غصے میں اپنی جان کی بھی پروا نہ کرنے والا۔ تکلیف اور درد سے چلاتے ہوئے وہ دونوں شدید زخمی جپسی' سکندر کو پیچھے ہٹتا دیکھ کر اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے اندھا دھند بھاگے تھے۔

"بلڈی باسٹرڈ۔" سکندر نے انہیں بھاگتا دیکھ کر دوبارہ گالی دی تھی۔ چند سیکنڈ ان دونوں کو دیکھتے رہنے کے بعد اس نے لیزا کی طرف دیکھا تھا۔ اسے سکندر کی آنکھوں میں ابھی بھی جنون سا نظر آرہا تھا۔ اسے اس کی آنکھوں سے ڈر لگا تھا۔ بے اختیار اس نے اسے [illegible] را تھا۔

"سکندر!" وہ جیسے اتنی دیر کے بعد اب اس کی پکار سن پایا تھا۔ وہ واپس اپنے حواسوں میں آیا اور اس نے اور اسے دیکھا تھا۔

"تم رو کیوں رہی ہو؟" وہ اس کے بالکل نزدیک کھڑا تھا۔ اس نے لیزا کی آنکھوں سے گرتے آنسو اپنے [illegible] ہاتھ سے صاف کیے تھے۔ اور اس کا پرس اسے [illegible] کر دیا۔

"یہ لو۔" اس کی نظریں سکندر کے چہرے پر نہیں تھیں نہ ہی اپنے شولڈر بیگ پر' اس کی نظریں سکندر کے بازو سے بہتے خون پر تھیں۔ اس کی ٹی شرٹ کی آستین آدھی ہونے کے سبب بازو سے خون بہتا بالکل نگاہوں کے سامنے تھا۔

"سکندر! تمہارا ہاتھ....." وہ ابھی تک خوف کے حصار میں تھی' پورا جملہ بول نہیں پائی تھی۔

"ہاتھ..... اوہ ہاں..... تمہارے پاس کوئی کپڑا ہے؟"

اس کے کہنے پر جیسے اسے اپنے ہاتھ کا دھیان آیا تھا وہ انتہائی لاپروائی سے اپنا خون بہتا دیکھ کر بولا۔ یوں جیسے اسے کوئی درد اور تکلیف ہو ہی نہ رہی ہو۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی سکندر! ان سے لڑنے کی؟ ایک بیگ ہی تھا ناں؟ لے جانے دیتے انہیں۔ چند سو یورو تمہاری جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہو سکتے۔" وہ غصے میں روتے ہوئے چلا اٹھی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں لیزا! مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ کیوں بے کار میں روئے جا رہی ہو۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔ ہمیں واپس بھی پہنچنا ہے۔"

تحمل اور بردباری سے کہتا اس کا ہاتھ پکڑ کر وہ اسے گاڑی کے پاس لے آیا۔ وہ گاڑی کی اگلی نشست کا دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ سکندر کا اتنا پُرسکون اور مطمئن سا انداز دیکھ کر وہ رونا بھول گئی تھی۔

"تم اس وقت کافی ڈسٹرب لگ رہی ہو' اگر مائنڈ نہ کرو تو میں ڈرائیونگ کرلوں؟"

وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر خود ہی آگے بڑھی تھی۔ وہ گاڑی کے اندر بیٹھ کر ڈیش بورڈ سے فرسٹ ایڈ باکس باہر نکال رہی تھی۔ سکندر برابر والی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کا بازو پکڑا۔ وہ سکندر کے بازو پر بینڈیج کرنا چاہتی تھی' خون کو مزید بہنے سے روکنا چاہتی تھی۔

"ابھی تو خون بہنا رک گیا ہے۔ راستے میں جہاں کہیں کوئی ہاسپٹل نظر آیا' ہم وہاں سے تمہارے ہاتھ کی پراپر بینڈیج کروالیں گے۔" وہ اس کے ہاتھ کی بینڈیج کرتے ہوئے بولی تھی۔

سکندر بے اختیار ہنسا تھا۔ اس کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا' جیسے اس نے کوئی بہت ہی بچکانہ بات کہہ دی تھی اور وہ اس پر اپنی ہنسی روک نہیں پایا تھا۔ اس نے غصے

سے سکندر کو دیکھا۔

"تمہارے لیے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال دینا' موت سے کھیلنا مذاق ہے؟" سکندر جواباً" لب بھینچ کر ایک دم ہی خاموش ہو گیا تھا۔

اسے سکندر کی آنکھوں میں درد پھیلتا نظر آیا تھا۔ غصہ کرنا بھول کر وہ خود بھی بالکل چپ ہو گئی تھی۔ اس نے سکندر کے ہاتھ کی بینڈیج خاموشی سے مکمل کر دی' پھر کاٹن پر دوا لگا کر سکندر کے ہونٹ کے پاس جہاں سے خون بہہ رہا تھا' اس پر رکھی اس جگہ پر ہاتھ سے ہلکا سا دباؤ ڈالا تاکہ خون بہنا رک جائے۔ سکندر نے بے اختیار اس کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"کیا ہوا؟ تکلیف زیادہ ہو رہی ہے کیا؟" اس نے نرمی سے پوچھا۔ اس نے جواباً" سر ہاں میں ہلایا تھا۔

"بس ایک دو منٹ کی تکلیف اور جلن ہے' برداشت کر لو۔"

وہ چند منٹ اس کے ہونٹ کے پاس یونہی ہاتھ سے دباؤ ڈال کر بیٹھی رہی۔ اس کا زخمی بازو بھی اس نے دوسرے ہاتھ میں قدرے اوپر کر کے پکڑا ہوا تھا تاکہ خون بہنا دوبارہ شروع نہ ہو جائے۔

"میری بینڈیج ہو گئی ہے' اب کیا ہم چلیں؟" وہ سنجیدگی سے بول رہا تھا' لہجہ نرمی لیا ہوا اور دوستانہ سا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے سر اثبات میں ہلا کر گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

"ویسے اگر تم مجھے ڈرائیونگ کرنے دیتیں تو اچھا تھا۔ تمہاری جتنی فاسٹ ڈرائیونگ تو نہیں کرتا مگر میں بھی تمہیں روما جلدی ہی پہنچا دیتا۔" وہ ہنس کر اس سے بولا۔ یوں جیسے کچھ دیر پہلے کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہی نہیں تھا' وہ اب بالکل نارمل اور کمپوزڈ سا بیٹھا تھا۔ وہ جواباً" چپ رہی تھی۔ سکندر نے راستے میں دو ایک بار خوشگوار موسم' وہاں کے مضافات کو موضوع گفتگو بنا کر بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر وہ اس گفتگو میں اس کا ساتھ نہیں دے سکی تھی۔

جو بات وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی وہ سکندر نے بتائی نہیں تھی اور باقی کسی موضوع پر گفتگو کا اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ان کا باقی سارا راستہ بالکل خاموشی سے کٹا تھا۔ اس نے گاڑی اس کے ہوٹل پہ لا کر روکی وہ فوراً" ہی گاڑی سے اتر گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی' وہ اندر جا رہا ہے' مگر وہ گھوم کر اس کی طرف والی کھڑکی پر آیا اور کھڑکی پر بازو ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

"پتا نہیں کیوں مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں نے تمہیں ناراض کر دیا ہے۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر سنجیدگی سے بولا۔

"میں ناراض نہیں ہوں سکندر! مگر تمہارے جذباتی پن پر مجھے غصہ ہے۔ ایک بیگ ہی تھا ناں میرا' اس کے لیے اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا؟ اگر تمہیں کچھ ہو جاتا یا پھر اگر ان کے کچھ اور ساتھی بھی ہوتے' وہ بھی وہاں آ جاتے؟" وہ ناراض لہجے میں جھرجھری سی لے کر بولی تھی۔

"میں دراصل اپنی رومن آرٹسٹ دوست پر' جو مجھے پانی کے ساتھ طاقت کے سمبل کے طور پر دکھانا چاہتی ہے' یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں واقعی بہت بہادر ہوں۔"

وہ ہنس کر لاپروائی سے بولا۔ خود پر لاپروائی کا ملمع چڑھائے وہ اپنے اس جنونی عمل کی عجیب عجیب توجیہات پیش کر رہا تھا۔ وہ جواباً" سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تمہاری زندگی اتنی بے وقعت اور بے مول نہیں ہے سکندر! کسی اور کو فرق پڑے نہ پڑے لیکن اگر تمہیں کچھ ہو گا تو مجھے بہت تکلیف ہو گی۔"

وہ بہت آہستہ آواز میں بولی تھی۔ مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا سکندر یک دم ہی اس کی گاڑی کی کھڑکی سے ہٹا۔ یک دم ہی اس کا چہرہ سنجیدہ اور بے تاثر سا ہو گیا تھا' بہت سخت سا ہو گیا تھا۔

"چاؤ لیزا۔" اس نے فوراً" ہی اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا اور اس کے گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے اندر چلا گیا۔ وہ وہیں رکی اسے اندر جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ کیا دکھ تھا اس شخص کو' آخر ایسا کیا دکھ تھا اسے خود سے' رشتوں سے' محبتوں سے' ہر شے سے اس قدر متنفر کر چکا تھا؟

گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے وہ سکندر کو سوچ رہی تھی اور پتا نہیں کیوں مگر اسے ایسا لگ رہا تھا کہ سکندر شہریار وہ نہیں جو پچھلے بہت سارے دنوں سے اسے روما میں مختلف جگہوں پر مل رہا ہے بلکہ اصل سکندر شہریار وہ ہے جو اسے Tivoli کی سڑک پر غنڈوں کے ساتھ انہی کی زبان میں بات کرتا نظر آیا تھا' جنونی سا غصہ اور پاگل پن لیا ہوا۔

☼ ☼ ☼

وہ گھر آتے ہی اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ اس نے لباس تبدیل کرنے یا شاور لینے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ ابھی تک اسی خوف ناک واقعہ کے حصار میں تھی۔ وہ مسلسل سکندر کے اس جنونی انداز کو سوچ رہی تھی۔ وہ اپنے جسم سے بہتے خون کو اتنے سکون سے کس طرح دیکھ سکتا تھا؟ کیا وہ خود کو سزا دیا کرتا تھا؟ آج اس کے صرف ایک بیگ کی خاطر اس نے اپنی جان کو خطرے میں کیوں ڈالا تھا جبکہ بیگ تو وہ اس لڑکے سے فوراً" ہی حاصل کر چکا تھا۔ وہ ان دونوں خانہ بدوشوں کو چند منٹوں میں ڈھیر کر چکا تھا' پھر انہیں مار مار کر ادھ موا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کیسا جنون اور کیسی وحشت تھی جو اس پل اس پر سوار ہوئی تھی؟ آخر زندگی نے اس کے ساتھ ایسا کیا کیا تھا جو وہ خود کو' اپنی زندگی کو اتنا ارزاں اور بے مول سمجھنے لگا تھا؟

اس کا دل چاہ رہا تھا' وہ سکندر کو یقین دلائے کہ اس کا وجود اس دنیا کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اس کا ہونا اس زندگی کے لیے بہت قیمتی ہے' اس کی موجودگی لیزا محمود کے لیے بہت قیمتی ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو لیزا محمود کو بہت تکلیف پہنچتی ہے۔ وہ ایکسیڈنٹ کے بعد ہسپتال میں زخمی پڑا تھا تو لیزا محمود کا دل اس کے لیے پریشان تھا۔ وہ آج اپنی جان کو خطرے میں ڈال رہا تھا تو لیزا محمود کا دل سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا' اگر اسے کچھ ہو جاتا پھر؟ اسے اپنے جسم سے بہتے خون سے کوئی تکلیف ہو رہی تھی یا نہیں' مگر لیزا محمود کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

وہ نینی کو بارہا جھٹلا چکی تھی۔ وہ سکندر کے پیچھے کیوں آئی ہے' اس کا جواب دیتے ہوئے وہ سکندر کو جھٹلا چکی تھی' وہ اپنے مختلف اعمال کی مختلف وجوہات تلاش کر کر کے خود کو مسلسل جھٹلاتی رہی تھی' مگر اس پل سکندر کی تکلیف پر روتے ہوئے وہ خود کو ہرگز جھٹلا نہیں پا رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سکندر کو فون کر کے بتائے میں پہلی بار بریرا میں تمہارے پاس اس لیے آئی تھی کہ تمہیں دیکھ کر میرے دل میں کہیں بہت اندر بہت خوب صورت گھنٹیاں بجی تھیں۔

"جس سے مجھے محبت ہو گی' وہ جب میری زندگی میں آئے گا تو مجھے فوراً" پتا چل جائے گا' میرے دل میں اسے دیکھتے ہی گھنٹیاں بجنے لگیں گی۔"

اپنا پُرمزاح انداز میں کہا وہ جملہ یاد کر کے اس پل وہ روتے روتے ہنس پڑی تھی۔ وہ اسے خوب صورت لگتا ہے اس لیے وہ اسے پینٹ کرنا چاہتی ہے' وہ اسے اچھا لگتا ہے اس لیے وہ اس سے دوستی کرنا چاہتی ہے' کتنی وجوہات اور جواز وہ خود اپنے آپ کو سکندر کے ایکسیڈنٹ سے پہلے تک پیش کرتی رہی تھی اور اس کے ایکسیڈنٹ کے بعد جب وہ بھاگتی دوڑتی اس کے پاس ہسپتال پہنچی تھی اس کے بعد اس نے اپنے اندر سے ابھرتے ہر سوال کو نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ وہ اس کے پاس ہسپتال میں مسلسل کیوں ہے؟ وہ اسے اپنے گھر لانے پر بضد کیوں ہے؟ اسے اس کی دوا اور خوراک کی اس قدر پروا کیوں ہے؟ وہ خود سے لاپروائی برتتا ہے تو اسے کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ وہ اس کے گھر سے جا رہا ہے تو اسے یہ فکر کیوں ہے کہ واپس جا کر وہ اپنا خیال ٹھیک سے رکھے گا بھی کہ نہیں؟ آج دل کو یہ بات یاد کر کے کیوں ناقابل بیان تکلیف پہنچی تھی کہ وہ چند دنوں یا چند ہفتوں میں واپس چلا جائے گا۔

وہ اسی ایک شخص کو سوچتے' روتے اور ہنستے ہوئے سوئی تھی اور صبح بیدار ہوتے ہی جو پہلا خیال اس کے دل میں آیا تھا وہ اسی کا تھا' جو پہلا نام لبوں سے نکلا تھا وہ اسی کا تھا' جو پہلا چہرہ تصور میں آیا تھا وہ اسی کا تھا۔

چند دن پہلے اس نے نینی کو سکندر کی سب سے بڑی خامی اس کا پاکستانی ہونا بتا کر ان کی ہر سوچ کی نفی کر دی تھی اور آج اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا کہ وہ پاکستانی ہے یا دنیا کے کسی بھی اور ملک کا رہنے والا۔ وہ جو بھی ہے، وہ جیسا بھی ہے، وہ جس بھی جگہ سے ہے، بس بہت اہم ہے۔

وہ اپنی سوچوں اور اپنے جذبات کی شدت سے خود ہراساں سی ہو رہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اگر اس وقت وہ سکندر کے سامنے گئی تو وہ اس کا چہرہ دیکھ کر ایک پل میں جان جائے گا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔ اس کی خیریت پوچھنے کی شدید چاہ رکھنے کے باوجود اس سے اسے فون نہیں کیا جا سکا تھا۔ اس کا چہرہ سامنے نہیں بھی ہوگا تب بھی اس کا لہجہ اسے سب کچھ بتا دے گا۔ اس کے دل کا ہر بھید اس پر کھول دے گا۔ وہ بغیر کچھ کھائے اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آ گئی اور سکندر کی تصویر مکمل کرنے لگی۔ جو تصویریں اس نے کیمرے سے کھینچی تھیں اسے ان کی طرف ایک نظر بھی دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آ رہی تھی۔ اس کے وہاں فوارے کے سامنے بیٹھے ہونے کی ایک ایک تفصیل اسے یاد تھی، اس کی آنکھوں کے تاثر، اس کے لبوں کی مدھم سی مسکراہٹ، دیوار پر رکھے اس کے ہاتھ کی انگلیاں یہ سب یاد رکھنا تو شاید بہت عام سی بات تھی اسے تو یہ تک یاد تھا کہ یوں بیٹھنے سے اس کی شرٹ اور پینٹ پر کہاں کہاں شکنیں پڑ رہی تھیں، ہوا سے اگر اس کے بال اڑے تھے تو کیسے لگے تھے، اسے ہر بات یاد تھی، اس منظر کی کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی، جسے پھر سے دیکھنے کے لیے اسے اپنے سامنے تصویریں رکھنی پڑتیں۔

"ناشتا کیے بغیر اوپر آ گئیں لیزا؟" نینی اوپر آئی تھیں۔ اس سے ناشتے کے بارے میں پوچھتے پوچھتے ان کی نظر سکندر کی پینٹنگ پر پڑ گئی۔ "بن گئی سکندر کی تصویر، کل رات تو تم آتے ہی سونے چلی گئیں تم سے بات ہی نہیں ہو سکی۔"

"جی نینی! بس وہ میں تھک گئی تھی۔" وہ جانتی تھی کہ نینی اس پل اسے اور سکندر کی تصویر کو بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان سے نگاہیں چرا کر جان بوجھ کر خود کو کام میں مصروف ظاہر کرنے لگی تھی۔

"ناشتا یہیں لا دیتی ہوں تمہیں۔" ایک پل اسے خاموشی سے دیکھتے رہنے کے بعد وہ ناشتا لانے کا کہتی نیچے اترنے لگیں۔

"تھینک یو نینی! اپنا بھی لے آیئے گا۔ بالکونی میں ساتھ بیٹھ کر کریں گے۔" اس نے قدرے بلند آواز میں ان سے کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے سکندر کو فون نہیں کیا تھا۔ وہ خود کو سکندر کی تصویر میں مصروف کیے ہوئی تھی، مگر میز پر پڑے اپنے موبائل پر گھوم پھر کر اس کی نگاہیں بار بار جا رہی تھیں۔ کام پر دھیان رکھتے ہوئے بھی اس کا سارا دھیان فون کی طرف تھا۔ نیچے بھی فون کی بیل بج رہی تھی تو وہ چونک رہی تھی۔ اس کے کان فون کی گھنٹیوں پر لگے تھے۔

اگر اس نے اسے فون نہیں کیا تو سکندر کو بھی خیال نہیں آیا کہ اسے فون کر لے؟

وہ دل ہی دل میں سکندر سے خفا ہوئی۔ شام ہو گئی تھی اور اب وہ خود کو مزید روک نہیں پا رہی تھی۔ ایک بے اختیاری کیفیت میں بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے اس کا موبائل نمبر ملایا تھا۔

"کیسی ہو مصورہ؟" وہ اس کی آواز سن کر خوش مزاجی سے بولا تھا۔

"تم کہاں ہو؟" اسے کیوں غصہ آ رہا ہے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی، مگر اس کا لہجہ غصے سے بھرا تھا۔

"میرے ہاتھ میں موجود نقشہ کے مطابق میں اس وقت Via del Corso پر ہوں۔ آفس سے نکلا تو سوچا اب تک Trevi Fountain نہیں دیکھا سو ارادے چہل قدمی کرتے ہوئے وہاں جانے کے ہیں۔" وہ اسی خوش مزاج انداز میں بولا تھا مسکراتے ہوئے۔

"تم Trevi Fountain جا رہے ہو؟ اکیلے؟ تم نے مجھے بتایا بھی نہیں؟ کیا اس سے پہلے روما کی ہر جگہ میں نے تمہیں نہیں دکھائی جو آج تم نقشہ لے کر اکیلے نکلے ہو؟" وہ خفگی سے تلخ لہجے میں بولی۔

"مجھے لگا، کل میری روم من دوست مجھ سے خفا ہو گئی تھی اس لیے آج کہنے کی ہمت نہیں ہوئی ورنہ ظاہر ہے، میں تم سے ہی کہتا لے جانے کو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بالکل اسی انداز میں بات کر رہا تھا جیسے اس سے کیا کرتا تھا۔ ہاں اس کے لہجے میں زیرِ پردہ چھپی ایک حیرانی سی تھی جیسے وہ اس کی تلخی اور خفگی کی وجہ سمجھ نہ پا رہا ہو۔

"اچھا تم جہاں ہو، وہیں ٹھہرو، میں آ رہی ہوں۔ آس پاس کوئی کیفے یا بار ہے تو وہاں بیٹھ کر میرا انتظار کرو میں بس دس، پندرہ منٹ میں وہاں پہنچتی ہوں۔"

تیز رفتاری سے سیڑھیاں اترتے ہوئے اس نے تحکمیہ انداز میں سکندر سے کہا اور پھر اس کا جواب سنے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ محض سات منٹ لگائے تھے اس نے شاور لینے اور تیار ہونے میں۔ اس نے گلابی اور کاسنی رنگوں کے امتزاج والی پرنٹڈ شرٹ کاسنی رنگ کے لوز ٹراؤزر کے ساتھ پہنی تھی۔ گیلے بالوں کو یونہی بکھرا چھوڑ کر سینڈلز پیروں میں ڈالتی وہ گاڑی کی چابی اٹھا کر نیچے کی طرف دوڑ رہی تھی۔ انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتی وہ اس جگہ پہنچی اور سکندر کو کال کیا تب سکندر نے اسے اس کیفے کا نام بتایا جہاں بیٹھا وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گاڑی اس کیفے تک لائی تو سکندر دروازے سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

"گاڑی کسی جگہ پارک کر دو، میں اس وقت روما کی سڑکوں پر پیدل چلنا چاہتا ہوں۔"

وہ اس سے مسکرا کر بولا۔ اس نے گاڑی پارک کر دی۔ اب وہ دونوں پتھروں سے بنی اس کئی سو سال پرانی سڑک پر پیدل چل رہے تھے جو انہیں Trevi Fountain کی طرف لے کر جا رہی تھی۔

"تمہاری چوٹ کیسی ہے؟" اس کا اشارہ سکندر کے ہاتھ کی طرف تھا۔

"ٹھیک ہوں اور تمہاری ڈانٹ سے بچنے کے لیے میں نے ڈاکٹر سے برابر ہر قسم کی بینڈیج کرا رکھی ہے اور پین کلرز بھی لے رہا ہوں۔" اس نے اپنا کوٹ اور ٹائی اس کی گاڑی میں اتار کر رکھ دیے تھے۔ شرٹ کا اوپری بٹن کھلا ہوا تھا اور آستین کہنی سے ذرا نیچے تک فولڈ کر رکھی تھیں۔ وہ اسے اپنا ہاتھ دکھا کر مسکرا کر بتا رہا تھا۔ اس کی کریم کلر کی قمیص کی آستین کے اندر سے اس کے بازو پر پٹی بندھی نظر آ رہی تھی۔

"ہاں، میری باتوں کا جیسے تم پر بڑا اثر ہوتا ہے۔" وہ قدرے برا مان کر بولی تھی۔

چند سیکنڈ وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے تھے۔ اس خاموشی میں جب اسے اپنے دل کی دھڑکنوں کا شور زیادہ تیز سنائی دینے لگا تب اس شور سے گھبرا کر اس نے اسے مخاطب کیا۔

"تم پیدل کیوں چلنا چاہ رہے تھے؟"

وہ سکندر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے پیروں سے ایک چھوٹے سے پتھر کو ٹھوکر مارتا سڑک کی طرف دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ اس کے سوال پر سکندر نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔

"بس یونہی میرا دل چاہ رہا تھا۔ کل میرا یہاں آخری دن ہے، پرسوں صبح کی فلائٹ سے میں واپس چلا جاؤں گا۔ نجانے پھر کبھی تمہارے روما کی ان سڑکوں پر چلنا نصیب ہو کہ نہ ہو، اس لیے میں نے سوچا آج لیزا کے روما کی سڑکوں پر پیدل چلا جائے۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔ یہ وہ کیا کہہ رہا تھا؟ کل آخری دن؟ پرسوں صبح کی فلائٹ؟

"کل آخری دن؟ اس طرح، اتنی اچانک؟ تم نے تو کہا تھا تم یہاں دو، تین ہفتوں کے لیے آئے ہو؟"

اس کے دل میں یک دم ہی یاسیت اور اداسی اتر آئی تھی۔ اس کا دل چاہا تھا وہ سکندر سے لڑے، پوچھے کہ وہ واپس جانے کی بات کیوں کر رہا ہے۔ مگر وہ ٹوٹے، شکستہ سے لہجے میں اگر کچھ کہہ پائی تھی تو محض یہ جملہ۔ وہ اس کی کیفیات سے انجان مسکرا کر جواباً بولا۔

"ہاں تو ٹھیک کہا تھا ناں مصورہ دو ہفتے ہو تو گئے مجھے یہاں پر اور میرا کام جس کے لیے میں یہاں آیا تھا' آج مکمل ہو گیا ہے۔ کل بس ایک میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے' پھر میں فارغ۔"

وہ جیسے اپنی واپسی پر بہت خوش تھا۔ ہاں وہ خوش کیوں نہیں ہوتا وہ اپنے گھر واپس جا رہا تھا۔ روما اس کا گھر نہیں تھا۔ وہ کیوں بھول گئی تھی یہ بات کہ سکندر شہریار یہاں مہمان ہے' پردیسی ہے' اجنبی ہے۔ اس کا گھر' اس کا شہر' اس کی زندگی کہیں اور ہے۔ اسے ایک نہ ایک دن یہاں سے چلے جانا ہے' پھر کبھی بھی یہاں نہ آنے کے لیے۔

ایک دم ہی اس کا دل چاہا تھا وہ چیخیں مار مار کر رونا شروع کر دے۔ اس کے اندر آنسو جمع ہو رہے تھے وہ اگر اس پل کچھ بولتی تو یقیناً رو پڑتی' اس لیے بجائے کچھ بولنے کے سر جھکا کر خاموشی سے چلنے لگی تھی۔ وہ خود کو سمجھا رہی تھی۔ خود کو رونے سے روک رہی تھی۔ خود کو سمجھاتے ہوئے وہ سکندر کو روما کی اس قدیم ترین سڑکوں میں سے ایک سڑک پر لے آئی تھی' جس پر Trevi Fountain موجود تھا۔

ان کی نگاہوں کے سامنے کچھ دور' تھوڑے فاصلے پر صرف اٹلی ہی میں نہیں بلکہ ساری دنیا میں مشہور ترین Trevi Fountain نظر آ رہا تھا۔

"بہت شوق تھا مجھے Tvevi Fountain دیکھنے کا۔ تم اٹالین لوگ اسے De Trevi Fontana کہتے ہو ناں؟"

ٹریوی فاؤنٹین کے نزدیک جاتے ہوئے سکندر نے اس سے پوچھا تھا۔ ہمیشہ جہاں بھی وہ دونوں جاتے تھے وہاں کی تاریخ' وہاں کے آرکیٹیکچر کی تفصیلات وہ اسے بتایا کرتی تھی' چاہے سکندر دلچسپی سے سن بھی رہا ہو یا نہیں' مگر آج وہ خاموش تھی۔ سکندر کی بات کے جواب میں وہ سر ہلا کر بدقت مسکرائی تھی۔

"اپنے ٹین ایج کے دنوں میں' میں نے La Dolce Vita دیکھی تھی' تب سے ہی مجھے شوق تھا Trevi فاؤنٹین دیکھنے کا۔ مووی میں اسے اتنی خوبصورتی سے دکھایا تھا۔"

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی تھی۔ Trevi فاؤنٹین ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسے وہ اسے اپنے بچپن سے دیکھتی آئی تھی۔ اس سڑک پر اطراف میں کئی کئی سو سال پرانی تاریخی عمارتیں اسی طرح ایستادہ تھیں جیسا اس نے انہیں ہمیشہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ ہی کی طرح وہاں پر سیاحوں کا ہجوم تھا۔

اس ہجوم میں گھس کر وہ دونوں بھی فاؤنٹین کے سامنے آ گئے تھے۔

"ایسا ہی دیکھا تھا میں نے اسے مووی میں' پپ آرکیٹکٹس کا بنایا خوب صورت محل اس کے بیرونی منظر پر یہ پتھروں کو تراش کر مجسمہ سازوں کے بنائے گئے رومن گاڈ (Roman God) - Neptune اور سمندری گھوڑوں کے مجسمے اور ان مجسموں اور پتھروں کے اوپر سے گرتا' بہت بلندی تک جاتا اور پھر نیچے اس خوب صورت بڑے سے تالاب میں گرتا یہ نیلگوں پانی۔" وہ دونوں اس بڑے سے تالاب کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ بہت سے سیاح وہاں تالاب میں سکے اچھال رہے تھے۔

سکندر اس کی سوچوں سے انجان Trevi فاؤنٹین کی خوب صورتی کو سراہنے میں مصروف تھا۔ وہ محل اس کے کولمبز' رومن گاڈ اور گھوڑوں کے مجسموں اور ان کے عین نیچے پانی کے بہت بڑے اور بہت گہرے تالاب کی دلکشی اور خوب صورتی کو جیسے مبہوت ہو کر دیکھ رہا تھا۔ آج جب اپنے روما کی خوب صورتی اسے متاثر نہیں کر رہی تھی' تب پہلی مرتبہ وہ اس سے متاثر ہوتا نظر آ رہا تھا۔

سکندر اپنے موبائل سے فاؤنٹین کی مختلف زاویوں سے تصاویر کھینچنے لگا۔ اس نے تالاب میں سکے اچھالتے سیاحوں کو دلچسپی سے دیکھا۔

"اگر Trevi Fountain میں Coins اچھالیں گے تو زندگی میں کبھی نہ کبھی روما دوبارہ ضرور آئیں گے' ہے ناں لیزا؟" ان لوگوں کے بالکل ساتھ ایک لڑکی تالاب میں سکہ اچھال رہی تھی اور اس کا بوائے فرینڈ سکہ اچھالتے وقت اس کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ ساتھ ہی اس نے چیخ کر اپنی گرل فرینڈ سے کہا تھا۔

"Make a wish" (کوئی خواہش کرو)

لڑکی کی فاؤنٹین کی طرف پیٹھ تھی' اس نے اپنے سیدھے ہاتھ میں سکہ پکڑ رکھا تھا وہ اسے اپنے کندھے سے اوپر لے جا کر بغیر پیچھے مڑ کر دیکھے Pond میں اچھالنے لگی' ساتھ ہی اس نے جیسے آنکھیں بند کر کے بڑی شدت سے کوئی دعا مانگی' پھر آنکھیں کھولیں اور سکہ پانی میں اچھال دیا' عین اس کے سکہ اچھالتے لمحے' اس کے بوائے فرینڈ نے اس کی ایک ساتھ تین' چار تصاویر کھینچی تھیں۔

"ہاں' صدیوں سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوئی روایتوں کے مطابق کہا تو یہی جاتا ہے کہ روما وزٹ کرنے والا کوئی بھی شخص اگر Trevi فاؤنٹین میں Coin اچھالے گا تو وہ زندگی میں کبھی نہ کبھی دوبارہ Eternal سٹی ضرور آئے گا۔" خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے سکندر کو مسکرا کر بتایا تھا۔

اسے سامنے دیوار پر تھوڑی خالی جگہ نظر آئی تو اس پر بیٹھ گئی۔ اسے بیٹھتے دیکھ کر سکندر بھی اس کے ساتھ ہی آ کر بیٹھ گیا تھا۔ پاؤں دائیں بائیں ہلاتی وہ خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

سکندر کو اس کی اداسی کسی بھی قیمت پر پتا نہیں چلنی چاہیے۔ وہ سکندر پر سے نظریں ہٹائے خود کو لاپروا ظاہر کرنے کی بھرپور شعوری کوشش کرتے ہوئے فاؤنٹین میں سکے اچھالتے سیاحوں کو دیکھ رہی تھی۔

"صحیح طریقہ کیا یہی ہوتا ہے فاؤنٹین میں سکہ اچھالنے کا؟" سکندر نے ایک سیاح مرد کو فاؤنٹین میں سکہ اچھالتے دیکھ کر اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں' آپ کی پشت فاؤنٹین کی طرف ہونی چاہیے سکہ آپ کے سیدھے ہاتھ میں ہونا چاہیے اور بغیر فاؤنٹین کی طرف سر گھما کر دیکھے آپ نے کندھے کے اوپر سے Coin پانی میں اچھالنا ہوتا ہے۔ روایت ہے اگر ایک سکہ اچھالیں گے تو دوبارہ روما آئیں گے اور اگر دو سکے اچھالیں گے تو دوبارہ روما بھی آئیں گے اور کسی رومن سے آپ کو محبت بھی ہو جائے گی اور اگر تین سکے اچھالیں گے تو جس سے آپ کو محبت ہو گی اس سے آپ کی شادی بھی ہو جائے گی۔"

وہ سکندر کی طرف دیکھ کر ہنس کر بولی تھی۔

"تم یقین کرتی ہو اس بات پر؟" سکندر نے ہنستے ہوئے اس سے پوچھا۔

"نہیں' تم کرتے ہو؟"

"نہیں' بھئی بالکل بھی نہیں۔" وہ دونوں ہنس رہے تھے گویا فاؤنٹین میں سکے اچھالنا ان دونوں کے لیے ایک مذاق اور تفریح سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھا۔

"اس تالاب میں اب تک کتنے سکے جمع ہو چکے ہوں گے۔ اٹالین گورنمنٹ ان کا کرتی کیا ہے؟" سکندر نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔ "روما کے غریب اور ضرورت مند لوگوں کی مدد کے لیے استعمال ہو جاتے ہیں یہ پیسے۔ کم از کم بھی ہر دن یہاں تین ہزار یوروز تو پانی میں جمع ہوتے ہی ہیں۔" اس نے مسکرا کر سکندر کو جواب دیا تھا۔

"اچھا تم یہاں میری جگہ رکھ کر بیٹھو' میں ابھی آیا۔"

وہ یک دم ہی کچھ سوچ کر بولتا ہوا اس کے پاس سے اٹھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟ کیا Coin اچھالنے؟" اس کے شرارت بھرے سوالیہ انداز کے جواب میں سکندر قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"اتنا پاگل نہیں ہوا ابھی۔ کسی اور کام سے جا رہا ہوں۔ بس ابھی آیا۔ تم میری جگہ رکھنا۔"

ہنس کر بولتا وہ تیزی سے چلا گیا اور جس رفتار سے وہ گیا تھا۔ اسی رفتار سے چار پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ موجود تھا۔ اس کے ہاتھوں میں دو آئس کریم کونز تھیں۔

"گیلاٹو سینوریتا۔" اس نے کون اس کی طرف بڑھائی تھی۔

"اچھا تو تم یہ لینے گئے تھے؟" مسکرا کر کون ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے اس سے پوچھا۔

"ہاں' میں نے سوچا اتنے دنوں میں اٹلی کی کافی

مشہور جگہیں بھی دیکھ لیں، یہاں کے مزے دار کھانے بھی کھالیے، اگر نہیں کھائی تو ساری دنیا میں مشہور اٹالین آئس کریم نہیں کھائی۔"

"میں آرڈر کردیتی، تمہیں مشکل تو نہیں ہوئی؟"

"جناب! کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے مجھے؟ خاصا ذہین آدمی ہوں میں، گزارے لائق اٹالین لفظ سیکھ لیے ہیں میں نے۔" وہ آئسکریم کھاتے ہوئے ہنس کر بولا۔

"اٹالین آئس کریم میں Fats بھی کم ہوتے ہیں اور اس کا ذائقہ بھی دوسری آئسکریمز کے مقابلے میں بہت زیادہ اچھا ہوتا ہے۔"

وہ اتنے آرام سے اس سے مختلف موضوعات پر کس طرح بات کررہی ہے، اسے خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ اندر سے بہت اداس تھی بہت پریشان تھی۔

"چلیں؟" وہ دونوں کون کھا چکے تب سکندر نے اس سے پوچھا۔ اس نے سر اثبات میں ہلایا تھا اور دیوار پر سے اٹھ گئی تھی۔ وہاں سے اٹھتے ہوئے یک دم ہی پھر اس کا دل اداسیوں میں گھرنے لگا تھا۔ کیا وہ دونوں اس طرح پھر کبھی ایک ساتھ یہاں Trevi فاؤنٹین کے سامنے بیٹھ پائیں گے؟ اس کا دل چاہا وہ سکندر سے کہے۔

"تم پانی میں سکہ اچھالو، تم چاہتے ہو یا نہیں، مگر میں چاہتی ہوں تم روما دوبارہ آؤ اور اب کی بار تم میری خاطر روما آؤ۔"

وہ اس کی کیفیات سے انجان وہاں سے اٹھ گیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے پیدل واپس جا رہے تھے۔ سکندر نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے ٹراؤزر کی جیبوں میں ڈال رکھے تھے، وہ بہت مطمئن سا لگ رہا تھا۔

"تمہارا کل کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے آہستگی سے اس سے پوچھا۔

"بس آفس ہی جانا ہے اور تو کچھ خاص نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا ناں کل آفس میں ایک میٹنگ ہے دوپہر دو تین بجے تک میٹنگ ختم ہوگی۔ اس کے بعد ہوٹل جا کر اپنی پیکنگ وغیرہ کروں گا۔ کل رات ایک، ڈیڑھ بجے ایئرپورٹ کے لیے نکلوں گا۔ صبح ساڑھے تین بجے کی میری فلائٹ ہے۔"

وہ اپنے جانے کی بات اتنے سکون سے کر رہا تھا۔ ذرا سا افسوس، ذرا سا دکھ بھی اس کے چہرے پر نظر نہیں آرہا تھا، بلکہ وہ بہت مطمئن لگ رہا تھا، جیسے کہ واپس اپنے گھر جانے پر خوش ہو۔

"تم اتنے خوش کیسے ہوسکتے ہو سکندر شہریار! تم مجھ سے دور جانے پر، مجھ سے جدا ہونے پر اتنے خوش کیسے ہوسکتے ہو؟"

اس کا دل چاہا تھا وہ اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر پوچھے۔ چند دنوں کے لیے ملا وہ شخص اتنی خوشی خوشی اس سے جدا ہونے کی بات کر رہا تھا۔ کیا اتنے دنوں میں بھی ایک پل کے لیے بھی اس نے اس کے لیے وہ نہیں سوچا تھا، جو وہ اس کے لیے سوچا کرتی تھی؟

"تم کل رات کا کھانا میرے گھر پر میرے اور نینی کے ساتھ کھاؤ۔" بے اختیار اس نے اسے دعوت دی، جیسے اس کے ساتھ وقت گزارنے کے لیے ایک وجہ تلاش کی ہو۔

"ڈنر۔۔۔ لیکن لیزا۔۔۔" وہ شاید اس سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا، مگر اس نے اسے بات پوری نہیں کرنے دی تھی، اس نے بہت اصرار کر کے کہا تھا۔

"پلیز سکندر! انکار مت کرو، مجھے افسوس ہوگا۔ تمہاری پینٹنگ میں مکمل کرچکی ہوں، میں تمہیں وہ دکھانا چاہتی ہوں، تم کل آؤ گے تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔"

سکندر نے ایک پل کے لیے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھا تھا، وہ اسے بہت گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر بولا۔

"بہت دفعہ تمہارا اور تمہاری نینی کا مہمان بن چکا ہوں، بہت بار تمہارے گھر پر کھانا بھی کھا چکا ہوں۔ لیکن اگر تمہارا اصرار ہے مصورہ! تو میں کل پھر آجاؤں گا۔"

وہ یک دم ہی مسکرا دی تھی۔ سکندر بھی اسے مسکراتے دیکھ کر مسکرایا تھا۔

"میں تمہیں کل شام میں تمہارے ہوٹل سے پک کرلوں گی۔"

وہ دونوں چلتے ہوئے وہاں تک آگئے تھے جہاں اس نے اپنی گاڑی پارک کی تھی۔

"نہیں، یہ غلط بات ہے، میری دعوت بھی کرو اور مجھے لینے بھی آؤ؟ میں آفس کی گاڑی سے آجاؤں گا، تمہارے گھر کا پتا مجھے یاد ہے سینوریتا۔" اپنے جملے کا آخری حصہ ادا کرتے وقت وہ دھیمے سے مسکرایا تھا۔

تھوڑی دیر بعد سکندر کو اس کے ہوٹل اتارنے کے بعد وہ اپنے فلیٹ واپس جا رہی تھی تو اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ اس نے خود کو رونے سے روکا، خود کو سرزنش کی۔ وہ کل آتو رہا ہے، وہ کل اس سے مل تو رہا ہے، ابھی وہ جدا تو نہیں ہوگیا، کیا پتا کل وہ کچھ ایسا کہہ دے کہ پھر اس کا چلے جانا، بچھڑ جانا، لگے ہی نہیں۔ وہ سکندر کو اس کے ہوٹل چھوڑ دینے کے بعد سے ہی کل کی شام کا انتظار کرنے لگی تھی۔

کل کی شام اپنے ساتھ اس کے لیے بہت ساری خوشیاں لائے گی، اس کی محبت یک طرفہ نہیں ہے۔ وہ خود کو یقین دلا رہی تھی۔ سکندر نے اس کی خاطر اپنی جان خطرے میں ڈالی تھی، اس نے اس کے لیے اپنا خون بہایا تھا، اس نے اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔

کیسے مان لے کہ وہ سب فریب تھا؟ اس کے سچے اور بہت انمول جذبے اتنے بے وقعت نہیں ہوسکتے تھے کہ سکندر انہیں سمجھے بغیر، اس سے کچھ بھی کہے بغیر واپس چلا جاتا۔

کل وہ اس سے کچھ نہ کچھ من چاہا ضرور کہہ کر جائے گا۔

سکندر شہریار کوئی آس، کوئی امید، کوئی وعدہ اس کی جھولی میں ڈالے بغیر یہاں سے جا ہی نہیں سکتا۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک آس اور نراس میں گھری سکندر کی دعوت کی تیاری کررہی تھی، دل اچانک ہی اداسیوں میں گھرنے لگتا، پھر اچانک ہی پرامید سا ہونے لگتا۔ نینی کے ساتھ مل کر وہ ایک بہت اچھی اور شاندار سی دعوت کا اہتمام کررہی تھی، جس میں پاکستانی کھانے بھی تھے اور اٹالین بھی۔ پاکستانی کھانے بنانے اسے نہیں آتے تھے، مگر کھاتی شوق سے تھی۔

پاکستانی ڈشز نینی بنا رہی تھیں۔ اٹالین ڈشز وہ تیار کررہی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل پر اس نے گلدان میں تازہ پھول سجا دیے تھے۔ میز پر نیپکنز، پلیٹس، چھری، کانٹے سب کچھ سلیقے اور ترتیب سے رکھ دیا تھا۔ وہ خود بھی ٹخنوں تک آتا لمبا سیاہ اسکرٹ اور گلابی سادہ شرٹ پہن کر تیار ہوچکی تھی۔

بیل کی آواز سنتے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔ کیا پتا وہ۔۔۔ کیا پتا وہ آج اس سے وہ کہہ دے، جو وہ اس کے لبوں سے سننا چاہتی ہے۔ اپنے اپارٹمنٹ کا دروازہ سکندر کے لیے کھولتے ہوئے وہ جانتی تھی کہ اس کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا ہے۔

"چاؤ سینوریتا۔" جینز اور ٹی شرٹ پہنے مسکراتا ہوا وہ اس کے سامنے تھا۔

اس کے ایک ہاتھ میں خوب صورت پھولوں کا گلدستہ تھا اور دوسرے میں دو خوب صورت اور فینسی شاپنگ بیگز۔ ایک الگ سے شاپر اور بھی تھا۔

"چاؤ۔" وہ مسکراتے ہوئے سامنے سے ہٹی اور اسے اندر آنے کے لیے راستہ دیا۔

"یہ تمہارے لیے۔" وہ دروازہ بند کرکے مڑی تو سکندر نے پھول اور ایک شاپنگ بیگ اسے پکڑا دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"اپنی رومن دوست کے لیے ایک چھوٹا سا تحفہ۔" وہ مسکرا کر بولا۔ وہ پھولوں کی خوشبو سونگھنے لگی تھی۔ وہ دونوں لونگ روم میں آکر صوفے پر بیٹھ گئے تھے۔ لیزا سکندر کے لائے تحفے دیکھنے لگی تھی۔ وہ اس کے لیے فائن آرٹس ۔۔۔ پر ایک بہت مہنگی اور نایاب کتاب تحفے میں لایا تھا۔ بہت قیمتی لکڑی سے بنا ایک پورٹیبل ایزل کا سیٹ بھی تھا جس میں پینٹس برشز اور پلیٹ وغیرہ کو رکھنے کے لیے خوب صورت

خانے بنے ہوئے تھے۔ دو عدد قیمتی پرفیومز تھے ' ایک مہنگا سا پین کا سیٹ تھا اور ساتھ میں چاکلیٹس کا ایک ڈبہ تھا۔

"یہ ایک تحفہ ہے؟" وہ ابھی اس کے لائے تحفوں کو دیکھ رہی تھی کہ کچن سے نینی بھی وہیں آگئیں۔

"آگئے بیٹا؟"

"السلام علیکم۔" سکندر انہیں دیکھ کر احتراماً" کھڑا ہوا تھا۔

"وعلیکم السلام ' جیتے رہو۔" نینی نے دعا دیتے ہوئے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا تھا۔ آج کے اس ڈنر کی تیاری میں نینی نے اس کا ساتھ اتنی ہی خوشی سے دیا تھا جتنی خوش وہ تھی۔ اسے کئی بار شک سا ہوا تھا کہ شاید نینی اس کی کیفیات کو سمجھ رہی ہیں۔ انہوں نے زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا ' مگر ڈنر کی تیاری انہوں نے جس جوش و خروش سے کی اور ابھی سکندر کو دیکھ کر جو خوشی ان کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی ' وہ اسے اس شک میں مبتلا کر رہا تھا کہ نینی کو کچھ نہ کچھ اندازہ ہے اس کی سوچوں کا۔

دوسرا شاپنگ بیگ سکندر نے نینی کو دیا تھا۔ وہ ان کے لیے بھی پرفیوم اور گھر میں سجانے کے لیے چند ڈیکوریشن پیس لایا تھا۔ تیسرا شاپر جو سکندر نے سینٹر ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ اس میں ناشپاتیاں تھیں۔ اسے اس کی پسند یاد رہی تھی۔ وہ اس کے لیے اس کی پسند کا پھل لے کر آیا تھا۔

"خیر سے آج رات روانگی ہے بیٹا؟"

"جی آنٹی! صبح ہی ہو جائے گی۔" نینی نے تحفہ لیتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھے سکندر سے پوچھا۔

سکندر بڑے اخلاق سے انہیں جواب دے رہا تھا۔ جتنی دیر نینی اس سے بات کر رہی تھیں ' وہ ان کی طرف متوجہ تھا ' وہ اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ بہت سادہ اور عام سے انداز میں مسکرا کر بول رہا تھا۔ اسے نینی کے دیکھنے کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ اسے اور سکندر کو صوفے پر ساتھ بیٹھا بہت غور سے دیکھ رہی تھیں۔

"نینی! آپ اور سکندر باتیں کریں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔" وہ صوفے پر سے اٹھنے لگی تھی۔

پتا نہیں کیوں اسے رونا آنے لگا تھا۔ اسے سامنے رکھے سکندر کے لائے تحفے الوداعی تحفے لگ رہے تھے۔ جیسے وہ اس سے بچھڑنے سے پہلے ' اسے الوداع کہنے سے پہلے اپنی کچھ خوب صورت یادیں ان تحفوں کی صورت میں اس کے پاس چھوڑ جانا چاہتا تھا۔ وہ دوستانہ انداز میں اسی طرح باتیں کر رہا تھا جس طرح کیا کرتا تھا۔ پھر بھی اس کے بیٹھنے کا انداز وداع ہونے والا لگ رہا تھا۔

"تم دونوں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کھانا میں لگاتی ہوں۔" نینی اسے کندھے پر ہاتھ رکھ کر واپس بٹھاتے ہوئے بولیں۔ اور کچن میں چلی گئیں۔

"کہاں کھو گئیں؟" اسے گم صم سا بیٹھا دیکھ کر سکندر نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" وہ زبردستی ہلکا سا مسکرائی۔

"چپ چپ سی لگ رہی ہو آج ' تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" اس نے جیسے ایک دوستانہ سی فکر مندی ظاہر کی تھی۔ وہ اس کی طرف بغور دیکھ رہا تھا۔

"کیا تمہیں پتا نہیں چل رہا کہ میں کیوں چپ ہوں؟ میں کیوں اداس ہوں؟" اس کا دل چاہا تھا وہ سکندر سے چیخ کر پوچھے ' اسے جھنجھوڑے۔

"ہاں آج صبح سے طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔" وہ بول سکی تو مسکرا کر محض اتنا ہی۔

"تو سینوریتا! تمہیں اس ڈنر کو ملتوی کر دینا چاہیے تھا۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی تو آرام کرتیں۔"

وہ اتنے اطمینان سے اسے یہ حل بتا رہا تھا کیا اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ وہ آج یہاں سے چلا جائے گا۔

"صبح میں طبیعت ٹھیک نہیں تھی ' اب بالکل ٹھیک ہے ' آؤ میں تمہیں تمہاری پینٹنگ دکھاؤں۔"

وہ یک دم ہی صوفے سے اٹھی تھی۔ سکندر اس کے پیچھے اٹھا۔ چکردار زینے پر چڑھ کر وہ دونوں اوپر آگئے تھے۔ وہ سکندر کی تصویر کی نوک پلک بھی سنوار چکی تھی ' اب وہ ہر اعتبار سے مکمل تھی۔ کسی اور حوالے سے بھی یہ پینٹنگ اس کے دل کے بہت قریب تھی ' مگر ایک آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے بھی وہ جانتی تھی ' یہ اس کی ایگزیبشن میں رکھی جانے والی تصاویر میں سب سے بہترین اور بے مثال تصویر ہو گی۔ کام تو وہ ہر تصویر پر ہی دل سے کیا کرتی تھی ' مگر یہاں شاید دل کی دھڑکنیں بھی اس تصویر کے ساتھ ہم آہنگ ہو گئی تھیں۔

"واؤ! گریٹ۔ کیا میں اتنا خوب صورت ہوں لیزا؟" وہ تصویر کی تعریف کرتے کرتے شرارتی انداز میں بولا تھا۔

"نہیں ' میں نے تمہیں خوب صورت پینٹ کیا ہے ' اس لیے خوب صورت لگ رہے ہو۔" وہ اس کی شرارت کا شرارت بھرے ہی انداز میں جواب دیتے ہوئے بولی تھی۔

"تم واقعی کمال کی آرٹسٹ ہو لیزا! صرف میں ہی نہیں بلکہ فاؤنٹین اور اس سے گرتا پانی سب کچھ جیسے زندہ ہو کر پھر سے سامنے آگیا ہے ' جیسے میں کسی پینٹنگ کے سامنے نہیں بلکہ حقیقت میں Trevi میں اس فاؤنٹین کے سامنے بیٹھا خود کو دیکھ رہا ہوں۔"

وہ سچے دل سے اس کے آرٹ کی توصیف کر رہا تھا۔ اپنا آرٹ اس پل اسے بالکل بے معنی اور حقیر لگ رہا تھا۔ اپنی کوئی خوبی اس پل خوبی نہیں لگ رہی تھی۔ اگر وہ اتنی ہی اچھی ہوتی ' اگر وہ اتنی ہی خوبیوں کی مالک ہوتی تو کیا اسے اچھی نہ لگ جاتی؟ تب کیا وہ اسے پردیس میں ملی ' چند روزہ ایک دوست سمجھ کر یوں الوداع کہہ پاتا؟

"لیزا ' سکندر آجاؤ بیٹا کھانا لگ گیا ہے۔" شاید اس کی آنکھیں نم ہونے لگی تھیں ' جب زینے کے نیچے سے کھڑے ہو کر نینی نے ان دونوں کو آواز دی تھی۔ سکندر کی نگاہیں ہنوز اپنی تصویر پر تھیں ' وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ نینی کی آواز اس نے بھی سن لی تھی۔

"کیا تم نے میری آنکھوں کے وہ تمام تاثر پینٹ کر لیے جو کرنا چاہتی تھیں؟" پینٹنگ سے نگاہیں اٹھا کر اس نے اس سے پوچھا۔

"میرے خیال سے تو کر لیے ہیں ' خیر چھوڑو اسے ' چلو نیچے چلتے ہیں ' نینی کھانے کے لیے بلا رہی ہیں۔" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرا کر بولی تھی۔ سکندر نے سر اثبات میں ہلایا تھا۔

"چلو۔" وہ دونوں کھانا کھانے کے لیے نیچے آگئے تھے۔

"آپ لوگوں نے تو واقعی میری دعوت کر دی ' اتنے زیادہ تکلف کی کوئی ضرورت تھی تو نہیں۔ میں خود کو یہاں مہمان سمجھ کر بالکل نہیں آیا تھا۔"

سکندر کھانے کی میز پر چنے انواع و اقسام کے کھانوں کو دیکھ کر بولا تھا۔ نینی اس کی خاطر تواضع بڑے دل سے کر رہی تھیں۔ انہوں نے تندوری چکن کا ایک پیس کاٹ کر اس کی پلیٹ میں رکھا۔

"ہم کبھی تمہیں مہمان نہیں سمجھتے۔ دوبارہ جب بھی روما آؤ ' اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھ کر آنا۔"

نینی نے اس سے مسکرا کر کہا تھا۔ پُر تکلف کھانے کے بعد نینی نے پوچھا۔

"اب کیا چلے گا کافی یا گرین ٹی؟" وہ کھانے کے دوران زیادہ وقت خاموش رہی تھی ' مگر اس کی خاموشی بھی زیادہ محسوس نہیں ہوئی تھی کہ نینی سکندر سے باتیں کر رہی تھیں ' وہ صرف خاموشی سے مسکراتی رہی تھی ' جیسے ان دونوں کی گفتگو میں بھرپور دلچسپی لے رہی ہو۔

"کچھ بھی نہیں آنٹی! میں بس اب چلوں گا۔ میری پیکنگ تھوڑی رہتی ہے۔ ایکچوئیلی! آفس سے لیٹ آیا تھا ' میری پیکنگ پوری نہیں ہو سکی۔"

سکندر، نینی کے استفسار پر مسکرا کر بولا تھا۔ وہ تینوں میز پر سے اٹھ گئے تھے۔
"اتنے مزے کا آپ نے مجھے کھانا کھلایا ہے کہ اب فلائٹ پر بھی کچھ نہیں لوں گا۔ کل دوپہر سے پہلے تو اب میرا کچھ بھی کھانے کا دل نہیں چاہے گا۔"
وہ نینی سے خوش گوار اور با اخلاق سے انداز میں خدا حافظ کہہ رہا تھا۔
"جیتے رہو بیٹا۔ اللہ خیریت سے تمہیں تمہارے گھر پہنچائے۔" نینی نے پُر شفقت انداز میں اسے دعائیں دیں۔
"تم کیسے جاؤ گے سکندر! میں تمہیں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"
اپارٹمنٹ کے دروازے تک نینی بھی ان دونوں کے ساتھ ہی آئی تھیں۔
"اس کی ضرورت نہیں لیزا۔ آج آفس کی گاڑی مجھے ملی ہوئی ہے۔ نیچے آفس کا ڈرائیور میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہی مجھے ایئرپورٹ بھی چھوڑے گا۔"
وہ جیسے اسے پہلے ہی سے بتا رہا تھا کہ اس کی ایئرپورٹ روانگی کا بھی بندوبست ہو چکا ہے، مبادا وہ چلنے کو کہہ دے۔ نینی نے سکندر کو وہیں سے ہی خدا حافظ کہہ دیا تھا، جبکہ وہ اس کے ساتھ نیچے جا رہی تھی۔
سکندر پُر سکون، مطمئن اور بہت خوش سا نظر آ رہا تھا۔ اس کی سوچوں سے انجان اسے اپنے گھر، اپنے شہر اور اپنے ملک جانے کی جلدی تھی، خوشی تھی۔ وہ آنسوؤں کو اپنے دل پر گرتا محسوس کر رہی تھی۔ وہ جو بہت پیارا ہو، اس سے بچھڑنا کیسا ہوتا ہے۔
وہ یہ درد پہلی بار تو نہیں سہہ رہی۔ زندگی یہ درد تو اسے پہلے بھی دے چکی ہے۔ اس سے اس کا پیارا گھر چھینا تھا، اس سے اس کی بہت پیاری بہن بچھڑی تھی۔ تقدیر نے اس کی زندگی میں بار بار یہ درد سہنا لکھا ہے۔
پھر وہ آج کیوں ٹوٹ رہی ہے؟ آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ اپنے حوصلوں کو مضبوط کر رہی تھی۔

وہ دونوں چلتے ہوئے اس کے اپارٹمنٹ کی پارکنگ میں آ گئے جہاں سکندر کے آفس کی گاڑی کھڑی تھی۔
"اوکے۔ سینوریناً لیزا! میں چلوں؟" گاڑی کے پاس آ کر رکتے ہوئے وہ اس سے بولا۔
"جاؤ سینور سکندر۔" اس نے خود کو بہادری اور ہمت کے تمام بھولے ہوئے سبق یاد دلا کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔
سکندر نے بڑی گرم جوشی اور خلوص سے اس کا ہاتھ تھاما۔
"کیا میں تمہارا شکریہ ادا کروں؟" اس نے اس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔
"نہیں۔" وہ اندر ہی اندر رو رہی تھی، مگر اوپر سے بہادری سے مسکرا رہی تھی۔
"لیزا! تمہارا روما واقعی بہت خوب صورت ہے، بہت اچھا ہے، میں نے یہاں اپنی زندگی کے چند بہت ہی یادگار دن گزارے ہیں۔ روما کی ہسٹری، آرٹ، آرکیٹیکچر، فوڈ، موسم اور لیزا... سب بہت بہت اچھے ہیں۔"
وہ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ لا کر کہہ رہا تھا۔ اس کا ہاتھ ابھی تک سکندر کے ہاتھ میں تھا۔
"میں نے Trevi میں Coin نہیں اچھالا تھا، پھر بھی میری خواہش ہے میں زندگی میں دوبارہ روما ضرور آؤں اور لیزا سے بھی ملوں۔" وہ اس کا ہاتھ تھامے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں اس سے الوداعی جملے کہہ رہا تھا۔
"خیر سکہ نہیں بھی اچھالا، تب بھی کیا ہوا؟ تم قسمت پر بہت یقین رکھتی ہو، کیا پتا قسمت ہمیں پھر ملوا دے، کسی کام سے تم وہاں آ جاؤ یا کسی کام سے میرا روما یا لندن آنا ہو جائے اور یوں اتفاقیہ ہماری پھر ملاقات ہو جائے۔"
وہ ہنس کر بولا تھا۔

"بس یہی؟ تم اور کچھ بھی نہیں کہو گے؟ یوں ہی چلے جاؤ گے؟"
اس کی آنکھوں کی سطح گیلی ہونے لگی تھی۔ وہ کمال ہمت سے مسکرا رہی تھی کہ اپنا بھرم اسے بہت عزیز تھا۔ جب اس کے دل میں اس کی محبت نہیں تھی تو کچھ کہہ کر اپنا بھرم اپنی عزت گنوانا اسے ہرگز منظور نہ تھا۔
"اگر کبھی دوبارہ آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا لیزا!" سکندر نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
"ہاں ضرور۔" اس نے مسکرا کر سر ہاں میں ہلایا تھا۔
وہ دوبارہ آ کر اس سے کہاں ملے گی، کس پتے پر ملے گی، یہ بتانے کی زحمت گوارا کیے بغیر وہ اسے دوبارہ آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ ایک زخمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھر آئی تھی۔ سکندر گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ سکندر نے اسے ہاتھ ہلا کر خدا حافظ کہا تھا۔
"کیا یہ شخص اب مجھے زندگی بھر کہیں نظر نہیں آئے گا؟ کبھی نہیں ملے گا؟" وہ اسے ہاتھ ہلا کر جواباً خدا حافظ کہہ رہی تھی۔ وہ اس کی گاڑی کو اپنے اپارٹمنٹ سے نکلتا ہوا دیکھ رہی تھی۔
جیسے ہی سکندر کی گاڑی نگاہوں سے اوجھل ہوئی، آنکھوں میں کب سے رکے آنسو یک دم ہی بہہ نکلے۔ وہ اپنا کوئی بھی اتا پتا، نشان چھوڑے بغیر اس سے رخصت ہو گیا تھا، وہ اس سے اس انداز میں رخصت ہو کر گیا تھا جیسے اب زندگی بھر وہ دونوں شاید ہی کبھی ایک دوسرے سے دوبارہ مل پائیں گے اور وہ دوبارہ بھی اگر کبھی آئی تو اتفاقاً آئے گی۔ وہ خود سے اس سے پھر ملنے کی کوئی چاہ نہیں رکھتا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ شکستہ قدموں سے واپس اوپر آ گئی تھی۔ وہ سیدھی اپنے کمرے میں گئی تھی۔ وہ اس وقت بالکل تنہا رہنا چاہتی تھی۔ بالکل گم صم، وہ جیسے ہاری ہوئی

بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو گر رہے تھے، چند لمحوں کے بعد کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ نینی اندر آئی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر انہیں نہیں دیکھا تھا۔

"چلا گیا سکندر؟" اس کے پاس بیٹھ کر انہوں نے آہستگی سے پوچھا۔

"جی۔" اس نے آنکھوں سے گرتے آنسو بڑی سرعت سے صاف کیے۔

"ابھی اوپر آتے ہوئے پتا نہیں کس چیز سے ٹھوکر لگ گئی، بڑی زور سے چوٹ لگی ہے نینی!" بھرائی آواز میں اس نے جیسے انہیں اپنے آنسوؤں کی توجیہہ دینا چاہی۔

"تم نے اس سے کچھ کیوں نہیں کہا لیزا؟ جو تمہارے دل میں تھا، ایک بار ہمت کرکے بول تو دیتیں بیٹا!"

نینی اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

"نینی؟" وہ بس اتنا ہی کہہ پائی تھی۔

"تمہیں نو مہینے اپنی کوکھ میں نہیں رکھا، تمہیں پیدا نہیں کیا، مگر پالا تو ماں بن کر ہی ہے لیزا! ماں ہوں تمہاری۔ کیا ماں اپنی بیٹی کے دل کا حال بھی نہیں جانے گی؟ میں تو یہ بات اس وقت بھی جانتی تھی جب تم کہتی تھیں سکندر کی سب سے بڑی disqualification (خرابی) اس کا پاکستان سے تعلق ہونا ہے۔ بڑی ہنسنے، کھیلنے اور دوستیاں رکھنے والی ہے میری بیٹی مگر پھر بھی میں نے اسے پہلے کبھی کسی انجان شخص کے لیے آدھی رات کو روما سے نیپلز جاتے نہیں دیکھا تھا۔ کسی چند روزہ ملے ہوئے کسی شخص کے ایکسیڈنٹ کے ہونے پر یوں ہلکان ہوتے نہ دیکھا تھا، اس کی خاطر اپنے دن، رات، اپنا سونا، جاگنا، آرام سب کچھ بھول جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے گھر لاکر ٹھہراتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہو، اسے کوئی بات بری نہ لگ جائے، اس فکر میں مبتلا نہ دیکھا تھا۔"

وہ نینی کے نرم لہجے میں کہی باتیں سن کر یک دم ہی رو پڑی تھی۔

"جب سکندر یہاں ٹھہرا ہوا تھا اور تم نے ساری رات اس کے پاس لونگ روم میں فلور کشن پر بیٹھ کر گزار دی تھی، اس صبح جب میں فجر کے لیے اٹھی۔ میں وضو کرکے باہر نکلی تو تمہیں فلور کشن پر بے آرامی سے بیٹھے، صوفے پر سکندر کے نزدیک سر ٹکا کر سوتے دیکھ کر میرے دل کو کامل یقین مل چکا تھا کہ تمہاری سکندر کے لیے توجہ اور التفات وقتی نہیں بلکہ بہت گہری ہے۔ تمہیں میرا اس سے یہ پوچھنا برا لگا تھا کہ میں نے اس کی شادی اور منگنی کی بات کیوں پوچھی ہے۔ مگر لیزا! میں نے وہ سوال تمہارے لیے، تمہاری ماں بن کر سکندر سے پوچھے تھے۔۔۔ تم اس سے محبت کر رہی تھیں اور تمہیں اس کی ذاتی زندگی کی کوئی ایک بھی بات پتا نہیں تھی۔"

وہ بے اختیار نینی کے کندھے پر سر رکھ کر زار و قطار رو پڑی تھی۔

"ہاں، مجھے اس سے محبت ہوگئی تھی نینی! وہ میرے لیے بہت اہم بن گیا تھا مگر جو میں نے اس کے لیے سوچا، وہ اس نے میرے لیے کبھی بھی نہیں سوچا۔ اگر سوچا ہوتا تو یوں خاموشی سے چلا نہ جاتا؟ بنا کچھ کہے؟" وہ نینی کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"تو تم کہہ دیتیں لیزا! اس کے کچھ کہنے کا انتظار کیوں کرتی رہیں؟ تم بول دیتیں اپنے دل کی بات اس سے۔"

"اور اگر جواب میں وہ ہنس پڑتا، یہ کہہ دیتا کہ لیزا محمود! میں تمہیں اتنا امیچور نہیں سمجھتا تھا کہ محض چند دنوں کی ملاقاتوں کو محبت سمجھنے لگوگی، ایک وقتی تعلق کو عمر بھر کا رشتہ سمجھنے لگوگی۔ پھر نینی میں کیا کہتی؟ میں تو اپنی ہی نظروں میں گر جاتی اور اگر وہ یہ کہہ دیتا کہ اس نے مجھے ایک چند روزہ اور وقتی دوست سمجھا تھا، جس سے یہاں سے جاکر اس کا کوئی رابطہ رکھنے کا بھی ارادہ نہیں ہے؟"

وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔

"میں ہار گئی نینی! میں ہار گئی۔ محبت آپ کی لیزا کا نصیب نہیں۔ میرا گھر، ہیم اور اب سکندر۔ ایک ایک کرکے میں نے اپنی ہر محبت کھو دی ہے نینی!"

☼ ☼ ☼

اور زندگی میں پہلی بار اپنے روما کی گلیاں اسے اچھی نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کا کہیں دل نہیں لگ رہا تھا۔ پتا نہیں کیا ڈھونڈنے وہ اکیلی کلوزیم گئی تھی۔ وہ وہاں ادھر سے ادھر اکیلی پھری تھی۔ اسے وہاں اپنے گرد اس کی آوازیں سنائی دی تھیں۔

"رومن اتنے برے بھی نہیں ہوتے۔ میں ایک رومن لڑکی کو جانتا ہوں اور وہ کافی اچھی ہے۔" وہ کلوزیم سے نزدیک اس ریسٹورنٹ میں آگئی تھی جہاں انہوں نے ساتھ بیٹھ کر لنچ کیا تھا۔

"مجھے تو کوئی خوشی نہیں ہو رہی کہ جو لڑکی تازہ تازہ میری دوست بنی ہے۔ وہ ٹرک ڈرائیوروں والی اردو بولتی ہے۔" وہ ہر جگہ یہاں تک کہ وہ اکیلی نیپلز بھی دوبارہ چلی گئی تھی۔ پتا نہیں کس چیز کی کھوج میں، کس چیز کی تلاش میں۔ مگر جو اس نے کھو دیا تھا، وہ اس کو کہیں نہیں مل رہا تھا۔ وہ دن بھر میں جتنی بار آئینہ دیکھتی۔ اس کے کانوں میں سرگوشی ہوتی۔

"Bella (خوبصورت)۔" وہ جتنی بار اپنے اسٹوڈیو میں جاتی، اس کی پینٹنگ پر نظر پڑتی، اسے اس کی آواز اپنے بالکل نزدیک سنائی دیتی۔

"اور تم مجھے پینٹ کب کروگی؟" وہ اس پینٹنگ کو دیکھتے ہوئے رو پڑتی۔ نہ گھر کے اندر نہ گھر سے باہر اسے کسی بھی جگہ چین نہیں مل رہا تھا۔

محبت کیا ایسی ہی دل دکھانے والی چیز ہوتی ہے؟ کیا اس کے لیے دنیا کے تمام شاعروں نے اس قدر خوبصورت شعر کہے ہیں؟

مصوروں نے لاجواب شاہکار تخلیق کیے ہیں، موسیقاروں نے بے مثال دھنیں بنائی ہیں اور ناول نگاروں نے روح کو چھو لینے والے جملے تحریر کیے ہیں؟ محبت خوشی کب ہے؟ محبت تو فقط آنسو ہے، جیسے ایک آہ، ایک بددعا ہے، جسے لگ جائے اس کے دل کا چین اور سکون زندگی بھر کے لیے چھین لیتی ہے۔

وہ چاہتی تھی۔ اس کا ضدی دل اس تلخ سچائی کو مان لے کہ سکندر شہریار اس کے لیے نہیں تھا۔ وہ اسے دنیا کی بھیڑ میں اب دوبارہ کبھی نہیں ملے گا۔ کیونکہ وہ اس سے دوبارہ ملنا چاہتا ہی نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

وہ جائے نماز پر تھیں۔ ہمیشہ کی طرح ان کے سجدے طویل تھے اور دعائیں محض آنسو۔ وہ دعا مانگنے کے لیے جیسے ہی ہاتھ اٹھاتیں۔ لبوں سے کوئی لفظ ادا نہ ہو پاتا، فقط آنسو ہوتے جو قطار در قطار بہے چلے جاتے۔ اگر شدت غم سے کبھی کوئی لفظ نکلتے بھی تھے تو صرف "اللہ" اور "میرا بچہ۔"

وہ کب یاد نہیں آتا تھا، وہ کب ان کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ کوئی اسے یاد نہ کرے، سب اسے بھول جائیں مگر وہ تو اپنے بیٹے کو نہیں بھول سکتیں۔ ماں کے لیے تو اس کا بیٹا اگر قتل بھی کرکے آجائے تب بھی اس کا بیٹا ہی رہتا ہے۔ اس کی یاد کی تڑپ انہیں راتوں کو گہری نیند سے جگا دیا کرتی تھی، اس کی یاد انہیں ہنستے ہنستے رلا دیا کرتی تھی۔

دن بھر میں نجانے کتنی مرتبہ اسے یاد کرکے سب سے چھپ کر رویا کرتی تھیں۔ نجانے دنیا کی بھیڑ میں کہاں بھٹک رہا تھا ان کا بچہ، ان کی جان، ان کا سکندر۔ کسی کسی لمحے ایسی تڑپتی تھی ان کی ممتا کہ دل چاہتا تھا گھر سے نکل جائیں، اپنے بیٹے کو ڈھونڈنے، اسے کھوجنے۔ وہ مل جائے تو اسے بھینچ کر اپنے سینے سے لگالیں، اس کا سر اپنی گود میں رکھ لیں، بالکل اس طرح جیسے اسے بچپن میں اپنی گود میں بھر لیا کرتی تھیں۔ انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا رکھے تھے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

"اللہ! میرے بچے کی حفاظت فرما۔ اسے اپنی امان میں رکھ۔"

روتے ہوئے ٹوٹ ٹوٹ کر لفظ ان کے لبوں سے ادا

ہورہے تھے۔

وہ فون پر کہہ رہا تھا "میں ٹھیک ہوں' میں خوب گھوم پھر رہا ہوں' میں آفس کے بعد سارا ٹائم سیر و تفریح میں گزارتا ہوں۔"

مگر وہ ماں جانتی تھی کہ اس کا بیٹا جھوٹ بول رہا ہے' محض اس کا دل خوش کرنے کے لیے۔ وہ جس پل اپنے خوش اور مطمئن ہونے کی خبر انہیں دے رہا تھا' انہیں اس کی آواز تکلیف اور درد سے بھری لگ رہی تھی۔

اس روز ان کا دل بہت گھبرا رہا تھا تب ہی انہوں نے اسے فون کیا تھا ورنہ بہت جلدی جلدی ان کی سکندر سے فون پر بات نہیں ہوتی تھی کہ اس سے بات ہونے پر خود کو سنبھالنا' اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا ہمیشہ ان کے لیے بے حد کٹھن ہوا کرتا تھا۔

وہ اٹلی میں تھا' اور اپنے آفس کے کام سے روم گیا ہوا تھا' مگر وہ وہاں ٹھیک نہیں تھا۔ یہ ان کی ممتا انہیں بتا رہی تھی۔ کچھ ہوا تھا ان کے بیٹے کو' اس کی آواز میں تکلیف وہ کیوں کر محسوس نہیں کر سکتی تھیں؟ لاکھ وہ اسے ہنسی اور خوشگواریت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتا۔ کہیں چوٹ لگی تھی ان کے بیٹے کو یا وہ بیمار تھا۔ وہ روتے ہوئے بے آواز اس کی صحت' تندرستی' لمبی عمر اور خوشیوں کے لیے دعائیں مانگ رہی تھیں۔ اب ان کے سکندر کو بھی خوشیاں ملنی چاہیے تھیں۔

اور کتنی سزا کاٹے گا وہ؟ مقررہ مدت زندان میں گزارنے کے بعد تو بڑے سے بڑے مجرم بھی معاف کر دیے جاتے ہیں' ان کے بیٹے کی سزا کب ختم ہو گی؟

ان کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا تھا۔ انہوں نے گھبرا کر جلدی سے آنسو صاف کیے۔ وہ جائے نماز لپیٹتے ہوئے اٹھی تھیں۔

"آجاؤ۔" انہوں نے مصنوعی مسکراہٹ اپنے لبوں پر سجائی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر زین اندر آیا۔

"السلام علیکم اموجان!" وہ مسکراتے ہوئے ان کے نزدیک آگیا۔

"وعلیکم السلام!" پیار بھری نگاہوں سے انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹے کو دیکھا۔ اب ان کے لبوں پر سچی مسکراہٹ تھی۔ جیسے چھوٹا بیٹا ان کی نگاہوں کے سامنے رہتا ہے' اسی طرح ان کا بڑا بیٹا کیوں نہیں رہتا؟

"جلدی واپس آگئے بیٹا۔" دل میں درد سا جاگا تھا۔ زین یہاں ہے پر وہ کیوں نہیں؟ انہوں نے بیٹے کی پیشانی چومی۔

"جی اموجان! بس وہ علی کی طبیعت کا سن کر مجھ سے مزید رکا نہیں جا سکا۔"

اور آمنہ شہریار خان اپنے بیٹے کو دیکھتی رہ گئی تھیں۔ ان کا بیٹا اپنے بیٹے کے موسمی نزلے زکام کا سن کر اپنے سب کام چھوڑ چھاڑ بھاگا بھاگا سنگاپور سے واپس آگیا تھا۔

ان کا' آمنہ شہریار خان کا بیٹا بھی تو بیمار تھا' ان کا بیٹا تو برسوں سے تنہا تھا' زین سے چار دن بیٹے کی جدائی برداشت نہیں ہوئی تھی۔ انہیں تو زمانے بیت گئے تھے اسے گلے سے لگائے ہوئے' اسے پیار کیے ہوئے' اسے جی بھر کر دیکھے ہوئے۔ ان کی خاموش نگاہوں میں اس پل ایک شکوہ در آیا تھا۔

"مل لیے علی سے؟" انہوں نے ایک گہری سانس لے کر موضوع تبدیل کیا۔

"جی' آتے ہی سب سے پہلے علی سے ملا ہوں اور پھر سیدھا آپ کے پاس آیا ہوں۔ پاپا کہاں ہیں؟" زین مسکرا کر بولا۔

"اسٹڈی میں ہیں۔" انہوں نے نماز کے لیے بندھا دوپٹہ کھولتے ہوئے اسے بتایا۔

"اچھا! میں پاپا سے بھی مل لوں۔" وہ ان کے چہرے کو پیار سے دیکھ کر کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکلا تھا۔

انہوں نے سرد آہ بھر کر زین کو جاتے ہوئے دیکھا۔ ایک بیٹا نگاہوں کے سامنے ہے اور ایک نگاہوں سے اتنا دور' اتنا اوجھل' جیسے وہ کبھی ان کی زندگیوں کا حصہ تھا ہی نہیں؟

☆ ☆ ☆

وہ کھانے کی میز پر بھی خاموش بیٹھی تھیں۔ ان کا شوہر، بیٹا، بہو، پوتا سب کھانے کی میز پر موجود ہیں۔ وہ اپنے شوہر اور اپنے بچوں کے ساتھ ہیں، پھر آخر وہ خوش کیوں نہیں ہیں؟ اس لیے کہ اس میز پر وہ موجود نہیں ہے۔ وہ بھی یہاں بیٹھا ہوتا تو یہ منظر کتنا مکمل لگتا۔

ساری زندگی شوہر کی اطاعت گزاری کی تھی، خاموش سر جھکائے رہی تھیں اس لیے اب بھی ان کی خاموشی کسی کو زیادہ محسوس نہیں ہوا کرتی تھی۔ وہ تو برسوں سے مہر بہ لب تھیں۔ نہ کوئی شکوہ نہ شکایت۔

"دادی جان! پاپا میرے لیے اتنی بڑی اسپورٹس کار لائے ہیں۔" ان کے ڈھائی سال کے پوتے نے ماں کے ہاتھوں سے چاول کھاتے ہوئے بڑے جوش سے انہیں بتایا۔

وہ اسے دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی تھیں۔ اب صرف ایک وہی تھا جسے دیکھ کر جس کی توتلی زبان میں اس کی میٹھی میٹھی باتیں سن کر دل خوش ہوا کرتا تھا۔ تھا بھی وہ بلا کا ذہین۔ ڈھائی سال کی عمر میں چار سے پانچ سال کے بچے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ اپنے دادا اور پاپا کی ذہانت اس نے وراثت میں لے لی تھی۔

"واہ بھئی واہ۔ مزے آگئے میرے بیٹے کے۔" وہ ہنس کر بولی تھیں۔

"دادا جان! آپ دیکھیں گے میری اسپورٹس کار؟"

"اگر علی دکھائے گا تو ہم ضرور دیکھیں گے۔" شہریار خان کا سخت، بے لچک اور سرد انداز بھی پوتے کو دیکھ کر مسکراہٹوں میں بدل جایا کرتا تھا۔ وہ شوہر کو مسکرا کر پوتے سے باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ یوں مسکراتے ہوئے بھی دل کے اندر کہیں ماتم ہوا تھا، آنسو بہہ نکلنے کو بے قرار تھے۔ خوشی کے لمحوں میں بھی ان سے خوش ہوا نہیں جاتا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنی جس نمائش کی پرجوش تیاری وہ اس بار روما میں کر رہی تھی اس کا سرے سے اس سے دل ہی اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے اپنی تصاویر، اپنی نمائش یہاں تک کہ اپنا آرٹ بھی سب کچھ بے معنی اور بے کار لگ رہا تھا۔ اگر اس کا سولو شو ناکام ہو گیا تو بھی کیا فرق پڑے گا؟ اور اگر کامیاب ہو گیا تب بھی زندگی میں کیا تبدیلی رونما ہو جائے گی؟ نہ کامیاب ہونے سے نہ ناکام ہونے سے، وہ تو اسے کسی بھی طرح نہیں ملنے والا تھا۔

کئی دنوں سے اس کی سیم سے بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ قنوطیت اور ڈپریشن اس پر ایسا طاری تھا کہ کچھ دنوں سے اس نے اپنا سیل سرے سے آف رکھا تھا۔ اس کے سیل پر کئی بار ٹرائی کرنے کے بعد سیم نے گھر کے نمبر پر کال کی تو وہ گھر پر موجود نہیں تھی۔ وہ سینڈرا کے ساتھ اوپیرا دیکھنے گئی ہوئی تھی اس خیال سے کہ شاید یونہی اس کا دل بہل جائے۔ وہ واپس آئی تو نینی سے اسے سیم کے فون کا پتا چلا تھا۔ اپنے ڈپریشن میں وہ سیم کو بھول ہی گئی تھی۔ سیم یقیناً اس کے لیے پریشان ہو رہی ہو گی۔ اس نے اسی وقت سیم کا نمبر ملایا تھا۔

"کہاں ہو لیزا؟ میں کتنا پریشان ہو رہی تھی تمہارے لیے۔ تمہارا سیل کیوں آف تھا؟"

اس کی آواز سنتے ہی وہ بے چینی سے بولی۔

"میں ٹھیک ہوں سیم!" وہ مختصر لفظوں میں بس اتنا ہی کہہ پائی۔

بچپن سے اپنی ہر بات اس سے شیئر کرنے کی ایسی عادت تھی کہ اس وقت جب یہ سوچ بیٹھی تھی کہ اس بے کار قصے کا سیم سے ذکر نہیں کرے گی، خوامخواہ دور بیٹھی سیم اس کے لیے پریشان ہو جائے گی تب اس کی آواز سنتے ہی گلا رندھ گیا تھا۔

"لز! کیا ہوا ہے سوئٹ ہارٹ! تم رو رہی ہو؟" وہ بے قراری سے بولی۔

"سیم!" وہ بھرائی آواز میں بولی۔ "سیم مجھ سے پینٹ نہیں کیا جا رہا۔ میری ایگزیبیشن کا کیا ہو گا؟ اتنے کم دن رہ گئے ہیں۔"

اسے رونا کسی اور بات پر آ رہا تھا اور رو کسی اور چیز کا نام لے کر رہی تھی۔

"لز! کیا ہوا ہے۔ تم رو کیوں رہی ہو؟ پچھلے کئی دنوں سے تم سے بات کر رہی تھی تو تم مجھے اتنی خوش لگ رہی تھیں۔ مجھ سے شیئر نہیں کر رہی تھیں، مگر تمہارے لہجے کی کھنک اور تمہاری بے وجہ ہنسی مجھے بتا رہی تھی کہ کچھ ایسا ہوا ہے تمہاری زندگی میں جو تمہیں خوش کر رہا ہے، پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ کوئی آ گیا ہے میری بہن کی زندگی میں، کوئی ہے جو میری بہن کو اچھا لگنے لگا ہے۔"

"مگر میں اسے اچھی نہیں لگتی سیم۔" وہ رو پڑی اسے پتا تھا کہ وہ بچکانہ حرکت کر رہی ہے، مگر بہن کے سامنے بھی نہ روتی تو پھر اور کہاں جا کر روتی؟ سیم جواباً ایک پل کے لیے بالکل چپ ہو گئی تھی یوں جیسے سوچ رہی ہو کہ اس انکشاف پر خوش ہو یا بہن کے رونے پر دکھی؟

"لز! وہ کون ہے؟" ایک پل کی خاموشی کے بعد اس نے بہت آہستہ آواز میں پوچھا۔

"وہ اپنے آفس کے کام سے یہاں آیا تھا۔ میں اس سے پہلی بار ملی تو میرا دل خود بخود ہی اس کی طرف کھنچنے لگا تھا۔ میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی مگر وہ مجھے اچھا لگنے لگا تھا۔ ان فیکٹ میں اب بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی مگر اسے بھولنا میرے لیے ناممکن ہے سیم۔ حالانکہ وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے جا چکا ہے۔"

اس کے تصور میں سکندر کا چہرہ آ رہا تھا، مسکرا کر اس سے بات کرتا، کبھی اداس، کبھی قہقہہ لگا کر ہنستا۔ اس کے چہرے کو تصور میں دیکھتے وہ رونا بھول گئی تھی۔ وہ سکندر کے چہرے کو تصور میں دیکھتی سیم کو مزید بتا رہی تھی۔

"وہ لائر تھا، اس کا تعلق پاکستان سے تھا۔"

"وہ پاکستانی ہے؟" سیم اس کی بات کاٹ کر قدرے بے اعتباری سے بولی۔ جیسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

"ہاں۔"

"اور تم ایک پاکستانی مرد کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہو لز؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تم اتنی بے وقوف کیسے ہو سکتی ہو؟ میں پاپا کے خلاف کچھ کہنا چاہتی ہوں اور نہ ہی ہاشم کے خلاف۔ مگر لز! کیا ہم بہنوں نے اپنی زندگیوں میں اتنے پاکستانی مرد بھگت نہیں لیے کہ ہم یہ سمجھ سکیں۔ یہ لوگ فطرتاً کس قدر خود غرض اور بے حس ہوتے ہیں؟"

سیم بہت دکھ اور بے یقینی سے بول رہی تھی۔ اسے جیسے اس سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی۔

"سیم! میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا۔ محبت سوچ سمجھ کر نہیں کی جاتی سیم! مجھے یاد ہے تمہاری شادی کے وقت میں نے کہا تھا، میں پاپا کو یہ خوشی کبھی نہیں دوں گی کہ ان کی خواہش کے مطابق کسی پاکستانی مرد سے شادی کر لوں۔ مجھے اپنی سب باتیں یاد ہیں سیم! مگر محبت کر لینے سے وہ کوئی مجھے مل تو نہیں گیا نا؟ وہ تو مجھے ہمیشہ کے لیے خدا حافظ کہہ کر جا چکا۔ میری زندگی سے نکل چکا۔ پھر اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ پاکستانی تھا یا کسی اور ملک سے؟ یہ تو میں صرف تم سے شیئر کر رہی ہوں۔ پاپا کو تو یہ بات کبھی پتا بھی نہیں چلے گی۔"

ہاں، محبت کر لینے سے وہ کون سا اسے مل گیا تھا، کون سا وہ اس سے محبت کرتا تھا، کون سا اس کے کوئی رابطہ رکھنے کی امید تھی جو وہ سیم کو سمجھانے اور اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کرتی کہ تمام پاکستانی مرد برے نہیں ہوتے۔

اگر ان بہنوں کا گھر اور سیم کی زندگی پاکستانی مردوں کی وجہ سے برباد ہوئی تھیں تب بھی یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا نا کہ تمام پاکستانی مرد ہاشم اسد اور محمود خالد جیسے ہوتے ہیں۔ سیم کو قائل کرنا بے معنی تھا کہ جس کے لیے وہ اسے قائل کرنا چاہتی وہ تو کئی روز ہوئے زندگی ہی سے جا چکا تھا ہمیشہ کے لیے۔

"وہ میری زندگی سے جا چکا ہے سیم۔ وہ میری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خود کو بہت دور لے جا چکا ہے۔" گلوگیر لہجے میں بولتے ہوئے اس نے فون بند

کردیا تھا۔ وہ فون بند کرنے کے بعد بہت اداس اور خاموش بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا لیزا؟ کیا کہہ رہی تھی سیم؟" نینی کچن کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سیدھی اس کے پاس آئی تھیں۔

"وہ خفا ہو رہی تھی اس بات پر کہ میں نے کسی پاکستانی مرد سے یک طرفہ محبت بھی کیوں کی۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس کر بولی۔

"دماغ خراب ہے اس لڑکی کا۔"

"سیم اپنے لحاظ سے بالکل ٹھیک بات کہہ رہی تھی نینی! اگرچہ یہ محبت بالکل بے کار ہے، جس کے لیے یہ بحث ہو رہی ہے، وہ تو کب کا جا بھی چکا۔ پھر بھی سیم کی زندگی جس طرح برباد کی گئی ہے، اس کے بعد وہ کیسے کسی پاکستانی مرد کو اچھا سمجھ سکتی ہے۔ وہ تو یہ چاہے گی کہ میں کسی پاکستانی کے پیچھے اس کی محبت میں یک طرفہ طور پر بھی مبتلا ہو کر اداس ہو کر اپنا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کروں۔" وہ اداس لہجے میں بولی تھی۔

"کیا برباد ہوئی ہے سیم کی زندگی لیزا؟ ماشاء اللہ پیسے میں کھیل رہی ہے۔ دولت، نوکر، چاکر، عیش و آرام، میاں عمر میں کچھ بڑا ہے تو کیا ہوا اسے چاہتا تو ہے، اس کے ناز اٹھاتا ہے۔"

نینی یک دم ہی خفگی سے بولی تھیں۔ ان کے چہرے پر بھی ناپسندیدگی اور ناراضی جھلک رہی تھی جیسے لیزا کی بات سے اتفاق کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔

"کچھ بڑے نہیں، ہاشم اسد سیم سے پورے پندرہ سال بڑے ہیں نینی! ایک بیوی کو فارغ کرچکے ہیں، تین بچوں کے باپ ہیں۔ دولت سے خوشی نہیں ملتی نینی! سیم کی ان کے ساتھ کوئی مطابقت ہی نہیں ہے۔ کہاں سیم اور کہاں وہ شادی شدہ مرد۔ سیم لاکھ خود کو خوش ظاہر کرتی رہے، آپ چاہے یقین کرلیں اس کی جھوٹی ہنسی کا مگر میں اس کی بہن ہوں۔ میں جانتی ہوں اس نے پاپا کے لیے خود کو قربان کردیا ہے، اپنی خواہشات اور آرزوؤں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ وہ ایک سمجھوتے کی زندگی گزار رہی ہے نینی!"

وہ دکھ بھرے لہجے میں بولی تھی۔ نینی نے برا سامنہ بنا کر یوں خاموشی اختیار کی تھی جیسے اس کی کسی بھی بات سے اتفاق نہیں کرتیں۔

"خیر ہم اس موضوع پر بہت بار بات کرچکے ہیں چھوڑیں اس ٹاپک کو۔ یہ بتائیں مجھے کافی ملے گی؟"

اس معاملے میں اس کی اور نینی کی سوچ میں اتنا فرق تھا کہ ذرا سی دیر اور اس موضوع پر بات ہوتی اور ان دونوں ہی کا موڈ خراب ہو جاتا۔ وہ سیم کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتی تھی اور نینی جو اس پر والہانہ چاہتیں نچھاور کیا کرتی تھیں، اس کے لیے بالکل ماں جیسی ممتا لٹایا کرتی تھیں، سیم کے لیے پتا نہیں کیوں ان کا دل اتنا ہی سخت ہو جایا کرتا تھا۔

بچپن میں جس طرح اس نے نینی کو پہلی ہی نظر میں اپنی آیا سے بڑھ کر اپنی ماں مان لیا تھا۔

سیم ایسا نہیں کرسکی تھی۔ اس نے بچپن میں نینی کو بہت تنگ کیا تھا۔ شاید لیزا بہت ننھی سی بچی تھی اس لیے نینی کی حفاظت میں آجانے پر خوش ہوئی تھی جبکہ سیم اس کے برخلاف شرارتی اور نٹ کھٹ تھی سو وہ نینی کو تگنی کا ناچ نچائے رکھتی۔ وہ فرماں برداری سے نینی کے احکامات مان لیا کرتی تھی جبکہ سیم ان کے گھر کی Rebellious Princess (سرکش) تھی، نینی کے احکامات کو تو کیا خاطر میں لاتی — سیم الٹا ایسی حرکتیں کرجاتی کہ نینی کو اکثر و بیشتر خاصی سختی سے ڈانٹ پڑ جاتی تھی۔

سیم نے بچپن میں نینی کو بہت تنگ کیا تھا، انہیں محمود خالد سے بہت بار ڈانٹیں پڑوائی تھیں۔ ان بہنوں کا وہ بچپن کب کا گزر چکا تھا مگر نینی نے جیسے سیم کو اس کی شرارتوں اور حکم عدولیوں کے لیے کبھی معاف نہ کیا تھا۔ اسے نینی کے سیم سے اختلاف کی وجوہ چونکہ پتا تھیں اس لیے اس وقت بھی اس نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔

"کھانا کھالیا تم نے؟" انہیں اس کے کھانے کی فکر ہوئی تھی۔

"جی نینی! سینڈرا کے ساتھ ہی کھالیا۔ اب بس

آپ کافی پلادیں۔" نینی سرہلاتی اس کے پاس اٹھ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز صبح صبح ہی سیم کا فون آیا تھا۔ وہ جانتی تھی سیم اس کے لیے پریشان ہے، وہ اس کے لیے بہت فکر مند ہے۔

"کل سے تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہوں لز! تمہاری روتی ہوئی آواز نے مجھے رات میں ایک پل کے لیے بھی سونے نہیں دیا۔" وہ اس کی آواز سنتے ہی بولی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں سیم۔" وہ بیڈ پر لیٹی تھی، سیم کے فون سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"اگر ٹھیک ہو تو پھر مجھے میری بہن کی آواز ہمیشہ کی طرح ہنستی اور مسکراتی ہوئی کیوں نہیں لگ رہی ہے؟"

وہ جواباً چپ رہی تھی۔

"لز! پلیز خود کو سنبھالو۔ جو جاچکا ہے اسے بھول جاؤ۔ زندگی ختم نہیں ہوئی۔ دیکھنا تمہاری زندگی میں اتنی ساری خوشیاں اور اتنی ڈھیر ساری محبتیں آئیں گی کہ تم انہیں سمیٹتے سمیٹتے تھک جاؤ گی۔"

"میں خود کو سمجھا رہی ہوں سیم۔ مجھے تھوڑے دن لگیں گے مگر میں خود کو سمجھالوں گی کہ وہ چند دنوں کے لیے مجھے ملا تھا اور وہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو گیا ہے۔ میں شاید زندگی میں اب کبھی دوبارہ اس سے مل بھی نہیں پاؤں گی۔ شاید وہ مجھے خواب میں ملا تھا۔ آنکھ کھلی ہے تو وہ کہیں نہیں ہے۔" اس کی آنکھوں میں نمی آگئی، وہ آہستہ آواز میں بہت دھیمے لہجے میں بولی تھی۔

"ہاں، تمہیں ایسا ہی کرنا ہو گا لز! اور تمہیں اپنے شو کی اسی طرح تیاری کرنی ہوگی، جس طرح پہلے کر رہی تھیں۔ تمہیں پتا ہے ناں لز! میں تمہارے آرٹسٹ ہونے پر کتنا فخر کرتی ہوں۔ میری بہن ایک کامیاب اور مشہور مصورہ ہے، میں ہر ایک کو فخریہ بتاتی ہوں۔ تم میری خاطر اپنی پینٹنگز کمپلیٹ کرو۔ میں چاہتی ہوں، تمہارا شو بہت کامیاب رہے۔ آرٹس کے نقاد تمہارے کام کو خوب سراہیں، آرٹس کے قدر دان تمہاری پینٹنگز خریدنے کے لیے بے قرار ہو جائیں، آرٹ گیلریز تمہارا کام اپنے پاس لگانے کے لیے تمہاری منتیں کریں، تمہیں تمہارا منہ مانگا معاوضہ دیں۔ میں تمہیں بہت کامیاب دیکھنا چاہتی ہوں لز!"

بہن کی والہانہ محبت اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو لے آئی تھی۔ اس نے سیم سے وعدہ کیا تھا وہ پھر سے اپنے شو کی تیاری شروع کرے گی۔ وہ کامیاب ہوگی، وہ سیم کو مایوس نہیں کرے گی۔ اس کے آرٹسٹ ہونے پر سیم نے ہمیشہ فخر کیا کہ وہ سیم ہی تھی جس کے ہمت دلانے اور حوصلہ بندھانے کے سبب وہ فائن آرٹس پڑھ پائی تھی، مصوری کو بطور پروفیشن اختیار کرپائی تھی ورنہ محمود خالد تو اسے اس کی خواہشات کے برخلاف بزنس ایڈمنسٹریشن کی طرف دھکیلنا چاہتے تھے۔

ناشتے کے فوراً بعد وہ اوپر اپنے اسٹوڈیو میں آگئی تھی۔

☼ ☼ ☼

چیخ چیخ کر روتی ام مریم اور اسے اپنی گرفت میں جکڑے سکندر دونوں نے اسے دیکھ لیا تھا۔ اس کے قدم زمین میں یوں گڑ گئے تھے، جیسے وہ اب انہیں زندگی بھر کبھی اٹھا نہیں پائے گا۔

سکندر فوراً ام مریم کے اوپر سے ہٹ کر سیدھا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی قمیص کے تمام بٹن آگے سے کھلے تھے۔ اس کی ناک اور ہونٹوں کے پاس سے خون بہہ رہا تھا، اس کے چہرے اور گردن پر ام مریم کے ناخنوں کے نشان تھے، جو اس نے خود کو بچاتے ہوئے مزاحمت کے دوران سکندر پر ڈالے تھے۔

ان کے خوبصورت لونگ روم میں رکھے کئی خوبصورت گلدان اور دیگر آرائشی اشیا یہاں وہاں ٹوٹی پڑی تھیں جیسے بھاگ کر خود کو سکندر کے شکنجے سے

بجاتی مریم ان چیزوں سے ٹکرائی تھی۔ روتی ہوئی' بالکل تباہ حال مریم نڈھال سی لڑکھڑائی ہوئی قالین پر سے اٹھی تھی۔ اس کے چہرے' بازوؤں اور گردن پر سکندر کی دست درازی اور اس کی ہوس کے نشان رقم تھے۔ جاتے وقت ام مریم کو جینز کے اوپر جس خوبصورت Top میں وہ دیکھ کر گیا تھا' اس کا وہ Top جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا' وہ نیم برہنہ حالت میں اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر اس کا شرم اور غیرت سے زمین میں گڑ جانے کو دل چاہا۔

ام مریم دوڑ کر آکر اس کے گلے لگ کر رو پڑی تھی۔ وہ اس کے گلے لگ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔

"مجھے اس درندے سے بچالو زین! یہ میری عزت برباد کرنا چاہتا ہے۔ خدا کے لیے مجھے اس سے بچالو۔ مجھے چھپالو زین! اس درندے سے۔"

"یو بچ۔" ہونٹوں سے خون صاف کرتے ہوئے سکندر نے ام مریم کو گالی دی تھی۔ وہ فوراً" ہی اس کے پاس آیا تھا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا زین! یہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔ یہ ایک بدکردار لڑکی ہے زین۔"

سکندر کو اپنے سامنے کھڑے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ اس کے پاؤں جنہیں وہ ہلا نہیں پا رہا تھا' ان میں ایک دم ہی جان آگئی تھی۔ اس نے اپنے گلے لگی ام مریم کو خود سے دور ہٹایا تھا اور قتل کردینے کے ارادے سے سکندر کی طرف بڑھا۔

روتی ہوئی ام مریم کے پاس اموجان آگئی تھیں۔ وہ جیسے شرم و غیرت سے گڑتی مریم کو مزید اس نیم برہنہ حالت میں دیکھ نہیں پا رہی تھیں۔ انہوں نے اپنی شال اتار کر مریم کے اوپر ڈال دی تھی۔ مریم یک دم ہی ان کے گلے لگ گئی تھی۔

"آنٹی۔" وہ اموجان کی شال میں لپٹی ان کے گلے لگ کر زارو قطار رو رہی تھی۔ شہریار خان اپنی جگہ بالکل سُن کھڑے تھے۔ اس نے سکندر کے منہ پر کھینچ کر ایک تھپڑ مارا تھا۔

"زین! یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے' بکواس کررہی ہے۔ یہ مکار لڑکی ڈرامہ کررہی ہے۔" اتنی جرأت تھی ابھی بھی سکندر شہریار میں کہ اس کے سامنے کھڑا ہوسکے؟ اس کے کانوں میں مریم کے رونے کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اسے وہ شال میں اپنی برہنگی چھپاتی نظر آرہی تھی۔ اگر اس وقت اس کے پاس ریوالور ہوتا وہ اس کی تمام گولیاں سکندر کے سینے میں اتار دیتا۔

اس نے دوسرا' تیسرا اور پھر چوتھا تھپڑ مارا تھا سکندر کے منہ پر۔ اس پر خون سوار تھا' وہ سکندر پر پل پڑا تھا۔ وہ اسے لاتیں' گھونسے' مکے مار رہا تھا۔

"بے غیرت انسان! ام مریم! پر گندی نظر ڈالنے کی تمہاری ہمت کیسے ہوئی؟" سکندر خود کو اس سے بچانے کی کوشش کررہا تھا مگر وہ خود اس کے اوپر ہاتھ نہیں اٹھا رہا تھا۔ ایسی گھناؤنی حرکت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کے بعد وہ اس پر ہاتھ اٹھا بھی کیسے سکتا تھا؟ اموجان شرم' غیرت اور صدمے سے چور ام مریم کو سینے سے لگائے کھڑی تھیں جبکہ شہریار خان اپنے ولی عہد' اپنے شہزادے کا اصلی اور گھناؤنا روپ دیکھ کر بالکل گم صم اور ساکت کھڑے تھے۔

وہ سکندر کو بری طرح مار رہا تھا' وہ اس بے غیرت انسان کو لہولہان کرچکا تھا مگر اسے لہولہان کرنے کے بعد بھی اس کا جنون ختم نہیں رہا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سکندر کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔

"پاپا! زین کو سمجھائیں۔ اس سے کہیں میرا یقین کرے۔ یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے' مکاری کررہی ہے۔ یہ بہت مکار' بہت خطرناک لڑکی ہے پاپا۔" وہ ذلیل شخص خود کو بچانے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ سکندر کے منہ پر تھوک دے۔

"زین! بس کرو۔" شہریار خان جیسے یک دم ہی سکتے کی کیفیت سے باہر نکلے تھے۔ وہ ان کے روکنے پر بھی نہیں رکا تھا۔

"پاپا! میں آج یا تو اس کی جان لے لوں گا یا اپنی جان دے دوں گا۔ میں اس ذلیل' بے غیرت کو زندہ نہیں

چھوڑوں گا۔"

وہ غصے اور جنون میں سکندر کو مارتا پاگل سا ہو رہا تھا۔

"پاپا! آپ زین کو سمجھائیں۔ یہ مجھے بالکل غلط سمجھ رہا ہے۔ میں نے کچھ نہیں کیا ہے پاپا۔ یہ سب اس ناگن کا مجھ سے انتقام ہے۔" سکندر نے پھر شہریار خان کو پکارا تھا۔ اس نے پھر ام مریم پر الزام تراشی کی کوشش کی تھی۔ شہریار خان ان دونوں کے قریب آگئے تھے۔ وہ اسے اور سکندر کو چھڑا رہے تھے۔ چند منٹوں کی کوششوں کے بعد وہ اسے سکندر کے پاس سے ہٹا لینے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ وہ پھولی سانسوں اور نفرت بھری نگاہوں سے بری طرح زخمی ہوئے سکندر کو اب دور ہٹ کر کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے درمیان اب شہریار خان کھڑے تھے۔

"پاپا زین کو سمجھائیں یہ لڑکی۔۔۔"

سکندر پھر ام مریم کے اوپر کوئی بہتان تراشی کرنا چاہتا تھا مگر شہریار خان کے زوردار تھپڑ نے اسے آگے بات پوری نہیں کرنے دی تھی۔

"پاپا؟" سکندر منہ پر ہاتھ رکھے باپ کو دیکھ رہا تھا۔ شہریار خان' سکندر کو شدید غصے میں دیکھ رہے تھے۔

"شرم آرہی ہے مجھے تمہیں اپنا بیٹا کہتے ہوئے۔ یہ لڑکی تمہاری ہونے والی بھاوج ہے' تمہارے بھائی کی منگیتر ہے۔ کیا اسی لیے آج صبح اس رشتے کے خلاف بول رہے تھے کہ تم خود اپنے بھائی کی منگیتر پر غلیظ نگاہیں جمائے بیٹھے تھے۔" شہریار خان' سکندر پر بہت زور سے دھاڑے تھے۔

"بے غیرت اور بدکردار میں نہیں' یہ لڑکی ہے پاپا۔ مجھے کہتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔ اس نے خود۔۔۔ اس نے خود۔۔۔ میرے پیچھے پڑی ہے۔

She tried to seduce me.
She is an adulteress Papa!"

ام مریم کے لیے سکندر کے ان گھٹیا ترین الفاظ پر اس کا دل چاہا' وہ اس کو یہیں کھڑے کھڑے جان سے مار ڈالے۔ اس کی ہوس کا نشانہ بنی' اپنی بے لباسی چھپاتی مریم اموجان کے گلے لگے لگے زارو قطار رو پڑی تھی۔ عزت بھی اسی کی خراب کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور بہتان بھی اس پر باندھا جارہا تھا۔

"آنٹی! میں آپ کے گھر پر جس دن سے سکندر سے ملی ہوں' یہ مجھ سے کہہ رہا ہے میں زین سے منگنی توڑ دوں۔ میرے انکار پر اس نے مجھے دھمکی دی تھی کہ یہ مجھے زین کے تو کیا' کسی کے بھی قابل نہیں چھوڑے گا۔"

یہ کہا کرتا تھا اس کا سگا بھائی اس کی منگیتر سے؟ اس کا دل چاہا تھا وہ اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ لے۔ اب زندگی میں کبھی رشتوں پر اعتبار کس طرح کرسکے گا وہ؟

"You bloody bitch" میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پاپا! میں جان سے مار دوں گا اس ناگن کو۔" اپنی مکروہ اور گھناؤنی شکل سب پر عیاں ہوتی دیکھ کر بوکھلاتا سکندر غصے میں آپے سے باہر ہو کر فوراً" ہی ام مریم کی طرف لپکا تھا۔ مگر شہریار خان نے اس کے سامنے آکر اسے آگے بڑھنے سے روک دیا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اور کتنا نیچے گروگے سکندر؟" وہ اسے غیظ و غضب سے دیکھ رہے تھے۔

"پاپا! آپ اس مکار لڑکی کو سچا اور مجھے جھوٹا سمجھ رہے ہیں؟ میں۔۔۔" کس قدر ڈھٹائی تھی اس بے غیرت انسان میں' اس کا گناہ سب لوگ دیکھ چکے ہیں یہ جاننے کے باوجود وہ جھوٹ پر جھوٹ بولے جارہا تھا۔ مگر شہریار خان نے اسے آگے کچھ اور بولنے نہیں دیا تھا۔

"اپنے گناہ پر پردہ ڈالنے کے لیے اس معصوم لڑکی پر الزام لگا رہے ہو؟ ذرا حالت دیکھو اپنی بھی اور اس کی بھی۔ میرا سر ندامت سے جھکا دیا ہے سکندر! تم نے۔ میرا بیٹا اتنا عیاش اور بدکردار کیسے ہوسکتا ہے؟ اسے رشتوں کی عزت کا بھی پاس نہیں؟ یہ میرا وہ بیٹا ہے جس سے میں نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں؟ یہ میرا وہ بیٹا ہے جسے میرا جانشین بننا تھا' میرے بعد میری جگہ سنبھالنی تھی۔ یہ رشتوں کی دھجیاں اڑانے

والا؟"

"پاپا! آپ بھی زین کی طرح مجھ ہی کو قصوروار سمجھ رہے ہیں؟ پاپا آپ..." خود کو مظلوم اور بے قصور ثابت کرنے کی مکاری کرتا وہ بدکردار شخص نجانے اور کیا کہنا چاہتا تھا مگر شہریار خان نے اسے اس کی بات مکمل نہیں کرنے دی تھی۔

"مت کہو مجھے پاپا! تم آج سے یہ حق ہمیشہ کے لیے کھو چکے ہو۔ اپنے نفس کا غلام، اپنے ہی گھر کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے والا میرا بیٹا کبھی نہیں ہو سکتا۔"

شہریار خان کی چیخ نے ان کے گھر کے در و دیوار کو ہلا دیا تھا۔

"پاپا! آپ مجھ سے سچائی سنے بغیر مجھے کیسے مجرم قرار دے سکتے ہیں۔ میری بات تو آپ کو سننی چاہیے پاپا۔"

جھوٹ پر جھوٹ بولتا سکندر پتا نہیں شہریار خان سے کیا کیا کہہ رہا تھا اور شہریار خان جواب میں اسے کیا کہہ رہے تھے، اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اسے اگر کچھ سنائی دے رہا تھا تو ام مریم کی سسکیاں، اگر کچھ دکھائی دے رہا تھا تو سیاہ شال میں اپنی برہنگی چھپاتی ام مریم جو امو جان کے گلے سے لگی ہوئی خوف سے ابھی تک کانپ رہی تھی۔ ام مریم کا سیاہ شال میں چھپا وجود دیکھ کر اس پر پھر خون سوار ہونے لگا تھا کہ یک دم ہی شہریار خان کے بہت زور سے چیخنے سے وہ چونک کر انہیں دیکھنے پر مجبور ہوا تھا۔ وہ سکندر کی کسی بات کے جواب میں بہت زور سے دھاڑ رہے تھے۔

"بس سکندر! بس۔ ایک Rapist میرا بیٹا کبھی بھی نہیں ہو سکتا۔ میں تمہیں ابھی اور اسی وقت اپنے گھر سے نکل جانے کا حکم دیتا ہوں۔ میں تمہیں اپنے گھر، اپنی دولت، اپنی جائیداد اور اپنی زندگی سے بے دخل کرتا ہوں۔ اور میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے مرنے پر بھی تمہیں میرے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ تم ابھی اور اسی وقت میرے گھر سے نکل جاؤ۔ آج کے بعد زندگی بھر مجھے اپنی منحوس شکل کبھی مت دکھانا۔" شہریار خان کا انداز بہت بے لچک اور فیصلہ کن تھا۔

"امو جان! آپ سمجھائیں پاپا کو۔ دیکھیں پاپا مجھے کیا کہہ رہے ہیں۔"

اس نے مظلومیت کے ڈرامے کرتے سکندر کو امو جان کو رو کر پکارتے سنا۔ وہ اب رو کر خود کو مظلوم اور بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ام مریم کو گلے لگائے امو جان خود بھی مسلسل رو رہی تھیں۔

شہریار خان سکندر کی طرف شدید غصے کے عالم میں بڑھے تھے۔ ان کی حاکمیت، ان کا اپنے فیصلے منوانا ان سب نے بہت دیکھا تھا مگر ان کا یہ جنون اور یہ غصہ وہ سب پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں خون اور چہرے پر بہت سختی تھی۔

"سنا نہیں تم نے؟ میں تم سے یہاں سے دفع ہو جانے کو کہہ رہا ہوں۔"

انہوں نے آگے بڑھ کر سکندر کا ہاتھ پکڑا تھا۔ وہ اسے لونگ روم سے باہر لے جا رہے تھے۔ بہت دیر سے چپ کھڑی امو جان نے یک دم ہی روتے ہوئے شہریار خان کو پکارا تھا۔

"شہریار! پلیز اس طرح مت کریں۔ وہ کہاں جائے گا۔"

شہریار خان نے غیظ و غضب سے انہیں دیکھا۔ ان کے غصے میں ایک جنونی سی کیفیت نمایاں تھی۔

"تم بیچ میں مت بولنا آمنہ۔ اگر تمہیں اس Adulterer سے زیادہ ہمدردی ہو رہی ہے تو میں تمہیں ابھی طلاق کے تین بول بول کر فارغ کرتا ہوں۔ تم بھی اس کے ساتھ ہی میرا گھر چھوڑ کر جا سکتی ہو۔ ایک زانی میرا بیٹا نہیں ہو سکتا اور اس کی حمایت کرنے والے سے بھی مجھے کوئی رشتہ نہیں رکھنا۔ یہ گناہ تو میں اپنے باپ کا بھی معاف نہ کروں۔"

شہریار خان کا ایسا غصہ، ایسا جنون ان سب میں سے کسی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کا غصہ دیکھ کر وہ خود بھی ساکت سا کھڑا تھا، ان کی دھاڑتی آواز سن کر امو جان کی اب مجال نہ تھی کہ کچھ بول پاتیں۔ وہ سکندر کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے لونگ روم سے باہر لے جا رہے تھے۔ وہ خاموش تماشائی کی طرح اس سارے منظر کو دیکھ رہا تھا۔

امو جان نے کرب اور صدمے سے نڈھال ہو کر اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ وہ زار و قطار رو رہی تھیں۔

ام مریم اسی طرح ان کے گلے سے لگی سسک رہی تھی۔ شہریار خان سکندر کو کھینچتے ہوئے لونگ روم سے باہر لے گئے تھے۔ وہ وہاں پر اسی طرح بت کی مانند ساکت کھڑا تھا۔ محض چند گھنٹوں کے اندر اس کی خوشیوں کا جہاں اجڑ چکا تھا۔ اس کا ہر خواب بکھر چکا تھا۔

وہ ام مریم سے نگاہیں ملانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ اس کا اپنا سگا بھائی اس کی عزت اور ناموس کی دھجیاں بکھیر گیا تھا۔ اسے باہر سے شہریار خان کے چلانے، سکندر کو گھر سے نکالنے اور سکندر کی منتوں اور اس کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے ایک نظر سسکتی ہوئی ام مریم اور آنکھیں بند کر کے پھوٹ پھوٹ کر روتی امو جان پر ڈالی تھیں۔ اس کے اندر ان دونوں میں سے کسی کو بھی چپ کرانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ نڈھال سے قدموں سے چلتا لونگ روم سے جانے لگا تھا۔ اسے اپنے گھر کا گیٹ بہت زور سے کھولے جانے اور پھر بند کیے جانے کی آوازیں آئی تھیں۔ ان کے گھر پر موت کا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس لیے ہر آواز اور ہر آہٹ واضح سنائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں آ گیا تھا۔

وحشت کے عالم میں وہ کمرے کی دیواروں سے سر مار مار کر رو رہا تھا، وہ زین شہریار زار و قطار رو رہا تھا۔ وہ اب ام مریم کا سامنا کیسے کر پائے گا؟ وہ اس سے کیا کہے گا؟ کیسے کہے گا؟ کیا وہ اس سے یہ کہہ پائے گا کہ جو کچھ بھی ہوا، اسے بھول جاؤ؟ اس کی زندگی کا پہلا خواب، پہلی امید اور پہلی محبت اس کے اپنے سگے بھائی نے کس طرح برباد کی تھی۔ کس طرح اس نے اس سے اس کی خوشیاں چھینی تھیں۔

اس پوری رات ان کے گھر پر موت کا سناٹا طاری رہا تھا۔ امو جان اپنے کمرے میں بند روتی رہی تھیں، شہریار خان نے خود کو اپنی اسٹڈی میں بند کر لیا تھا اور ام مریم، وہ اپنے کمرے میں تھی۔ یوں لگ رہا تھا، وہ تمام افراد ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کترا رہے ہیں۔

وہ تمام افراد ایک دوسرے سے نگاہیں ملانے سے ڈر رہے ہیں۔ باہر نئے سال کا جشن منایا جا رہا تھا اور ان کے گھر میں رشتوں اور اعتبار کی موت کا سوگ منایا جا رہا تھا۔ جاتا ہوا سال اس سے اس کی زندگی کی پہلی خوشی، پہلی ہنسی اور اس کی زندگی چھین کر لے گیا تھا۔

صبح ہو چکی تھی مگر اس میں سکت نہ تھی اپنے کمرے سے باہر نکلنے کی، ام مریم کا سامنا کرنے کی۔ اپنے نام کی انگوٹھی اسے پہنا کر اس نے زندگی بھر کے لیے اس کی حفاظت اور خوشیوں کی ذمہ داری قبول کی تھی، اور وہ اپنے ہی گھر پر اسے تحفظ فراہم نہ کر سکا تھا۔ اس کی عزت اور آبرو کی رکھوالی نہ کر سکا تھا۔

وہ شاید پورا دن یوں ہی کمرے میں بیٹھے گزار دیتا کہ اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے کر ام مریم اندر آ گئی تھی۔ اسے ایک نظر دیکھ کر اس نے شرم اور ندامت سے فوراً ہی نظریں جھکا لی تھیں۔ وہ اس سے کیا کہے؟ کیسے کہے؟ وہ خاموشی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ گئی اور اس کے برابر میں بیڈ پر بیٹھ گئی۔ وہ بھی بالکل خاموش تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرائے فرش کو گھور رہے تھے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد اسے احساس ہوا کہ ام مریم رو رہی ہے۔ اس نے بے اختیار نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"مریم۔" درد اور کرب کی شدت نے اسے مزید کچھ بولنے نہیں دیا تھا۔

"سکندر نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا زین؟ میں تو بالکل شفاف تھی، بالکل ان چھوئی تھی۔" وہ روتے ہوئے بولی۔

"تم ابھی بھی شفاف ہو، تم مریم ہو۔ تم پاکیزہ ہو، تم شفاف ہو۔" اس نے تڑپ کر کہا تھا۔ "اس بدکردار شخص نے جو میرا بھائی تھا، مجھے کچھ کہنے کے لائق نہیں چھوڑا۔ میں تم سے کیسے معافی مانگوں مریم؟"

بولتے ہوئے اس کی نگاہیں پھر جھک گئی تھیں۔ اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عظمیٰ افتخار

وہ اک دن

"سنیں! مہربانی کر کے آپ بتادیں گی کہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ (کیمیا کا شعبہ) کدھر ہے؟" انوشہ، شنزا اور ردا کراچی یونیورسٹی کے سلور جوبلی گیٹ سے اندر داخل ہوئی ہی تھیں کہ ایک اجنبی مگر خوب صورت سی لڑکی نے انوشہ کو روک کر مخاطب کیا۔

انوشہ نے معنی خیز نظروں سے شنزا اور ردا کو دیکھا۔ دونوں کے ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم پھیل گیا۔

"آپ کا نام کیا ہے؟" انوشہ نے اس سے پوچھا۔

"جی! میرا نام وانیہ ہے۔"

"آپ فرسٹ ایر کی ہیں؟" اب کے سوال شنزا کی طرف سے آیا۔

"جی نہیں! میں پریویس کی ہوں۔" وانیہ نے جھجکتے ہوئے کہا۔ اس کی جھجک فطری تھی۔ آج سولہ جنوری تھی یعنی کہ یونیورسٹی میں نئے تعلیمی سال کا آغاز تھا۔ اس لیے فرسٹ ایر اور پریویس کے لیے یہ پہلا دن تھا۔

"اچھا ہوا، آپ نے ہم سے پوچھا۔ اگر کسی اور سے پوچھا ہوتا تو وہ آپ کو پوری یونیورسٹی گھما دیتا مگر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کا پتا نہ دیتا۔"

ردا نے یوں توصیفی نظروں سے وانیہ کو دیکھتے ہوئے کہا کہ گویا یہ بات عقل مندی کی سند ہو۔

"جی وانیہ بی بی! آیئے ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کدھر ہے؟ وہ تینوں آہستہ آہستہ وانیہ کے ساتھ چل رہی تھیں۔

"یہ سامنے جو فوجی انکل کھڑے نظر آرہے ہیں ناں، انہیں آپ اپنا یونیورسٹی پاس دکھائیں گی تو یہ آپ کو اندر جانے دیں گے۔ آگے کی طرف شٹل سروس کے لیے کچھ بسیں کھڑی ہوں گی۔ وہ دیکھیں! یہاں سے بھی نظر آرہی ہیں ناں آپ کو؟" انوشہ نے ہاتھ کے اشارے سے شٹل کی طرف نشاندہی کی۔

وانیہ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

"بس جو بھی شٹل چلنے کے لیے تیار ہو، اس میں بیٹھ جائیں۔ یہی شٹل آپ کو آپ کی منزل مقصود تک لے جائے گی۔" انوشہ نے یوں کہا کہ جیسے یہ شٹل کوئی خلائی شٹل ہو اور وانیہ کوئی خلاباز۔

"یہ شٹل پہلے پوائنٹ پر رکے گی۔" انوشہ نے اتنا کہا اور چپ ہوگئی۔

"کیا وہ ہی کیمسٹری ڈپارٹمنٹ ہے؟" وانیہ فوراً پوچھا۔

"ناں… ناں! اتنی جلدی کہاں۔ وہ تو آرٹس لابی ہے۔ اس پوائنٹ کے بعد ایک اور پوائنٹ پر رکے گی…"

"تو میں اتر جاؤں؟" وانیہ نے پھر پوچھا۔

"آپ کیوں اتریں گی بھلا۔ وہ تو مائیکرو بیالوجی کا ڈپارٹمنٹ ہے۔ اس ڈپارٹمنٹ کو دیکھو تو لڑکیوں کا گرلز کالج لگتا ہے۔ دور تک لڑکیاں ہی لڑکیاں…"

انوشہ کی بیان بازی جاری تھی اور لڑکی جلدی میں تھی۔ وہ چاہ رہی تھی کہ جلد سے جلد پتا چل جائے تو وہ شٹل میں بیٹھ جائے۔ پہلا والا شٹل تو جا بھی چکا تھا۔ اس نے گھڑی میں دیکھا۔ ساڑھے آٹھ ہو رہے تھے۔ نو بجے چیئرمین صاحب کی تقریر تھی۔

"پھر شٹل تیسرے پوائنٹ پر رکے گا… یہاں بھی نہیں اتریے گا۔ یہ بائیو کیمسٹری ڈپارٹمنٹ ہوگا۔ آپ کے کس کام کا، پر جب چوتھا پوائنٹ آئے تو آنکھ بند کر کے چھلانگ لگا دیجیے گا۔ سامنے ہی سبزہ ہے۔ کیا خوب صورتی ہے۔ ذرا ترچھا ایک میدان پار کریں گی تو راہداری شروع ہوجائے گی۔ بس چلتے جائیں، آگیا کیمسٹری ڈپارٹمنٹ۔ واہ… واہ کیا ڈپارٹمنٹ ہے، پوچھو مت۔ اسم مسمیٰ۔ کیوں شنزا؟" اس نے شنزا کو مخاطب کیا تو شنزا کا سر بھی کسی قوال کی طرح ہلنے لگا۔

"اتنا دور ہے یہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ؟ وہاں تو جاتے جاتے ہی نو بج جائیں گے۔" وانیہ کو مایوسی ہوئی۔

"ارے! آپ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کو معمولی نہ سمجھیں۔ مسٹری آف کیمیکلز ہے وہاں۔ پراسراریت ہی پراسراریت۔" اب کے شنزا نے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی دھاک بٹھائی۔ باتیں کرتے ہوئے وہ لوگ "فوجی انکل" کے پاس آگئے تھے۔

"ارے بھئی! ایک عمر گزری ہے اس دشت کی

سیاحی میں..... آخر کو ہم فائنل ایر کی طالبات ہیں کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کی۔" ردا نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

"اوہ! تو آپ لوگ میرے سینئرز ہیں۔" اتنے عرصے میں لڑکی پہلی بار مسکرائی۔ "پھر تو میں آپ کے ساتھ ہی ڈپارٹمنٹ چلتی ہوں۔" اس نے کہا تینوں نے ایک دوسرے کی شکل دیکھی' آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کہا اور پھر انوشہ نے اسے "اوکے" کردیا۔ پاس دکھا کر یہ لوگ شٹل میں چڑھ گئے۔ سامنے کی سیٹیں خالی تھیں۔ چاروں کو ایک ساتھ ہی بیٹھنے کی جگہ مل گئی۔

"جی! اب بتایئے کیسا ہے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ؟" وانیہ پر تجسس تھی۔

"ارے! پوچھو مت۔ الیکٹران' پروٹان اور نیوٹران کی کارستانی تم ہے کیا' تیزاب اور اساس (Base Asid and) بھی وہاں ایکٹو ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ ذرہ اس میں تو سمجھو پارہ بھرا ہے' ابھی توانائی کی موج میں تبدیل ہوا اور ابھی ذرہ بن کے جگمگا رہا ہے۔ عجیب دوہری شخصیت پائی ہے اس نے۔ بس بیٹھ کر اس کی کیمیائی مساواتیں حل کرتے رہو۔ ارے! اکشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔" انوشہ کی ریل گاڑی پھر پٹڑی سے اتر چکی تھی۔

"اور انوشہ! یہی کیوں... پورا کیمسٹری ڈپارٹمنٹ ہی پراسرار ہے۔" شزا نے اتنا کہا اور چپ ہوگئی۔

"جی! کیا مطلب؟ کیا وہاں کچھ ہے؟" وانیہ نے "کچھ ہے" پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ اس کے انداز میں ایک ڈر سا تھا۔ ردا نے مسکرا کر انوشہ کو اشارہ کیا اور انوشہ پھر سے شروع ہوگئی۔

"ایسا ویسا... فزیکل کیمسٹری (طبیعاتی کیمیا) میں جو تھرڈ فلور پر ہے۔ اف اللہ! پوچھو مت۔" پوچھو مت انوشہ کا تکیہ کلام تھا۔

"تم فائنل ایر میں جا کے آرگینک کیمسٹری (نامیاتی کیمیا) ان آرگینک کیمسٹری (غیر نامیاتی کیمیا" یا انڈسٹریل کیمسٹری (صنعتی کیمیا) کچھ بھی لے لینا۔ مگر فزیکل کیمسٹری (طبیعاتی کیمیا) مت لینا۔"

"ایسا کیا ہے وہاں؟" وانیہ کی آنکھیں قدرے پھیل گئیں۔ فزیکل کیمسٹری تو اس کا پسندیدہ سبجیکٹ تھا۔ بی ایس سی میں اس کے اچھے نمبر آئے بھی اسی سبجیکٹ کی وجہ سے تھے۔ آرٹس لابی آگیا تھا۔ کافی سارے لڑکے لڑکیاں وہاں اتر گئے۔

"بھئی! سنا ہے کہ اس فلور کے کوریڈور میں چلنے والے کو اپنے قدموں کے پیچھے کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور پلٹ کر دیکھو تو کوئی ہوتا ہی نہیں۔" ردا نے کوئی پر زور دیا۔

"اتنا ہی نہیں۔ لیب کے دروازے بھی اکثر خود بخود بند ہوجاتے ہیں۔ بس اندر گئے تو رہ ہی گئے۔" شزا نے بھی اضافہ کیا۔

"کیا کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے وہاں؟" وانیہ کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"واقعہ نہیں... آنکھوں دیکھی۔ تم بتاؤ انوشہ!" شزا نے وانیہ کے تجسس کو اور بڑھایا۔ مائیکرو بیالوجی کا ڈپارٹمنٹ آگیا تھا۔ لڑکیوں کا ایک غول وہاں اترا۔

"فائنل ایر کی فیرویل تھی۔ ہم نے دی تھی۔ بس لڑکوں میں شرط لگ گئی کہ رات آٹھ بجے ڈنر کے بعد جو لڑکا فزیکل کیمسٹری کے فلور کا پورا چکر لگا کے آئے گا' وہ سب سے بہادر ہوگا۔ بس! پھر کیا ہوا' پوچھو مت۔" انوشہ نے حسب عادت "پوچھو مت" پر بریک لگا دیا۔ بائیو کیمسٹری کا ڈپارٹمنٹ آگیا تھا۔ چند لڑکے لڑکیاں نیچے اترے اور شٹل پھر چل پڑا۔

"کیا ہوا پھر۔" وانیہ نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا ہم لوگ تو ڈنر کے بعد ظاہر ہے گھر جانے کے لیے نکل گئے تھے۔ مگر سنا ہے کہ دوسرے دن اس لڑکے کی بولتی بند تھی۔ جانے اس نے کیا دیکھ لیا تھا۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔ کوئی کہہ رہا تھا آسیب سے ڈر گیا' کوئی کہہ رہا تھا' وہ چھلاوہ تھا اور کسی کا کہنا تھا کہ جس گروپ نے اس لڑکے سے شرط لگائی تھی۔ اسی نے دوسرے زینے سے اوپر جاکر اس بے چارے کو ڈرا دیا تھا' اب یہ سچ ہے یا جھوٹ' مگر کیمسٹری ڈپارٹمنٹ اور بالخصوص فزیکل کیمسٹری کی تیسری منزل ہے بڑی پراسرار...."

شزا نے ڈرامائی انداز میں کہا اور بات ختم کردی۔ وانیہ شاید کچھ زیادہ ہی ڈرپوک تھی۔ اس کا چہرہ سفید ہوگیا۔ لگ رہا تھا کہ وہ ابھی کیمسٹری ڈپارٹمنٹ سے اپنا داخلہ منسوخ کروادے گی۔

کیمسٹری ڈپارٹمنٹ آچکا تھا۔ وہ چاروں نیچے اتر آئیں۔ وانیہ سمجھی' شاید وہ لوگ اندر چلیں گی کہ ان تینوں کی موجودگی سے اسے ڈھارس تھی' مگر انوشہ نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود تینوں میرین بیالوجی کے سامنے جو آدھی اٹھی ہوئی دیوار (پلیا) ہے' وہاں تک گئیں اور ایک دوسرے کی شکل دیکھ کر جو ہنسنا شروع کیا تو پھر ہنستی چلی گئیں۔

یہ تھا وہ ایک دن جسے وہ تینوں بے تحاشا انجوائے کرتی تھیں۔ زندگی کے بھاگتے دوڑتے ہوئے لمحوں میں سے وہ یہ دن چپکے سے چرالیتی تھیں۔ وہ تینوں انوشہ' شزا اور ردا آپس میں بہترین سہیلیاں تھیں۔ انہوں نے کیمسٹری ڈپارٹمنٹ سے آرگینک کیمسٹری (نامیاتی کیمیا) میں دو سال پہلے ماسٹرز کیا تھا۔ انوشہ ایک معروف فوڈ انڈسٹری میں اسسٹنٹ منیجر تھی۔ شزا ایک فارماسیوٹیکل کمپنی میں کوالٹی کنٹرولر تھی جبکہ ردا پی سی ایس آئی آر (PCSIR) میں ریسرچر (محقق) تھی۔ ان تینوں میں صرف انوشہ تھی جو اب تک غیر شادی شدہ کے مزے لوٹ رہی تھی۔ ورنہ ردا کی تو فائنل ایر میں ہی شادی ہوگئی تھی اور اب اس کا ایک ڈیڑھ سال کا بیٹا بھی تھا اور شزا کا بھی اپنے ماموں زاد کزن سے نکاح ہوچکا تھا۔ چار مہینے بعد اس کی بھی رخصتی تھی۔

وہ تینوں ہر سال سولہ جنوری کو اپنی مادر علمی (کراچی یونیورسٹی) ضرور آتی تھیں۔ یہ دن فرسٹ ایر فول کہلاتا ہے۔ نئے نئے چہرے ہر طرف نظر آتے ہیں۔ اس دن وہ تینوں بھی یہاں آکر اسی رنگ میں رنگ جاتی تھیں۔ آنے جانے والوں کو' راستہ پوچھنے والوں کو تنگ کرتیں۔ کبھی اپنے آپ کو فرسٹ ایر کا ظاہر کرکے فائنل ایر کے طالب علموں کو تنگ کرتیں اور یوں انجان بن کر ایک ایک چیز پوچھتیں کہ وہ بے چارا سینئر ہو کے بھی' ان کے ہنستے چڑھنے پر اپنے آپ کو کوستا۔ کبھی فائنل ایر کے اسٹوڈنٹس بن کے پریویس یا فرسٹ ایر کے اسٹوڈنٹس کو بے وقوف بنا کر مزے لیتیں' مگر اس ساری کارکردگی میں وہ یہ بات کبھی نہ بھولتیں کہ مذاق صرف ہنسنے مسکرانے کے لیے ہو۔ کسی کو "حقیقتاً" ان کی وجہ سے تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔

☼ ☼ ☼

"سنیے مس! یہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ کا آڈیٹوریم کدھر ہے؟ وہاں اصل میں تعارفی کلاس ہے۔" ایک اونچا لمبا سا لڑکا ان کے سامنے کھڑا بڑی عجلت میں آڈیٹوریم کا پتا پوچھ رہا تھا۔

"اسے کہتے ہیں' آبیل مجھے مار۔" انوشہ' شزا کے کان میں گھسی۔ شزا نے بمشکل اپنی مسکراہٹ چھپائی۔

وہ آئیں ہمارے گھر خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

انوشہ نے لہک لہک کر شعر پڑھا' شزا اور ردا حسب عادت سر دھننا شروع ہوچکی تھیں۔

"جی مس! مجھے اردو ڈپارٹمنٹ نہیں جانا' کیمسٹری کے آڈیٹوریم کا پتا بتادیں۔" وہ تینوں کو اردو ڈپارٹمنٹ کی طالبات سمجھا تھا' اس لیے قدرے عاجزی سے دوبارہ پوچھا۔

"یہ کیمسٹری ڈپارٹمنٹ ہی ہے بچہ! بس اللہ کا نام لے اور سیدھا چل دے۔ چلتے چلتے سیڑھیاں آئیں گی' بنا رکے چڑھتے جانا۔ پہلی منزل پر الٹے ہاتھ پر کچھ کمرے بنے ہیں۔ پہلے والے کمرے میں ہی تعارفی کلاس ہو رہی ہے۔ بس آنکھ بند کرکے اندر داخل ہوجانا۔"

شزا نے کسی درویش کی طرح اپنی آنکھیں نیم وا کیں۔ پھر اپنے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی اس کی سمت کرکے یوں پتا سمجھانے لگی گویا کہ وہ اس کا بالک ہو۔ لڑکے نے ایک نظر غور سے اس کے چہرے پر ڈالی۔ اسے کچھ شک بھی ہوا کہ کہیں تینوں لڑکیاں اسے بے وقوف نہ بنا رہی ہوں۔ مگر جب گھڑی کی سمت دیکھا نو بجنے میں صرف پانچ منٹ تھے۔ اس لیے اسے ان کے بتائے ہوئے رستے پر ہی قدم بڑھاتے بنی۔ اس کے مڑتے ہی ان تینوں کے منہ سے ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ شزا نے اس اجنبی لڑکے کو جو شاید فرسٹ ایر کا ہی تھا لیڈیز باتھ روم کا پتا بتادیا تھا۔ ہنستے ہنستے تینوں کی آنکھوں میں پانی آگیا تھا۔ جب ہنسی کا فوارہ رکا تو ردا نے تجویز دی۔

"چلو بھئی! اب ذرا اندر چل کر جائزہ لیتے ہیں۔ ایسا نہ کریں جہاں تعارفی کلاس ہونے والی ہے' وہاں کچھ ہلچل مچا دیں۔" اور انوشہ کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ یقیناً" اسے کوئی نیا آئیڈیا سوجھا تھا۔

تعارفی کلاس آڈیٹوریم میں تھی۔ وہ تینوں کوریڈور میں آئیں تو یہاں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی۔ نوٹس بورڈ والی دیوار کے آگے خاصا رش لگا ہوا تھا۔ وہ تینوں بنا دیکھے بھی جانتی تھیں کہ یہ رش کیوں ہے۔ یہاں تین طرح کے نوٹس لگے ہوئے تھے۔ ایک فرسٹ ایر والوں کے سبسڈی سبجیکٹ (اختیاری مضامین) کی فہرست کہ انہیں کیمسٹری کے ساتھ کون سے اور دو مضامین لینے ہیں۔ ایک فرسٹ ایر کا ٹائم ٹیبل اور ایک پریولیس کا ٹائم ٹیبل۔ سارا ہجوم ان چیزوں کو چھاپنے میں مگن تھا۔

"کیا ہورہا ہے یہاں ؟ یہ کوئی مچھلی بازار ہے؟" انوشہ نے ایک کڑکتی آواز نکالی اور ہجوم میں خاموشی چھاگئی۔ "واہ انوشہ واہ! کیا آواز ہے تیری" اس نے دل ہی دل میں خود کو شاباش دی۔

"آپ لوگوں کو احساس نہیں کہ نو بج چکے ہیں اور تعارفی کلاس شروع ہونے والی ہے۔ اگر پہلے دن ہی آپ نے وقت گنوا دیا تو آگے اس کی اہمیت کیا جانیں گے؟" شزا ابھی کیوں پیچھے رہتی۔

"چلیے! سب لوگ آڈیٹوریم میں۔" ردا نے سب کو ہانکنا شروع کیا۔ پانچ منٹ میں سارا ہجوم آڈیٹوریم میں پہنچ چکا تھا۔ شزا پہرے داری کے لیے باہر ہی کھڑی ہوگئی' جبکہ انوشہ اور ردا اندر داخل ہوگئیں اور دروازہ بند کردیا۔ جب سب طلبہ وطالبات اپنی نشستوں پر براجمان ہوگئے تب انوشہ نے بولنا شروع کیا۔

"میں مس انوشہ ہوں' آرگینک کیمسٹری کی لیبارٹری انچارج اور یہ مس ردا ہیں' ان آرگینک کیمسٹری کی لیبارٹری انچارج۔ جب تک چیئرمین صاحب اور سینئر اساتذہ تشریف لاتے ہیں' آپ میں سے ہر کوئی ایک ایک صفحہ نکالے اور اپنا' اپنے والد کا اور اپنے دادا کا نام لکھنے کے بعد ان کی جاب کی نوعیت لکھے۔ پھر نیچے یہ وجہ بھی لکھے جس کی بنا پر آپ اس شعبے میں وارد ہوئے۔ اور ہاں! اپنا فون نمبر لکھنا نہ بھولیے گا پلیز۔"

اس کی آواز نہایت سنجیدہ تھی۔ جب وہ بول رہی تھی تو ردا پورے آڈیٹوریم کا جائزہ لے رہی تھی کہ وانیہ اور باتھ روم جانے والا لڑکا تو یہاں موجود نہیں مگر دونوں میں سے کوئی اسے نظر نہ آیا۔ انوشہ کی بات کے اختتام پر پورے آڈیٹوریم میں پھر سے ہلچل مچ گئی۔ کچھ اپنے بیگ سے نوٹ بک نکالنے لگے۔ کچھ دوسروں سے ادھار صفحہ مانگنے کے چکر میں تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جن کے چہروں پر بڑا بڑا سا "کیوں" لکھا ہوا تھا۔

"مس آخر ایسا کیوں؟ پورا شجرہ نسب لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟" آخر پوری کلاس میں ایک لڑکا اٹھ کھڑا ہوا۔ انوشہ نے سوچا کہ اس کا شمار ان طالب علموں میں ہوتا ہوگا جو ہر لیکچر کے دوران سوال کرکر کے استاد کو زچ کردیتے ہیں۔

"اب بیٹا! تم اپنی خیر مناؤ۔" اس نے دل ہی دل میں اس لڑکے کو مخاطب کیا اور پھر اس کی سمت پوری طرح متوجہ ہوگئی۔

"بیٹا جی! بات دراصل یہ ہے کہ استاد سے صحیح معنوں میں علم حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ

اس کی باتوں پر آمنا صدقنا کہا جائے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ میں نے ایسا کرنے کے لیے کیوں کہا تو یہ اصل میں ہمارے چیئرمین صاحب کا آپ سے تعارف حاصل کرنے کا انداز ہے۔ وہ خود بھی اپنے بارے میں آپ کو اتنا ہی تفصیل سے بتائیں گے۔ اس لیے وہ بھی آپ سے کچھ تو جاننے کے متمنی ہوں گے ناں؟ جتنی دیر میں وہ آئیں گے یقیناً" یہ تعارفی مرحلہ طے ہوچکا ہوگا۔"

انوشہ نے نہایت تسلی سے جواب دیا جبکہ ردا اپنی ہنسی دبانے میں مشغول تھی' کیونکہ اس کی ہنسی کا پٹاخہ سارا منصوبہ ناکام کردیتا۔ انوشہ سے اپنے سوال کا جواب پانے کے بعد وہ لڑکا بیٹھ گیا۔ دس منٹ بعد ردا نے سب سے ان کے تعارفی پرچے جمع کرنے شروع کردیے۔ انوشہ بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگی۔ اتنے میں شزا جو دروازے کے باہر پہرہ دے رہی تھی۔ اندر داخل ہوئی اور دونوں کو بتایا کہ سر ممتاز اور سر انور ادھر ہی آرہے ہیں' ابھی صرف آدھے لوگوں سے وصولی ہوئی تھی۔ مگر اب وقت تعارفی پرچے جمع کرنے کا نہیں' بلکہ بھاگنے کا تھا ورنہ سارا بھانڈا پھوٹ جاتا۔

"مائی ڈیر اسٹوڈنٹس' ابھی جو دو استاد صاحبان اندر آئیں گے' بقیہ اسٹوڈنٹس انہیں اپنے تعارفی پرچے جمع کرادیں۔ آپ لوگوں کے تعاون کا بے حد شکریہ۔"

ردا نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور آڈیٹوریم کی سیڑھیوں کے ساتھ موجود بائیں طرف والے دروازے سے انوشہ اور شزا کے ساتھ باہر نکل آئی کہ سر انور اور سر ممتاز دائیں طرف والے دروازے سے اندر داخل ہورہے تھے۔

☼ ☼ ☼

نام۔۔۔ رحیم خان۔۔۔ طالب علم
والد۔۔۔ سلیم خان۔۔۔ بینک منیجر
دادا۔۔۔ کلیم خان۔۔۔ ریلوے سپروائزر
فون: ۔۔۔۔۔۔۔۔0307
کیمسٹری میں داخلہ لینے کی وجہ۔ مجھے فارمیسی میں داخلہ نہیں ملا' پرسنٹیج کم ہونے کی وجہ سے' اس لیے میں یہاں آگیا۔"

انوشہ کوک اور سموسوں سے انصاف کرتے ہوئے میرین بیالوجی کے سامنے بنی اسی آدھی اٹھی ہوئی دیوار (پلیا) کے ساتھ ٹیک لگائے فرش پر بیٹھی باآواز بلند کسی کا تعارفی پرچہ پڑھ رہی تھی۔ ردا اور شزا ہنسے جارہی تھیں کہ کیا خوب مذاق تھا۔ انہیں یہ سوچ کے مزید بل پڑرہے تھے کہ جب اسٹوڈنٹس سر انور اور سر ممتاز کو اپنا شجرہ نسب جمع کروائیں گے اور وہ دونوں انہیں بتائیں گے کہ یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے تو تب ان سب کو پتا چلے گا کہ وہ کتنے آرام سے بے وقوف بن گئے ہیں۔

"آپ تینوں کو چیئرمین صاحب بلا رہے ہیں۔" انوشہ پانچویں طالب علم کا تعارف پڑھ رہی تھی کہ کسی کا سایہ پہلے صفحے پر پڑھا اور پھر آواز نے سماعت پر دستک دی۔

"آپ کیا خدائی فوجدار ہیں جو آپ پر یہ نزول ہوا ہے کہ ہمیں چیئرمین صاحب بلا رہے ہیں۔" انوشہ نے نووارد کو سر اٹھا کر گھورا۔

"جی نہیں۔ میں خدائی فوجدار نہیں بلکہ فائنل ایر کا سی آر ہوں اور جس طرح آپ تینوں آڈیٹوریم میں ایک ہلچل مچا کر آئی ہیں وہ تو تیزاب اور اساس کے تعامل سے بھی کہیں زیادہ طاقت ور ہے۔ جو تعارفی پرچہ جات طالبہ وطالبات نے جمع کرائے ہیں' ان کے آگے تو چیئرمین صاحب کا تعارف بھی ماند پڑگیا ہے۔" نووارد نہایت سنجیدگی کے ساتھ اپنے آنے کا مقصد بیان کررہا تھا۔

"یقیناً" تم ہمیں بے وقوف بنا رہے ہو۔ ہم کیسے مان لیں کہ تم فائنل ایر کے سی آر ہو اور یہ کہ ہم ہی وہ تین لڑکیاں ہیں' جنھوں نے یہ ہلچل مچائی ہے؟" شزا نے فوراً" اس کی گفتگو پر اک نکتہ اعتراض اٹھایا۔

"آپ تینوں یہ کارڈ دیکھ سکتی ہیں۔" اس نے اپنی سامنے کی جیب سے اپنا فائنل ایر کا کارڈ نکال کر دکھایا۔ کارڈ دیکھ کر ان تینوں کی بولتی بند ہوگئی۔

"اور رہی یہ بات کہ آپ ہی وہ تینوں لڑکیاں ہیں یا نہیں، تو جس طرح کے حلیے کی نشان دہی اسٹوڈنٹس نے کی ہے، وہ آپ تینوں پر فٹ بیٹھتا ہے۔" یہ ان دو سالوں میں پہلی بار تھا کہ وہ اپنے کسی مذاق پر چیرمین کے روم میں طلب کی گئی تھیں۔

"اگر آپ لوگوں کا مراقبہ ختم ہو گیا ہو تو، چیرمین صاحب کے آفس چلیں؟ اصل میں وہاں کمپلین (شکایت) کرنے والے اسٹوڈنٹس کا تانتا بندھ گیا ہے۔" نووارد نے تینوں کو یکسر خاموش دیکھ کر لطیف سا طنز کیا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا مسٹر! کہ آپ یہ معاملہ یہیں رفع دفع کر دیں، چیرمین صاحب تو اتنی بے عزتی کریں گے کہ پوچھو مت۔" انوشہ اپنے تکیہ کلام سمیت مطلب کی بات پر اتر آئی۔

"آپ مجھے رشوت دے رہی ہیں؟ ان سارے لوگوں کا کیا جنہیں آپ تینوں نے بے وقوف بنایا ہے؟" نووارد نے انوشہ کو گھورا۔

"اب بے وقوف کو تو صرف بے وقوف ہی بنایا جا سکتا ہے۔" ردا نے نروٹھے پن سے کہا۔ جانے کہاں سے یہ خدائی فوج دار بن کے آ گیا تھا۔ انوشہ نے ردا کا ہاتھ دبایا۔ یہ وقت معاملہ بڑھانے کا نہیں بلکہ دبانے کا تھا۔

"بتائیے ناں! کہ کیسے رفع دفع ہو سکتا ہے یہ معاملہ؟" انوشہ نے قدرے انکساری سے کہا۔

"ہوں....." نووارد نے سوچتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ لوگ مجھے مرکزی لائبریری کے پاس کے سموسے، کیفے ٹیریا کا ڈبل ڈیکر برگر اور چائے پیش کریں تو پھر بات بن سکتی ہے۔ میں چیرمین صاحب کو کہہ دوں گا کہ مجھے وہ لڑکیاں ملی ہی نہیں۔" اس نے بڑے اطمینان سے سینے پر ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ نظریں ہنوز انوشہ پہ تھیں۔

"توبہ! کتنا عجیب ہے، گھورے ہی جا رہا ہے بدتمیز نہ ہو تو....." انوشہ نے اسے دل ہی دل میں صلواتیں دیں۔

"اور اگر ساتھ میں فزیالوجی سے گنے کا رس اور مجیدے کے ہوٹل کی بریانی بھی ہو جائے تو..... کہاں کا معاملہ اور کیسا معاملہ۔"

"جی نہیں مسٹر! اتنا پھیلنے کی ضرورت نہیں، مان نہ مان میں تیرا مہمان۔" شزا نے چیخ کر کہا۔

"کیا مطلب آپ کا؟" اس شخص نے فوراً ابرو چڑھائے۔

"جی! اس کا مطلب یہ ہے کہ فزیالوجی..... وہ تو خدا کے پچھواڑے ہے ناں! میرا مطلب بہت دور ہے اور مجیدے کے ہوٹل میں تو آج گوشت کا ناغہ ہو گا تو آپ کو تو بس وہ انڈا بریانی ہی مل پائے گی۔ ہم آپ کے لیے سموسے، برگر اور چائے لے آتے ہیں، کیوں ردا؟" انوشہ نے شزا کو چھوڑ کر ردا کو مخاطب کیا، مبادا شزا پھر کچھ بول پڑتی۔

"او کے! اسی پر اکتفا کر لیتا ہوں۔ ایسا کیجیے گا کہ اکیس سموسے، دو کپ چائے اور برگر تو ایک ہی ٹھیک ہے۔ اب میں انسان ہی ہوں، کچھ اور تو ہوں نہیں۔ کوئی پراسرار شخصیت، کوئی آسیب، جیسا فزیکل کیمسٹری کی تیسری منزل پر ہے۔"

نووارد نے لہجے کو گمبھیر کیا اور تینوں کا چہرہ فق ہو گیا۔ یہ تو ان کی ہر بات جانتا تھا۔

"کیا پتا واقعی آسیب ہو۔" انوشہ نے سوچا۔ "اتنی دیر سے ہم لوگ اس سنسان جگہ پر قل قل کر کے ہنسے جو جا رہی تھیں، ورنہ اکیس سموسے....."

"اکیس سموسے زیادہ نہیں ہیں؟" شزا چپ نہ رہ سکی۔

"آپ تین ہیں اور فی بندہ سات سموسوں کا جرمانہ دیں تو اکیس سموسے تو ہوئے ناں..... اب ذرا جلدی لائیے! اگر میری بھوک برداشت سے باہر ہو گئی تو میری اس بے وقت کی بھوک کو کنٹرول کرنے کے لیے آپ کو مزید خرچا پانی دینا پڑے گا۔" اس نے اس انداز سے کہا کہ ان تینوں کو آگے بڑھتے ہی بنی۔

"ایکسکیوزمی..... یہ آپ تینوں ایک ساتھ کہاں چل دیں؟ میں یہاں بیٹھا رہوں اور آپ تینوں مجھے چکما دے کر نکل جائیں..... مجھے کیا باقی لوگوں کی طرح بے وقوف سمجھا ہے۔ آپ..... جی مس! آپ سے مخاطب ہوں۔ کیا نام ہے آپ کا؟" اس نے کہتے ہوئے انوشہ کی سمت اشارہ کیا۔

"جی! میں انوشہ، یہ شزا اور یہ ردا....." انوشہ نے روبوٹ کی طرح کھٹ سے تینوں کا نام بتا دیا۔ شزا نے اسے گھور کے دیکھا کہ 'ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے' کے مصداق اپنا نام تو بتایا ہی تھا، ساتھ میں ان کی بھی معلومات دے دیں۔

"جی مس انوشہ! آپ یہاں رہیں گی میرے ساتھ۔ ان دونوں خواتین کے آنے تک۔" اس نے کہا اور انوشہ کی جان نکل گئی۔ اسے واقعی لگا کہ کوئی آسیب اس سے چمٹ گیا ہے۔ انوشہ نے ایک الوداعی نظر دونوں پر ڈالی۔ مرتے کیا نہ کرتے وہ دونوں بھی اسے اللہ کی امان میں دے کر چیزیں لینے چل دیں۔ جتنی دیر میں شزا اور ردا واپس آئیں، وہ انوشہ سے ساری کہانی زور دے کر اگلوا چکا تھا کہ وہ تینوں کون ہیں اور کیا کرتی ہیں۔

☆ ☆ ☆

شزا اور ردا کی لائی ہوئی چیزوں سے وہ بھرپور انصاف کر رہا تھا۔ گاہے بگاہے ان تینوں سے بھی پوچھا مگر تینوں نے منع کر دیا۔

"میرا خیال ہے کہ ہم نے آپ کی ڈیمانڈ پوری کر دی۔ اب ہمیں چلنا چاہیے۔" انوشہ نے کہتے ہوئے قدم بڑھائے۔ ان دونوں نے اس کی تقلید کی۔

"ایک منٹ۔ مس انوشہ۔ اس سارے ڈرامے کا ڈراپ سین ابھی باقی ہے۔" اس نے معنی خیزی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" تینوں مڑیں۔

"مطلب یہ کہ مس ردا! آپ نے کہا تھا ناں کہ بے وقوف لوگوں کو ہی بے وقوف بنایا جا سکتا ہے تو مبارک ہو! آج آپ تینوں بھی اس کیٹیگری میں شامل ہو گئی ہیں۔" اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

"جی؟" ان تینوں کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

"جی..... کیونکہ کبھی نہلے پہ دہلا بھی پڑ جاتا ہے اور کبھی کبھی چور کو مور بھی مل جاتے ہیں۔" کہتے ہوئے اس کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

"میرا نام منہاج حسن ہے۔ آپ لوگوں کی طرح میں نے بھی دو سال پہلے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کیا ہے اور ایک معروف چینل سے وابستہ ہوں۔ میں بھی آپ تینوں کی طرح آج کے دن کی خوب صورتی اور بے وقوفیاں سمیٹنے یہاں آتا ہوں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ یادیں آپ کی یادداشت کے خانے میں چھپی رہتی ہیں اور میرے پاس کیمرے میں محفوظ ہو جاتی ہیں۔ وہ دیکھیے ہماری کیمرا ٹیم۔"

منہاج نے کہتے ہوئے میرین بیالوجی کے سامنے والے باغ کی طرف اشارہ کیا، جہاں منہاج کی کیمرا ٹیم کے دو صاحبان کھڑے ان کی طرف ہاتھ ہلا رہے تھے۔ وہ لوگ کچھ ہی منٹ پہلے وہاں پہنچے تھے۔

"یو مین آپ وہ ہیں جو ٹی وی پر چھپن چھپائی والے پروگرام کرتے ہیں۔ آپ نے ہمیں چیٹ کیا ہے۔" شزا نے سلگ کر کہا۔

"سوری! چیٹ (دھوکا) نہیں کیا۔ وہ کیا جو آپ لوگ صبح سے کر رہی تھیں۔ یعنی فول بنایا اور ایسا ارادتاً نہیں ہوا۔ میرے کیمرا مین آگے کی طرف کچھ شوٹ کرنے گئے تھے تو میں اس باغ میں کچھ دیر کے لیے ستانے کے لیے بیٹھ گیا، کیوں کہ میرے پیر میں موچ آ گئی تھی۔ اور یہیں پر میں نے آپ تینوں کی گفتگو سنی جو آپ آپس میں باآواز بلند کر رہی تھیں اور ہنسے جا رہی تھیں کہ کس طرح آپ نے کسی لڑکی کو ڈرایا، پھر ایک لڑکے کو لیڈیز باتھ روم کا پتا بتایا اور سب سے بڑھ کر پورے کے پورے آڈیٹوریم کو فول بنایا۔

میری بھوک اس وقت زوروں پر تھی کہ صبح سے کچھ نہ کھایا تھا، بلکہ رات سے ہی مصروفیت کے باعث بھوکا تھا اور اس پر یہ پیر کی موچ، بس اسی وقت میرے ذہن میں ایک پلان آیا۔ میں نے اپنے بھائی کو جو واقعی فائنل ایئر کا سی آر ہے۔ اس کو ٹیکسٹ میسج کر کے

کارڈ منگوایا۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو تصویر والی سائڈ سے کارڈ نہیں دکھایا تھا' ورنہ آپ پہچان جاتیں۔ اور پھر باقی کی کہانی تو آپ کے علم میں ہے ہی۔ اور ہاں یہ جو میری جیب میں پین ہے نا' یہ کوئی معمولی پین نہیں' بلکہ ایک مائیکرو کیمرا ہے اس میں۔"

منہاج مزے سے اپنا کارنامہ بتا رہا تھا۔ وہ تینوں گنگ تھیں۔ کتنے مزے سے یہ شاطر نوجوان انہیں نہ صرف اپنی لچھے دار باتوں سے ٹھیک ٹھاک بے وقوف بنا چکا تھا' بلکہ ان کے پیسوں سے سموسے' برگر اور چائے بھی ہڑپ کر چکا تھا۔

"میں کہہ رہی تھی نا کہ دال میں کچھ کالا ہے' مگر تم تو فورا" ایمان لے آئی تھیں اس کی باتوں پہ۔" شزا' انوشہ کے کان میں گھسی۔

"ہاں تو' وہ بھی تو سنجیدہ صورت بنائے ثبوت پہ ثبوت دیے جا رہا تھا۔" انوشہ گڑبڑائی۔

"اب نکلو بھی یہاں سے' ایسا نہ ہو کہ مزید کچھ اور ریکارڈ کر لے' اب یہ سب نہ جانے کس چینل سے چلے گا اور پھر ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے بے بھاؤ کی سننے کو ملیں گی۔"

ردا بھی آہستہ آہستہ بڑبڑانے لگی۔ آج تو واقعی نہلے پہ دہلا پڑ گیا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ ان تینوں کی ساری ہنسی نو دو گیارہ ہو چکی تھی۔ "خدائی فوجدار کہیں کا۔" انوشہ بڑبڑائی اور تینوں جانے کے لیے مڑنے لگیں' تو اس نے آواز دے کر روک لیا۔

"اب کچھ اور مذاق کرنا رہتا ہے کیا مسٹر منہاج حسن؟" ردا نے طنز کیا۔

"مذاق نہیں' معذرت۔ آئی ایم سوری! میرا مقصد آپ تینوں کے چہرے کی مسکراہٹ چھیننا نہیں تھا۔"

وہ ان تینوں کے آگے ہاتھ جوڑے مسکین صورت بنائے کھڑا تھا۔ موچ کی وجہ سے چہرے پر تکلیف کے ہلکے سے آثار بھی تھے۔ اس کی صورت دیکھ کر تینوں کا غصہ جھٹ سے دور ہو گیا اور اس کی جگہ ہونٹوں پر مسکراہٹ در آئی۔

"تھینک گاڈ! آپ تینوں مسکرائیں تو سہی۔ اور ہاں! یہ میرا پرامس ہے کہ میں یہ ساری ریکارڈنگ تلف کر دوں گا' مگر..... آپ لوگ بھی وعدہ کریں کہ اگلے سال کا فرسٹ اپریل فول میرے ساتھ منائیں گی..... اور رہی یہ ٹریٹ..... تو اس کا ادھار بھی میں چکا دوں گا۔" وہ ان کی سب باتیں سن چکا تھا۔ "پرامس کریں میرے ساتھ۔"

منہاج نے تینوں کی طرف دیکھا اور تینوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آج تک وہ دوسروں کو بے وقوف بناتی آئی تھیں' مگر آج کوئی انہیں بھی ہاتھ دکھا گیا تھا۔ تینوں نے جانے کی اجازت مانگی اور قدم آگے کی طرف بڑھا دیے۔

"ویسے ماننا پڑے گا آپ تینوں کو' اور مس انوشہ خاص طور پر آپ کو..... حضرت خضر کی متضاد کاپی ہیں آپ' راہ چلتے ہوؤں کو بھٹکانے کا ہنر بخوبی جانتی ہیں۔"

وہ لوگ تھوڑا سا آگے بڑھیں تو منہاج نے اونچی آواز میں کہا اور وہیں کھڑا مسکراتا رہا۔ ردا اور شزا نے پلٹ کر اپنے فرضی کالر کھڑے کیے' مگر انوشہ نہ پلٹی۔ اسے ڈر تھا کہ اب اگر اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ کہیں اس بولتی آنکھوں والے شخص کی اسیر نہ ہو جائے اور اسیر تو منہاج حسن بھی اسی وقت ہو گیا تھا' جب انوشہ پلیا سے ٹیک لگائے' تعارفی پرچہ پڑھتے ہوئے بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ اسے زندگی کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر ساتھ چلنے کے لیے کوئی ایسا ہی ہنستا مسکراتا ساتھی درکار تھا۔ نام پتا جاننے کے لیے اس کا یہ سب کرنا ضروری تھا۔ کیمرے نے سب کچھ قید کر لیا تھا۔ اس نے ہولے سے اپنی جیب میں رکھے پین کو تھپتھپایا اور مسکرا دیا۔ آج کا دن واقعی ایک یادگار دن تھا۔

زُہرہ مُمتاز

اس نے دھیرے دھیرے چوٹی گوندھ کر سرے پر پہنچ کر آخر کے بال موڑ دیے اور کس کر ربر بینڈ لگا دیا۔ آئینے میں شکل دیکھ کر اس نے سکون سے سوچا "چلو اب دوسرے دن صبح تک بال بنانے کی ضرورت نہ پڑے گی۔"

پلٹ کر اس نے کمرے کی طرف دیکھا۔ بستر کی چادر سے لے کر سنگھار میز کی دراز تک ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا، شکن بستر کی چادر پر ہو یا کسی کے ماتھے پر، اس کے لیے انتہائی ناپسندیدہ تھی۔ سو وہ کسی کام میں کمی رکھا ہی نہ کرتی تھی۔

وہ چلتے چلتے قدم قدم پر چیزوں کی ترتیب اور ترکیب پر خاص توجہ دیا کرتی۔ نفاست اور سلیقہ اس کی طبیعت میں رچا بسا ہوا تھا۔ صرف اپنے کمرے کی حد تک نہیں، پورے گھر کو وہ اپنی خاص نگرانی میں صاف کروایا کرتی تھی۔ اس سلیقے کے ساتھ ملنساری اور رکھ رکھاؤ میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ اسی لیے دادی حضور سے لے کر چھوٹی پھوپھی کے سات سالہ منان تک سب کی ہر دل عزیز تھی، کیونکہ وہ خاندان کے ہر فرد کو برابر اور خصوصیت سے وقت دیتی کہ جس کے پاس بیٹھی ہوتی، وہ سمجھتا ثریا حیدر خاص اسی کے لیے بنی ہے۔

مکمل ناول

حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور اس کی ماں کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب وہ صرف تیرہ سال کی تھی۔ ہادی اس سے چھوٹا تھا ولید جوان تھا جبکہ سعد اور حماد لڑکپن کی عمر میں تھے۔ والد صاحب اتنے مصروف بزنس مین تھے کہ کبھی کبھی رات گئے گھر آتے اور صبح اٹھ کر اس وقت چلے جاتے جب آدھے سے زیادہ لوگ سوئے ہوئے ہوتے۔ مہینے دو مہینے میں ایک بار ملک سے باہر بھی ضرور جاتے۔ ہفتہ آٹھ دن بھی لگ جاتے۔ سوائے وقت کے انہیں ہر چیز بڑی فراوانی سے ملی ہوئی تھی۔ اب وہ اکیلے پانچ بچوں کی تربیت پر قطعی دھیان نہ دے سکتے تھے لیکن ان مشکلات کے باوجود ان کی سب اولاد نہ صرف نیک اور صابرین تھی بلکہ انتہائی محنتی اور لائق بھی تھی۔

کچھ لوگوں کی تربیت فطرت کرتی ہے اور بہت اچھی کرتی ہے کہ لوگ مثالیں دیتے ہیں۔ اس میں والدین کی نیک نیتی کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ کچھ نیکیاں ایسی ہوتی ہیں جو صدقہ جاریہ بن جاتی ہیں اور ہمیشہ پھل دیتی ہیں۔ ثریا حیدر کی ماں اتنی سلجھی ہوئی، خاموش طبیعت اور نیک عورت تھی کہ اس کے جانے کے بعد بھی اس کی ممتا کا سایہ سو سال تک اس کی اولاد کے لیے مشعل راہ بن جانے والا تھا۔ اس کی سب سے بڑی نیکی اس کی خاموشی تھی۔ وہ کہتے ہیں نا ایک چپ سو سکھ منصے میں، مشکل میں، تکلیف میں، دکھ میں بھی اور سکھ میں بھی، حتیٰ کہ اپنی برائی اور دوسروں کی برائی کے نازک معاملات میں بھی وہ چپ رہا کرتی۔ چپ رہنے والوں کی ایک خوبی یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنی اچھائی کا اشتہار لگاتے ہیں، نہ دوسروں کی برائی کا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ جب اس کا انتقال ہو گیا تو حیدر صاحب ایسے سکتے میں آئے کہ سال بھر تک گم ہی رہے۔ ایسی خاموشی ان پر طاری ہوئی کہ کسی طور دنیا میں جی لگانا مشکل ہو گیا۔

"اپنے بچوں کی طرف دیکھو، ان میں جی لگاؤ، بہو کی روح بھی خوش ہو گی اور تمہارے مزاج میں بھی ٹھہراؤ آئے گا۔"

ماں آہستہ آہستہ بیٹے کو محبت سے سمجھاتی رہتیں اور وہ کبھی سر ہلاتے رہتے، کبھی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکائے رکھتے۔ اور کبھی "آپ ہیں نا، سب گھر والے ہیں، سب ان بچوں سے پیار ہی تو کرتے ہیں۔" اسی طرح کے جواب دے کر کنارہ کر لیتے۔

☼ ☼ ☼

دو ہزار گز کی اراضی پر بنے ہوئے ان چار گھروں میں وہ تین بھائی اور ایک بہن رہتے تھے۔ ان کی چھوٹی بہن کی شادی ان کے چچا زاد بھائی سے ہوئی تھی، جس کو اماں جان نے اس کے والدین کے ایک حادثے میں انتقال کے بعد سے اپنے پاس رکھا ہوا تھا اور صرف پالا پوسا نہیں تھا بلکہ تمام معاملات میں مساوی حقوق بھی دیے تھے۔ جس پر ان کی اپنی اولاد نے کبھی اعتراض نہ کیا تھا۔

حیدر علیم کے والد مرحوم نے جائیداد اور گھر کے حصے خود اپنی زندگی میں ہی کر دیے تھے۔ ایک بیٹی یعنی فائزہ آپا جسے خاندان سے باہر بیاہا گیا تھا، اسے بھی ایک گھر لے کر دیا تھا کہ اس کے دل میں کوئی حسرت نہ رہ جائے۔

یوں تو انہوں نے اپنے تئیں انصاف ہی کیا تھا، لیکن عورتوں کی ناقص العقلی اور کم علمی اکثر گھروں کی بنیاد میں دراڑیں ڈالا کرتی ہے۔ بظاہر سب بھائی بہنوں میں آپس میں بڑا پیار اور لحاظ تھا۔ لیکن فائزہ آپا کے دل میں ایک ہلکی سی جو حسد کی چنگاری تھی، اسے گھر کے باہر کے لوگ سالوں سے ہوا دے کر آگ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ اماں جان اپنی محبت اور سمجھ بوجھ سے اس چنگاری کو دبا دینے کی بڑی کوشش کرتی رہتیں۔ چاہتی تو یہ ہی تھیں کہ یہ چنگاری بجھ جائے لیکن فائزہ آپا خود کانوں کی بڑی کچی اور جذباتی عورت تھیں، پھر ان کی اپنی منجھلی بھابھی سے بہت بنتی تھی جو بہت شاطر اور تیز عورت تھیں۔ بظاہر مزاج بڑا نرم

اور نرم تھا، لیکن انہیں بھی وہی حسد کا مرض لاحق تھا، خاص کر بیگم حیدر اور ان کے بچوں سے بڑا بغض رکھتی تھیں۔ اس کی بھی ایک ٹھوس وجہ تھی۔

جب حیدر علیم کے لیے رشتہ ڈھونڈا جا رہا تھا تو انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ ان کی چچا زاد بہن اس گھر میں بیاہ کر آجائیں لیکن اماں جان اور فائزہ آپا خود اس وقت اس رشتے کے لیے راضی نہ ہوئیں۔ امینہ بیگم کی یہ کزن خاندان بھر میں تیز طرار اور بہت زیادہ فیشن ایبل مشہور تھی۔ پہلے فائزہ آپا کو ہی ایسی عورتیں پسند نہ تھیں۔ وہ اپنے سیدھے سادے بھائی کے لیے ایسا رشتہ کہاں ہونے دیتیں۔ ان کے بھائی حیدر صاحب نے بھی بہن کو اپنا شریک حیات ڈھونڈنے کے معاملے میں ایک ہی بات کہی تھی کہ لڑکی سیدھی سادی اور نرم خو ہو۔ تیز مزاج اور چالاک عورتیں انہیں زہر لگتی تھیں اور ایک بات چپکے سے بڑی بہن کو اور کہی کہ کسی بھی رخ سے امینہ بھابھی جیسی نہ ہو، سو یہ رشتہ تو ناممکن ہی تھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ سالوں گزر گئے، کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا کہ کینہ اب بھی امینہ بھابھی کے دل میں گھر کیے بیٹھا ہے۔ صرف اماں جان اپنی اس بہو کے مزاج اور چالاکیوں کو سمجھتی تھیں۔ مگر گھر میں ہر کسی کو وہ یہ آگاہی دینا ضروری نہ سمجھتی تھیں، لیکن حیدر علیم کے بچوں کو خاص طور پر ثریا اور ولید کو وہ خصوصی توجہ کے ساتھ ان کی امینہ چاچی سے ہمیشہ ہوشیار رہنے کی تاکید کرتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"پورا دن گزر گیا، اب تو نہانے کے لیے چلے جاؤ۔"

ثریا نے اپنے چھوٹے بھائی ہادی سے کہا، جو سیٹی بجاتے ہوئے لاؤنج سے اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔

"سستی آرہی ہے۔ کل نہاؤں گا۔" اس نے جواب دیا۔

"حلیہ دیکھو اپنا... بالوں کا تو سر پر گچھا بنایا ہوا ہے۔ ناخن کیسے لمبے اور غلیظ ہو رہے ہیں، اور شکل دیکھو جیسے... لگتا ہے بس عید کے عید نہاتے ہو۔" ثریا کی باتوں نے اسے سخت غصہ دلایا۔

"میرے حلیے سے کسی کو کیا لینا دینا۔ میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا ہے، مجھے یوں نہ ٹوکا کرو۔"

وہ چڑ کر جوتوں سمیت اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ ثریا کو اتنی گھن آئی، جی چاہا ان ہی جوتوں سے چھوٹے بھائی کی پٹائی کر دے، مگر بڑے ضبط سے بولی۔

"کیوں نہ ٹوکوں، آخر تمہاری بڑی بہن ہوں۔"

"بڑی بہن ہی ہو، اماں تو نہیں۔ خوامخواہ پیچھے پڑی رہتی ہو۔"

"بڑی بہن بھی ماں کی جگہ ہی ہوتی ہے۔ تمہیں لحاظ کرنا چاہیے۔"

"خدا کا واسطہ میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم جیسی ماں سے میں بن ماں ہی بھلا ہوں۔"

اتنی سختی سے ہادی نے جواب دیا کہ اس کا دل ہی ٹوٹ گیا۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئی اور سیدھا دوڑ کر اپنے کمرے میں بستر پر گر گئی اور تکیے میں منہ دے کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اسے رونا بہت جلدی آجاتا تھا۔ بچپن سے اس کی عادت تھی' بات بے بات رونے بیٹھ جاتی۔ جب تک ماں کی شفیق گود موجود تھی اس میں سر دے کر لوگوں کی بے اعتنائیوں کا گلہ کر لیتی۔ اب اپنا بستر تھا اور اپنا تکیہ۔ بے جان آسرا تھا۔ کون بالوں میں نرم نرم انگلیاں پھیرتا۔ کون بھلا پھسلا کر آنسو پونچھتا۔

"تم رو رہی ہو؟ مجھے پتا تھا کہ تم بستر میں منہ دے کر رو رہی ہوگی۔" ہادی سر پر کھڑا تھا۔

"یار! کتنی بار کہا ہے کہ میرے معاملے میں نہ پڑا کرو' پھر میرے منہ سے اول فول نکل جاتا ہے اور تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ چڑیا جتنا تو دل ہے تمہارا۔"

اس کا روتا ہوا سرخ چہرہ دیکھ کر ہادی کو ملال ہوا۔

"اچھا بھئی! اب سوری کہہ رہا ہوں۔ معاف کردو۔" دونوں اوپر تلے کے تھے' اس لیے آپس میں اکثر الجھتے رہتے تھے اور ایک دوسرے کی پروا میں مرے بھی جاتے تھے۔

"تم مجھے ستانا چھوڑ دو۔ میں رونا چھوڑ دوں گی۔"

"تم میرے معاملات میں ٹانگ اڑانا چھوڑ دو۔ میں تمہیں ستانا چھوڑ دوں گا۔"

"یہ کیسے ممکن ہے' تمہارے معمولات پر تو مجھے نظر رکھنے کا حکم ہے۔"

"ابا نے دیا ہوگا یہ حکم۔ ان سے میں ایسی ہی امید رکھتا ہوں۔ خود تو انہوں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔"

"ایسا نہ کہو ہادی! ابا اتنی محنت صرف ہم بہن بھائیوں کے لیے تو کرتے ہیں کہ کاروبار مضبوط ہوگا تو کل ہم لوگ ہی فائدہ اٹھائیں گے۔"

"آج کی انہیں پروا نہیں اور کل کی فکر میں مبتلا ہیں۔" وہ روکھے پن سے بولا۔

"ہادی پلیز! اب اور کوئی ایسی بات نہ کہنا۔ میں تمہاری شکایت لگا دوں گی۔"

ہادی کو کچھ جھرجھری سی آئی کہ کہیں ثریا سچ مچ شکایت ہی نہ لگا دے۔ بڑھ بڑھ کے بول رہا تھا۔ ابھی ابا آجاتے تو سب سے پہلے اسی کی آواز بند ہو جاتی۔ اس کے دل میں باپ کا رعب بڑا تھا۔ ان کے غصے سے وہ ڈرتا بھی تھا اور گھبراتا بھی تھا۔ مگر کبھی کبھی روکھا بول جاتا تھا۔

"دیکھو اگر تم نے اس طرح کی کوئی بھی حرکت کی نا تو میں یہ گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ سمجھیں۔"

اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ہادی اتنی بڑی بات کہہ کر خود تو وہاں سے چلا گیا۔ مگر اسے عجیب سی سوچ میں ڈال دیا گیا۔

بہت دنوں سے اس کا رویہ' اس کی باتیں اور اس کے تیور بگڑتے ہی جا رہے تھے' لیکن اس حد تک اس کا دماغ خراب ہو چکا ہوگا۔ ثریا کو یہ اندازہ نہ تھا۔ ابا سے ضرور بات کرنا چاہیے' لیکن براہ راست بات کرنے سے شاید انہیں فوری غصہ ہی آجائے۔ اس نے سوچا۔

کئی دنوں سے اس کا اپنی امینہ چاچی کے گھر آنا جانا بھی بہت بڑھ گیا تھا۔ رات گئے تک ان کے پاس بیٹھا رہتا تھا۔ حالانکہ امینہ چاچی اپنے بچوں کے معاملے میں بڑی اصول پسند تھیں۔ ہفتے کے علاوہ ان کے بچے رات دس بجے کے بعد گھر سے باہر نظر نہیں آتے تھے۔ لیکن ہادی کو جانے کیوں وہ اتنی دیر لیے بیٹھی رہتی تھیں۔ اب روز ہی ہادی دیر سے سونے لگا تھا۔ پھر صبح اسکول کے لیے اٹھتے ہوئے اس کا یہ حال ہوتا کہ نہ ناشتا کرتا' نہ بال بناتا۔ جیسے تیسے دانتوں میں برش کرتا۔ چند چھینٹے پانی کے منہ پر مارتا اور یونیفارم بدل کر اسکول کے لیے بھاگتا۔ ٹائی جیب میں' موزے ہاتھ میں' آدھے جوتے پاؤں میں' آدھے باہر' اس پر بھی وین والا روز اس کو دو' ایک باتیں سناتا۔

رات کھانے کے بعد جیسے وہ دس بجنے کا انتظار کرتا' بلکہ پونے دس بجے ہی کھسک جاتا۔ بہت دنوں تک...

دیکھتی رہی۔ ساڑھے گیارہ' بارہ' کبھی ساڑھے بارہ' ایک دن تو ایک ہی بجا دیا۔

"آخر کیا کرتے رہتے ہو تم وہاں؟ ان کے بچے تو سوجاتے ہیں۔" وہ پوچھتی۔

"باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اتنے مزے مزے کے قصے کہانیاں سناتی ہیں چاچی۔"

"قصے کہانیاں بھی کوئی کب تک سن سکتا ہے ہادی! تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔" اس کی ڈھٹائی پر سخت پریشان تھی۔

"کسی دن آپ بھی چلیں۔ ان کی باتیں سنیں تو پتا چلے گا کہ کتنا مزہ آتا ہے۔"

اور ثریا اتنی ہوشیار نہ تھی کہ ہادی کے ساتھ چاچی کے گھر چلی جاتی۔ دو' تین دن ساتھ جاتی تو پھر چاچی ضرور چوتھے دن انہیں آدھے گھنٹے میں واپس بھیج دیتیں۔

"ہادی اپنی امینہ چاچی سے بہت گھل مل گیا ہے۔"

اس دن دادی جان نے پوچھا تو وہ کچھ گڑبڑا گئی۔

"دادی جان! ہادی بڑا ضدی اور خود سر ہو گیا ہے' بات بھی نہیں سنتا۔ کہتا ہے میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔"

"ابھی سے اس کے ایسے کون سے نرالے معاملے ہو گئے ہیں جن میں ہم دخل نہیں دے سکتے۔"

"پتا نہیں۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ابا سے اس کی شکایت کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ غصے میں اس کی پٹائی ہی نہ کر ڈالیں۔ وہ اور خود سری پر اتر آئے گا۔"

"تو کیا تم ننھی سی جان اس سے نمٹ لوگی۔ اتنا تردد نہ کرو۔ اب تو حیدر ہی اس سے نمٹ سکتا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"لیکن مجھے ان کے غصے سے ڈر لگتا ہے.... اور ہادی کی خود سری سے بھی خوف آتا ہے۔" اس نے پھر دادی جان کو اس کے گھر چھوڑنے والی دھمکی کے بارے میں بھی بتایا۔

"دادی! اگر آپ چند دنوں کے لیے ہمارے پاس رہنے آجائیں تو ہادی کو کچھ سدھار سکتی ہیں۔"

دادی جان سوچ میں پڑ گئیں۔ وہ ہمیشہ سے اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ رہتی آئی تھیں۔ انہیں اپنا بستر' اپنا تکیہ' اپنی الماری' اپنا باتھ روم' اپنی ہر چیز سے بڑا جذباتی سا لگاؤ تھا۔ اس لیے پاس پاس گھر ہونے کے باوجود وہ دوسرے بیٹوں کے گھر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ جایا کرتی تھیں۔

"پلیز دادی جان! چند دنوں کے لیے آجائیں نا۔ میں آپ کی بہت خدمت کروں گی۔ آپ کے سارے کام خود اپنے ہاتھوں سے کیا کروں گی۔ نیچے لاؤنج والے کمرے کو آپ کی پسند کے مطابق سیٹ کر دوں گی۔"

"اچھا بیٹا میں دیکھتی ہوں۔" وہ ثریا کو انکار بھی نہ کر سکتی تھیں۔

وہ چلی آئی' رات کو دادی جان نے پیغام بھجوایا کہ وہ دوسرے دن شام کو آجائیں گی' ثریا اتنی خوش ہوئی ابا اور سب بھائیوں کو یہ خبر سنائی۔

"اماں ادھر ہمارے پاس آکر رہیں گی' انہوں نے خود کہا ہے؟" حیدر علیم بہت حیران تھے۔

اس نے دیکھا سب بھائیوں کے چہرے پر بھی رونق آگئی تھی۔

"اچھی بات ہے ثریا! تم کل رات کھانے میں دادی جان کی پسند کا اہتمام کروا لینا۔" ولید نے کہا۔

"کل تو سارا کھانا میں خود ہی بناؤں گی۔ مجھے سب پتا ہے' وہ کیسا کھانا پسند کرتی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"میں تو کل کالج سے آتے ہی سو جاؤں گا' تاکہ رات کو دیر تک دادی جان کے پاس بیٹھ کر باتیں کر سکیں۔" حماد نے بھی جوش میں کہا۔

"میں بھی یہ ہی کروں گا۔" سعد بھی پرجوش تھا۔

سب بچے دادی کے آنے کی خوشی میں بڑی گرم جوشی دکھا رہے تھے۔ صرف ہادی خاموش بیٹھا رہا۔

"چلو اب سب بچے سونے کی تیاری کریں' تاکہ صبح سب اپنے اپنے وقت پر الارم کے ساتھ اٹھ سکیں۔" حیدر علیم خود بھی اٹھ گئے اور بچوں کو بھی ہدایت کر دی۔

☼ ☼ ☼

دادی جان گھر میں کیا آئیں' گھر میں رونق سی آگئی۔ جس طرح روز سب بھائی' ان کے بیوی بچے' اقصیٰ پھوپھو وغیرہ دادی جان سے ملنے یا ان کو سلام کرنے صفدر بھائی کے گھر جایا کرتے تھے' آج حیدر علیم کے گھر آرہے تھے۔ ثریا دل جمعی سے سب مہمانوں کی خدمت میں پیش پیش تھی۔ بسکٹ' نمکو اور فروٹ کی ٹرالی اس نے شام کو سجا کر رکھ دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی چائے' کافی یا جوس' ہر کسی کو اس کی پسند کے مطابق پوچھ کر پیش کر رہی تھی۔ اسے یہ سب کام کر کے فرحت محسوس ہو رہی تھی۔ مجال ہے جو ذرا سی تھکن یا بے زاری اس کے چہرے سے ظاہر ہوئی ہو۔ اس کے بھائی خصوصاً" حماد اور سعد ایسے معاملوں میں اس کی بڑی مدد کر دیا کرتے تھے۔

"ہادی تم آئے نہیں میرے پاس۔ میں کب سے انتظار کر رہی تھی۔"

امینہ چاچی بہت دیر سے اماں جان کے پاس آئیں۔ یقیناً" اپنے بچوں کو سلا کر سب کام نمٹا کر آئی ہوں گی۔ کیونکہ ان کے بچے اور میاں پہلے ہی آکر اماں جان سے مل لیے تھے۔

"مگر آج تم کہاں آؤ گے۔ آج تو تمہارے اپنے گھر میں ہی رونق لگی ہوئی ہے۔" وہ ایک انداز سے ہنسیں۔

"سچ پوچھو' تمہارے انتظار میں ہی مجھے آنے میں اتنی دیر ہو گئی۔" ان کا انداز حیدر علیم کو بڑا ناگوار گزرا۔ خود ہادی سب کے سامنے عجیب طرح سے شرمندہ ہوا کہ وہاں سے اٹھ کر ہی چلا گیا۔

"بچہ یوں شرما گیا کہ جیسے میں اس سے اظہار محبت کر رہی ہوں۔"

انہوں نے آہستہ سے ہنستے ہوئے برابر میں بیٹھی صالحہ بھابھی سے کہا' اماں جان ساتھ ہی بیٹھی تھیں اور ان کا دھیان بھی اس طرف ہی تھا' اس لیے انہوں نے سن لیا۔

انہیں شدید کوفت ہوئی۔ ان کی اپنی کوتاہی یا نصیب کی کمی کہ ایک امینہ کے نام پر بہو کے معاملے میں وہ مات کھا گئیں۔ ورنہ صالحہ اور چھوٹی بہو ایسی نیک صورت' نیک فطرت تھیں کہ ان کا جی ٹھنڈا ہو جایا کرتا تھا۔ اب ان کا کڑھنا اور جی جلانا بے کار ہی تو تھا' پھر بھی جاتے ہوئے امینہ بھابھی اماں جب جانے کے لیے اٹھنے لگیں تو اماں جان نے انہیں ٹوکا ضرور۔

"امینہ! ایسے بے ہودہ مذاق ہمیں زیب نہیں دیتے۔ گھر کی روایات کا خیال رکھنا چاہیے۔" اماں جان کو غصہ تو بہت آیا تھا' لیکن انہوں نے امینہ بیگم کو بس نیچی آواز میں تنبیہہ کی۔

"ہادی سو گیا کیا؟" سب چلے گئے تو حیدر علیم نے ثریا سے پوچھا۔ آج وہ بھی اپنی ماں کی آمد کی خوشی میں رات کھانے کے وقت ہی گھر آگئے تھے۔

"پتا نہیں۔ میں دیکھتی ہوں۔" وہ جانے لگی۔

"بس پھر تم بھی جا کر سو جاؤ۔ صبح کالج جانا ہے۔ باقی باتیں کل کر لینا۔"

"میں نے تو دادی جان سے کوئی بات بھی نہیں کی۔ ابھی تو فارغ ہوئی ہوں۔ ابو میں صبح کالج کی چھٹی کر لوں گی۔" اس نے مچل کر کہا۔

"نہیں۔ چھٹی کی کیا ضرورت ہے۔ اماں تو ابھی یہاں رہیں گی نا۔" حیدر علیم نے سختی سے کہا تو وہ سر ہلانے کے سوا کچھ نہ کر سکی۔

"اماں! آپ بھی آرام کریں۔ یہاں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں گی۔" ثریا نے اپنے کمرے کے ساتھ والے کمرے کو دادی کے لیے بڑی محبت سے آراستہ کیا تھا۔ بستر کی چادر سے لے کر باتھ روم کے برش تک اس نے اس قدر خیال رکھا کہ کوئی چیز ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو۔

"حیدر! اولاد کے معاملے میں تم بڑے خوش قسمت ہو۔ ثریا جیسی بیٹی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوتی ہے۔"

"جی اماں! اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے۔" سب بچے سونے کے لیے چلے گئے تھے اور حیدر تھوڑی دیر کے لیے اپنی ماں کے سرہانے بیٹھ گئے۔ خوشی اور رونق خود بخود گھر بھر میں چھلکی پڑ رہی تھی۔

صبح جی نہ چاہ رہا تھا، پھر بھی ثریا کو کالج جانا پڑا۔ دادی جان فجر کی نماز کے بعد تلاوت اور درود و وظائف میں مشغول تھیں، جب ثریا ان کے پاس آئی۔

"فجر کی نماز پڑھ لی بیٹا!" انہوں نے پوچھا۔

"جی دادی جان! ہم کہاں آپ کی طرح سکون اور توجہ سے نماز پڑھ سکتے ہیں۔ ہمیں لگتا ہے ہمیں دنیا میں بڑے کام ہیں۔"

"والدین اور گھر والوں کی خدمت کرنا بھی عین ثواب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہر اچھے کام کا اجر ہے۔ اس کی رحمت کی چادر ہر آن اس کے بندوں پر تنی رہتی ہے۔ بس بندے کو اپنے فرائض خوش اسلوبی سے نبھاتے رہنے چاہئیں۔"

صبح کے سحر انگیز لمحات میں دادی جان کی باتیں اسے بہت بھلی لگیں۔

"آپ ناشتا کریں گی؟"

"ابھی مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ تم اطمینان سے کالج جاؤ، ویسے بھی اپنے اس طرح کے چھوٹے چھوٹے کام میں خود کرلیا کرتی ہوں۔"

"لیکن آپ کے کام کرکے مجھے خوشی ہوتی ہے۔"

"اللہ تمہیں خوش رکھے۔ اتنا سب کچھ تم نے ہی تو کیا ہے۔" انہوں نے اپنے کمرے میں ہر طرف نظر دوڑا کر کہا۔

☼ ☼ ☼

ہفتہ کی صبح فائزہ آپا نے فون کرکے کہا کہ وہ رات کو اماں سے ملنے آئیں گی تو حیدر علیم نے انہیں کھانے پر ہی بلا لیا۔

"کھانے پر کیوں بلایا ہے؟" ثریا بہت تردّد میں پڑ جاتی ہے "ابھی بچی ہے۔"

حیدر علیم نے ماں کو بتایا تو انہوں نے جواب میں کہا۔

"آپ کی بات درست ہے، لیکن فائزہ کب میرے گھر آتی ہیں، عید، بقر عید پر جب سب گھر والوں کی دعوت ہوتی ہے، اس کے علاوہ تو کبھی چائے پینے کے بہانے بھی نہ آئیں۔ اب انہوں نے خود ہی فون کیا تو اخلاقاً" کھانے کا تو مجھے کہنا ہی چاہیے تھا۔" اماں جان نے سر ہلایا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں کھانا باہر سے لے آؤں گا۔" دادی اماں تو فوراً" راضی ہو گئیں، لیکن ثریا کو بہت برا لگا۔

"ابا! آپ کو پتا ہے، مجھے تو کوکنگ کا اتنا شوق ہے اور اب میں اتنی پھوہڑ بھی نہیں کہ دس، بارہ لوگوں کے لیے کھانا نہ بنا سکوں۔" اس نے جوش سے کہا۔

"تمہیں شوق ہے تو اسے گھر میں آزما لیا کرو۔ فائزہ کبھی کبھار ہی آتی ہے تو اہتمام بھی کرنا پڑے گا۔ کھانا باہر سے منگوا لینے کا خیال بہتر ہے۔ مہمان آئیں گے تو ویسے ہی کام بڑھ جائیں گے۔" دادی جان نے اسے سمجھایا۔

"یوں کہیں نا دادی جان کہ آپ کی چہیتی بیٹی آ رہی ہیں اور آپ کو لگتا ہے کہ میں ان کے شایان شان اہتمام نہیں کرسکوں گی۔ یعنی آپ کو مجھ پر بھروسا نہیں۔" وہ ناراض ہی ہو گئی۔

"ایسی بات نہیں ہے بیٹا! بات یہ ہے کہ جب سہولت موجود ہے تو کیوں مشکل میں پڑا جائے، یوں بھی میری خاطر تم اتنی جان ماری کرو۔ یہ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"دادی جان! آپ ہمیں اور ہمارے گھر کو اپنا نہیں سمجھتیں، جب ہی ایسی غیروں والی باتیں کر رہی ہیں۔ صفدر چچا کے گھر میں بھی تو رشتہ داروں کا آنا جانا لگا رہتا ہے، کیا صالحہ چاچی ان کی خاطر مدارات نہیں کرتیں؟" وہ بحث کرنے لگی۔

"اچھا بھئی! جو چاہو پکالو، ہاں اگر کچھ برا پکایا تو خیر نہیں۔" دادی جان نے اس کی دلجوئی کرتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا پڑی اور پھر اتنی خوشی خوشی کام میں لگ گئی کہ دادی جان کو اپنے فیصلے پر اطمینان ہی ہوا۔ سکینہ سارا وقت اس کے ساتھ لگی رہی۔ اپنے تئیں دادی جان نے خود بھی بڑا ہاتھ بٹایا، بلکہ ان بچوں کی محبت میں انہوں نے اپنے کئی وہم اور وسوسے بالائے طاق رکھنا شروع کردیے تھے۔

ثریا ٹی وی کے کوکنگ پروگراموں سے، نیٹ پر اور کوکنگ کی کتابوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر بڑے تجربے کرلیا کرتی تھی، پھر اپنی صالحہ چاچی سے بہت کچھ پوچھ لیا کرتی۔ صالحہ چاچی کا کھانا بنانے کا انداز بہت اچھا اور منفرد تھا اور ان کی طبیعت میں اتنا اخلاص اور چاہت تھی کہ ثریا دس بار بھی ان سے کچھ پوچھ لے یا ان کے گھر کے چکر کاٹ لے، وہ برا مانتیں نہ ٹوکتیں، بلکہ حوصلہ افزائی ہی کیا کرتی تھیں۔ یوں بھی اللہ نے ثریا کو ایسی صلاحیت دی تھی کہ جس کے پاس بیٹھتی، اس سے چار باتیں سیکھ کر ہی اٹھتی۔ چاہے وہ گھر کا کوئی نوکر ہی کیوں نہ ہو، کھانا بہت لذیذ بنا تھا اور چونکہ ساتھ ثریا کی لگن اور توجہ بھی بہت شامل تھی۔ اس لیے سب کو لطف آیا۔

کھانے کے بعد جب سب کچھ سمٹ گیا اور اس نے بہت تعریفیں بھی سمیٹ لیں تو وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر اپنے چھوٹے سے لان میں آکر بیٹھ گئی۔

"آپ نے تو کمال کردیا، مجھے خبر نہ تھی کہ ہمارے خاندان میں ایسی باکمال لڑکیاں بھی موجود ہیں۔" یہ فائزہ آپا کا بڑا بیٹا آفاق تھا۔

"ہونہہ! آپ کے اپنے اندر کوئی کمال نہ ہوگا، اسی لیے آپ نے سمجھا کہ خاندان میں سارے ایسے ہی بے کار لوگ ہوں گے۔"

وہ ایسی بات سن کر جواب میں چپ رہ جانے والوں میں سے بھی نہ تھی۔

"آداب کے خلاف سمجھا جاتا ہے، ورنہ میں اپنے کمالات گنوانے بیٹھوں تو آپ کی رات یہیں ختم ہو جائے۔" توقع کے عین مطابق جواب آیا۔

"آپ پروا نہ کریں، اپنے کمالات گنوانا شروع کردیں۔"

"اب لمبی بات کیا کروں۔ میرا نام ہی میرے تعارف کے لیے کافی ہے۔"

"اچھا! اتنا عمدہ نام ہے، سوری مجھے بالکل یاد نہیں رہا کیا نام ہے آپ کا؟" وہ بھرپور تفریح کے موڈ میں آگئی تھی۔

"آفاق، دراصل اتنا نفیس اور بامعنی نام ہے، ہر کسی کو یاد نہیں رہ سکتا۔" وہ بھی دل لگی ہی کر رہا تھا۔ ابھی وہ کچھ کہتی کہ اس نے بات آگے بڑھائی۔

"نام تو آپ کا بھی بڑا بامعنی اور خوب صورت سا ہے، ثریا۔" اس نے اتنی لے میں طرز بنا کر اس کا نام لیا کہ اسے یک دم بہت کوفت سی ہوئی۔ اور اسے خیال بھی آیا کہ وہ بلاوجہ ہی اس شخص سے اتنی طویل گفتگو کرنے لگی۔

"ثریا حیدر، میرا پورا نام ہے، صرف بامعنی ہی نہیں بارعب بھی۔"

وہ فوراً" اٹھ کر اندر لاؤنج کی طرف چلی گئی۔ آفاق یقیناً" اس کے اچانک اٹھ کر چلے جانے پر حیرت زدہ رہ گیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں یہ ہی سمجھا تھا کہ صرف گھر کے کام کاج کرنے والی، کھانا پکانے والی ایک ڈیو سی بے وقوف سی لڑکی ہوگی۔

لاؤنج میں ابھی تک سب بیٹھے باتوں میں مشغول تھے۔ وہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

ذہن میں وہ ہی آفاق کی باتیں اور انداز گردش کر رہا تھا۔ اس سے پہلے اس کی کبھی آفاق سے ایسی کوئی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ سلام دعا سے آگے کبھی کلام بھی نہ کیا تھا۔ بس اس کے بارے میں باتیں سن رکھی تھیں کہ پڑھائی میں تیز ہے "کتابی کیڑا ہے، جب ہی پوزیشن آئی تو اسکالر شپ پر امریکہ اعلا تعلیم کے لیے چلا گیا تھا۔ چند مہینوں پہلے ہی تعلیم مکمل کرکے آیا تھا۔ اپلائیڈ فزکس کے علاوہ کمپیوٹر میں بھی کچھ کورسز کیے تھے۔ سنا تھا وہیں امریکہ میں بہترین جاب کی آفرز ٹھکرا کر پاکستان آیا تھا کہ اپنے ملک میں ہی کام کرے گا۔

رشتہ داروں کے گھر آنے جانے اور دعوتیں اٹینڈ

کرنے سے کتراتا تھا۔ ثریا نے سن تو سب کچھ رکھا تھا، لیکن ایسی کوئی جنونی دلچسپی اسے بھی پیدا نہ ہوئی تھی جیسے خاندان کی لڑکیاں۔ افصیٰ پھوپھو کی بیٹی فاخرہ کی منگنی میں آفاق کی آمد پر "ہائے اللہ اور اوئی اللہ" کی صدائیں لگانے لگی تھیں۔

اس کا دھیان ایسی باتوں میں الجھتا ہی نہ تھا۔ اس کے اپنے الگ ہی مشاغل تھے جن میں اس کا دھیان اٹکا رہتا۔ جیسے فاخرہ کی منگنی میں اس کا دھیان صالحہ چاچی کی بہو رعنا بھابھی کی کرنکل جارجٹ کی خوب صورت ساڑھی میں الجھا، جس کے پلو اور بارڈر پر یقیناً" انہوں نے خود اتنی نفاست سے پینٹنگ کی ہوئی تھی۔

پھر فاخرہ کی منگنی میں ہی امینہ چاچی کی کہی کچھ باتوں نے اس کا موڈ ہی خراب کر دیا تھا۔ کسی سے اس کا تعارف کراتے ہوئے چچی نے کہا تھا۔

"یہ میرے دیور کی بیٹی ہے، بے چاری کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے۔"

اسے بھی بتایا" ثریا بیٹا! یہ فاخرہ کی ساس ہیں۔" وہ سر ہلا کر وہاں کھڑی نہ رہی، ذرا دور ہو گئی لیکن چچی کی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

"نہیں، نہیں، میری دیورانی کی اتنی عمر تو نہیں تھی، جانے کس روگ میں چلی گئی۔"

"آپ اچھی طرح دیکھ لیں، پڑھی لکھی ہے، سگھڑ ہے، لیکن بن ماں کی بچی ہے، میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔" چچی کی بات سے زیادہ ان کا لہجہ خراب تھا۔

وہ اتنی زیادہ دل برداشتہ ہوئی کہ گھر آکر پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ ماں نہیں رہی تھی لیکن ماں کی کمی قدم قدم پر دل دکھاتی رہتی تھی۔ اس محرومی کا احساس اس دن حد سے بڑھ کر ہوا تھا، کوئی بہن بھی نہ تھی۔ اپنے یہ دکھ بھلا وہ اور کس سے شیئر کرتی۔ بہرحال کچھ حالات ناسازگار تھے۔ کچھ اس کا اپنا مزاج ایسا عامیانہ نہ تھا کہ فضول سطحی خیالات میں عام لڑکیوں کی طرح الجھا کرتی۔

☼ ☼ ☼

"فائزہ کا فون آیا تھا، بڑی تعریفیں کر رہی تھی، اسے یہاں کھانے پر بہت لطف آیا، کہہ رہی تھی آفاق بھی بہت خوش ہوا اور اس کے میاں بھی بڑے متاثر ہوئے۔"

دادی جان نے دوسرے دن حیدر علیم کو بتایا۔

"حیرت کی بات یہ ہوئی کہ آفاق بھی چلا آیا، ورنہ فائزہ بتا رہی تھی کہ کہیں آنے جانے کے نام سے بہت جھنجلاتا ہے۔ خاص طور پر کھانے کی دعوت وغیرہ میں۔" دادی جان نے مزید کہا۔

"جی اماں! کیسے نہ آتا۔ میں نے خصوصی طور پر اسے الگ سے فون کیا تھا، اب میرا کہا تو ٹالنے سے رہا۔"

"بڑا ہونہار اور باادب بچہ ہے۔ اس بار اس سے مل کر مجھے اپنی ثریا کا خیال آیا۔ اگر تم کہو تو میں اشارتاً" فائزہ سے بات کر کے دیکھوں؟"

"کیسی باتیں کرتی ہیں اماں! ہم خود اپنی طرف سے کیونکر بات کر سکتے ہیں، ایک ہی تو بیٹی ہے میری۔ مجھ پر کون سا بوجھ بنی ہوئی ہے۔"

حیدر علیم اپنی ماں کی بات پر یک دم چڑ گئے۔

"تمہارا نام لے کر تو بات نہیں کروں گی۔ اپنی طرف سے کہوں گی، تم تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر بگڑ جاتے ہو۔" دادی نے گھرکا۔

"ابھی آپ میرے ساتھ رہ رہی ہیں بات کریں گی تو یہی ظاہر ہوگا۔ میری طرف سے کر رہی ہیں۔ رہنے دیں! بس اس بات کو یہیں ختم کر دیں۔" حیدر علیم نے حتمی کہہ دیا تو دادی جان کو چپ ہونا پڑا۔ دروازے پر کھڑی ثریا بھی اندر جانے کی ہمت نہ پا کر وہیں سے پلٹ گئی۔

☼ ☼ ☼

"دادی جان! میں ابھی آیا۔" کہہ کر وہ چلا گیا تو ڈیڑھ گھنٹے تک واپس نہ آیا۔ ثریا بار بار گیٹ کے چکر لگاتے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔

"سعد! اپنی امینہ چچی کے گھر جاؤ اور ہادی کو بلا لاؤ۔ اس سے کہنا دادی جان بلا رہی ہیں، فوراً" حاضر ہو جاؤ۔"

جب سب بھائی، بہن اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے چلے گئے۔ گھڑی بھی گیارہ بجانے لگی تو دادی جان نے سعد کو آواز دے کر کہا۔ وہ جی کہتے ہوئے فوراً" دوڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہادی ان کے سامنے کھڑا تھا۔ گھبرایا ہوا تھا۔ سمجھا ابا بھی آگئے ہوں گے۔ آج تو پٹائی لازمی ہے، سعد کو دادی جان نے جانے کا اشارہ کیا۔

"ہادی بیٹا! آپ کو نیند نہیں آ رہی؟"

"نیند تو بہت آ رہی ہے دادی جان! مگر چاچی اتنے مزے کا قصہ سنا رہی تھیں کہ... اب میں جاؤں، سونے کے لیے؟"

وہ ان کے سامنے نظریں جھکائے کھڑا تھا، لیکن یوں جیسے اشارہ ملتے ہی ابھی بھاگ اٹھے گا۔

"بہت نیند آ رہی ہے تو یہاں میرے پاس سو جاؤ۔"

وہ حیرت سے اپنی دادی کا چہرہ تکنے لگا۔ جانتا تھا کہ دادی جان یوں کسی کو اپنے بستر پر جگہ نہیں دیتی تھیں، خاص طور پر اس جیسا لاابالی لڑکا، کہ پاؤں گندے، مٹی سے اٹے ہوئے تو چہرہ کالا مرجھایا ہوا، جیسے کئی دنوں سے منہ دھویا ہی نہ ہو۔

"یہاں آپ کے بستر پر؟" وہ گڑبڑا کر بولا۔

"ہاں! بلکہ آؤ میری گود میں سر رکھ لو، میں تمہارا سر دبا دوں گی تو تمہیں میٹھی نیند آجائے گی۔"

ہادی اتنا حیران ہوا، پھر رنجیدہ ہو گیا۔

"میں آج نہایا بھی نہیں دادی حضور!" اسے اپنے حلیے پر افسوس تھا۔

ہلکے فیروزی رنگ کا بے داغ سوٹ پہنے ہوئے بڑی سی سفید چادر میں ان کا نورانی چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ انہیں روز دیکھتا تھا، لیکن آج یوں دیکھا تو اسے لگا، وہ ان کے پاس کھڑے رہنے کے قابل بھی نہیں۔

"ارے — آجاؤ، بچہ کیسا بھی ہو، ماں کی گود سب بچوں کے لیے برابر ہوتی ہے۔" وہ نہ جاتا، لیکن اسی وقت گیٹ پر ابا کی گاڑی کا ہارن بجا۔ وہ ان کی ڈانٹ اور سخت لہجے سے بچنے کے لیے دادی جان کی گود میں منہ چھپا کر لیٹ گیا اور آنکھیں بھی بند کر لیں۔

انہوں نے یوں دھیرے دھیرے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں کہ فوراً" اس پر نیند طاری ہونے لگی۔ یوں بھی تھکن اور نیند سے وہ بے حال ہی ہو رہا تھا۔ حالانکہ اس کا ارادہ تھا کہ ابا جیسے ہی اپنے کمرے میں جائیں گے، وہ جلدی سے اپنے کمرے کی طرف کھسک جائے گا، لیکن نیند ایسی غالب ہوئی کہ ہوش ہی نہ رہا۔

صبح فجر کے وقت دادی جان کے جگانے سے ہی جاگا۔

"فجر کی نماز پڑھتے ہو نا!" انہوں نے پوچھا۔

"کبھی کبھی پڑھتا ہوں، حالانکہ ثریا روز اٹھاتی ہے۔" وہ ندامت سے کہہ رہا تھا۔

"چلو! آج میرے ساتھ پڑھو۔" انہوں نے بہت پیار سے کہا۔

"جی اچھا، میں ابھی منہ دھو کر آتا ہوں۔" اسے پھر اپنے بدتر حلیے کا احساس جاگا۔

"کیا صرف منہ دھونے کے لیے اپنے کمرے میں جاؤ گے؟ یہیں دھو لو۔" انہوں نے اٹھ کر اپنی الماری کی دراز سے ایک تولیہ اور ٹوتھ برش نکال کر دیا۔

"آپ کا واش روم خراب ہو جائے گا دادی! میں اب جاتا ہوں۔" دادی کی صاف ستھری عادات اور وہمی طبیعت کا اسے بھی پتا تھا۔

"اگر خراب ہوا تو دوبارہ صاف بھی ہو جائے گا۔ چلو جلدی کرو نماز کا وقت تنگ ہو رہا ہے۔"

غسل خانہ اتنا صاف ستھرا تھا۔ مٹی یا گندگی تو دور کی بات، کہیں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ تھا۔ لگتا تھا کبھی کسی نے استعمال ہی نہیں کیا۔ وہ پورا اندر تک گیا بھی نہیں اور دوڑ کر باہر آگیا۔

"دادی جان! آپ نماز شروع کریں، میں ابھی آیا۔" اور پھر شاید زندگی میں پہلی ہی بار اس نے اپنے کپڑے الماری میں سے خود نکالے، تولیہ لیا اور صبح ہی صبح نہانے بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ صاف ستھرا کرتا

شلوار پہنے آئینے کے سامنے کھڑا بال سلجھا رہا تھا۔ ولید حیران اسے دیکھتا رہ گیا۔

"اتنی پھرتی سے تیار ہو کر کہاں جا رہے ہو بھائی؟"

"دادی جان کے پاس۔" اس نے جلدی میں جواب دیا اور بھاگ گیا۔ دادی جان نماز پڑھ رہی تھیں، اس نے بھی ایک کونے میں جاء نماز بچھا کر نماز شروع کردی۔

نماز پڑھ کر دادی جان نے دعا کی اور اس پر دم کیا۔ دادی کی ان خصوصی عنایات نے اس کے روئیں روئیں کو سرشار کردیا تھا۔ اسے آج دنیا ہی بدلی ہوئی لگ رہی تھی۔

رات کو جب اسے امینہ چاچی کے ہاں سے بلوایا گیا تو اسے پورا یقین تھا کہ اسے بری طرح ڈانٹ پڑے گی۔ امینہ چاچی کو برا بھلا کہا جائے گا اور آئندہ وہاں جانے کی پابندی بھی لگ جائے گی۔ امینہ چاچی نے خود بھی سعد کو دیکھ کر اس سے رات کو یہ ہی کہا۔

"جاؤ صاحب زادے! آج تو تمہاری درگت بننے والی ہے۔ یوں پتا نہیں چلتا، مگر اماں غصے کی بہت تیز ہیں۔ تمہارے ابا کو بھی خوب شکایتیں لگائیں گی۔"

لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ نہ رات، نہ صبح کسی نے اس معاملے میں کچھ کہا ہی نہیں۔

رات حسب معمول کھانے کے بعد صفدر چچا اور صالحہ چاچی آئیں۔ کچھ دیر بعد امینہ چاچی اور مدثر چچا بھی آئے اور سب بچے بھی ایک ایک کرکے دادی جان کو سلام کرکے اور دعائیں لے کر چلے گئے۔

"اوہو!" نکلتے ہوئے ہادی کو دیکھ کر امینہ چاچی نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

"آج میں نے لوکی کا حلوہ بنایا ہے۔ تمہارے لیے نکال کر بھی رکھا اور دیکھو، لانا بھول گئی۔ چلو آؤ! اب تم خود ہی آکر لے لو۔"

"کسی کے ہاتھ بھجوا دیں نا چاچی! میں تھک بہت گیا ہوں۔" اس نے ٹالنے کی کوشش کی تو امینہ چاچی نے آہستگی سے پوچھا۔

"تمہارے آنے پر پابندی تو نہیں لگ گئی؟"

"نہیں چاچی! ایسے ہی کہہ رہا ہوں، نیند بہت آرہی ہے۔"

"دیکھ لو! تمہاری مرضی ہے، تمہارے چچا بچوں کو تو اب گھر سے باہر نکلنے نہ دیں گے۔ وہ سب بستر میں پڑ گئے ہوں گے۔"

آج اسے امینہ چاچی کا انداز اچھا نہ لگ رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ ان کے پیچھے چل پڑا۔

دادی جان نے اسے چاچی کے ساتھ جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ کسی سے کہہ کر بھی نہ گیا۔

"اندر تو آؤ۔" وہ باہر ہی کھڑا رہا تو چاچی نے اسے اندر بلایا۔

"نہیں چاچی! بس حلوہ دے دیں۔" وہ باہر ہی کھڑا رہا۔

"تھوڑی دیر کے لیے تو آؤ، تمہیں پتا تو ہے تمہاری چاچی کو تم سے باتیں کیے بغیر نیند نہیں آتی۔" وہ اندر چلا گیا۔ حالانکہ وہ اندر جاکر بیٹھا بھی نہیں، لیکن امینہ چاچی کی باتوں میں پندرہ، بیس منٹ نکل ہی گئے۔

"اب میں جاؤں؟" اس نے دوسری بار کہا تو وہ چڑ گئیں۔

"لگتا ہے، تمہیں کل زیادہ ہی ڈانٹ پڑی ہے کہ دو منٹ کے لیے ٹک کر بیٹھ بھی نہیں رہے۔"

انہیں یہ جاننے کی بے چینی تھی کہ اماں نے کل کھڑے کھڑے بلوا کر اسے کیا کچھ کہا۔

"دادی جان نے صرف اتنا کہا کہ دیر بہت ہوگئی ہے، اب سو جاؤ اور ابا تو آئے بھی نہیں تھے۔" اس نے زیادہ تفصیل نہ بتائی۔

"اتنا سا کہنے کا ایسا اثر ہوا ہے کہ تم ٹک ہی نہیں رہے؟"

"آخر دادی جان ہیں میری۔" اس نے کچھ یوں جذب سے کہا کہ پچھلے دن کی ساری عنایتیں اور شفقتیں اس ایک جملے میں ہی عیاں ہوگئیں۔ امینہ چاچی کو اس کے لہجے پر بڑی تپ چڑھی۔

"بڑی شاطر عورت ہے، اپنے مطلب کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرلیتی ہے۔" ہادی کو برا لگا۔ وہ جی ہی جی میں چاچی پر بہت غصہ بھی ہوا، لیکن ظاہر نہ کیا اور گھر چلا آیا۔

"دادی جان سو گئیں کیا؟" ثریا کو حلوے کی پلیٹ پکڑاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ تمہارا انتظار کررہی ہیں۔" وہ تیزی سے ان کے کمرے کی طرف بڑھا۔

"یہ کیا ہے؟" ثریا نے پیچھے سے آواز لگائی، لیکن وہ جواب دینے کے لیے بھی نہ رکا۔ ورنہ امینہ چاچی کے ہاتھ کا بنایا لوکی کا حلوہ وہ کسی صورت نہ چھوڑا کرتا تھا۔ کمرے کے دروازے تک پہنچ کر وہ رک گیا۔ اندر سے ابا کی آواز آرہی تھی۔ وہ اندر نہ گیا، پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اپنے باپ سے وہ بہت خائف رہا کرتا تھا۔

آج وہ شام کو خاص طور پر اچھی طرح نہایا دھویا تھا، ناخن کاٹے تھے۔ صاف ستھرے کپڑے پہن کر تیار ہوا تھا۔

سونے سے پہلے وہ باتھ روم گیا، منہ دھو کر خوب اچھی طرح دانت صاف کیے اور نائٹ سوٹ پہن کر اپنے بستر میں لیٹ گیا۔

"آج تو ہمارا چھوٹا بھائی چاند کی طرح چمک رہا ہے، کیا بات ہے بھئی۔"

ولید نے اسے محبت سے چھیڑا۔ وہ بچپن سے ولید کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ سعد اور حماد کا الگ کمرہ تھا۔ ثریا رات کو اس کے پاس آتی، نائٹ سوٹ نکال کر دیتی۔ کئی بار کہتی "بھائی! برش کرلو، کپڑے بدل لو۔ مگر منہ دھونے سے تو اس کی جان جاتی تھی۔ اکثر ثریا ٹوتھ پیسٹ اور برش باتھ روم سے اٹھا کر لے آتی اور اس کے ہاتھوں میں پکڑاتی۔ لیکن وہ اتنا ڈھیٹ تھا کہ بندے کو زچ کردیتا، پر جواب نہ دیتا تھا۔ ولید کمرے میں آتا تو وہ بھی ٹوکتا رہتا۔ وہ ہوں ہاں کرتا رہتا۔ اکثر پینٹ شرٹ میں ہی سو جاتا۔

"آپ کو پتا ہے نا دادی جان نے کل مجھے اپنے کمرے میں سلایا تھا۔" ولید کے چھیڑنے پر وہ یک دم جوش میں آگیا۔

"اتنا اچھا لگا، شاید ہماری ماں ہوتیں تو مجھے اسی طرح پیار کرتیں۔" یک دم وہ بالکل رونے جیسا ہوگیا۔

"ماں جیسی ہی تو ہیں وہ۔" ولید نے چھوٹے بھائی کو کھینچ کر سینے سے لگالیا۔

"مگر ماں تو نہیں ہیں۔" وہ سچ مچ رو ہی پڑا۔

"ارے پگلے! ہمارے باپ کی ماں ہیں۔ ہمارے لیے تو زیادہ محترم اور محبت کرنے والی ہیں۔" ولید نے سمجھایا تو اس نے سر ہلایا۔

"اچھا! تم اس لیے اتنا تیار ہوئے ہو کہ ان کے پاس جارہے ہو؟"

"یوں ہی میں نے سوچا، شاید آج بھی وہ مجھے بلائیں۔"

"بلانے کا انتظار کیا کررہے ہو، خود ہی چلے جاؤ۔"

"گیا تھا، لیکن ان کے پاس ابا بیٹھے ہوئے تھے، میں واپس چلا آیا۔"

"ہادی بیٹا! سو گئے کیا؟" دادی جان کی آواز سن کر وہ اچھل کر بیٹھ گیا۔

"آپ دادی جان! میں آپ کے پاس آیا تھا، لیکن ابا بیٹھے ہوئے تھے، اس لیے واپس چلا گیا۔"

"کیوں؟ تمہارا اپنے باپ سے پردہ ہے کیا؟" انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

"ایسے ہی ڈر لگتا ہے دادی جان!"

"کیوں ڈر لگتا ہے۔ میرے سامنے تو اس نے آج تک کسی کو نہیں ڈانٹا۔"

"ان کے پاس وقت ہی کہاں ہے، ہمارے لیے۔" اس نے بے باکی سے کہا تو دادی جان رنجیدہ سی ہوگئیں۔

"بیٹا وہ اپنے بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں۔ تم لوگوں کے لیے اتنی محنت کرتے ہیں۔"

"اونہہ! باتیں کرتے ہیں صرف! آپ نے دیکھی ہے ان کی محبت۔" "میں نے تو نہیں دیکھی۔"

وہ جانتی تھیں، اس کے دل میں بڑے شکوے شکایات ہیں، اتنی سی عمر میں وہ عجیب الجھنوں میں گھرا

رہتا تھا۔

"چلو! اب آجاؤ سونے کے لیے۔ آج تم نے پھر دیر کردی ہے۔" وہ کچھ کہے بغیر ان کے پیچھے چل دیا۔

کل کی طرح وہ ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹا تو انہوں نے محبت سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنا شروع کیں۔ اس ایک محبت بھرے لمحے کے انتظار میں وہ کب سے آس لگائے بیٹھا تھا۔ ممتا سے محرومی کی حسرت اس کے دل سے جیسے مٹتی چلی جارہی تھی۔

"دادی جان! اب آپ بھی آرام کریں' میں تکیہ لگا کر سوجاتا ہوں۔" تھوڑی دیر گزری تو اس نے ان کی گود سے سر اٹھالیا۔

"کیوں بیٹا! اچھا نہیں لگ رہا کیا؟"

"ایسی بات نہیں دادی جان! آپ تھک جائیں گی اور پھر میں کوئی بچہ تو تھوڑی ہوں۔"

"ارے تم ابھی بچے ہی تو ہو اور کوئی ماں اپنے بچے کے لاڈ اٹھاتے ہوئے نہیں تھکتی۔"

وہ پھر کچھ بول ہی نہ سکا اور یوں ہی اسے نیند آگئی۔ صبح فجر کے وقت دادی جان نے آواز دی تو ہی آنکھ کھلی۔

"بابا آپ جیسے کیوں نہیں ہیں دادی جان؟" اس نے اچانک ہی سوال پوچھا جب نماز اور دعاؤں سے فارغ ہو کر انہوں نے اس کے چہرے پر دم کیا۔

"ارے بیٹا! وہ تو مجھ سے زیادہ محبت کرنے والے اور مہربان ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میرے پاس کرنے کو کوئی کام نہیں اور وہ بہت مصروف رہتا ہے۔"

"ہمارے لیے مصروف نہیں رہتے۔ یہ ان کا اپنا شوق ہے۔" اس نے رکھائی سے کہا' دادی کو برا تو لگا لیکن ہادی پر ظاہر نہ کیا جب اٹھ کر جانے لگا تو صرف اتنا کہا۔

"اپنے باپ کو سمجھنے کی کوشش کرو بیٹا۔" جیسے سُنی اَن سُنی کر کے وہ چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے فائزہ! تم کیسے آئیں' آج تمہیں دیکھ کر میرا جی خوش ہوگیا۔" اپنی ماں کے یوں خوشی کے اظہار پر فائزہ آپا بھی کِھل گئیں۔

"اماں دو دن سے آنے کا سوچ رہی تھی' لیکن آپ کو پتا ہے گھٹنوں کا درد مجھے ہر کام سے بے کار کردیتا ہے۔"

"برا مت ماننا تمہارے لیے ضروری ہے کہ پہلے اپنا وزن کم کرو اور بہت چلا پھرا کرو بھلا تمہاری کوئی عمر ہے ابھی سے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گئی ہو۔"

"اماں!" فائزہ آپا جھنجلا گئیں۔

"آفاق کی یہ باتیں سن کر تنگ آگئی ہوں ——— آپ کے پاس آئی ہوں تو آپ بھی یہ ہی لیکچر دے رہی ہیں۔ اب تو کھانے پینے میں بھی اتنی کمی کردی ہے' مگر وزن ہے کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔"

"ارے بیٹا! بیٹھے بیٹھے تو جو کچھ کھاؤ گی نظر ہی آئے گا' میری مانو یہ جو تم نے دو' ڈھائی سال سے لڑکی رکھی ہے نا' اپنے گھر پر۔ سارا دن چھوٹے موٹے کام کاج کرنے کے لیے' اسے نکال دو' اور گھر کے ایسے کام خود کرلیا کرو۔" انہوں نے مشورہ دیا۔

"بات آپ کی ہے تو بالکل درست' اس عمر میں کھانا پینا بہت کم کردینے سے بھی کمزوری ہوجاتی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ صالحہ سے ملیں۔" اماں جان نے پوچھا۔

"قصیٰ اور امیمہ بھابھی دونوں سے مل کر آرہی ہوں' صالحہ بھابھی سے جاتے ہوئے مل لوں گی۔"

"بس ایک امیمہ ہی تمہاری چہیتی بھابھی ہے اسی سے مل لینا کافی ہے۔" اماں جان نے چڑ کر کہا۔

"آج تو تمہیں خاص طور پر صالحہ کے پاس جانا چاہیے تھا کہ اسے برا محسوس نہ ہو' اب تو صاف ظاہر ہوگیا کہ تم میری وجہ سے ان کے پاس جایا کرتی تھیں۔"

"ایک تو یہ اچھی مصیبت ہے کہ آپ سے ملنے آؤ تو ہر کسی کے در پر الگ الگ دستک دو۔"

"رشتہ داری ہر کسی سے نبھانی پڑتی ہے بیٹا۔ یہ ہی سمجھ کر چلی جایا کرو کہ صالحہ تمہاری ماں کی کتنی خدمت کرتی ہے۔"

"اب ایسا بھی نہیں ہے اماں! آپ میرے پاس آجائیں تو میں آپ کی ساری زندگی خدمت کروں' آپ کی خدمت کرنے کے لیے تو سب تیار ہیں۔"

"یوں بڑی بڑی باتیں کرلینا آسان ہے بیٹا اور ایک بات بتادوں صالحہ جیسی میری خدمت کوئی نہیں کرسکتا۔"

"اور یہ جو حیدر بھائی کے گھر آپ آئی ہیں' یہاں کوئی کمی ہے آپ کو۔"

"یہاں تو مسئلہ ہی الگ ہے' تم جانتی ہو یہاں تو مجھے خدمت کروانی نہیں کرنی چاہیے۔ دیکھو' اللہ تعالیٰ مجھے کچھ کرنے کی استطاعت دے۔"

فائزہ آپا نے کچھ جواب نہ دیا اور اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ واپس آئیں تو اماں عصر کی نماز پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے خود بھی نماز پڑھی اور پھر ثریا کے پاس آئیں۔ وہ سکینہ کے ساتھ کچن میں چائے کی تیاری میں لگی ہوئی تھی۔

"تم کیوں کچن میں الجھی ہوئی ہو' آؤ ہمارے پاس بیٹھو' سکینہ نمٹالے گی۔" انہوں نے کہا۔

"جی پھوپھو! بس ابھی آئی' آپ بیٹھیں دادی جان کے پاس۔"

"یہ چائے کی تیاری ہورہی ہے یا پورا کھانا بن رہا ہے' تم کیوں اتنے تردّد میں پڑی رہتی ہو' ہمارا تو اماں کے پاس آنا جانا لگا ہی رہے گا۔"

وہ سینڈوچ بنا رہی تھی اور ساتھ سکینہ کو دوسری چیزیں ٹرالی میں لگانے کی ہدایت بھی دیتی جارہی تھی۔

"آپ کہاں آتی ہیں فائزہ پھوپھو!" اس نے محبت سے کہا۔

"یہ ساری اپنائیت کی باتیں ہیں' ورنہ اپنی صالحہ چاچی کو ہی دیکھ لو کبھی چائے سے آگے نہیں بڑھیں۔"

"میں بھی چائے ہی تو بنا رہی ہوں' آپ بیٹھیں میں بس ابھی آئی۔"

"چائے ایسی ہوتی ہے؟ اماں! آپ ہی اسے منع کرتیں' ہم تو تمہارا کچھ خیال نہیں کرسکتے اور تم اتنی خدمت کرو۔" آلو کے سموسے' کچے قیمے کے کباب' دہی پھلکی' سینڈوچ' گلاب جامن' نمکو' بسکٹ ہر چیز اس نے چائے کے ساتھ ٹرالی میں سجادی تھی۔

وہ اپنی اماں کے پاس آکر بیٹھیں اور پیچھے ہی سکینہ ٹرالی گھسیٹتی ہوئی آئی' ساتھ ہی ثریا بھی تھی۔

"اس کو شوق ہے' میں بھی منع تو بہت کرتی ہوں' لیکن یہ ہر کسی کی ایسی ہی محبت سے مہمان نوازی کا کرتی ہے۔ ایک طرح سے اچھا بھی ہے' لڑکیاں گھریلو کام کاج میں الجھی رہتی ہیں۔" ثریا چیزیں سرو کر کے واپس چلی گئی تھی۔

"کہہ تو آپ ٹھیک رہی ہیں' حقیقت یہ ہے اماں! خاندان کی تمام لڑکیاں ایک طرف اور ثریا ایک طرف' صورت دیکھو کہ سلیقہ' اخلاق دیکھو کہ ہنر' ایسی پیاری بچی ہے کہ گھر کو چار چاند لگادے۔" فائزہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوگئی تھیں۔

"بس اللہ تعالیٰ لڑکیوں کے نصیب اچھے کرے' جتنی محنتی اور سگھڑ ہے اتنی ہی محبت کرنے والی بھی ہے۔"

اسی وقت ان کا موبائل بجا۔ آفاق انہیں لینے آگیا تھا۔

"بیٹا! اندر آکر اپنی نانی جان کو سلام تو کرلو۔"

"آرہا ہوں' لیکن آپ دیر نہ کیجیے گا' مجھے آٹھ بجے سے پہلے گھر پہنچنا ہے۔" وقت کی پابندی اس کا شعار تھا اور اپنے ساتھ چلنے والوں سے بھی اسی طرح پابندی کرواتا۔

"آرہا ہے نا؟" اماں جان نے پوچھا۔

"آتو رہا ہے' لیکن وہی جلدی جانے کی شرط ساتھ لگا کر۔" فائزہ آپا نے جواب دیا' آفاق اندر آچکا تھا۔ نانی جان کو سلام کرتے ہی اپنی ماں سے کہا۔

"بس امی پانچ منٹ میں چلتے ہیں۔"

"ارے بیٹا! اب آئے ہو تو ذرا سا دم بھی لے لو۔"

"میں رک جاتا نانی جان! لیکن مجھے کچھ ضروری کام

ہے۔" اس نے گھڑی دیکھی۔
"تمہارا ہر کام ہی اتنا ضروری ہوتا ہے کہ ذرا سا ادھر ادھر نہ ہو سکے۔" وہ ہنسنے لگا۔ سعد اور حماد اس سے سلام دعا کرنے کے لیے کمرے میں آئے۔ سعد نے سلام کے ساتھ ہی اسے ایک پلیٹ دی اور کباب وغیرہ آگے بڑھائے۔

"میں اس وقت جلدی میں ہوں نانی جان! کچھ کھا نہیں سکوں گا۔" اس نے ہلکی سی ناگواری کے ساتھ منہ بنایا۔

"کچھ تو لو بیٹا! یہ کباب اور سینڈوچ ثریا نے خود بنائے ہیں۔" ثریا کا نام سن کر اس کے چہرے کا زاویہ بدل گیا۔ اس نے ایک سینڈوچ اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

"نانی جان! مجھے صرف ایک اچھی سی کڑک چائے کی پیالی پینی تھی۔"

"چائے تو سکینہ لا ہی رہی ہوگی مگر جاؤ حماد! ثریا سے کہو، چائے ذرا کڑک بنوائے۔"

وہ جی اچھا کہہ کر فوراً اٹھ گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں چائے آگئی اور چائے کی پیالی ختم ہوتے ہی آفاق اٹھ کھڑا ہوا۔

"لگتا ہے آپ کو یہاں کچھ زیادہ ہی مزہ آگیا ہے نانی جان! اپنے اڈے پر واپسی کا نہیں سوچ رہیں۔" اٹھتے اٹھتے آفاق نے ہنس کر کہا۔

"اچھا ہے اماں جان یہاں جتنے دن رہیں، ہمیں بھی یہاں آنا جانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔ بچوں کا خلوص اتنا فطری ہے کہ دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔" فائزہ آپا نے بھی بات کی تائید کی اور پھر اپنی ماں سے جانے کی اجازت چاہی۔

"چائے بہت لاجواب تھی، تمہیں تکلیف ہوگی، ورنہ میں اور ایک پیالی پینے چلا آؤں۔" لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس نے کچن کے پاس رک کر ثریا سے کہا۔

"جی ضرور۔ مجھے کیا تکلیف ہونی ہے سکینہ اتنی لاجواب چائے بناتی ہے کہ لوگ دور دور سے پینے آئیں۔" اس نے بغیر پلٹ کر دیکھے جواب دیا۔

"واہ واہ! ملازمہ اتنی ماہر ہے تو مالکن کی مہارت کا کیا عالم ہوگا۔"

"آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔" وہ ابھی بھی پلٹی نہیں، اپنے کام میں لگی ہوئی تھی۔

"جی اندازہ تو ہو رہا ہے کہ اتنے مصروف لوگ ہیں کہ دو منٹ رک کر مہمان کو پلٹ کر دیکھنے کی فرصت نہیں۔"

"مہمان خود اتنی ایمرجنسی میں آئیں کہ انہیں گھر والوں کو سلام کرنے کا بھی وقت نہ ہو تو میزبان بھی کیوں اپنا قیمتی وقت برباد کریں۔" بالآخر وہ تپ ہی گئی۔

"میں نانی جان کو سلام کرنے آیا تھا۔ سارے گھر والوں کے پاس حاضری لگوانا لازم نہیں۔" اس نے زچ ہو کر کہا۔

"یہ اپنی اپنی استطاعت کی بات ہے، کچھ طبیعتاً بخیل ہوتے ہیں، سلامتی کی دعا دینے سے بھی کتراتے ہیں۔" وہ جواب دیتا، لیکن فائزہ پھوپھو آگئی تھیں، وہ چڑ کر یہ کہتے ہوئے پلٹ گیا۔

"پھر دیکھ لیں گے۔"

وہ مسکرا دی، جب آفاق آگے نکل گیا تو اس نے بڑھ کر اپنی پھوپھو کو خدا حافظ کہا۔

رات کا کھانا کھا کر آج ہادی سیدھا اپنی دادی کے پاس آگیا، کیونکہ آج اتفاق سے رات کو دادی جان کے پاس کوئی نہ آیا۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا تھا۔

وہ ان کے بستر پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا، گھبرایا اس لیے نہیں کہ نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہنے، بال سنوارے، دانتوں کو بھی رگڑ رگڑ کر برش کر کے آیا تھا۔

ثریا بھی آگئی دادی جان نے پیغمبروں کے قرآنی قصے سنانا شروع کیے۔ ہادی ہی کی طرح ثریا بھی بڑے شوق اور انہماک سے سنتی رہی۔ ہادی حسب معمول دادی جان کی گود میں سر رکھے ہی سو گیا۔

"آپ کا کتنا احسان ہے دادی جان کہ آپ کی وجہ سے ہادی....."

"والدین کے خلوص اور اپنائیت کو احسان نہیں

کہتے ثریا بیٹا۔" ثریا نے جی کہہ کر ندامت سی سر ہلایا۔

"اور ہادی بالکل بدل نہیں گیا۔ یہ تو صرف وقتی طور پر اس کا رجحان دوسری طرف ہوا ہے۔ یہ سب تو میری موجودگی کا کمال ہے ناں میں چلی جاؤں تو ہادی پھر امینہ کے گرد چکر کاٹنے لگے گا اور تمہاری امینہ چاچی بھی اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والی نہیں ہیں۔"

"آپ چلی جائیں گی دادی جان!" اس نے مایوسی کے لہجے میں پوچھا۔

"اس بات کو رہنے دو، ابھی تو میں کہیں نہیں جا رہی، میں تمہیں یہ سمجھانا چاہ رہی تھی کہ ہادی آسرے اور سہارے کی تلاش میں رہتا ہے۔ میں اگر چلی جاؤں تو وہ پھر اپنی امینہ چاچی کا دامن پکڑ لے گا لیکن اب اس میں اتنا شعور آگیا ہے کہ ابھی سے وہ موازنہ کرنے لگا ہے میری محبت اور اپنی امینہ چاچی کے انداز میں۔ اب اسے یہ سمجھانا ہے کہ محبت اور آسرے زندگی میں ملتے بھی ہیں اور بچھڑ بھی جاتے ہیں، انسان کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ اگر کچھ کھو جائے تو اس کے دکھ میں اپنے آپ کو برباد نہ کرلے، ہمت سے کام لے۔"

ثریا ان کی صورت دیکھتے ہوئے ساری باتیں سن رہی تھی۔

"تمہیں میری باتیں سمجھ میں آرہی ہیں۔" دادی جان یہ ساری باتیں ثریا کو بھی سمجھانا چاہ رہی تھیں اس لیے اس کے سامنے بیان کر رہی تھیں۔ اتنے دنوں سے اس کے ساتھ رہتے ہوئے وہ اس کے اندر کی الجھنیں بھی اچھی طرح سمجھ رہی تھیں۔ وہ خاموش طبع اور اپنے مسائل ظاہر نہ کرنے والی لڑکی تھی لیکن دراصل ماں کی بے وقت موت نے سب سے زیادہ دکھی اسے ہی کیا۔ اسے پڑھائی لکھائی کھانے پکانے لوگوں کی خدمت کرنے اور دیگر گھریلو کام کاج کا شوق ضرور تھا لیکن اس سے زیادہ اسے اس بات کی لگن تھی کہ لوگ اس کی طرف متوجہ ہوں، اس پر دھیان دیں، اس کی باتیں کریں اور اس کی واہ واہ کریں۔ اس کا انداز غلط نہیں تھا، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہی تھا کہ اس نے کمزوری کو ایک بہتر راستے پر لگا دیا تھا۔ سب کی خدمت، ہر کسی کی دل جوئی اور ہر کسی کی پسند ناپسند کا دل سے خیال رکھنا اچھے اعمال ہی تھے۔ لیکن اچھائیوں کی اس حد تک تشہیر پر، حاسد بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور ہر بھلائی اور خوبی کے ساتھ بے غرضی ہو تو وہ دیرپا ہو سکتی ہے ورنہ کوئی اور آزمائش یا کوئی اور حادثہ ایسے انسان کو سرے سے تباہ بھی کر سکتا ہے۔

☆ ☆ ☆

رات کے کھانے کی تقریباً تیاری ہو گئی تھی۔ سکینہ کو کچھ ہدایتیں دے کر وہ کچن سے نکل آئی۔ ہادی اپنا ہوم ورک کر رہا تھا، سعد اور حماد میچ کھیلنے گئے تھے۔ ولید اور ابا کے آنے میں ابھی بہت وقت تھا، وہ بھی کالج کا کام نکال کر بیٹھ گئی۔ کام اتنا زیادہ نہ تھا، پھر وہ یونہی کوئی کتاب پڑھنے لگی۔

فون کی گھنٹی بجی تو اس نے کتاب پلٹ کر رکھی اور اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔ ریسیور کان سے لگا کر اس نے اطمینان سے ہیلو کہا۔ دوسری طرف آفاق تھا۔

"اچھا آپ ہیں، دادی اماں سے بات کریں گے؟ میں انہیں بلاتی ہوں۔" وہ پلٹنے کو تھی۔

"ارے مجھے نانی اماں سے بات کرنا ہوتی تو ان کے موبائل پر ہی فون کرتا۔" اس کا جواب آیا۔

"ابا تو اس وقت گھر پر نہیں ہوتے اور....."

"کمال ہے نہ سلام نہ دعا سارے گھر والوں کے نام گنوا رہی ہیں۔"

"جن کو آپ سلام کرتے ہیں، ان کے نام گنوا رہی ہوں اور کیا۔"

"نہیں۔ آج صرف آپ کو سلام کرنے کے لیے فون کیا ہے اور اگر آپ کہیں تو آپ کے ہاتھ کی چائے پینے آجاؤں۔"

"آپ کی بے تکلفی کی وجہ سمجھ میں نہیں آرہی

چائے تو آپ ادھر سے گزریں گے تو بھی آپ کو مل ہی جائے گی۔ آپ کے ماموں کا گھر ہے۔"

"آپ کی طرف سے اور آپ کے ہاتھ کی چائے پینے کی طلب ہے۔"

اس کی بے باکی پر ثریا اچھل سی گئی۔ مرد کو بے باکی کی جرات عورت کے رویے سے ملتی ہے۔ یہ ثریا کا خیال تھا۔

"بلاوجہ کسی کی ضرورت تو پوری کی جاسکتی ہے لیکن خواہش نہیں۔"

ثریا نے فون رکھ دیا' اس جواب کو سننے کے بعد آفاق کو آنا نہیں چاہیے تھا لیکن اس کو یقین ہو رہا تھا کہ وہ آئے گا اور وہ آیا۔

"دیکھو سکینہ! ابھی میرا بہت سارا کالج کا کام باقی ہے' دادی جان کے کہنے پر بھی مجھے نہ بلانا اور آفاق صاحب کو تم چائے بنا کر دے دینا۔"

سکینہ نے جی اچھا کہا اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کی گاڑی کا ہارن سن کر اس نے گیراج میں جھانک کر دیکھا اور پھر سکینہ کو ہدایت دی تھی۔ پھر اس نے یہ بھی تسلی کر لی تھی کہ وہ اکیلا ہی آیا ہے۔

عشاء کا وقت ہو چلا تھا نہ کسی نے اسے بلایا تھا نہ وہ خود کمرے سے باہر نکلی تھی۔

عشاء کے بعد کھانے کا وقت تھا' وہ اٹھ کر سیدھی کچن میں آئی۔ تھوڑی دیر میں کھانا لگوانا تھا۔ سکینہ شاید نماز پڑھنے گئی ہوگی۔ دادی جان بھی نماز پڑھنا شروع کر چکی ہوں گی۔ وہ یونہی ان کے کمرے میں جھانکنے کی نیت سے پلٹی تو سامنے آفاق کھڑا ملا۔

"بہت ضدی ہیں بالآخر چائے نہ پلائی۔ چلیں آپ کی ایک جھلک تو دیکھنے کو ملی۔ سر چکرا رہا ہے لیکن روح کو سکون مل گیا۔"

"آپ...." وہ کچھ کہتی لیکن اپنی بات کہہ کر وہ سرعت سے نکل گیا۔ اسے یقین نہ آرہا تھا کہ وہ دو ڈھائی گھنٹے یوں فالتو دادی جان کے پاس بیٹھا رہا اور تھوڑی دیر بعد جب دادی جان کے کمرے سے سکینہ ٹرالی واپس لائی تو اس نے دیکھا کہ چائے اور اس کے ساتھ رکھے ہوئے بسکٹ وغیرہ ویسے کے ویسے پڑے ہوئے تھے۔

"موصوف کو برا لگا اس لیے شاید انہوں نے چائے نہ پی۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اگر اسے برا بھی لگا تو میں کیا کروں۔" اس نے کاندھے اچکائے اور اپنا دھیان کام کی طرف لگا دیا۔

"ثریا! آج تو بڑی بھوک لگی ہے بھئی جلدی کھانا لگواؤ۔" سعد اور حماد ایک ساتھ میز پر آکر بیٹھ گئے۔ آواز سعد نے لگائی تھی اور اس وقت اسے یاد آیا کہ سعد اور حماد کا تو آج فائنل میچ تھا۔

"سب کو آنے تو دو' کیا اکیلے کھانا شروع کر دو گے۔" اس نے کہا۔

"آتو گئے ہیں ابا اور ولید بھی' بس کھانے کے لیے آتے ہی ہوں گے' آپ ہمیں تو کچھ دیں' بھئی کچھ بھی دے دیں صبر نہیں ہو رہا۔" اب حماد واویلا کرنے لگا۔

اس نے سلاد اور پاپڑ وغیرہ میز پر رکھنا شروع کیے تھے' دونوں بھائی ان ہی چیزوں کو غنیمت جان کر کھانا شروع کر چکے تھے۔ ثریا نے بھی مصلحت سے کام لیتے ہوئے سلاد وغیرہ کے بعد کھانا لگانے میں سستی دکھائی تھی۔ پھر دادی جان کی موجودگی میں دونوں بھائی آگے کچھ بول بھی نہ سکے تھے۔ اتنے میں ابا اور ولید بھی آگئے' پیچھے ہی ہادی بھی چلا آرہا تھا' ابا کو دیکھتے ہی ثریا نے سکینہ کو اشارہ کیا اور دو منٹ میں ہی دونوں نے کھانے کی چیزیں میز پر پہنچا دیں۔

باوجود شدید بھوک کے نہ سعد نہ حماد کسی نے بڑوں سے پہلے کھانے کو ہاتھ نہ لگایا۔ حسب معمول دادی جان نے پہلے کھانا اپنی پلیٹ میں نکالا۔

"ہاں بھئی' آج تم لوگوں کا میچ کیسا رہا۔ ابا کو ان کا میچ یاد آیا۔" سالن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے انہوں نے پوچھا۔

"اے ون! ابا جیت کر آگئے۔" حماد نے جواب دیا۔

"بہت خوب' لگتا ہے سخت محنت کی ہے تھک گئے ہو گے اور بھوک بھی زیادہ لگی ہو گی۔" انہوں نے مسکرا کر سالن پہلے سعد اور حماد کی پلیٹوں میں ڈالا۔ وہ

دونوں دائیں طرف بیٹھے تھے۔ پھر اپنی پلیٹ میں نکال کر ولید کی طرف بڑھایا۔

"چلو' جلدی کھانا شروع کرو' بھوک لگی ہوگی۔"

"اوہو! آج تمہاری پسند کا قیمہ بنا ہوا ہے۔ دیکھا مجھے تمہاری پسند کی کھانے کی چیزیں یاد رہ گئی ہیں ناں۔" دادی جان نے ہادی کی پلیٹ میں قیمہ نکال دیا اور روٹی بھی اس کی طرف بڑھائی۔

"دادی جان! آپ میری طرف دھیان بہت دیتی ہیں ناں اس لیے آپ کو میری ساری باتیں یاد رہ جاتی ہیں۔" اس نے فوراً" ہی جواب دیا' دادی جان نے سامنے بیٹھے اپنے بیٹے کو دیکھا اور پھر کھانا شروع کردیا'

حیدر صاحب نے شاید اپنے ان چھوٹے چھوٹے افعال پر کبھی غور نہ کیا تھا جو ہادی کے دل میں گھر کرجاتے تھے۔ یوں سعد اور حماد کو پوچھنا اور ہادی کی طرف دھیان بھی نہ کرنا انہیں اندازہ نہ تھا کہ ہادی پر یوں اثر کرے گا۔

"شام کو آفاق آیا تھا۔ بڑی دیر بیٹھا میرے پاس' کہہ رہا تھا نانی جان صرف آپ کے لیے آیا ہوں' مجھے بہت اچھا لگا۔" کھانے کے بعد چائے دیتے ہوئے ثریا نے دادی جان کو کہتے سنا۔

٭ ٭ ٭

کالج میں خاموشی سے کلاس روم میں بیٹھے لیکچر سنتے' دوستوں سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے' گھر میں طرح طرح کے کام کاج کرتے' دادی حضور سے باتیں کرتے یا اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹے بے وجہ چھت کو گھورتے وہ مسلسل اس کے آنے کی وجہ اور اس کے ایک جملے کو نظر انداز کرنا چاہتی تھی۔ اس خیال کو ترک کرنا چاہتی تھی۔ لیکن گھوم پھر کر وہی بات' وہی انداز اور وہی چہرہ سامنے آنے لگتا۔

وہ اپنے آپ سے ہرگز مایوس نہ تھی۔ نہ ہی اتنی بے وقوف کہ کسی کے رک کر اس کے گھر چائے پینے کی خواہش پر دل جیسی مضبوط چیز میں ایسا نقص پائے کہ پھر درست نہ ہوسکے یا کچھ بے چینی اور اضطراب تھا جسے اس نے دیدہ دلیری سے اپنے قابو میں کرلیا۔

دادی جان چلی گئیں تو دن بھی مصروف ہوگئے۔ ہادی کی طرف اس کی توجہ خصوصی تھی۔ ابا بھی ہادی کے لیے ہر روز وقت بلکہ خصوصی وقت نکالنے لگے تھے۔

"نیند آرہی ہے بیٹا!" کھانے کے بعد دس بجے کے قریب وہ ہادی کے پاس آئے' وہ اپنے بستر میں لیٹ چکا تھا۔

"نیند آتو نہیں رہی لیکن دادی جان سے وعدہ کیا ہے روزانہ رات کو دس بجے بستر میں چلا جاؤں گا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔ آہستہ آہستہ عادت پڑجائے گی۔" وہ اس کے سرہانے بیٹھ گئے تو وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹے رہو' میں تمہیں بالوں میں ہاتھ پھیروں گا تو تمہیں نیند آجائے گی۔"

"رہنے دیں ابا! آپ کہاں تردد میں پڑیں گے۔ آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوجائے گا؟؟"

"مصروف اور کاروباری آدمی ہوں لیکن میرا وقت آپ سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔"

"نئی نئی باتیں کررہے ہیں آج آپ! شاید دادی جان سب کچھ سکھا کر گئی ہیں ناں۔" وہ ذرا نہ شرمایا نہ ہچکچایا' بے باکی سے باتیں کررہا تھا۔

"مائیں تو اولاد کو زندگی بھر اچھی باتیں سکھا سکتی ہیں۔"

"آپ بہت خوش قسمت ہیں ابا کہ آپ کی ماں ہیں۔" یکدم وہ بالکل مایوس اور اداس ہوگیا۔

"وہ جیسے میری ماں ہیں' تمہاری بھی ماں ہی تو ہیں' تمہیں کتنا چاہتی ہیں۔"

"وہ تو مجھے ماں سے بھی بڑھ کر چاہتی ہیں مگر میری ماں نہیں ہیں ماں ہوتیں تو مجھے چھوڑ کر نہ جاتیں۔"

"وہ تمہاری ماں ہی ہیں لیکن ان کے اور بھی بچے ہیں' انہیں سب بچوں کو دیکھنا ضروری ہے ناں۔" ابھی تک حیدر صاحب ہادی کی تمام باتیں بڑے تحمل سے سن رہے تھے۔

"ابا اگر آپ چاہیں ناں تو مجھے میری ماں مل سکتی ہے۔" وہ بغیر جھجکے بات بھی کہہ گیا۔

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح الجھ گئے۔

"امینہ چاچی کہتی ہیں کہ اگر آپ دوسری شادی کرلیں تو مجھے میری ماں مل سکتی ہیں۔ ان کی کوئی کزن ہے' وہ آپ سے شادی کرنے کے لیے تیار بھی ہے۔ میں نے ان سے فون پر اتنی بار بات کی ہے۔ وہ آنٹی مجھے بہت اچھی لگتی ہیں ابا...."

حیدر صاحب تو حیدر صاحب تھوڑی دور کمپیوٹر پر کام کرتا ولید بھی چونک کر مڑا' لیکن حیدر صاحب نے اسے اشارہ کیا کہ وہ ہرگز کچھ نہ بولے۔

"زبردست بھئی ہادی! تم تو کمال کے لڑکے نکلے' چپکے چپکے اتنا بڑا کام کرڈالا۔ بھئی مجھے بھی ضرور ملوانا اپنی آنٹی سے۔"

ان کے چہرے کے تاثرات بدل گئے وہ بہت زیادہ حیران ہوئے تھے۔

"آپ ناراض نہیں ہوئے' آپ نے مجھے غصے میں تھپڑ بھی نہیں مارا۔ امینہ چاچی تو کہہ رہی تھیں کہ پہلی بار جب میں آپ سے بات کروں گا تو آپ شاید میری پٹائی ہی کردیں گے۔"

ایک تو اس کی عمر لاابالی تھی پھر اسے فطرتاً" صاف اور کھری بات کہنے کی عادت تھی۔ چاہے کسی سے بھی اور کسی کے لیے بھی...

"آپ کی امینہ چاچی غلط کہہ رہی تھیں میں بھلا کیوں پٹائی کروں۔ آخر اس آئیڈیے میں برائی کیا ہے۔"

"پتا ہے ابا پہلے میں سوچتا تھا کہ امینہ چاچی کبھی کچھ غلط نہیں کہہ سکتیں لیکن ابھی چند ہی دنوں میں کئی بار ایسا ہوا کہ ان کے کئی باتیں غلط ثابت ہوگئیں۔ یعنی پتا چلا کہ دنیا کا ہر آدمی غلط بات کہہ سکتا ہے۔"

"اچھا اب سو جاؤ' کتنا وقت باتوں میں ہی نکل گیا' تم کو صبح اسکول بھی جانا ہے۔"

اس کی آنکھیں واقعی نیند سے بوجھل ہورہی تھیں اور تھوڑی دیر حیدر صاحب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو وہ سو گیا۔

اپنے کمرے میں جاکر حیدر صاحب بے چینی سے ٹہلنے لگے۔

ہادی نے وہ کچھ کہا تھا جو وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

٭ ٭ ٭

دوپہر کے وقت وہ اپنے کمرے میں لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ جب اس کا موبائل فون بجا' اس نے بغیر دیکھے ہی فون کان سے لگالیا' اس کی چہیتی دوست سدرہ اس وقت فون کرتی تھی۔

"ہیلو کیسی ہیں آپ؟" ایک انجانی سی آواز سن کر وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"کون بول رہا ہے۔"

"اب یہ نہ کہیے گا کہ آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔"

"آپ کو میرا سیل نمبر کیسے ملا!" وہ سخت پریشان و پشیمان ہوئی بغیر دیکھے فون اٹھالیا' مفت کی مصیبت گلے پڑگئی۔

"کم آن ثریا! تمہارا نمبر حاصل کرنا ایسا مشکل کام بھی نہیں۔" آفاق فوراً" ہی فری ہوگیا۔

"آپ کو بلا اجازت میرے موبائل پر فون نہیں کرنا چاہیے۔ گھر کے فون پر بات ہوجاتی ہے ناں۔" وہ احتیاطی تدابیر کی طویل فہرست پر ہمیشہ سے عمل کرتی آئی تھی۔ اور یہ فہرست اس نے خود ہی بنائی تھی۔

"چلیں مس ثریا حیدر! اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے موبائل پر آپ کو فون کرلوں۔" وہ ہرگز سنجیدہ نہیں تھا اور ثریا بہت زیادہ سنجیدہ ہوگئی تھی۔

"مسٹر آفاق! یہ میرا پرسنل فون ہے۔" وہ غصے میں آگئی۔

"تو آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ میں بھی آپ سے پرسنل ہونا چاہتا ہوں۔"

"آخر کیوں بھئی!" وہ چیخ ہی پڑی۔

"آپ تو کچھ زیادہ ہی بگڑ رہی ہیں' چلیں میں پھر کبھی فون کرلوں گا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نے آپ کو اجازت تو نہیں دی۔"

"آپ کے انداز سے تو ایسا لگ رہا ہے کہ میں مرجاؤں' تب بھی آپ اجازت نہ دیں گی۔" وہ چڑ گیا۔

"تو کیوں دوں اجازت؟ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے؟" اس کے رویے میں قطعی لچک نہ آئی۔ پہلے تو اس نے چڑ کر سوچ لیا تھا کہ فون بند ہی کر دے لیکن پھر خیال آیا کہ فون کرنے کا کچھ تو مقصد واضح کر دے ورنہ بدگمانی اور ضد میں آگر آئندہ شاید وہ اس کا فون ہی نہ اٹھائے۔

"دیکھو تمہارا موبائل نمبر تو میرے پاس کئی دنوں سے تھا لیکن میں نے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اب سوچو کوئی ضرورت ہو گی' کوئی پرسنل کام ہی ہو سکتا ہے۔ ہر بات پر فوراً" ہی آگ بگولہ ہو جانے سے پہلے اس کے دونوں پہلوؤں پر غور کر لینا چاہیے۔"

"آپ کو مجھ سے کیا پرسنل کام ہو سکتا ہے۔" اس کا لہجہ نرم نہ ہوا تھا۔

"اب یہ تو تم مجھے بتانے دو گی تو ہی تمہیں پتا چلے گا ناں۔ یوں جھنجلا کر پوچھ رہی ہو' سارے رومانس کا ستیاناس کر دیا۔"

"اتر گئے ناں پٹری سے' اسی وجہ سے میں ہرایرے غیرے سے موبائل پر بات کرنا پسند نہیں کرتی۔" اس نے دانت پیس کر کہا تو آفاق کو بھی برا لگا۔

"یار کزن! ہوں تمہارا' دو جملے مذاق میں کہہ گیا تو کیا برا کیا۔"

"یہی سمجھا رہی ہوں آفاق صاحب! پرسنل فونز پر ایسے مذاق ایشو بن جاتے ہیں' یوں بھی میں تہذیب سے ہٹ کر ایسی چھچھوری باتوں کو ہرگز پسند نہیں کرتی۔ جس شخص کی بات میں شائستگی نہ ہو اور چال میں میانہ روی نہ ہو' میرے نزدیک اس کا کوئی مقام نہیں۔"

وہ باتوں' باتوں میں اسے وہ نکتہ سمجھا گئی' جس پر اس نے کبھی غور بھی نہ کیا ہو گا۔ اسے خبر نہ تھی کہ یہ بن ماں کی لڑکی اتنی محتاط اور عقل مند ہو گی جتنی خاندان کی پڑھی لکھی والدین کی لاڈلی لڑکیاں بھی نہیں ہو سکتیں۔

"اچھا چھوڑو' ایسا نہ ہو ساری باتوں میں اصل بات رہ جائے' سچ یہ ہے کہ میں کئی دنوں سے تمہارے بارے میں سوچ رہا ہوں' دراصل امی بضد ہیں کہ اب مجھے شادی کر لینی چاہیے۔ میں نے اس بارے میں غور کیا تو میرے ذہن میں صرف تمہارا ہی خیال آیا۔ یقین مانو' جتنی بار سوچا تمہارا ہی خیال آیا ہے' ابھی امی کو تو کچھ نہیں بتایا لیکن....." اس نے شاید جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑی اور چپ ہو گیا۔

"بتا دیں' کیوں نہیں بتایا۔" وہ ہمت کر کے بولی۔

"بتا دوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" وہ فوراً" بولا۔

"پتا نہیں۔ ان باتوں کا فیصلہ تو والدین کرتے ہیں ناں۔" آفاق کو اس سے اسی طرح کے جواب کی توقع تھی۔

"لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے میں تم سے چند ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

"کم آن آفاق صاحب! اب کون سی باتیں آپ کو مجھ سے کرنا رہ گئی ہیں۔"

"اب ساری باتیں فون پر تو نہیں ہو سکتیں۔" اس کے مزاج کی سختی کو دیکھ کر وہ ذرا دھیرے دھیرے مطلب کی طرف آ رہا تھا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کل دوپہر کو ہم لنچ کے لیے برزاہٹ چلے جائیں۔ میں تمہیں کالج سے باہر پک کر لوں گا۔"

"اچھا یہی وہ پرسنل کام تھا جس کے لیے آپ کو میرے موبائل پر مجھے فون کرنا پڑا۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔ یونہی سمجھ لو!" ادھر سے جواب آیا۔

"چلیں مان لیا کہ میں آپ کے ساتھ لنچ کے لیے چلی گئی پھر آپ مجھ سے کیا باتیں کریں گے۔"

"بھئی۔ ساری زندگی کا معاملہ ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو جائے۔"

"اور فرض کریں کہ آپ کی سوچ کے مطابق ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ پیدا نہ ہو سکی پھر آپ کیا کریں گے۔"

"نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھے تمہاری ہر بات پسند آئے گی۔"

"ابھی تھوڑی دیر آپ نے ہی کہا تھا کہ ہر بات کے دونوں پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔"

"ہاں لیکن کچھ باتیں ہوتی ہیں جن کا ہر پہلو اچھا ہوتا ہے۔"

"جب آپ کو اتنا اچھا ہی گمان ہے تو اتنے پاپڑ بیلنے کی کیا ضرورت ہے سیدھا سیدھا اپنی ماں سے اپنے دل کی بات کہہ دیں۔"

آفاق کو ہرگز اندازہ نہ تھا کہ ثریا حیدر اتنی سلجھی ہوئی لڑکی ہو گی کہ اپنے اصولوں پر نہ صرف سختی سے بلکہ نڈر بن کر جمی رہے۔

"پھر بھی ثریا! اس میں حرج ہی کیا ہے اگر میں تمہارے بارے میں اتنے اچھے گمان رکھتا ہوں تو تمہیں بھی میرے لیے اچھی سوچ رکھنی چاہیے۔"

"دیکھیں۔ اب تک آپ کے بارے میں میری ہر سوچ اچھی ہی ہے اور آپ کو خیال رکھنا چاہیے کہ یہ سوچ ہمیشہ اتنی اچھی ہی رہے۔"

"اب اس ذرا سی بات سے میرے بارے میں تمہاری رائے بدل تو نہیں جائے گی۔"

آفاق کو اب کسی حد تک اپنی ہتک محسوس ہونے لگی تھی۔ ثریا ذرا مروت یا رواداری کا مظاہرہ نہ کر رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے بدل جائے' اس لیے کہ جس بات کو آپ ذرا سی کہہ رہے ہیں' وہ میرے لیے چھوٹی بات نہیں۔"

"رہنے دو ثریا! تم ذرا سی بات کو اتنا الجھا رہی ہو جیسے میں تمہیں کہیں بھگا کر لے جانے کی بات کر رہا ہوں۔"

"میں بھی یہی کہہ رہی تھی آفاق صاحب! کہ جب اتنی سی بات پر ہماری انڈر اسٹینڈنگ نہیں ہو سکتی تو ساری زندگی کے لیے کیا ہو گی۔"

اس کو بھی غصہ ہی آگیا۔ اگلا بندہ اس کی بات سمجھنے کے لیے تیار ہی نہیں۔

"یعنی میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں!" اس نے عجیب بلکہ بہت ہی برے لہجے میں کہا۔

"کس بات کا انکار۔" اس نے بھی ہمت نہ ہاری وہ تھوڑی دیر بالکل چپ ہی ہو گیا پھر بولا۔

"یہی کہ تم نے میری لنچ کی دعوت قبول نہیں کی۔"

"دیکھو آفاق! میں یوں لڑکے لڑکیوں کا ہوٹلوں اور پارکوں میں ملنا قطعی پسند نہیں کرتی۔ آج تم مجھ سے رشتے کے خواہش مند ہو تو میں تمہارے ساتھ لنچ پر چلی جاؤں' پھر کوئی دوسرا آئے' اس کے ساتھ انڈر اسٹینڈنگ کے لیے پارک چلی جاؤں۔ اس سے بھی بات نہ بنے تو کوئی تیسرا ہو اور سمندر کا کنارہ ہو' تمہارے خیال میں کیا ہم لڑکیاں اتنی ہی فالتو اور مجبور ہیں کہ جس بندے کے جیسا جی میں آئے ویسا ہمیں بے وقوف بنا لے۔"

"اچھا بھئی۔ تم عقل مند اور میں بے وقوف اور نادان۔ اب خوش۔" اس نے دھڑ سے فون بند کر دیا۔

کچھ دیر وہ اپنا فون ہاتھ میں تھامے اسے تکتی رہی پھر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور وہیں اپنی کتاب کھول کر لیٹ گئی۔ کتاب میں اب دل لگنا کہاں ممکن تھا' لیکن وہ اپنے دل کو زبردستی سمجھا بجھا لینے والی ثریا حیدر تھی' یہ اور بات کہ اس کے لیے اسے کڑی محنت درکار تھی۔ آفاق کے سامنے اپنی انفرادیت قائم کرنے کے شوق میں وہ کہیں بہت مغرور تو نہیں ہو گئی۔ دل میں سرکش شیطان کئی کئی وسوسے ڈالنے لگا۔ ظاہر مضبوط تھا لیکن وہ اندر سے بھی اتنی ہی مضبوط بن جائے تو بات ہے۔

☼ ☼ ☼

حیدر صاحب کو ولید کے ساتھ اپنے گھر پر دیکھ کر امینہ بھابھی تھوڑی سی بوکھلائیں۔ وہ یوں بلاوجہ ان کے گھر آتے نہیں تھے۔

"آپ بیٹھیں' میں چائے لاتی ہوں۔" وہ کچھ عجلت میں بولیں۔

"مدثر بھائی اور بچے کہاں ہیں۔"

"آپ کے بھائی بس آتے ہی ہوں گے" اور بچے اب سونے کی تیاری کر رہے ہوں گے، صبح اسکول کے لیے جلدی اٹھتے ہیں ناں!"

"رہنے دیں بھابھی! میرے بھائی کہاں اتنا خیال کرنے والے ہیں اور ہوں بھی تو آپ انہیں نہ کرنے دیں۔"

"جی۔" وہ پھر بوکھلائیں مگر کمال کی ڈھیٹ اور خود غرض خاتون تھیں، اپنی بات اور اپنے آگے کسی کی نہ سننے ناماننے والی۔

"میں چائے لاتی ہوں۔" وہی انہوں نے اپنی بات دہرائی۔

"آپ جان لیجیے بھابھی کہ ہم چائے پینے نہیں آئے اور اپنے بھائی کو میں خود ہی بلا لیتا ہوں۔" انہوں نے اپنا موبائل نکالا اور فوراً" اپنے بھائی کا نمبر ملایا۔

"ہاں بھئی کہاں ہیں؟" انہوں نے ڈائریکٹ پوچھا اور پھر بتایا۔

"میں تمہارے گھر میں تمہارے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوں!" مدثر میاں دوڑے دوڑے آئے۔

"کمال ہے" امینہ بتاتی نہیں ہو کہ بھائی آئے ہیں۔" امینہ بیگم شرمندہ ہوئیں لیکن یہ بھی ان کا کمال تھا لاکھ شرمندہ ہوں پر دل پر قطعی اثر نہ پہنچایا کرتی تھیں۔

"میں بلانے ہی والی تھی۔" صاف ٹال دیا۔

"بچوں کو بلاؤ گے یا انہیں بھی میں ہی بلاؤں۔" حیدر صاحب نے اب سیدھا اپنے بھائی سے ہی کہا۔

"نہیں نہیں۔ میں دیکھتی ہوں، دس بج گئے ہیں ہو سکتا ہے سو ہی گئے ہوں۔"

"ہاں میں جانتا ہوں کہ آپ صرف اپنے بچوں کی روٹین اور صحت کا بہت خیال رکھتی ہیں۔"

"نہیں۔ میں تو سب بچوں کا خیال کرتی ہوں، ہادی بھی کبھی میرے پاس دیر سے آتا ہے تو اسے سمجھاتی ہوں کہ وقت پر سونا اور اٹھنا کتنا ضروری ہے۔"

چور کی داڑھی میں تنکا کی مثال وہ خود ہی ہادی کا ذکر لے بیٹھیں۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ ہادی کو دس بجے کے بعد آنے کی ہدایت کرتیں۔

"یہ بات قابل یقین نہیں کہ ہادی آپ کی بھی کوئی بات ٹالتا ہو۔"

"بن ماں کا بچہ ہے ناں، تھوڑا ضدی اور اکھڑ ہے۔" حیدر صاحب یہ جملہ سن کر کھول ہی گئے اور امینہ بیگم تو وہاں سے چلی بھی گئیں۔

مدثر بھائی کے بچے اتنے بچے بھی نہ تھے۔ ان کی بڑی بیٹی اس سال میٹرک کا امتحان دینے والی تھی پھر دونوں بیٹے بالترتیب ساتویں اور آٹھویں میں پڑھتے تھے اور سب سے چھوٹی بیٹی پانچویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ امینہ بیگم نے واقعی گھر میں بڑا سخت اور با اصول ماحول رکھا تھا۔ گھر میں بچے کیا اکثر ان کے میاں بھی اس دائرے سے نہ نکل سکتے تھے، یہ اس لیے ان کے شادی کے آٹھ سال بعد اولاد ہوئی تھی۔ وہ انتظار اور کوفت کے تحت ماہ و سال گزار کر خود بڑی کٹھور اور کچھ حد تک بے رحم سی بن گئی تھیں۔ کبھی کبھی مشکل اور آزمائش کے بعد راحت بندے کو بڑا شکر گزار اور اطاعت گزار بنا دیتی ہے اور کبھی یہی تکلیف اور سختیاں بندے کو بے مہر اور ناخوش، ناشکرا بنا دیتی ہیں۔

ابھی دس پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ دونوں لڑکے اٹھ گئے۔

"اچھا چچا جان! اب ہم سونے کے لیے جا رہے ہیں، صبح اسکول ہے۔" چائے لے کر آتے ہی امینہ بیگم نے پہلے اپنے بچوں کو گھور کر دیکھا تھا۔ دونوں لڑکے فوراً" ہی اٹھ گئے۔

چائے پی لی گئی تو امینہ بیگم نے بیٹی سے کہا۔

"بیٹا! یہ برتن سمیٹ لو اور پھر چھوٹی بہن کو بھی ساتھ لے جاؤ۔" یہ اشارہ اس کے لیے بھی تھا کہ اب وہ اٹھ کر چلی جائے۔ اس کی مجال نہیں تھی کہ وہ ٹالتی فوراً" کھڑی ہو گئی۔

"بچوں کو لے کر کھانے کے لیے آ جاتے ناں حیدر

یا اس طرف کا کبھی سوچتے ہی نہیں ہو۔" مدثر بھائی کہہ رہے تھے۔

"بچے فارغ کب ہوتے ہیں، اپنی اپنی پڑھائی اور کاموں میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کو تو پتا ہے، میں خود اکثر دیر سے گھر آتا ہوں خیر اب ولید ساتھ ہوتا ہے تو بہت آسرا ہو گیا ہے۔"

"ماشاء اللہ فرماں بردار اولاد اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ ایسا کرو بھائی حیدر اب اس کی شادی کر دو، تمہارے گھر میں رونق بھی ہو جائے گی اور کچھ زندگی میں بھی تبدیلی آئے گی۔"

"کہاں بھائی صاحب! اس کی شادی تو دور کی بات ہے، پہلے تو میں اپنی شادی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔" بات اس انداز میں خود ہی نکلی کہ حیدر صاحب خوش ہو گئے۔

"کیا کہہ رہے ہو حیدر! کرنی ہی تھی تو آٹھ سال پہلے ہی کر لیتے" اب تو تمہاری بچی بھی جوان ہو گئی ہے۔"

"بھائی جان! گھر میں کیا کچھ ہو رہا ہے" آپ کو خبر ہی نہیں۔ یہاں تو دلہن بھی ڈھونڈ لی گئی ہے اور میرے بیٹے ہادی کی اپنی ہونے والی نئی ماں سے ایسی دوستی کروا دی گئی ہے کہ وہ اسے چھوڑنے پر اب شاید ہی راضی ہو۔" مدثر صاحب بہت حیرت سے اپنے بھائی کی طرف دیکھ رہے تھے بھائی کے لہجے کا طنز اور ملامت سمجھ بھی رہے تھے لیکن بات کی تہہ تک ابھی نہ پہنچے تھے کہ ماجرا کیا ہے۔

"دراصل میں اسی لیے حاضر ہوا ہوں کہ بھابھی صاحبہ سے ان خاتون، بیٹا کیا نام بتایا تھا ہادی نے؟" انہوں نے وقفہ دے کر جان بوجھ کر ولید کو شامل گفتگو کیا۔

"جی ابا! وہ سارہ کہہ رہا تھا شاید۔" ولید نے فوراً" جواب دیا۔

"ہاں سارہ بیگم کا پتا اپنی بھابھی سے لے لوں تو بات کچھ آگے بڑھے۔"

اب امینہ بیگم کا یہ حال تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ انہیں ہرگز وہم بھی نہ گزرا تھا۔ حیدر بھائی ساری بات یوں بے باکی سے سامنے لے آئیں گے۔ انہوں نے سوچا تھا، سارا کھیل پیچھے ہی پیچھے سے ہادی کے ذریعے سے طے کر لیں گی اور ان کا نام کبھی ظاہر نہ ہو گا۔

"بھائی صاحب! رشتہ بھابھی محترمہ نے طے کیا ہے تو پتا بھی انہیں ہی معلوم ہو گا ناں!"

مختصراً" ہادی کی کہی ہوئی ساری بات انہوں نے بھائی کو سمجھائی۔

"کمال ہے امینہ بیگم! آپ اتنی زیادہ ہوشیار نکلیں۔" بہت سختی سے انہوں نے کہا۔ بھائی کے سامنے یوں شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہ سکتے ہوں گے۔

"جہاں تک میری معلومات ہیں، سارہ بیگم لاہور میں رہتی ہیں لیکن آج کل کراچی آئی ہوئی ہیں۔ اب آپ بتائیں بھابھی صاحبہ کہ آپ اپنے یہاں بلائیں گی یا ہم خود ان سے ملنے چلیں۔ بس کل ہی چلتے ہیں معاملہ جلد ہی نمٹ جائے تو اچھا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہو حیدر! کیا سچ مچ نکاح کر لو گے؟"

"تو اور کیا کر سکتا ہوں بھابھی صاحبہ نے اور کوئی راستہ چھوڑا ہی نہیں ہے۔" انہوں نے کچھ توقف کیا۔

"انہوں نے وہ کچھ کیا ہے۔ جو میری اماں جان بھی نہ کر سکیں۔"

"چچا جان! صرف چاچی کی بات رکھنے کا مسئلہ نہیں ہے۔ چاچی نے سارہ بیگم کے ساتھ مل کر ہادی کی اس طرح برین واشنگ کی ہے کہ اگر ابا سارہ کے بارے میں نہیں سوچتے ہیں تو ہادی پر بہت برا اثر پڑے گا۔ وہ حد سے زیادہ متاثر ہے سارہ بیگم سے۔" ولید نے بہت ڈٹ کر اپنی بات کہی۔

"بن ماں کا ضدی اور اکھڑ بچہ سمجھ کر چاچی نے ہادی کے ساتھ جو سلوک کیا ہے۔ آپ خود بتائیں چچا جان اس کا کیا صلہ ہونا چاہیے۔" اب ولید نے زیادہ سخت اور بگڑے ہوئے لہجے میں بات کی۔ امینہ بیگم کا رنگ

قطعی پیلا پڑ گیا تھا۔

”بھائی صاحب! آپ سارے معاملے کو غلط سمجھ رہے ہیں، میں نے تو یوں ہی ایک بار جب وہ اپنی ماں کو بہت یاد کر رہا تھا تو اس کی دل جوئی کے لیے یہ تذکرہ چھیڑ دیا تھا۔ پھر وہ خود پیچھے پڑ گیا۔ بہت تصوراتی دنیا میں رہنے والا بچہ ہے۔ ہادی اور بچہ ہی تو ہے سب کچھ بھول بھال جائے گا۔“

اتنی بات ہو جانے کے باوجود وہ ہمت ہار بیٹھنے والی نہ تھیں۔ بڑا دل گردہ تھا اب تاویلیں دے رہی تھیں۔

مدثر بھائی شرمندگی کے مارے بات کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔

”بس بات کو ختم کریں اور مجھے سارہ بیگم کا نمبر اور پتا دے دیں۔“ حیدر صاحب نے کہا۔

”جی ہادی کو تو سمجھانا ہی پڑے گا۔“ ولید نے کہا۔

”آپ یقین کریں ہادی کو میں سمجھالوں گی، آپ رہنے دیں۔“

”ہونہہ! آپ کا کیا خیال ہے کہ اب بھی میں آپ پر ہی بھروسا کروں گا۔“ وہ سختی سے بولے۔

وہ اندر گئیں اور ایک کاغذ لے آئیں۔ جس پر ایڈریس لکھا تھا۔

ولید نے کاغذ جیب میں رکھا اور دونوں باپ، بیٹے مدثر صاحب سے سلام و دعا کے بعد باہر نکل آئے۔

”ہیں کون آخر یہ سارہ بیگم؟“ ان کے نکلتے ہی مدثر صاحب نے پوچھا۔

”حفیظ چاچا کی لڑکی ہے نا وہ ہی جو لاہور میں رہتے ہیں۔“

”اوہ خدایا یہ وہی سارہ ہے۔ جس کی شادی تم پہلے بھی حیدر سے کروانے پر تلی ہوئی تھیں۔“ وہ حفیظ چاچا کا نام سنتے ہی بھڑک گئے۔

”بے چاری کے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہے اور بچے بھی اس سے چھین لیے ہیں۔“

”ہونہہ! وہ ہو گی اسی قابل تمہارے حفیظ چاچا کی لڑکی۔“

”آپ تو پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں، آپ کو کیا خبر وہ بڑی دکھی ہے، اسے خود بچوں سے بڑی محبت ہے، پوچھ لیجیے گا کبھی ہادی سے، وہ اس سے کتنی محبت سے بات کرتی ہے۔“

امینہ بیگم اتنی شرمندگی اٹھانے کے باوجود اب بھی مایوس نہ تھیں۔

”خبردار جو اب تم نے کسی کی ہادی سے بات کرائی ہو۔“ انہوں نے بری طرح جھڑکا۔

”میں کیوں کروانے لگی بات! اب تو آپ کے بھائی خود ہی بات کرنے جا رہے ہیں، جوڑے تو عرش پر ہی بنتے ہیں، مگر فرش والے خوامخواہ ہی اچھلتے رہتے ہیں۔“

”ہاں ضرور۔ جوڑے عرش پر ہی بنتے ہیں، لیکن تم جیسوں کی مرضی سے نہیں بنتے، سمجھیں۔“

جو لوگ زیادہ ہوشیار بنتے ہیں، اندر سے بے وقوف ہی نکلتے ہیں۔ امینہ بیگم بھی حیدر صاحب کے رویے سے کچھ بھی اندازہ لگائے بغیر بلاوجہ کی خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ثریا حیدر اپنے کمرے میں بیٹھی دادی جان کو یاد کر رہی تھی۔ ان کے گھر میں ہونے سے وقت کے گزرنے کا پتا ہی نہ چلتا تھا۔ ہادی کے معمولات میں بہت فرق ـــ آگیا تھا۔ لیکن یوں ہی کبھی ضدی سا ہو کر وہ ـ سارے معمولات چھوڑ کر خالی بیٹھ جاتا۔

معمولات تو ثریا حیدر کے بھی ان دنوں ضد پر آئے ہوئے تھے۔ یاد کا باب کھولا تو ورق جلدی جلدی بدلنے لگے تھے۔ وہ دادی جان کو یاد کرتے کرتے اگلے رخ پر آگئی۔ اس رخ پر جس سے وہ آنکھ بند کر کے گزر جانا چاہتی تھی۔ لیکن رات کے کسی خاموش حصے میں گرمیوں کی طویل بے زار کر دینے والی دوپہروں میں، یا صبح چڑیوں کی چہچہاہٹ اور پرندوں کے شور میں لان میں ٹہلتے ہوئے کوئی خیال بے دھیانی میں آجاتا، پھر اسے ہرگز خیال نہ رہتا اور وہ سوچنے لگتی کہ آفاق ناراض ہو گا، پلٹ کر فون بھی نہیں کیا، اگر آفاق یوں ہی ناراض رہا تو۔

”تو کیا؟“ وہ ٹہلتے ٹہلتے رک گئی ”تو اسے کیوں فرق پڑنے لگا۔“

وہ لان میں بچھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی۔ ہاں بھلا اسے کیوں فرق پڑنے لگا آفاق ناراض رہے یا خوش۔

نہ چاہتے ہوئے بھی جو خیال اسے ستاتا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی جو لگن اسے لگ گئی تھی اور نہ مانتے ہوئے جو وحشت دل میں کہیں دور تک اتر گئی تھی وہ ان سب سے لڑتے لڑتے بے حال ہو رہی تھی، اپنے دامن کو آگ سے بچاتے بچاتے ہلکان ہو رہی تھی۔ آگ ہی تو تھی پرایا خیال، پرایا دھیان! اگر تعلق نہ بنا تو اس کے پاس جذبوں کی راکھ کے سوا کیا بچے گا اور راکھ تو ساری عمر کا دکھ اور ملامت ہی کا باعث بنے گی۔

اسے اپنے دامن کو ہر حال میں بچا کر رکھنا ہے، کمال کا ضبط تھا اس کے اندر اور غضب کی خودداری، وہ چپ ہو کر اپنے دل و ذہن کی آوازوں کو دبا کر اپنے خول میں سمٹ کر بیٹھ گئی۔

شام کو ابا کے ساتھ دادی جان کو آتے دیکھ کر اس کا جی خوشیوں سے معطر ہو گیا۔ رب تعالیٰ کا کیسا کرم ہوا کہ اس نے اسے نامہربان تنہائی سے بچالیا۔

”آپ بتا تو دیتیں دادی جان! میں آپ کا کمرہ ٹھیک کر لیتی، آپ کی پسند کا کھانا بنا لیتی۔“

”بس اسی لیے نہیں بتایا کہ تم خوامخواہ تکلف میں پڑ جاتی ہو۔“

”ہائے دادی جان! آپ کو تو پتا ہے مجھے یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے۔“

”لیکن ہر وقت اچھا نہیں لگتا، کبھی بے تکلفی بھی ہونا چاہیے، جو ہے، جیسا ہے، ویسا ہی چلا لیا جائے۔“

”آپ لوگ بیٹھیں، میں کھانا لگواتی ہوں۔“ اتنی ذمہ دار، خدمت گزار، کام سے کبھی نہ گھبرانے والی! حیدر صاحب نے اپنی بیٹی کو فخر سے دیکھا۔

”ہرگز نہیں تم سکون سے بیٹھو کھانا سکینہ لگا دے گی بھئی ایک دن تم اپنے گھر چلی جاؤ گی تب بھی اس گھر کا نظام تو چلتا ہی رہے گا نا۔“

حیدر صاحب فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے میں جا چکے تھے۔

”ایسی باتیں نہ کریں دادی جان۔“ وہ گھبرائی۔

”کیوں نہ کروں! حقیقت سے کبھی بھی آنکھ نہیں چرانی چاہیے، میں نے تو بہت لوگوں سے کہہ رکھا ہے اور دعا بھی کرتی ہوں کہ اس بار تمہارا بھی کام نمٹ ہی جائے۔“

”یہ اچانک آپ کو کیا ہو گیا ہے دادی جان۔“

”یہ اچانک نہیں ہے، میں تو بہت دنوں سے اس کام پر لگی ہوئی ہوں، تم کو اس لیے بتا رہی ہوں کہ تمہارا ابھی ذہن بن رہا ہے، تمہاری ماں ہوتی تو تمہیں ان سب باتوں سے آگاہ رکھتی۔“ انہوں نے کہا تو ثریا چپ ہی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

”مجھے تو عجیب گھبراہٹ سی ہو رہی ہے حیدر! تم سوچ سمجھ کر اس عورت کے پاس جاؤ، ہادی کو بھی پہلی ہی دفعہ میں ساتھ لیے جا رہے ہو، پہلے خود مل لیتے، دیکھ لیتے تو بہتر نہ تھا؟ کہیں ہادی۔“

دادی اس سے آگے کچھ نہ بولیں، لیکن بس ان کا ذہن ماؤف ہونے لگا تھا۔

”نہیں اماں مجھے اللہ پر بھروسا کر کے جانے دیں، بس آپ دعا کریں کہ میں سارے معاملے کو بحسن و خوبی نمٹا لوں۔ ہادی ہے تو میرا بیٹا! رویوں اور بے بنیاد باتوں سے بدل گیا ہے، لیکن مجھے امید ہے کہ لوگوں کو پرکھنے اور سمجھنے کا شعور کچھ تو اس کا اپنے باپ جیسا ہو گا۔“ انہوں نے فخر سے اپنے بیٹے کے بارے میں حسن ظن رکھتے ہوئے کہا۔

اسی وقت ہادی کمرے میں آیا۔

”چلیں پاپا! دادی جان کو بتا دیا۔“ وہ باپ سے پوچھنے لگا۔

”ہاں ہاں، باپ کو تو ہر بات بتانی چاہیے نا۔“

”اچھا اماں! ہم چلتے ہیں، وقت پر ہر جگہ پہنچنا اچھا

ہوتا ہے۔" اپنی ماں کو خاموش دیکھ کر حیدر صاحب نے کہا۔

"اچھا! بیٹا اللہ نگہبان۔"

اچھے علاقے میں بے شمار اپارٹمنٹ بنے ہوئے تھے۔ لفٹ سے پانچویں منزل پر پہنچ کر حیدر صاحب نے 503 نمبر کے فلیٹ کی گھنٹی پر ہاتھ رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر میں گیٹ کھلا۔

"اوہ! آپ تو وقت کے بڑے پابند نکلے۔"

سامنے جو خاتون تھیں وہ یقیناً "سارہ" ہی تھی۔ شوخ سے رنگ کی باریک شیفون کی ساڑھی 'جس کے بلاؤز کی آستین نہ ہونے کے برابر تھی اور گلا اتنا گہرا تھا کہ جی ہی جی میں حیدر صاحب نے لاحول پڑھا۔

حیدر صاحب کو کچھ کچھ اندازہ تھا کہ سارہ ایسی ہی ہوگی 'لیکن پھر یہ سوچ بھی غالب آئی تھی کہ اتنے ماہ و سال گزرے ' زمانے کی ٹھوکر لگی تو بندہ سدھر جاتا ہے۔ آج سے اٹھائیس سال پہلے بھی وہ ایسی ہی تو تھی ' بے باک اور۔۔۔۔

"ارے تم بھی آئے ہو۔" ہادی کو دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ کچھ بدل سا گیا۔ حیدر صاحب نے فوراً جواب دیا۔

"سارا مسئلہ اسی کا تو ہے۔" وہ گڑبڑائی 'انہیں اندر بلا کر سامنے لاؤنج میں بٹھایا۔

"ہاں جی 'وہ دراصل آپ کو دیکھ کر میں کچھ جذباتی سی ہو گئی۔" اس کے لہجے پر حیدر صاحب کو کوفت سی ہوئی۔

سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے اس نے ہرگز پلو سے اپنے گلے کو ڈھکنے کی کوشش نہ کی۔ حیدر صاحب کو لمحوں میں ہی اکتاہٹ اور وحشت محسوس ہونے لگی تھی۔

"گھر میں اور کوئی نہیں ہے کیا؟" اب وہ جی ہی جی میں امینہ بھابھی کو کوس رہے تھے۔

"یہ میرا ذاتی اپارٹمنٹ ہے 'میرے شوہر نے پہلی شادی کی سالگرہ پر گفٹ کیا تھا۔"

"یوں بھی کراچی میں میرے ساتھ کوئی نہیں ہوتا ' آپ آئیں نا 'میں آپ کو پورا گھر دکھاؤں 'بہت خوب صورت بنا ہوا ہے۔"

"لیکن مجھے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" حیدر صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ وہ ذرا الجھی 'پھر کاندھے اچکا کر بولی۔

"اچھا آپ چائے لیں گے یا جوس وغیرہ۔"

"میں چائے پی کر آیا ہوں 'شکریہ۔" لہجے میں وہ ہی مُرکھائی تھی سارہ بیگم کی ساری طراری اور شوخی اکارت جا رہی تھی۔

"آپ بہت کم گو لگتے ہیں 'ہادی تو بڑی باتیں کرتا ہے۔ ایک بار کہنے لگا آپ جب میری ماں بن کر میرے گھر آجائیں تو گھر کے سارے نوکر نکال کر نئے رکھ لیجیے گا 'خاص کر آپ کا موٹا ڈرائیور اسے سخت ناپسند ہے۔"

"ہادی کی عمر کے بچے آپ جیسے لوگوں کے سامنے اپنی عقل سے کم اور آپ لوگوں ہی کی ہوشیاری سے زیادہ باتیں کرتے ہیں۔"

"ہائے نہیں 'مگر میرے اندر تو بالکل چالاکی نہیں۔ بس اچھا لباس ہو 'اچھا زیور ہو 'اچھا گھر ہو 'بس یہ ہی بے ضرر سی خواہشیں ہیں۔" وہ فوراً بولی۔

حیدر صاحب نے کوئی جواب نہ دیا۔

"اچھا 'میں آپ کے لیے جوس لے کر آتی ہوں۔" اتنی دیر میں اس نے ہادی سے ایک جملہ بھی بات نہ کی تھی۔

"میں نے کہا نا 'میں کچھ نہیں لوں گا۔"

"چلیں۔ تھوڑی دیر بعد دیکھ لیں گے۔" وہ ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی۔

"اب چلیں ابا! ولید بھائی انتظار کر رہے ہوں گے۔" اچانک ہادی اٹھ گیا 'حیدر صاحب تو اسی لمحے کا انتظار کر رہے تھے۔ فوراً کھڑے ہو گئے۔

"ہاں چلو دیر بھی ہو گئی ہے۔"

"ارے ایسا کیسے ہو سکتا ہے 'میں نے تو آپ کے لیے کھانے کی تیاری کی ہے 'رات کا کھانا کھائے بغیر تو آپ نہیں جا سکتے۔" ہادی نے کئی بار غور کیا کہ سارہ

آنٹی نے اسے مکمل طور پر غیر اہم اور جیسے غیر موجود ہی سمجھ لیا تھا۔ چائے 'جوس اور اب کھانے تک میں اس سے پوچھنا تو درکنار 'اس کا ذکر بھی شامل نہیں۔ فون پر گھنٹہ گھنٹہ بھر بات کرتی سارہ آنٹی کا لہجہ ان کی باتیں جیسے یہ وہ شخصیت ہی نہ ہو۔

"دیکھیے خاتون! میں اس طرح غیر لوگوں کے ساتھ کھانا وغیرہ کھانا ہرگز پسند نہیں کرتا اور آپ کو بھی پرہیز کرنا چاہیے۔" حیدر صاحب کو تو اس کے ہر انداز پر تاؤ آ رہا تھا۔ وہ باہر کے دروازے کی طرف بڑھے۔

"اب غیر کہاں 'اب تو ہم۔" وہ بات کہتے کہتے ہنس کر چپ ہو گئی۔

"غلط فہمی ہے آپ کی۔" وہ طنز سے کہتے ہوئے باہر نکل گئے 'ہادی پہلے ہی نکل چکا تھا۔

"سوری پاپا! سارہ آنٹی تو مجھے ہرگز پسند نہیں آئیں۔" گاڑی میں بیٹھتے ہی ہادی نے صبر کیا نہ انتظار 'پہلا جملہ یہ ہی کہا۔

"اور مجھے پتا ہے کہ آپ کو بھی ہرگز اچھی نہیں لگیں!" وہ مزید بولا۔

حیدر صاحب نے سکھ کا سانس تو اسی وقت لیا تھا جب خود کھڑے ہو کر ہادی نے کہا تھا کہ اب چلیں ابا۔

"کیوں بھئی ایسا کیا ہو گیا؟ کیا بہت کالی ہیں یا بہت موٹی ہیں یا قد بہت چھوٹا ہے۔" ولید نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں 'اچھی تو اتنی ہیں کہ اسٹار پلس کی ہیروئنیں انہیں دیکھ کر شرمائیں اور جب میں اور آپ شرما گئے تو وہ کیوں نہ شرمائیں گی۔"

☼ ☼ ☼

"ارے دادی جان! فون پر تو اتنی باتیں ایسے ایسے بہلاوے ' آواز کیوں بھاری ہو رہی ہے چندا! بہت ٹھنڈا پانی تو نہیں پی لیا 'نزلہ تو نہیں ہو گیا 'کوئی تمہارا خیال رکھنے والا بھی تو نہیں اور یہ کہ کھانے میں کیا پسند ہے 'اچھا میکرونی۔ ارے وہ تو میں اتنے اچھے بناتی ہوں کم سے کم دس الگ طریقوں سے بنا کر تمہیں کھلاؤں گی اور کبھی کہتیں آج کچھ موڈ میں نہیں لگ رہے ہو ' ہائے! کہیں میرے بچے کو اسکول میں کوئی تنگ تو نہیں کرتا 'لڑکے بہت بدتمیز اور شرارتی ہوتے ہیں 'ہر کسی سے نمٹنے کا طریقہ آنا چاہیے 'میں اگر تمہیں سکھاؤں گی۔" وہ تھوڑی دیر کو رکا۔

"اور آج پتا ہے 'کیا لگ رہا تھا جیسے ابا کو دیکھ کر وہ مجھے بھول ہی گئیں۔"

"ارے ہادی اس طرح تو نہ کہو۔" سعد نے ہنس کر کہا۔ سب بھائی 'بہن 'دادی جان کے کمرے میں جمع ہو کر بیٹھے تھے اور ہادی سے ساری باتیں سن رہے تھے۔

"چائے دے دوں 'جوس دے دوں 'کھانا ضرور کھائیں! اور مجھے ایک پانی کا بھی نہیں پوچھا۔ کیا مجھے غصہ نہیں آنا چاہیے۔" ہادی نے باقاعدہ سارہ بیگم کی نقل اتاری۔

"ہاں بھئی آنا تو چاہیے 'دو چار سنا ہی ڈالتے نا۔" حماد نے کہا۔

"نہیں نہیں بھئی۔ کسی کے گھر جا کر اسے کچھ کہنا یہ اچھی بات نہیں۔" ثریا نے کہا تو ہادی نے سر ہلایا۔

"ہاں بالکل میں نے بھی یہ ہی سوچا کہ ان کے گھر میں بیٹھ ــــ کر انہیں کچھ نہ ہی کہنا چاہیے 'ورنہ تم لوگ تو جانتے ہو کہ میں ادھار رکھنے والوں میں سے ہرگز نہیں۔"

"آپ اتنی خاموش بیٹھی ہیں دادی جان! کچھ کہہ نہیں رہیں۔" اچانک ثریا کو بالکل خاموش بیٹھی دادی جان کا خیال آیا۔

دادی جان واقعی اداس اور افسردہ تھیں 'اس سارے قصے پر ان کا دل بری طرح کڑھا تھا۔ امینہ بیگم کی چال اور بدلہ لینے کی آس 'ہوس کو وہ آسانی سے فراموش نہ کر سکتی تھیں۔

"آپ مجھ سے ناراض ہیں دادی جان۔" ہادی سب کچھ بھول کر ان کے پاس آگیا۔

"کہا نا بیٹا! ناراض نہیں ہوں 'لیکن دکھ ضرور ہوا۔"

"یہ بتاؤ' اب تو تمہیں اپنے باپ سے کوئی شکایت نہیں۔"

"نہیں دادی جان اب کس منہ سے شکایت کروں گا۔" اس نے سر اٹھا کر کہا۔

"تم جانتے ہو تمہارے ابا نے تمہاری شکایتیں دور کرنے کے لیے آج اپنی زندگی کی بہت انمول شے داؤ پر لگائی تھی۔"

"کیا دادی جان۔"

"نہیں اپنا بھرم اور خودداری دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز تھی۔"

"یہ کیوں کہہ رہی ہیں دادی جان! خدانخواستہ ان کی خودداری کو کوئی آنچ تو نہیں آئی۔"

"خدا نے عزت رکھ لی بیٹا' ورنہ کوئی کسر تو باقی نہ رہی تھی نا۔"

"آج بھی وہ ان کی گود میں سر رکھ کر سو گیا' وہ انگلیوں سے اس کے بال سہلاتی رہیں اور سوچتی رہیں کہ سارہ اور امینہ دونوں کتنی بے وقوف نکلیں' اگر ایک دن اور ہادی کو دھوکہ دے لیتی چند چکنی چپڑی باتیں ہی کر لیتی تو شاید ہادی کا ذہن ابھی اور طرف مائل ہوتا۔ لیکن اچھے اچھے شاطر اور چالاک لوگ ایسی جگہ مات نہ کھائیں تو سیدھے سادے ہادی جیسے لوگ دنیا کی حقیقت کو کیسے سمجھیں' سچ ہی ہے ہم بندے خدا کو بھول جاتے ہیں' لیکن خدا اپنے کسی بندے کو نہیں بھولتا۔

☼ ☼ ☼

"ہرگز ممکن نہیں ہے یہ' آپ کو اسی وقت فائزہ آپا کو منع کر دینا چاہیے تھا۔"

ڈائننگ ٹیبل سے دور کچن کاؤنٹر پر چیزیں سمیٹتی ہوئی ثریا ابا کا غصہ دیکھ کر سہم سی گئی۔ اس کے اعصاب مضبوط تھے' ورنہ چیزیں اس کے ہاتھ سے چھوٹ جاتیں۔

"نہ بات پر غور کیا' نہ تحمل سے پوری بات سنی' فوراً ہی دوٹوک جواب دے دیا۔" دادی نے شکوہ کیا۔

"آپ یقین کیجیے کہ میرا جواب قطعی نہ بدلے گا' میں اب اپنے کسی بچے کو اپنے خاندان کے کسی شخص کے حوالے کرنے کا تصور بھی نہ کروں گا۔ اماں! آپ کو خود سوچنا چاہیے' اتنا کچھ ہو گیا' پھر بھی آپ مجھے تحمل کا درس دے رہی ہیں۔"

"ایسا کیا ہو گیا جس کی تم مثال دے رہے ہو' اگر تم ہادی کے قصے کو اس بات سے ملا رہے ہو تو میرا خیال ہے یہ زیادتی ہے۔ فائزہ تمہاری سگی بہن ہے۔ اس طرح کے معاملات میں اس کا اپنی بھابھی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"آپ رہنے دیں اماں' میں اس وقت بحث کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"کیوں نہیں ہو بحث کے موڈ میں' بھئی آفاق جیسا پڑھا لکھا' محنتی ہونہار لڑکا پورے خاندان میں نہیں' جیسے ہماری ثریا صورت' سیرت' سگھڑپن اور ہوشیاری میں پورے خاندان میں یکتا ہے اسی طرح آفاق بھی....."

"اماں پلیز! آپ میری بچی کو قطعی اس سے نہ ملائیں' کمال ہے جب آپ ہی کی بتائی ہوئی باتیں میری سمجھ میں آئی ہیں تو آپ انہیں بھول رہی ہیں۔ فائزہ آپا اور امینہ بھابھی کی انتہا درجے کی دوستی کے احوال آپ ہی سنایا کرتی ہیں' پلیز اماں!" حیدر صاحب کرسی گھسیٹ کر کھڑے ہو گئے۔

ثریا نے محسوس کیا' کوئی چیز چھن سے ٹوٹ گئی۔ حالانکہ اس نے کتنا بچایا' کوئی چیز ہاتھ سے نہ پھسلے' شیشے کے گلاس' چائے کے مگ' سالن کے ڈونگے اس نے کتنی احتیاط سے سمیٹے' لیکن یہ ساری احتیاط خود کو سمیٹنے میں کوئی کام نہ آئی۔ اس کے دل میں دور اندر ہی اندر بہت کچھ بکھر گیا۔ ظاہر میں وہ سخت پتھر سی بنی یوں ہی جانفشانی سے سب کچھ سمیٹتی رہی۔ سارے کام نمٹا لیے' پھر اپنے کمرے کی طرف گئی۔

کمرے میں جا کر بھی اس نے ہر چیز پر جیسے پلٹ پلٹ کر دھیان دیا' سوائے ایک اپنی ذات کے' جب تہیہ کر لیا کہ دل کی بات نہیں سننی تو گھبراہٹ کیسی'

خود اپنے ساتھ سخت دلی کا مظاہرہ کرنے میں ماہر ہوتی چلی جا رہی تھی۔ وہ کالج کے کام نکال کر بیٹھ گئی' جو ضروری نہیں تھے' وہ نوٹس بنانے لگ گئی۔

تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ اس کا فون بجنے لگا۔ اس نے کان سے لگا کر ہیلو کہا۔

"جی جناب! اب تو آپ کے پرسنل فون پر بات کرنا میرے لیے جائز قرار دے دیا جائے گا یا اب بھی....."

اسے یک دم لگا جیسے چلتے چلتے اس کا دل بند ہو جائے گا۔

"جی کون بول رہا ہے۔" جیسے اس سے خود اپنی ہی آواز بھی نہ پہچانی جا رہی ہو۔

"یوں جھوٹ نہ بولا کرو ثریا! میں جانتا ہوں' تم میری آواز لاکھوں میں پہچان سکتی ہو۔" اس نے دیدہ دلیری سے کہا۔

"آپ حد سے زیادہ خوش فہم ہیں' کبھی یوں بھی سوچ لیا کریں کہ جس طرح آپ سوچتے ہیں' آپ چاہتے ہیں اس طرح نہیں بھی ہو سکتا۔ ساری دنیا آپ کے ذہن سے تو نہیں سوچتی؟" وہ اسے بھی ناخوش گوار باتوں سے آگاہ کر دینا چاہتی تھی۔

"کبھی کبھی کسی کو حاصل کرنے کے تصور سے ہی لگتا ہے کہ دنیا آپ کی دسترس میں آ گئی ہے۔ تم کیوں ایسی اچھی باتیں نہیں سوچتیں۔"

"کیونکہ خوش فہمی خوش قسمتی نہیں بن سکتی۔" اس نے فون بند کر دیا۔ جب انجام سے آگہی ہو گئی تو کیوں اس کی بے راہ رو گفتگو سن کر خود کو گناہ گار کرے۔ اسے خود پر زعم تھا کہ ہر طوفان سے لڑتے ہوئے بچ ہی نکلے گی۔ سو اسی زعم میں خود کو سمجھا بجھا کر اپنے تئیں۔ "اور بھی دکھ ہیں زمانے میں۔" کے مصداق وہ تو سو ہی گئی' لیکن آفاق کی نیند اڑ گئی۔

ثریا کے جواب پر وہ ٹھٹک گیا تھا' بری طرح چونکا تھا۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ثریا نے برملا کہہ دیا کہ وہ اب تک خوش فہمی میں ہی مبتلا ہے' اس نے تو اٹل فیصلہ کر لیا تھا۔ کتنے دنوں کے سوچ بچار کے بعد ثریا ہی کی ہر بات کو جائز مانتے ہوئے اس نے اپنی ماں سے خود

اس کا تذکرہ کیا تھا' بلکہ انہیں بھی تو اپنا فیصلہ ہی دیا تھا اور وہ بہت خوش ہوئی تھیں۔ ثریا جیسی لڑکی کے ذکر پر ہر کوئی خوش ہی ہو سکتا تھا۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ ثریا نے ایسی مبہم اور دل دکھانے والی بات کی۔

ثریا تو ناممکن تھا کہ اب اسے کوئی بات بتائے' وہ تو اب شاید اس کا فون ہی نہ اٹھائے۔ اس نے شاید یوں سمجھا تھا کہ آفاق رضا اب بھی دل لگی ہی کر رہا ہے' تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔ کی سوچ والا بندہ جان لیا ہے' یہ اچھا ہی ہوا کہ اسے موقع ملا کہ اپنے جذبوں کی صحیح پہچان کرائے۔

"نانی جان! میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔" اس نے صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے اپنی نانی جان کو فون کیا۔

"تم یہاں نہیں آ سکتے۔" انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

"مگر مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

"فون پر بات کر لو۔" سیدھا جواب آیا۔

"ابھی آپ میری بات سنیں گی؟"

"ابھی نہیں' دس بجے کے بعد فون کرنا۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ دس بجے تک کا انتظار دشوار ہو گیا۔ نانی جان کے لہجے سے بھی لگ رہا تھا کہ کوئی بات ایسی ہوئی ہے جو خوش گوار نہیں ہے۔ اور نانی جان سے بات کر کے اسے ساری الجھن سمجھ میں آ گئی۔

وہ آفس گیا' پھر اپنے کمپیوٹر پر بیٹھا۔ گھر میں عام سی روٹین کے مطابق کھانا کھایا' لیکن سوچ کا مرکز ایک ہی تھا اسے کیا کرنا چاہیے۔

"فائزہ آپا کا فون آیا؟" رات کھانے کے بعد حیدر صاحب نے اپنی ماں سے پوچھا۔

"نہیں۔ کیا ایک ہی دن میں اسے فون کرنا چاہیے۔" اماں جان کو تو ابھی بیٹے کو ٹالنا تھا۔ لیکن بیٹا بھی سخت پتھر ہی بن گیا تھا۔

"تو آپ خود فون کر کے میرا جواب پہنچا دیتیں۔"

"کسی کا دل دکھانے سے پہلے تھوڑا اس سے رشتے ناتے کا پاس ہی کر لینا چاہیے' آخر صبر کرنے میں کیا حرج ہے' دو ایک دن میں وہ خود ہی فون کرے گی نا' پھر

تو انکار ہی کرنا ہے۔"

اماں جان نے قطعی ناراض لہجے میں اپنے بیٹے سے بات کی، لیکن حیدر صاحب نے بھی پروانہ کرنے کی ٹھان لی تھی۔

"صبح میں جارہی ہوں۔" بیٹے کا ذرہ برابر احساس نہ کرنا انہیں واقعی گراں گزر رہا تھا۔

"فائزہ آپا کو جواب دیے بغیر آپ چلی جائیں گی۔" انہیں اپنی ہی بات کی پڑی تھی۔

"دنیا سے تو نہیں جارہی بیٹا! اس گھر سے ہی جارہی ہوں، صالحہ کے گھر سے بات کرلوں گی فائزہ سے۔" اماں جان بری طرح چڑ گئی تھیں۔

"میرے سامنے بات کرکے جاتیں تو بہتر تھا" آگے آپ کی مرضی۔"

حیدر صاحب ایک ہی بات میں الجھے کسی اور طرف شاید دھیان دینے والے ہی نہ تھے۔

"وقت کیسا پلٹا کھاتا ہے، ہمارے زمانے میں یہ حال تھا کہ اولاد اس فکر میں مبتلا میں رہتی کہ کہیں والدین ناراض نہ ہوجائیں، دنیا جہان کی فکروں کے ساتھ ایک یہ فکر تو اولاد کے ساتھ لگی ہی رہتی کہ والدین راضی رہیں، آج یہ دور ہے کہ والدین اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ اولاد ناراض نہ ہو، بوڑھے ہوجاتے ہیں، کمر جھک جاتی ہے، مگر ایک یہ ہی فکر کہ اولاد راضی رہے۔"

اماں جان اپنے بیٹے کے رویّے پر بری طرح دکھی ہوگئی تھیں۔ انہوں نے ایسا سخت جملہ کہہ دیا، پھر بھی بیٹے نے توجہ نہ کی تو ان کا دل برا ہوگیا تھا۔

"اماں جان پلیز، اس معاملے میں مجھے نہ آزمائیں۔" وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ اماں جان کتنی دیر وہیں بیٹھی رہی تھیں۔ ثریا آنکھ، کان بند کیے معمول کی طرح اپنے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

حیدر صاحب اپنے دفتر میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بیٹھے تھے۔ بظاہر انہوں نے اپنی طرف سے بات ختم کردی تھی، لیکن پھر بھی مسلسل اسی معاملے میں پریشان تھے۔ کل اس سلسلے میں ان کی بڑے بھائی صفدر سے بھی بات ہوئی تھی، انہوں نے بھی اس رشتہ پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

وہ سمجھا بجھا کر کچھ آس لے کر چلے گئے، لیکن حیدر صاحب تو بات کو کسی بھی دوسرے زاویے سے دیکھنے کے لیے راضی ہی نہ تھے۔ زیادہ غور کرنا اور سوچنا ہی نہ چاہ رہے تھے، جب ہی تو جلدی مچا رہے تھے۔

"مے آئی کم ان سر؟" ان کی آنکھیں بند تھیں اور سر کرسی کی پشت پر اسی طرح ٹکا ہوا تھا جب کسی نے کمرے میں آنے کی اجازت چاہی۔ سامنے دیکھ کر وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"اس بلیک لائن سے آگے پاؤں رکھ کر اندر آنے کی اجازت مانگنا حماقت ہے، پاؤں آگے ہے، اس کا مطلب ہے آپ اندر تو آہی چکے ہیں۔" آنے والے نوجوان کو انہوں نے سختی سے کہا۔

"آپ دور بیٹھ کر اندازہ لگارہے ہیں نا سر! دور کے اندازے غلط ہوتے ہیں، قریب آکر دیکھیں میرا پاؤں بلیک لائن پر ضرور ہے، لیکن اس سے آگے نہیں، میرا اجازت لینا بالکل جائز ہے۔" وہ ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔

"اب آہی چکے ہو تو بس۔ آؤ، بیٹھو۔"

"یہ تو زیادتی ہے سر! جائز بات دیکھ کر بھی اپنی ہی بات پر اڑے رہنا۔"

آفاق رضا حق بات کہنے میں کبھی کسی سے ڈرنے اور جھجکنے والا تو تھا نہیں، یوں بھی جب اس نے یہاں تک آنے کی جرأت کرلی تھی تو اپنے آپ کو کچھ تو ثابت کرنا تھا۔

"صاحب زادے کیا اپنے کچھ نمبر بڑھانے آئے ہو یہاں؟"

"ابھی تو انٹرویو بھی نہیں ہوا، سر نمبر بڑھوانے کی بات کیسے کرسکتا ہوں۔"

"سر!" وہ کچھ حیران ہوئے۔

"یہ جاب ویکنسی کی ایڈ آپ کی کمپنی کی طرف سے ہی ہے نا۔" اس نے کوئی پرچہ آگے کیا۔ انہوں نے آفاق کو جواب دینے کے بجائے فون اٹھایا۔

"میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ ابھی میں انٹرویو لینے کے موڈ میں نہیں ہوں، کسی کو بھی اس سلسلے میں اندر نہ بھیجا جائے؟" وہ بگڑتے ہوئے بولے، اگلی طرف کا جواب سن کر انہوں نے ٹھک سے فون رکھ دیا۔ وہ یوں ہی بیٹھا رہا۔

"انٹرویو تو ابھی نہیں ہوسکتا۔" حیدر صاحب نے کہا۔

"سر! آپ نے انٹرویو کے لیے یہ ہی ٹائم دیا ہے، اب یہ تو قطعی جائز نہیں کہ امیدوار اپنی پوری تیاری کے ساتھ وقت پر انٹرویو کے لیے پہنچتا ہے تو آپ صرف اپنے موڈ کی بنا پر انٹرویو کینسل کردیتے ہیں، اگر یہ اتنی بڑی کمپنی صرف موڈ پر ہی چل رہی ہے تو مجھے بھی سوچنا پڑے گا کہ مجھے یہاں جاب کرنا بھی چاہیے یا نہیں۔"

"اچھا ہی ہے تم سوچ لو، پھر تشریف لے آنا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے کہ میں دوبارہ آؤں گا؟"

"کچھ کرنے کی لگن ہو تو دھکے تو کھانے ہی پڑتے ہیں۔"

"یوں تو میں سو دھکے کھالوں، لیکن اگر ناک کی بات آجائے تو میں پلٹ کر اس گلی سے دوبارہ نہ گزروں۔" وہ کرسی پیچھے کرکے اٹھ گیا۔

"جاتے ہوئے میرے اسسٹنٹ سے مل لینا۔"

اس نے کاندھے اچکائے یوں جیسے سوچتا ہوا اور باہر نکل گیا۔

"سنو! یہ جو برخوردار باہر نکلے ہیں، انہیں آپ خود کیفے ٹیریا میں لے جائیں۔ اچھی سی چائے کے ساتھ بہترین تواضع کریں اور ان کو بتادیں کہ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ان کا انٹرویو ہے۔" آفاق کے نکلتے ہی حیدر صاحب نے فون اٹھا کر اپنے اسسٹنٹ سے کہا۔ آفاق اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"جی اچھا سر!" وہ فوراً "اپنی سیٹ سے اٹھا۔

"آئیے سر!" اس نے آفاق سے کہا۔

"کہاں۔" ساتھ جانے سے پہلے آفاق نے پوچھا۔

"کیفے ٹیریا میں جاکر بیٹھتے ہیں' ہم آپ کو اچھی سی چائے پلائیں گے۔"

"یہ عنایت کس لیے؟" اس نے پھر پوچھا۔

"شاید اس لیے کہ انٹرویو کے سلسلے میں آپ کو زحمت اٹھانا پڑی اور ابھی پندرہ منٹ مزید آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد آپ کا انٹرویو ہے۔"

"ٹھیک ہے' پھر میں پندرہ منٹ بعد خود ہی حاضر ہو جاؤں گا' کمپنی کی چائے کی آفر کا شکریہ۔" اس نے جواب کا انتظار بھی نہ کیا اور فوراً" باہر نکل گیا۔

"حد ہے آپ ایک لڑکے کو نہ روک سکے' آپ کی مضبوط شخصیت دیکھ کر آپ کو یہ جاب دی گئی ہے۔"

"سر! وہ پھرتی سے نکل کر چلا گیا' کوئی بات بھی نہ سنی' پندرہ منٹ بعد آجائے گا سر۔"

"پندرہ منٹ کا پیغام تو چپراسی بھی اسے دے سکتا تھا۔" حیدر صاحب کو ہر بات پر غصہ آرہا تھا۔ انہوں نے ریسیور رکھ دیا۔

انٹرویو کا ٹائم شروع ہوتے ہی پہلی بیل پر اندر بھیجا جانے والا امیدوار آفاق ہی تھا۔ حیدر صاحب کو گمان تو تھا کہ وہ پلٹ کر آئے گا' لیکن آفاق کا نہ رکنا انہیں اس وقت گراں گزرا' لیکن بعد میں سوچا تو انہیں احساس ہوا کہ اگر وہ رک جاتا تو اس کی اہلیت کے نمبر گھٹانے پڑتے۔

"وہ بلاشبہ بہت قابل اور ہوشیار نوجوان ہے" انٹرویو کے بعد پورے پینل کی یہ ہی رائے تھی' لیکن انہوں نے اپنی رائے مخفی رکھی۔

☼ ☼ ☼

"فائزہ آپا کا فون آیا۔" چائے پیتے ہوئے انہوں نے اماں جان سے پوچھا۔

"نہیں' فون تو آج بھی نہیں آیا' حالانکہ آج تو ضرور اس کا فون آنا چاہیے تھا۔"

"رہنے دیں اماں جان! اب میں فائزہ آپا سے خود ہی بات کرلوں گا' آپ کے پاس اگر فون آئے بھی تو آپ انہیں یہ ہی جواب دیجئے گا کہ مجھے فون کرلیں۔"

بیٹے کے لہجے میں سختی کا وہ پہلو نہ تھا جو پچھلے تین دنوں سے بری طرح عیاں ہو رہا تھا۔ لیکن اس بات سے کوئی امید لگا لینی بھی بے وقوفی ہی تھی جس طرح کا اس کا مزاج تھا' اس کو مدنظر رکھتے ہوئے انہوں نے یہ ہی سوچا کہ آخر کار حیدر وہ ہی کرے گا جو اس کا جی چاہے گا۔

تین روز گزر گئے۔ حیدر صاحب اپنی ماں کو بھی ٹالتے رہے اور فائزہ آپا کو بھی' وہ خود اب تذبذب کا شکار نہ تھے۔ فیصلہ انہوں نے اسی دن کرلیا تھا' جس دن آفاق اتفاق سے ان کی کمپنی میں انٹرویو دینے آیا تھا۔

"ارے کمال ہے" انہوں نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ اتفاق سے ان کی کمپنی میں آیا تھا۔ نہایت ہوشیاری سے اس نے اپنے آپ کو اہل ثابت کرنے کا موقع ڈھونڈا تھا اور یہ اس کا اچھا نصیب ہی تھا کہ اسے یہ موقع ملا تھا۔ ورنہ...."

آج چوتھے روز حیدر صاحب اپنے دفتر میں بیٹھے یہ باتیں سوچ رہے تھے کہ ان کے دائیں ہاتھ کی طرف رکھے فون کی بیل بجی۔

"سر! انٹرویو کے رزلٹ کے سلسلے میں مسلسل فون آرہے ہیں' صرف یہ پوچھنا تھا کہ امیدواروں کی تسلی کے لیے کیا جواب دیا جائے۔" ان کے اسسٹنٹ تھے۔

"آپ ایسا کریں ایک گھنٹے بعد آکر رزلٹ مجھ سے لے لیں' میں فائل پر سائن کر دیتا ہوں۔" انہوں نے جواب دیا' وہ ریسیور رکھ کر فائل سامنے رکھ کر بیٹھ گئے۔

سب سے پہلا نام آفاق رضا کا ہی تھا۔ پینل کے سارے ممبران نے اسے ہی پہلے نمبر پر رکھا تھا۔ مگر انہوں نے اپنی مرضی سے فائل پر سائن کیے اور فائل اپنے اسسٹنٹ کے سپرد کردی۔ نتیجہ دیکھ کر آفس کے بہت سے لوگ حیران ہوئے۔

آفاق رضا کو کیوں ریجیکٹ کر دیا گیا؟

آفاق کئی بار آفس فون کرچکا تھا لیکن کوئی تسلی بخش جواب نہ ملا تھا۔ اسی لیے اس نے اس بار ڈائریکٹ حیدر صاحب کا نمبر ملایا۔ آخر وہ اس کے ماموں بھی تھے۔

"میں نے کئی بار آفس فون کیا لیکن آپ سے بات نہ ہوئی تو سوچا' اب سیدھا سیدھا آپ کا نمبر ہی ملا لوں۔"

"ہوں' ٹھیک ہے!"

"سر! کیا اب رزلٹ بھی لیٹ کیا جائے گا۔"

"کون سا رزلٹ؟ انٹرویو کا' وہ تو آگیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"کچھ دیر پہلے آفس فون کیا تو مجھے رزلٹ نہیں بتایا گیا؟"

"شاید تم نے غلطی کی بھئی۔ تمہیں آفس ہی فون کرنا چاہیے تھا۔"

"نہیں غلطی کیوں؟ رزلٹ تو مجھے آپ بھی بتا دیں گے۔"

"کیا تم اس جاب میں بہت انٹرسٹڈ ہو؟"

"کمال ہے سر! یہی وہ سوال ہے جسے پہلے دن سے لے کر اب تک آپ نے پوچھا ہی نہیں تھا۔ میں تو سیدھا سیدھا اسی سوال کا جواب دینا چاہتا تھا کہ میں کس چیز میں انٹرسٹڈ ہوں۔"

"برخوردار! میں صرف جاب کی بات کر رہا ہوں۔"

"سر! جاب کے بارے میں تو اب میں کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں رہا۔ اس لیے کہ انٹرویو بھی ہو گیا اور رزلٹ بھی آگیا۔"

"بات تو تمہاری درست ہے' رزلٹ تو آہی گیا ہے لیکن میں نے یونہی تمہارا رجحان معلوم کرنے کے لیے پوچھ لیا تھا۔"

"آپ کا پوچھنا سر آنکھوں پر سر! لیکن میں بھی یونہی اپنی دلچسپی کی چند باتیں تو آپ سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔"

اس نے بھی "یونہی" پر زور دے کر کہا۔

"رہنے دو' تمہاری دلچسپی کی طرف میں خود ہی آجاتا ہوں' میرا خیال ہے۔ سیدھی اور صاف بات کرنا زیادہ بہتر ہے۔"

"جی سر!" وہ چوکنا ہو گیا۔

"یہ بتاؤ' تمہیں میری کمپنی میں جاب چاہیے یا گھر میں جگہ!" اسے تھوڑی دیر کے لیے یقین نہ آیا۔

"آپ خود سوچ لیں انکل! میری اہلیت کا فیصلہ تو اب آپ ہی کریں گے لیکن ایک عہدہ تو آپ کو مجھے دینا ہی پڑے گا۔"

وہ جانتا تھا کہ سیدھی اور صاف بات حیدر انکل خود ضرور کر رہے تھے لیکن اگر اس نے کی تو شاید وہ برداشت نہ کریں۔ البتہ کافی دیر سے وہ انہیں "سر" کہہ رہا تھا اب کی بار "انکل" ہی کہا۔

"ضروری تو نہیں!" حیدر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"ضروری تو ہے انکل! اتنا تو مجھے اپنی قابلیت پر بھروسا ہے۔" اس نے لہجے کو پرجوش بنا کر کہا۔

"ہوں..." لمبی سی ہوں کے بعد وہ خاموش ہو گئے۔

"پھر رزلٹ سر؟"

"آفس فون کر کے پوچھ لو۔" انہوں نے فون بند کر دیا۔ اس نے اسی لمحے رزلٹ معلوم کیا اور رزلٹ معلوم کر کے اس نے جب خوشی سے اسسٹنٹ صاحب کو کہا۔

"تھینک یو! تھینک یو ویری مچ سر!" تو حیرانی سے اپنے فون کے ریسیور کو دیکھنے لگا۔

"کمال ہے اتنی اچھی جاب کے نہ ملنے پر وہ شکریہ ادا کر رہا ہے۔"

✵ ✵ ✵

"تم نے سمجھ لیا تھا کہ آفاق صرف دل لگی ہی کر سکتا ہے۔" "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی ... کے چکر میں پڑا رہنے والا بندہ سمجھتی تھیں ناں مجھے! اب تک خیر تم مجھے بھول بھی چکی ہو گی۔ اپنے باپ حیدر علیم کی فرمانبردار اولاد ثریا حیدر!"

"ایک منٹ مسٹر! آپ نے شاید رانگ نمبر ڈائل کر لیا ہے۔"

"خبردار اب اگر فون بند کیا ناں تو اتنا فون کروں گا کہ ایک دن تنگ آ کر تم اپنا فون روڈ پر پھینک دو گی اور اگر بند نہ کیا تو..." وہ رکا۔

"تو آج کے بعد کبھی نہ ستاؤں گا۔"

"لگ رہا ہے کہ اب چھ کنکشن مل رہا ہے، لیکن تار میں پھر بھی ابھی تھوڑی گڑبڑ ہے" آواز کچھ صاف نہیں۔"

"ثریا حیدر! زیادہ بننے کی کوشش نہ کرو، پٹائی کر دوں گا۔"

"میں ابا سے کہہ دوں گی، میرے ابا میری ہر بات مانتے ہیں۔"

"خاک مانتے ہیں، مانتے ہوتے تو جب رشتہ بھیجا تھا تو اسی وقت دو لفظ بول دیتیں کہ ابا! مجھے آفاق بہت پسند ہے۔ مجھے اتنے پاپڑ تو نہ بیلنے پڑتے۔"

"نصیب میں لکھا تو ملتا ہے، عزت سے ملے تو اچھا کہ مانگ کے ملنے سے تو بہتر!" ثریا کا لہجہ بہت خوش بہت ستھرا تھا۔

"اسی جھنجھٹ میں تو میں بھی پڑا تھا کہ تمہیں حاصل کرنے کے لیے خود کو اہل ثابت کیا ہے۔ مانگتا تو شاید پہلے ہی دن انکل مجبور ہو کر مان جاتے۔ میں انہیں مجبور کر ہی دیتا لیکن بات میں مزہ نہ رہتا۔"

پھر اس نے ساری بات ثریا کو بتائی تو ثریا بہت زیادہ پُرسکون ہو گئی۔

"اب بتاؤ، اب تو تمہارے پرسنل فون پر پرائیویٹ باتیں کرنے کا حق مجھے مل گیا ناں۔"

"ہرگز نہیں۔ ابھی کہاں۔ ابھی تو آپ وہی صرف میرے کزن ہی ہیں مسٹر آفاق رضا۔"

"تم نہیں بدلو گی ثریا حیدر!"

"آپ مردوں کو کسی عورت سے ابھی تعلق جڑے نہ جڑے پہلا خیال اسے بدلنے کا ہی کیوں آتا ہے۔"

"زندگی کے بدلتے ادوار کے ساتھ بدلنا تو ہر انسان کو پڑتا ہے۔ کیا عورت کیا مرد، وہ مرد بے وقوف ہوتے ہیں جو خود نہ بدلیں اور صرف عورت کے بدلنے پر ضد کرتے رہیں۔"

"میں نے اندازہ کیا تھا کہ آپ کے اندر چند ایسی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے مجھے آپ کے عمر بھر کے ساتھ کی تمنا کرنی چاہیے۔ لیکن میں نے صرف تمنا کی اور دعا کی۔ باقی سارے کام اللہ تعالیٰ کے فضل سے خود بخود آسان ہو گئے۔"

"اوہ!" اتنی کوشش اور سعی کے بعد ثریا حیدر کا یہ خوب صورت اظہار آفاق رضا کو سرشار کر گیا۔

ثریا حیدر ایک الجھی ہوئی اور مشکل پسند لڑکی تھی لیکن اس کے خیالات بالکل واضح اور روشن تھے۔ وہ لڑکی جو اپنے بستر کی چادر پر شکن برداشت نہ کر سکتی تھی، وہ اپنے باپ کی پیشانی پر شکن کا باعث کیسے بنتی۔

وقت سے پہلے اس طرح کے اظہار اکثر لڑکیوں کے والدین کی پیشانی پر شکن کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔

✵

درسِ اوّل

محبت مری جاں!
تذبذب کی بے فیصلہ ساعتوں میں
اُچھالا گیا کوئی سکہ نہیں
جس کے اک رُخ پہ "ہے" دوسرے پر "نہیں" ہو
یونہی خالی اوقات میں رنگ بھرنے کا
جیون کی پھیلی ہوئی ریت پر
چند شکلیں بنانے کا اک شغلِ بے کار کب ہے
محبت، وظیفہ ہے
ایسا فریضہ ہے جو کام سارے بُھلا کر نبھانا ہے
یہ جنگلوں کی بھڑکتی ہوئی آگ کا ایک شعلہ نہیں
من پہ کِن مِن سی گرتی ہوئی
نرم کومل پھواروں کی رِم جھم میں
اندر تلک بھیگنا ہے!
سمندر کے سرگم پہ مدہوش وارفتگی ہے
جو میٹھے سُروں سے نمانوں کو مسحور کرتی رہی ہے
محبت مری جان!
جاں سے گزرنے کا رستہ ہے
منزل نہیں
ایک نقطے کی جانب سفر ہے
جہاں "میں" پگھلتا ہے
اور "تو" کے سانچے میں ڈھلتا ہے
آساں نہیں ہے
مری جاں، محبت!

شہزاد نیّر

کارڈ

اسے رنگ بہت بھاتے تھے
تو بیوٹیشن کا کورس کر لیا
اس کی صحت عزیز رکھنی تھی
کوکنگ کا ڈپلومہ بھی کر لیا حاصل
ہر صبح نچھاور کرنے تھے پھول
مالی سے گلابوں کی قسمیں بھی جان لیں ساری
ڈرائیور تو اس کے پاس ٹکتے ہی نہ تھے
آج ڈرائیونگ لائسنس پا لیا
گھر جو پہنچی اس کے، اپنی کامیابیاں لے کر
لان میں گلرنگ چہرہ لیے، اک لڑکی کے ساتھ
کر رہا تھا منتخب وہ اپنی شادی کے کارڈ

عافیہ احمد

کبھی دل گرفتہ خرام سے نہیں آئیں گے
تُو بلائے گا بھی تو شام سے نہیں آئیں گے

ترے پاس آئیں گے حال ہم ترا پوچھتے
کسی اور دوسرے کام سے نہیں آئیں گے

وہ مزاج دل کا نہیں رہا ہمیں مت بُلا
کہ نشے میں اب ترے جام سے نہیں آئیں گے

جو انا کے اپنی اسیر ہیں انہیں جا کے لا
ترے اک زبانی پیام سے نہیں آئیں گے

جو ہمارے نام سے خواب آئیں گے اب تمہیں
کسی اور شخص کے نام سے نہیں آئیں گے

سلمان صدیقی

آدھا جیون بیتا آہیں بھرنے میں
آدھی عمر توازن قائم کرنے میں

دُنیا تو پتھر ہے، پتھر کیا جانے
کتنے آنسو چیخ رہے ہیں جھرنے میں

اک طوفان اور اک جزیرہ حائل ہے
ڈوبنے اور سمندر پار اُترنے میں

آئینہ بے چارہ خود ہے زنگ آلود
بُجھ جلائے گا چہرے روشن کرنے میں

اک "پُل" جوڑ رہا ہے دو دُنیاؤں کو
اک "پَل" حائل ہے جینے اور مرنے میں

شبنم رومانی

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں بیٹھے تھے کہ قبلہ مزینہ کی ایک عورت زینت والا لباس پہنے اتراتی ہوئی مسجد میں آئی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"لوگو! اپنی عورتوں کو زینت والا لباس پہننے اور تفاخر والی چال چلنے سے منع کرو۔ بنی اسرائیل پر اسی وقت لعنت کی گئی تھی، جب ان کی عورتوں نے زینت والا لباس پہنا اور مسجدوں میں فخر سے چلنے لگیں۔"
(سنن ابن ماجہ)

مُنہ سے نکلی ہوئی بات

ایک شخص امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اور سوال کیا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک چھوٹے سوراخ سے بڑا بیل نکلا ہے۔ اس نے ہر چند چاہا کہ پھر سوراخ میں جائے وہ نہ جا سکا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے تاویل میں فرمایا کہ وہ بیل "بات" ہے جب مُنہ سے نکلتی ہے تو پھر اپنی جگہ پر نہیں جا سکتی ہے۔
مہوش ڈوگر۔ گوجرانوالہ

اللہ تعالیٰ کی مدد

حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک بار عزم کر لیا کہ حلال کے سوا کچھ نہ کھاؤں گا۔ چنانچہ صحراؤں میں گھوما کرتا تھا۔ وہاں میں نے ایک انجیر کا درخت دیکھا۔ اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ اس سے کچھ کھاؤں۔ اسی درخت نے پکار کر مجھ سے کہا۔
"تو اپنا عہد قائم رکھ اور مجھے مت کھا کیونکہ میں ایک یہودی کی ملکیت ہوں۔"
نمرہ، اقراء۔ کراچی

موتی مالا

- آنسوؤں کو بہہ جانے دو، یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہونے سے روکتے ہیں۔
(لی نیٹ)
- خوشی صرف ہنسنے ہنسانے کا نام نہیں ہے۔
(آرک بشپ ٹیٹلے)
- غصہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم دوسروں کا انتقام اپنے آپ سے لیتے ہیں۔
(پوپ)
- جب دو آدمی کسی مسئلے پر بحث کے بغیر متفق ہو جائیں تو ثابت ہوتا ہے کہ دونوں بے وقوف ہیں۔
(برنارڈ شا)
- میں صرف ایک چیز جانتا ہوں اور وہ یہ کہ میں کچھ نہیں جانتا۔
(بقراط)

ملیحہ طاہر۔ جھبراں

علم الیقین

عبدالواحد بن زیدؒ فرماتے ہیں کہ میرا ایک بزرگ راہب کے عبادت خانے پر گزر ہوا۔ میں نے اس سے باتیں کیں اور کہا۔
"اے راہب! علم الیقین کیا ہے؟"
اس نے عبادت خانہ کا پردہ اٹھایا اور کہا۔
"اے عبدالواحد اگر تو علم الیقین حاصل کرنا چاہتا ہے تو اپنے اور دُنیا کی خواہشات کے درمیان لوہے

کی دیوار کھڑی کر دے۔" پھر راہب نے پردہ چھوڑ دیا۔
اقصیٰ ناصر۔ کراچی

کتاب اور مطالعہ

● اگر دنیا کی تمام سلطنتوں کے تاج میری کتابوں اور میرے مطالعہ کے شوق کے عوض میرے پاؤں پر رکھ دیے جائیں تو میں اُن سب کو ٹھکرا دوں گا۔
(ہائل)

● آدمی مطالعے سے بیدار ہوتا ہے۔ مکالمے سے اس میں تمیز آتی ہے اور لکھنے سے اس کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔
(راجر بیکن)

● کپڑے چاہے انسان پرانے ہی کیوں نہ پہنے لیکن نئی کتابیں ضرور خریدے۔
(آسٹن فلپس)

● اکثر دیکھا گیا ہے کہ کتابوں کے مطالعے نے انسان کے مستقبل کو بنا دیا ہے۔
(ایمرسن)

● ایک اچھی کتاب انسان کا بہترین سرمایہ ہوتی ہے۔
(ملٹن)

● مصنف کی وہ سطر جو اُسے زندہ و جاوید بنا دے وہ اُس کی تمام تصانیف پر بھاری ہے۔
(وارث شاہ)

امبر گل۔ جھڈو (سندھ)

عشق کی ڈھول

جانے کون نگر کی چڑیا
شام منڈیر پہ آ بیٹھی ہے
چونچ میں اک نازک سی ڈالی
جیسے عشق سفر کی ڈھول

(نوشی گیلانی)
گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

راز

زندگی کا اصل راز یہ ہے کہ دنیا کو قلب سے نکالو گو ہاتھ میں بقدر ضرورت موجود رہے۔ دنیا کا ہاتھ میں ہونا مضر نہیں، دل میں سمانا مضر ہے۔ قلب تو بس حق تعالیٰ کے رہنے کی جگہ ہے۔ قلب کو صاف رکھنا چاہیے نہ معلوم کس وقت نور حق اور رحمت الٰہی جلوہ گر ہو جائے۔ اس کا خاص اہتمام رکھو کہ قلب فضولیات سے خالی رہے جس طرح فقیر اپنے برتن کو خالی رکھتا ہے کہ نہ معلوم کس وقت کسی سخی کی نظر عنایت ہو جائے۔ ایسے قلب کو خالی رکھو نہ معلوم کس وقت رحمت کی نظر ہو جائے۔
(قدرت اللہ شہاب کی "شہاب نامہ" سے اقتباس)
سیدہ نسبت گیلانی۔ کہروڑ پکا

راہ کے دیپ

★ اپنی خوشی کے لیے دوسروں کی مسرت کو خاک میں نہ ملاؤ۔

★ مجھے بتاؤ تمہارے دوست کون ہیں، میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کون ہو؟ (سروانٹس)

★ جو اپنی محبت کا اظہار نہیں کرتے وہ دراصل محبت ہی نہیں کرتے۔ (شیکسپیئر)

★ جو شخص کسی مقصد کو سامنے رکھ کر محنت کرتا ہے۔ اس کو اس کا پھل ضرور ملتا ہے۔ (گوئٹے)

★ میں اپنے حریفوں پر اکثر اس لیے غالب آتا ہوں کہ وہ دو چار منٹ کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے لیکن میں اس تھوڑے وقت کی قدر و قیمت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ (نپولین)

★ غصہ ہمیشہ حماقتوں سے شروع ہوتا ہے اور ندامتوں پر ختم۔ (ارسطو)

★ تمام چیزوں کا حل نمکین پانی میں مضمر ہے آنسو، پسینہ، سمندر۔ (آئزک ڈی سن)

تحریم۔ گوجرہ

پروفیسر صاحب

ارے یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہیں۔ میں پندرہ منٹ سے دیکھ رہی ہوں۔ آپ اس طرح بت کی مانند آنکھیں بند کیے کھڑے ہیں۔" بیگم اقرا نے باورچی خانے سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔

پروفیسر عاطف صاحب نے چونک کر آنکھیں کھول دیں پھر کچھ دیر تک آنکھیں مل مل کر اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ جب اچھی طرح یقین ہو گیا کہ ہاں یہ اپنا ہی گھر ہے تو کہنے لگے۔

"ارے بیگم اقرا! میں لکھتے لکھتے کچھ سوچ کر اٹھا اور پھر بھول گیا۔" پروفیسر عاطف نے کہا۔

"کیا دفتر جانا تھا؟" بیگم اقرا نے پوچھا۔

"نہیں" عاطف صاحب نے کہا۔

"عاطف! پھر کسی سے ملنے جا رہے تھے؟"

"نہیں اقرا بیگم! وہ کچھ عجیب طرح کا خیال تھا۔"

"امی! پانی" ناصر جو باورچی خانے میں بیٹھا تھا، چلا کر بولا۔

"کم بخت! اب یاد آیا۔ ذرا ایک گلاس مجھے بھی دے جانا اقرا بیگم!" یہ کہہ کر پروفیسر عاطف صاحب کمرے میں چلے گئے۔

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

نمائش

ایک صاحب اپنے بیوی بچوں کو میلہ دکھانے لے گئے۔ گھومتے گھومتے وہ ایک خیمے کے پاس پہنچے جس کے باہر ایک شخص ڈھول پیٹتے ہوئے چلا رہا تھا۔ "آئیے آئیے"

وہ اپنے بیوی بچوں سمیت وہاں کھڑے ہو گئے اور نہایت سنجیدگی سے اس شخص کو دیکھنے لگے۔

"جناب! کیا آپ اندر جا کر بارہ سنگھا نہیں دیکھیں گے؟" اس نے پوچھا "صرف دو روپے کا ٹکٹ ہے۔"

"نہیں جناب! میں اتنا خرچ برداشت نہیں کر سکتا۔" ان صاحب نے جواب دیا۔ "تم دیکھ رہے ہو کہ ہم میاں بیوی کے علاوہ ہمارے انیس بچے بھی ہیں۔"

"یہ انیس بچے آپ ہی کے ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بے شک"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کل اکیس افراد ہیں؟ تب آپ یہیں ٹھہریے، میں اندر سے بارہ سنگھا کو لے کر آؤں تاکہ وہ آپ کو دیکھ لے۔"

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

صحیح طریقہ

کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک صاحب اپنے دوست سے ملنے گاؤں جا رہے تھے راستے میں ایک بیل گاڑی نظر آئی تو انہوں نے بڑی خوش دلی سے گاڑی بان سے سوال کیا۔

"جناب! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی گاڑی کہاں جا رہی ہے؟"

گاڑی بان نے جواب دیا "میں گاؤں جا رہا ہوں"

یہ سن کر وہ صاحب خوش ہو گئے اور کہنے لگے۔

"تو کیا آپ مہربانی فرما کر میرا کوٹ اپنے ساتھ لے جائیں گے؟"

سادہ لوح دیہاتی نے ہنس کر کہا "مگر میں آپ کا کوٹ گاؤں میں کیسے دوں گا؟"

وہ صاحب یہ سن کر چونکے پھر کہنے لگے۔

"ہاں یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں بھی کوٹ کے ساتھ بیٹھ جاتا ہوں تاکہ آپ کو تکلیف نہ ہو۔"

نسبت گیلانی۔ کہروڑ پکا

بے ساختگی

مشہور مزاح نگار ایلین کنگ کو ملکہ الزبتھ دوم نے محل میں بلایا تو وہ جانے سے پہلے گھنٹوں تک یہ الفاظ دہرا دہرا کر یاد کرتا رہا۔

"آپ کیسی ہیں میجسٹی؟"

جب وہ ملکہ کے حضور پہنچا اور ملکہ نے کہا "آپ کیسے ہیں مسٹر کنگ؟"

تو اس نے بے ساختہ جواب دیا۔

"آپ کیسی ہیں مسٹر کوئین؟"

عذرا ناصر۔ کورنگی کراچی

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

آمنہ اجالا ______ ڈہرکی

دن کو سورج تو دیے جلتے ہیں شب بھر کے لیے
پھر بھی اندھیارے ہیں انسان کے اندر کتنے
لوگ ہنس ہنس کے دلاتے ہیں وفاؤں کا یقین
اور ہاتھ میں لیے پھرتے ہیں پتھر کتنے

نادیہ، عظمیٰ ______ کراچی

رگوں میں زہر کے نشتر اتر گئے چپ چاپ
ہم اہل درد جہاں سے گزر گئے چپ چاپ

انجم شہزادی ______ مرزا پور

پتھر کا شہر اور تکلم کی آرزو
کس کو سناؤں حال کوئی بولتا نہیں

رضوانہ شکیل راؤ ______ لودھراں

دورِ باطل میں حق پرستوں کی
بات رہتی ہے، سر نہیں رہتے

ایس عطاریہ ______ بھلوال

یہاں تو پھر وہی دیوار و در نکل آئے
کدھر کو یار چلے تھے کدھر نکل آئے

مہوش ڈوگر ______ گوجرانوالہ

عشق مجبور و نامراد سہی
پھر بھی ظالم کا بول بولا ہے

ثانیہ مشعل ______ حویلی لکھا

یہ جو سرگشتہ سے پھرتے ہیں کتابوں والے
ان سے مت مل کہ انہیں روگ ہیں خوابوں والے

رشیدہ بتول ______ کراچی

پل بھر میں بکھر جائیں گے مٹی کے گھروندے
بچوں کی مگر حسرت تعمیر تو دیکھو

گلشن شاکر ______ ہری پور

کس کس کے تعاقب میں بھٹکتی رہیں آنکھیں
ٹوٹے ہوئے اک خواب کی تعبیر تو دیکھو

ثریا رشید ______ بلدیہ ٹاؤن کراچی

وفا و مہر و الطاف و کرم تھے ہم عناں کیا کیا
ہوئے ہیں اپنے ہی دل سے مگر ہم بدگماں کیا کیا
اب اپنے گھر کا بھی احوال لب پر لا نہیں سکتے
کیا کرتے تھے ہم احوال عالم کا بیاں کیا کیا

نین تارا ______ گوجرانوالہ

حال دل اس کو سنانا حوصلے کی بات تھی
حوصلے کی یہ کرامات اچھی لگیں
ہم بساطِ عشق پر کب ہارتے اس سے مگر
جان کر کھائی ہوئی ماتیں اچھی لگیں

فرحانہ ______ میاں چنوں

ترکِ تعلقات پر رویا نہ تو نہ میں
لیکن یہ کیا کہ چین سے سویا نہ تو نہ میں

غزالہ جمیل ______ ایبٹ آباد

تم سے طلب صلہ کیا؟ تم سے کوئی گلہ کیا؟
دیدۂ تر کا ذکر کیا، یونہی چھلک گیا کہیں
وہ جو سبک خرام تھے منزل عشق پا گئے
راہ وفا کے بیچوں بیچ کوئی اٹک گیا کہیں

شبانہ ______ کراچی

مہکتے میٹھے مستانے زمانے
کب آئیں گے وہ من مانے زمانے
جو میرے کنج دل میں گونجتے ہیں
نہیں دیکھے وہ دنیا نے زمانے

ثمینہ اکرم ______ کراچی

مری تیم جاں اناتھی میری کج ادائی کے پیچھے
تجھے بھول کیوں نہ جاتے اگر اختیار ہوتا

رضیہ امین ______ کراچی

جہاں رہے گا وہیں روشنی لٹائے گا
کسی چراغ کا اپنا مکاں نہیں ہوتا

امۃ الصبور

خاص وں کی ڈائری

نورین تبخل ● کی ڈائری سے

شاعری وہ لفظ جو ہم محسوس کر سکیں۔ شاعری کبھی کومل جذبوں، کبھی تلخ حقائق تو کبھی انسان کے جینے کا مقصد بیان کرتی ہے۔ میری ڈائری میں موجود کشور ناہید کی نظم سب قاری بہنوں کے لیے۔

مجھے پڑھنے بیٹھے ہو تو آنکھیں ہاتھ پہ رکھ لو
کبھو ہنستا ہوا تم نے کبھی بادل دیکھا ہے
کبھی بجلی کے دامن سے مہک پھوٹی ہے آنگن میں
سمندر ڈوب جاتے کو کبھی دامن میں اترا ہے
مجھے پڑھنے اگر بیٹھو
تو پرچھائیوں کو مت دیکھو
نہ دیکھو بجھتے انگاروں کی بھوبھل کو
کہ ان ہاتھوں سے شعلوں کی تمازت
حرف بنتی ہے
مرے ہونٹوں سے مردہ منظروں کو
لفظ ملتے ہیں
مری آہٹ کو سن کر
بادباں خواہش سفر پہنے
مگر میں کون ہوں
آنکھیں اک صحرا بے رونق
بدن پہ آبرو کی کھتلی کا زنگ ٹھہرا ہے
قدم شوریدگی کی دلدلوں میں
زخم نخلستاں ہیں
مجھے پڑھتے ہوئے
ہاتھوں پہ رکھی آنکھ بہہ نکلے
تو ہنس دینا!

شہرے شفق ● کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر میری پسندیدہ نظم آپ سب قارئین بہنوں کے نام۔

بے سبب تو نہیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا
ضبط کا حوصلہ بڑھا لینا
آنسوؤں کو کہیں چھپا لینا
کانپتی ڈولتی صداؤں کو
چپ کی چادر سے ڈھانپ کر رکھنا
بے سبب بھی کبھی کبھی ہنسنا
جب ہو بات کوئی تلخی کی
موضوعِ گفتگو بدل دینا
بے سبب تو نہیں تیری یادیں
تیری یادوں سے کیا نہیں سیکھا

عزہ، اقراء ● کی ڈائری سے

میری ڈائری میں تحریر ساغر صدیقی کی یہ غزل آپ سب بہنوں کے لیے۔

واسطہ حسن سے یا شدت جذبات سے کیا
عشق کو تیرے قبیلے یا میری ذات سے کیا

میری مصروفیات اس کو کہاں روک سکیں گی
وہ تو یاد آئے گا اس کو میرے دن رات سے کیا

پیاس دیکھوں یا کروں فکر کہ گھر کچا ہے
سوچ میں ہوں کہ میرا رشتہ ہے برسات سے کیا

جس کو خدشہ ہو کہ مر جائیں گے بھوکے
سوچیے اس کو کسی اور کے حالات سے کیا

آج اسے فکر ہے کہ کیا لوگ کہیں گے ساغر
کل جو کہتا تھا، مجھے رسم و رواج سے کیا

دنیا کا کوئی بھی انسان جذبات و احساسات سے خالی نہیں۔ نرم و نازک جذبات زندگی کی اساس ہیں۔ جس طرح خوشبو کے بغیر پھول فقط رنگ رہ جاتا ہے' اسی طرح اظہار کے بنا جذبے اکثر بے مول رہ جاتے ہیں۔ اظہار کا پیرایہ چاہے کوئی ہو' اس کا ہونا ہی سرشاری ہے۔ شاعری اظہار کا ایک خوب صورت ذریعہ۔ اکثر طویل گفتگو بھی آپ کے احساس کو اس طرح واضح نہیں کر پاتی، جو فقط ایک شعر کہہ دیتا ہے اور آپ بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں۔ "ارے یہ ہی تو میرے دل میں تھا۔" زندگی کی طویل دھوپ چھاؤں میں بہت سی یادیں' بہت سی باتیں آپ کی ہم سفر رہی ہوں گی۔ کبھی آنکھ میں آنسو بن کر' کبھی لب پر پھول کھلائے۔ اپنی یادوں میں' ہمیں بھی شریک کیجئے' مگر صرف منظوم پیرائے میں۔ یہ کوئی شعر بھی ہو سکتا ہے' نظم بھی اور غزل بھی۔

سوالات یہ ہیں۔

1 وہ شعر جو اکثر آپ کے لبوں پہ رہتا ہے؟
2 وہ شعر' نظم یا غزل جو آپ کے پسندیدہ شاعر سے تعارف کی بنیاد بنا؟
3 کسی نے آپ کو دیکھ کر بے ساختہ کوئی شعر پڑھا ہو؟
4 وہ غزل جو آپ نے ٹی وی یا ریڈیو پر سنی تو گائیکی کی بنا پر آپ کو اچھی لگی؟
5 کلاسیکی شاعری میں سے آپ کا انتخاب؟

روشن حرف وہ سلسلے

ثریا جبیں

انسان عدم سے وجود میں آیا۔ تو پہلی نعمت جو اسے عطا کی گئی وہ آواز اور سُر تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ پہلا پہلا الاپ بے سرا ہوتا ہے۔ تاہم زندگی میں جذبوں کے اظہار کے لیے گنگناہٹ ناگزیر ہے۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے۔ اسکول کی تعلیم کے دوران سیکھے گئے قومی ترانے' کورس کی کتابوں سے پڑھی گئی نظمیں' حمد و نعت' چلتے پھرتے' کھیلتے' رسہ کودتے زد نوک زبان رہتیں۔ یہاں تک کہ میں اور مجھ سے تین سال بڑی بہن اگر موسم سرما ہوتا تو لحاف میں منہ ڈال کر اور اگر موسم گرمی کا ہوتا تو چھڑکاؤ کیے گئے فرش پر لگے بستر پر' تاروں بھرے آسمان تلے' گلاب اور موتیا کے پھولوں کی مہکار کے ساتھ' بڑی خوش دلی سے' جب تک تمام نظمیں' حمد و ترانے اونچے سُروں میں گا نہ لیتے سوتے نہیں تھے۔ آج اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی وہ سب کچھ یاد ہے۔

پھر زندگی کا وہ دور آیا' جب خوب صورت تصورات کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے اور دل خوشیوں' آرزوؤں اور امنگوں کا گہوارہ ہوتا ہے تو ہونٹوں پر خود بخود کچھ اس قسم کے نغمے مچلنے لگتے ہیں۔

یہ آرزو جواں جواں' یہ چاندنی دھواں دھواں
پکارتے پھریں بتاؤ ہم تمہیں کہاں کہاں

کبھی کوئی پسندیدہ ٹیچر یا کوئی عزیز دوست ناراض ہو جاتی یا کہیں دور چلی جاتی' تو دکھ کا اظہار کسی تنہا کونے میں بیٹھ کر بھرے دل اور بھری آنکھوں کے ساتھ یہ اشعار گنگنا کر کیا جاتا۔

زندگی میں اک پل بھی چین آئے نا
اس جہاں میں کاش کوئی دل لگائے نا

لگی دل کی کسی صورت بہل جائے تو اچھا ہو
تمنا اک نئے سانچے میں ڈھل جائے تو اچھا ہو

یہ ذکر بہاول پور کالج کا ہے' سردی کا موسم تھا۔ دیر ہو جانے کے ڈر سے میں اپنی کتابیں' کاپیاں سنبھالتی گیٹ سے بلڈنگ کی طرف بھاگی جا رہی تھی کہ میری اونی شال روش کے کنارے لگے گلاب کے پودے میں کچھ اس طرح اٹکی کہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی نہ چھٹ پائی۔

بلڈنگ کے سامنے چند ٹیچرز دھوپ میں کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو ٹیچرز نے آ کر نہ صرف میری شال چھڑائی' بلکہ ایک ٹیچر نے ایک شعر سے بھی نوازا' جس کا پہلا مصرعہ یاد نہیں' دوسرا مصرعہ یہ تھا۔

حسینوں سے رقیب اچھے جو جل کر نام لیتے ہیں
گلوں سے خار بہتر ہیں جو دامن تھام لیتے ہیں
(پہلا مصرعہ ہم نے لکھ دیا ہے)

بھائی کی شادی کا موقع تھا' ہم لاہور میں تھے۔ گھر میں کئی قسم کے مہمان ٹھہرے تھے۔ رشتہ دار' کزنز' ملنے والے' نہ جانے میرے کمرے میں ٹیبل پر رکھی میرے پسندیدہ اشعار کی ڈائری پر کس نے ان اشعار کا اضافہ کر دیا۔

لے آئے انقلاب سپہر بریں کہاں
اللہ ہم کہاں وہ ثریا جبین کہاں

دوسرا شعر بھی اسی نام کا ہے۔ آج ڈائری میں پڑھا تو لکھنا مناسب نہیں لگا۔ شعر کے نیچے شاعر کا نام اصغر گونڈوی درج ہے۔ پھر ایک بار ایک گم نام چٹھی میرے نام آئی' جس میں سادہ کاغذ پر یہ شعر درج تھا۔

مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں
تو میرا شوق دیکھ' میرا انتظار دیکھ

2۔ علامہ اقبال' فیض احمد فیض' احمد فراز جیسے بڑے نام تو ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں اور قابل افتخار ہیں۔ ان کے بعد جن کی شاعری نے دل کو چھوا' وہ ن م راشد' پروین شاکر اور امجد اسلام امجد ہیں۔ لیکن ان سے بہت پہلے ریڈیو پر طلعت محمود کی آواز میں سنی گئیں شکیل بدایونی کی غزلیں اور گیت بہت پسند تھے۔ پھر ان کی ایک نعت نے انہیں میرا پسندیدہ شاعر بنا دیا۔ وہ نعت شریف یہاں لکھ رہی ہوں۔

اے صل علیٰ دل کی دنیا کچھ اور ہی پائی جاتی ہے
سرکار عالم ﷺ کی صورت آنکھوں میں سمائی جاتی ہے

اے سرور دین اے ہادی کل' اے ماہ جبین اے ختم رسل ﷺ
وہ آپ کا در ہے' جس در پر تقدیر بنائی جاتی ہے

ہوتا ہے کرم کے وعدوں سے سوز غم فرقت اور سوا
اک آگ لگائی جاتی ہے' اک آگ بجھائی جاتی ہے

اے صل علیٰ دل کی دنیا کچھ اور ہی پائی جاتی ہے
ہاں نظارہ شکیل آتا ہے نظر' احساس عقیدت خام نہ ہو
وہ سامنے خود آ جاتے ہیں جب آنکھ اٹھائی جاتی ہے

آج بھی جب میرے ہونٹوں سے یہ نعت ادا ہوتی ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عقیدت سے دل بھر آتا ہے اور آنکھیں بہنے لگتی ہیں۔

4۔ گائیکی اور شاعری کے لحاظ سے میری پسندیدہ غزل۔

نظر نظر میں ادائے جمال رکھتے تھے
ہم ایک شخص کا کتنا خیال رکھتے تھے

جبین پہ آنے نہ دیتے تھے اک شکن بھی کبھی
اگرچہ دل میں ہزاروں ملال رکھتے تھے

خوشی اسی کی ہمیشہ نظر میں رہتی تھی
اور اپنی قوت غم بھی بحال رکھتے تھے

کچھ ان کا حسن بھی تھا ماورا مثالوں سے
کچھ اپنا عشق بھی ہم بے مثال رکھتے تھے

5۔ کلاسیکی شاعری میں میرا انتخاب علامہ اقبال کے اشعار۔

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
میرے جرم خانہ خراب کو تیرے عفو بندہ نواز میں

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے' تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

میں جو سر بہ سجدہ ہوا کبھی تو زمین سے آنے لگی صدا
تیرا دل تو ہے صنم آشنا' تجھے کیا ملے گا نماز میں

باتیں انوشے عباسی سے

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"انوشے عباسی۔"

2 "پیار کا نام؟"
"پاپا مجھے "بی بی" کہتے ہیں۔ باقی سب "انوشے" ہی کہتے ہیں۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر/اسٹار؟"
"24 نومبر 1993ء/کراچی/Sagittarius (قوس)"

4 "تعلیمی قابلیت؟"
"تعلیم کا سلسلہ جاری ہے اور میں سیکنڈ ایر کی طالبہ ہوں"

5 "بہن بھائی اور آپ کا نمبر؟"
"میرا نمبر آخری ہے۔ دو بھائی ہیں اور ہم تین بہنیں ہیں۔"

6 "شادی؟"
"کوئی جلدی نہیں ہے۔ ابھی بہت پڑھنا ہے اور بہت نام کمانا ہے۔"

7 "پہلی کمائی/کیا کیا تھا؟"
"کچھ یاد نہیں، چھوٹی عمر میں کمایا ہوا کچھ یاد نہیں ہے اور ویسے بھی میرے پاپا ہی سب ڈیل کرتے ہیں۔"

8 "صبح اٹھتے ہی کیا دل چاہتا ہے؟"
"کچھ نہیں، صبح اٹھتی ہوں تو شوٹ پہ جانے کے لیے گاڑی باہر کھڑی ہوتی ہے۔"

9 "اپنے چہرے کے نقش و نگار میں کیا پسند ہے؟"
"لوگ کہتے ہیں کہ مسکراہٹ بہت اچھی ہے۔"

10 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اپنے کمرے میں۔"

11 "شدید بھوک میں آپ کی کیفیت؟"
"بسکٹ وغیرہ کھالیتی ہوں۔"

12 "اپنے مسائل کس سے شیئر کرتی ہو؟"
"اپنی دوستوں سے۔"

13 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"
"تو غصہ تو بہت آتا ہے مگر میں کچھ نہیں کہتی۔ کوئی بچہ اٹھا دے تو بہت ڈانٹ پڑتی ہے اس کو۔"

14 "پہلی ملاقات میں شخصیت میں کیا دیکھتی ہو؟"
"ہاتھ اور پاؤں، پوری شخصیت کا پتا چل جاتا ہے۔"

15 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"
"(ہنستے ہوئے) کچھ خیال نہیں آتا۔"

16 "اگر اپنی مرضی سے زندگی گزارنی پڑے تو؟"
"ابھی بھی اپنی مرضی سے ہی جی رہی ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔"

17 "اپنے آپ کو کب بے بس محسوس کرتی ہو؟"
"جب بہت لیٹ ہو جاتی ہوں شوٹنگ سے۔"

18 "زندگی میں کس چیز کے لیے وقت نکالنا مشکل ہے؟"
"رشتے داروں کے لیے کیونکہ شوٹنگز میں بہت ٹائم لگ جاتا ہے۔"

19 "آپ کے لیے کون جان دے سکتا ہے؟"
"گھر والے اور میرے دوست۔"

20 "اگر دعا سے کچھ مل سکتا تو کیا مانگتیں؟"
"پاپا، ماما کے لیے بہت ساری خوشیاں۔"

21 "کوئی شخص جس نے آپ کی زندگی بدل دی ہو؟"
"مما، پاپا۔"

22 "جب پہلی مرتبہ نیا قلم استعمال کرتی ہیں تو کیا

لکھتی ہیں؟"
"اپنا نام۔"

23 "کوئی غلطی جس کو سوچ کر ندامت ہوتی ہو؟"
"اگر کسی سے لڑائی میری غلطی کی وجہ سے ہو۔"

24 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"
"بہت دفعہ، جب غصہ آتا ہے کھانا پینا چھوڑ دیتی ہوں۔"

25 "اپنا فیوچر کیسا دیکھتی ہو؟"
"بہت برائٹ۔"

26 "گھر میں کھانا کس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھاتی ہو؟"
"مما کے اور جویریہ باجی کے۔"

27 "کون سا ناشتا جو اکثر کرتی ہو؟"
"ناشتا تو میں عموماً نہیں کرتی..... ہاں، کھانا شوق سے کھاتی ہوں۔"

28 "آپ کی مرغوب غذا؟"
"آلو قیمہ، دال چاول ایک ساتھ، باربی کیو پسند نہیں۔"

29 "موڈ کب خراب ہوتا ہے؟"
"جب کوئی کسی اور کا غصہ مجھ پر نکالے تو۔"

30 "ملک میں کون سی تبدیلی ضروری ہو گئی ہے؟"
"ہر طرح کی تبدیلی... انقلاب آنا چاہیے۔"

31 "پسندیدہ چینل؟"
"9xm"

32 "بھروسے کے قابل کون ہوتا ہے۔ لڑکیاں یا لڑکے؟"
"لڑکیاں۔"

33 "کیا دعا سے قسمت بدل جاتی ہے؟"
"بالکل بدل سکتی ہے۔ میرا ایمان ہے۔"

34 "اپنی شخصیت میں کیا تبدیلی لانا چاہتی ہیں؟"
"اپنے اندر سے غصہ کم کرنا چاہتی ہوں۔"

35 "اللہ تعالیٰ سے کوئی شکوہ؟"
"نہیں، کوئی نہیں۔ اللہ سے تو مزید مانگتی ہوں۔"

36 "کبھی چھٹی حس ایکٹو ہوئی؟"
"ہاں! بالکل ہوتی ہے۔ جیسے ایک مرتبہ میرا بھائی اور میرے دوست پکنک پہ جا رہے تھے تو میں ان کو منع کر رہی

تھی کہ مت جاؤ۔ مگر یہ لوگ چلے گئے۔ راستے میں ان کو پولیس نے پکڑ لیا اور تین گھنٹے نہ صرف روکے رکھا، بلکہ بہت برا سلوک بھی کیا۔"

37 "گھر آکر پہلی خواہش؟"
"کہ نہا دھو کر سو جاؤں۔"

38 "موت سے ڈر لگتا ہے؟"
"نہیں اب پتا ہے کہ موت برحق ہے۔ پہلے ڈر لگتا تھا۔"

39 "کون سی تقریبات میں جانا پسند نہیں؟"
"پاپا کی غزل نائٹ میں بوریت ہو جاتی ہے۔"

40 "سائنس کی بہترین ایجاد؟"
"موبائل فون۔"

41 "جھوٹ کب بولتی ہو؟"
"کبھی کبھی بولتی ہوں۔ سچویشن پر منحصر ہے۔"

42 "کون سے تہوار شوق سے مناتی ہیں؟"
"عید اور اپنی سالگرہ۔"

43 "شوبز کی سب سے بڑی برائی؟"
"مجھے کوئی برائی نظر نہیں آتی۔"

44 "چھٹی کا دن کیسے گزارتی ہیں؟"
"اگر بہت تھکی ہوئی ہوتی ہوں تو سو جاتی ہوں ورنہ فیملی کے ساتھ گھومنے پھرنے نکل جاتی ہوں۔"

45 "موبائل فون کے بارے میں آپ کے تاثرات

"بہت کام کی چیز ہے اور سب کے پاس ہونا چاہیے۔"

46 "شہرت کیسی لگتی ہے؟"
"بہت اچھی لگتی ہے مزا آرہا ہے۔"

47 "زندگی کب بری لگتی ہے؟"
"مجھے بری لگتی ہی نہیں زندگی۔"

48 "کوئی سوال جو برا لگتا ہے؟"
"نہیں، برا نہیں لگتا۔ بس کوئی بہت زیادہ پرسنل نہ ہو۔"

49 "کوئی لڑکا مسلسل گھورے تو؟"
"میں اس جگہ سے چلی جاؤں گی۔"

50 "سارے دن میں تمہارا پسندیدہ وقت؟"
"جب سونے کا موقع مل جائے۔"

51 "شور کب مچاتی ہو؟"
"جب کھانا میری پسند کا نہیں ہوتا۔"

52 "زندگی میں کیا چینج آیا؟"
"یہی کہ میں عام سے خاص ہوگئی۔"

53 "نصیحت جو بری لگتی ہے؟"
"یہ کہ اب فیلڈ میں آگئی ہو تو پڑھائی نہیں چھوڑنا۔ بھئی! کیوں چھوڑوں گی۔"

54 "غصہ کب آتا ہے؟"
"جب پسند کا کھانا نہ ہو۔"

55 "غصے میں رد عمل؟"
"کہ میں کھانا نہیں کھاتی۔"

56 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتی ہو؟"
"پچاس یا سو۔"

57 "کن باتوں پہ قابو نہیں؟"
"غصے پہ اور اچھا کھانے پہ۔"

58 "کیا محبت ایک بار ہوتی ہے؟"
"پتا نہیں، ابھی ہوئی نہیں۔ فی الحال تو اماں ابا اور دوستوں سے ہے۔"

59 "کبھی مانگ کر تحفہ لیا؟"
"بہت بار... اور جو مانگتی ہوں، مل جاتا ہے۔"

60 "اپنی غلطی کا اعتراف کرلیتی ہو؟"
"بالکل کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی ہوں۔"

61 "سفر کس پر کرتی ہیں، رکشہ، بس یا اپنی کار؟"
"بس میں مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ رکشے میں مجھے بہت مزا آتا ہے اور ویسے زیادہ تر اپنی کار میں۔"

62 "کوئی دلچسپ خواہش؟"
"فی الحال تو نہیں ہے کوئی خواہش۔"

63 "ٹین ایج کا پیار سچا ہوتا ہے یا نادانی؟"
"نادانی اگر والدین کو علم نہ ہو تو۔"

64 "گھر والوں کی کس بات سے موڈ آف ہوجاتا ہے؟"
"اگر مجھے کہیں ضروری جانا ہو اور کوئی مجھے نہ لے جائے تو۔"

65 "کن چیزوں پہ بہت خرچ کرتی ہو؟"
"اپنے کپڑوں پہ، جوتوں پہ، جیولری پہ۔"

66 "فٹ پاتھ پہ کھڑے ہو کر کن چیزوں کا جائزہ لیتی ہو؟"
"ہر چیز کا کوئی کیا کر رہا ہے۔ کیا کھا رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

67 "کس چیز کے بغیر نہیں رہ سکتیں؟"
"کوک۔"

68 "کس شخصیت سے خوفزدہ رہتی ہو؟"
"کوئی نہیں ہے۔ سب سے دوستی ہے۔"

69 "اپنی کوئی اچھی اور بری عادت بتاؤ؟"
"اچھی تو یہ کہ میں خلاف مزاج باتوں کو نظر انداز کردیتی ہوں اور بری یہ کہ غصہ تیز ہے میرا۔"

70 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو تروتازہ محسوس کرتی ہو؟"
"صبح صبح۔"

71 "رات کو اچانک آنکھ کھل جائے تو؟"
"عموماً دوبارہ سوجاتی ہوں اور نیند نہ آئے تو ٹی وی لگالیتی ہوں۔"

72 "ایک شام جو اپنی پسندیدہ شخصیت کے ساتھ گزارنا چاہتی ہو؟"
"اور کسی کے ساتھ نہیں، صرف اپنے والدین کے ساتھ۔"

73 "کس ملک کے لیے کہتی ہو کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"
"برطانیہ... لندن، بہت اچھا لگتا ہے۔"

74 "اچانک چوٹ لگنے پر بے ساختہ منہ سے کیا نکلتا ہے؟"
"کچھ نہیں، کیونکہ آواز ہی نہیں نکلتی۔"

75 "بستر پر لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتی ہو؟"
"بڑی مشکل سے نیند آتی ہے۔ کروٹیں بدلتی رہتی ہوں۔"

76 "انسان کا بہترین روپ مرد یا عورت؟"
"مرد۔"

77 "کھانے کے لیے بہترین جگہ ڈائننگ ٹیبل یا چٹائی؟"
"ڈائننگ ٹیبل اور میرے بیٹھنے کا انداز یہ ہے کہ ایک ٹانگ اٹھا کر بیٹھتی ہوں۔"

78 "کون سے جملے زیادہ استعمال کرتی ہو؟"
"کوئی خاص نہیں۔"

79 "مرد کب برے لگتے ہیں؟"
"جب وہ اپنے غصے پہ کنٹرول نہیں کرتے۔"

80 "پیسہ کس شکل میں جمع کرتی ہو؟"
"بینک میں۔"

81 "اگر مذہب میں ایک قتل کی اجازت ہوتی تو؟"
"کسی کو بھی نہیں کرسکتی، میری فطرت ایسی نہیں ہے۔"

82 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتی ہو؟"
"لیمپ، فون، پرس اور پانی۔"

83 "تمہاری ایک عادت جو گھر والوں کو پسند نہیں؟"
"میں ہر چیز نہیں کھاتی۔ سلیکٹو ہوں کھانے کے معاملے میں۔"

84 "اپنی کمائی سے اپنے لیے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"کچھ نہیں۔"

85 "دوسرے ملک جاکر کیا باتیں نوٹ کرتی ہو؟"
"سب ہم سے اچھے ہیں ہر لحاظ سے۔"

86 "کن چیزوں کے بغیر گھر سے نہیں نکلتی؟"
"فون اور پرس۔"

87 "آپ کی زندگی عام لوگوں سے کتنی مختلف ہے؟"
"بہت زیادہ مختلف ہے۔"

88 "پاکستان کے لیے کیا سوچتی ہو؟"
"اب کچھ نہیں سوچتی، کیونکہ اب کچھ نہیں ہونے والا۔"

89 "لوگ گرنے والوں پہ ہنستے کیوں ہیں؟"
"کیونکہ میں بھی ہنستی ہوں اور بہت ہنستی ہوں۔ اس لیے جب میں گرتی ہوں تو دوسرے بھی ہنستے ہیں۔"

90 "انسان کی زندگی کا بہترین دور؟"
"بچپن کا۔"

91 "لائٹ چلی جانے پر بے ساختہ جملہ؟"
"اب کچھ نہیں کہتی عادت ہوگئی ہے۔"

92 "لوگ آپ سے مل کر پہلا جملہ کیا بولتے ہیں؟"
"آپ ٹی وی میں آتی ہیں نا؟"

93 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"
"اپنی پولیس تبدیل کروں گی۔"

94 "ٹی وی آن کرتی ہیں تو پہلا چینل کونسا لگاتی ہیں؟"
"جیو۔"

95 "کس کے ساتھ دنیا گھومنے کا شوق ہے؟"
"اپنے والدین کے ساتھ۔"

96 "خدا کی حسین تخلیق؟"
"دنیا بہت خوب صورت ہے۔"

97 "اخبار میں کون سا صفحہ سب سے پہلے پڑھتی ہیں؟"
"اخبار ہی نہیں پڑھتی۔"

98 "صبح اٹھ کر پہلی خواہش؟"
"برش کروں اور فریش ہو جاؤں۔"

99 "قسمت پر کتنا یقین ہے؟"
"100فیصد۔"

100 "رشتہ جس نے دکھ دیا ہو؟"
"نہیں، سب رشتے ابھی تک تو بہت پیارے ہیں۔"

101 "اگر آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"
"کوئی بات نہیں، نارمل لائف گزاروں گی یا پھر دوبارہ کوشش کروں گی۔"

آپ کا باورچی خانہ

زیب النساء

1 کھانا پکاتے وقت سب باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے میرے بچے کھانا کھانے کے معاملے میں بڑے چوزی اور مشکل بچے ہیں شروع سے ہی۔ میں ہمیشہ غذائیت کو اول اہمیت دیتی ہوں۔ صحت کا بھی خیال رکھتی ہوں پھر جو بچے پسند کریں۔ ہم میاں بیوی اپنی پسند کا بھی بنالیتے ہیں۔

2 گھر میں ویسے تو ہمیشہ مہمان اطلاع دے کر ہی آتے ہیں۔ ہمارے ہاں بہت زیادہ مہمان داری ہوتی ہے۔ اس لیے الحمد اللہ میرا فریزر، فریج ہر طرح کی چیزوں سے بھرا رہتا ہے۔ ریڈی میڈ چیزیں آج کل کے دور میں بہترین مل جاتی ہیں۔ پھر بھی میں چکن کے کباب، آلو کے کباب بنا کر فریز کر دیتی ہوں۔ چکن زیادہ منگواتی ہوں تو صاف کروا کر حصے بنا کر رکھ دیتی ہوں۔ چکن بہت جلد اور آسانی سے بن جاتی ہے اور مسالوں کے پیکٹس نے سارا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ چکن کی ترکیب لکھ رہی ہوں جو پندرہ سے بیس منٹ میں تیار ہو جاتی ہے۔

چکن جل فریزی

اجزا :

چکن	آدھا کلو
چھوٹی بوٹی بون لیس	
ٹماٹر	آدھا کلو
آئل	4 ٹیبل اسپون
نمک، مرچ	حسب ذائقہ
(ویسے میں آدھا آدھا چمچ ڈالتی ہوں)	
گرم مسالا (ثابت)	1 چائے کا چمچ
ہری مرچ	2 عدد باریک کٹی ہوئی
شملہ مرچ	1 عدد
(چوکور پیس چھوٹے چھوٹے کاٹ لیں)	
چکن جل فریزی پیکٹ مسالا	دو چمچ

ترکیب :

سب سے پہلے کڑاہی میں آئل ڈالیں پھر ثابت گرم مسالا ڈالیں۔ گرم ہونے پر چکن ڈال دیں پانچ منٹ ہلکی آنچ پر چھوڑ دیں۔ چمچ سے ہلائیں آنچ تیز کریں۔ ہلکا براؤن ہو جائے تو ٹماٹر ڈال دیں پھر ہلکی آنچ کر دیں۔ دس منٹ کے بعد ٹماٹر تھوڑے گل جائیں گے۔ چمچ سے ہلاتے رہیں آنچ تیز کر دیں۔ نمک مرچ، چکن جل فریزی دو چمچ ڈال دیں۔ بھونتے رہیں۔ جب آئل اوپر آجائے تو شملہ مرچ، ہری مرچ ڈال دیں۔ آنچ ہلکی کر دیں اور ڈھکن لگا دیں۔ چکن جل فریزی تیار ہے گرم گرم نان یا پھر پراٹھوں کے ساتھ پیش کریں۔

3 کچن بے شک عورت کی سلیقہ مندی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ میری ماسی بہت اچھی صفائی کرتی ہے۔ میرے پاس خانساماں بھی ہے جو میرا ہی ٹرینڈ کیا ہوا ہے۔ ہر کام اپنی نگرانی میں کروانا میری عادت ہے۔ مجھے صفائی بہت پسند ہے۔ اس لیے ماشاء اللہ میرا کچن ہر وقت چمکتا نظر آتا ہے۔ کیبنٹ کی باقاعدگی سے صفائی۔ ان میں پلاسٹک کور کاٹ کر بچھاتی ہوں ان کے نیچے صفائی کے بعد کوپھکس پاؤڈر چھڑک دیتی ہوں تو کاکروچ اور چیونٹیاں وغیرہ نہیں ہوتیں۔ کچن کی دیواروں میں لگی ٹائلوں کو باقاعدگی سے روز کپڑے سے صاف کرواتی ہوں منی پلانٹس کی بوتلوں میں پانی ہر دوسرے دن بدلواتی ہوں۔ برتن یا گلاس کبھی بھی سلیب پر نہیں رہنے دیتی اسی وقت دھل جاتے ہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر رکھواتی ہوں۔ میرا کچن میری ہر وقت کی نظرداری کی وجہ سے صاف ستھرا رہتا ہے۔

4 صبح کا ناشتہ واقعی بہت اہمیت رکھتا ہے لیکن میں بہت کوشش کے بعد بھی عمل نہیں کروا سکتی۔

بچوں کے اسکول پھر یونیورسٹی کے زمانے تک میں نے بڑے مزے مزے کے سینڈوچ، برگر کیا کیا نہیں بنایا بچوں کے لیے لیکن انہوں نے کبھی صحیح طرح سے کھا کے نہیں دیا۔ بڑے خوب صورت لنچ باکس ان کو لے دیے۔ ایلومینیم فوائل اور پلاسٹک فوائل میں پیک کر کے دیے لیکن بچوں کو باقاعدگی سے ناشتہ کی عادت نہ ڈال سکی۔ باقی اتوار کو ناشتہ کچھ اہتمام سے بنتا ہے۔ جس میں آلو چھولے کی بھجیا اور پوریاں جو بچے بھی شوق سے کھاتے ہیں۔

آلو چھولے کی بھجیا اور پوریاں

اجزا :

آلو	ایک کلو
چھولے ابلے ہوئے	ایک پیالی
ٹماٹر	2 عدد
ہری مرچ	دو عدد
زیرہ ثابت	2 چمچ
کلونجی	2 چمچ
لال مرچ	1 چمچ
ہلدی	2 چمچ
املی	تھوڑی سی بھگو دیں

ترکیب :

آلو چوکور کاٹ کر ـــــ پانی میں ابالیں جب پانی کم رہ جائے تو اسے چمچ سے بھونیں۔ لال مرچ، کلونجی اور ہلدی شامل کر دیں۔ اب ٹماٹر بھی باریک کاٹ کر ڈال دیں۔ چمچ چلاتی رہیں۔ اب چھولے بھی شامل کریں۔ نمک، مرچ، پسا ہوا زیرہ سب ڈال دیں۔ گرم گرم پوری کے ساتھ سرو کریں۔

پوری کے لیے :

آٹا	3 پیالی
دودھ	1 پیالی
نمک	حسب ذائقہ

ترکیب :

آٹا گوندھ کر روٹی بالکل باریک بیلیں۔ کڑاہی میں زیادہ تیل یا گھی میں تلیں۔ بڑی خستہ اور کراری پوریاں بنیں گی۔

5 گھر سے باہر کھانا مہینے میں کم از کم ایک بار اچھا لگتا ہے۔ چاروں بچوں کی سالگرہ کے دن، ہم دونوں کی سالگرہ، شادی کی سالگرہ، یا بچوں کے رزلٹ کے دن جو ماشاء اللہ ہمیشہ شان دار رہا ہے۔ الحمد اللہ۔ تو ضرور کوشش کر کے باہر جاتے ہیں۔ حیدر آباد کا تقریباً" ہر پوائنٹ ٹرائی کیا ہوا ہے۔

6 اچھا پکانے کے لیے اچھی محنت کی قائل ہوں ویسے اگر ڈاکٹر صاحب (میرے میاں) تعریف کریں تو مجھے محنت کا بہت اچھا انعام مل جاتا ہے۔ ویسے میں گھر پر دعوتوں کا بھی اہتمام کرواتی ہوں سو ڈیڑھ سو لوگوں کی دعوت بڑے مزے سے ہو جاتی ہے۔ ویسے الحمدللہ کام کرتے ہوئے درود شریف کا ورد کرتی رہتی ہوں

7 کھانا پکواتے وقت موسم کو ضرور مدنظر رکھتی ہوں۔ گرمی کے موسم میں ٹھنڈی چیزیں اچھی لگتی ہیں جیسے مینگو شیک، بنانا شیک میٹھے میں کھیر وغیرہ۔ سردیوں میں انڈوں کا حلوہ، گاجر کا حلوہ، انڈوں کی پڈنگ، چکن کارن سوپ، نہاری، حلیم، برسات کے موسم میں پکوڑے، پھلوں کی چاٹ تو میرے ہاتھ کی پورے خاندان میں مشہور ہے۔

ویسے میں کھانا بناتے یا بنواتے وقت درود شریف کا ورد کرتی رہتی ہوں۔ الحمد اللہ کھانے میں ذائقہ اور برکت ہوتی ہے۔

❀

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

عالمگیری قورمہ

اجزا :

گوشت	1کلو
ادرک لہسن پیسٹ	2کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	1کھانے کا چمچہ
پسا دھنیا	1چائے کا چمچہ
ہلدی	1چٹکی
پیاز بڑی	2عدد
دہی	1پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1پیالی

ترکیب :

تمام مسالا جات اور پیاز (پیس کر) دہی میں ملا کر خوب پھینٹ لیں۔ گوشت کو اچھی طرح دھو کر خشک کریں اور دہی میں ملا دیں۔ آدھے گھنٹے بعد تیل گرم کر کے دہی سمیت گوشت ڈال دیں۔ ہلکے ہاتھ سے مکس کریں اور دھیمی آنچ پر پکنے دیں۔ گوشت گل جائے تو بھون لیں یہاں تک کہ روغن اوپر آجائے' پھر حسب ضرورت شوربے کے لیے پانی ڈال دیں۔ جوش آجائے تو ہلکی آنچ پر دس منٹ کے لیے چھوڑ دیں۔ پیش کرتے وقت ہرا دھنیا باریک کاٹ کر چھڑک دیں۔

بوٹی گوشت

اجزا :

گوشت	ڈیڑھ کلو
سرکہ	ڈیڑھ پیالی
لہسن ادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے

انڈے	4عدد
پیاز بڑی	1عدد
ٹماٹر	1عدد
ہری مرچ	6عدد
پسی سرخ مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	حسبِ ضرورت

ترکیب :

انڈے ابال لیں اور چھیل کر گول قتلے کاٹ لیں۔ گوشت ایک انچ کے چوکور ٹکڑے کروالیں۔ سرکے میں پیاز (باریک کاٹ کر) نمک، مرچ، لہسن، ادرک پیسٹ اور گوشت ڈال کر رکھ دیں۔ دو گھنٹے بعد تیل گرم کر کے بوٹیاں سرکے سے نکال کر ڈال دیں۔ سنہری ہو جائے تو پلیٹ میں نکال لیں۔ انڈوں کے قتلے، ٹماٹر گول کاٹ کر اور لچھے دار پیاز سے سجائیں۔ چٹنی اور رائتے کے ساتھ پیش کریں۔

مٹن کباب مکھنی

اجزا :

مٹن	1کلو
پسا ہوا گرم مسالا	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسی ہوئی ہری مرچ	2کھانے کے چمچے
مکھن	آدھی پیالی
پیاز پسی ہوئی	1کھانے کا چمچہ
لہسن ادرک پیسٹ	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پسا سفید زیرہ	2چائے کے چمچے
زردے کا رنگ	ایک چوتھائی چائے کا چمچہ
نمک	حسبِ ذائقہ

ترکیب :

بغیر ہڈی کا گوشت لے کر مشین سے خوب باریک قیمہ بنوالیں۔ پھر اس میں پسی ہوئی پیاز، نمک، مرچ، گرم مسالا، زردے کا رنگ، سفید زیرہ، کٹی ہوئی سرخ مرچ، پسی ہوئی ہری مرچ اور لہسن ادرک پیسٹ ڈال کر اچھی طرح ملائیں اور تقریباً" ایک گھنٹے تک ڈھانک کر رکھیں۔ ایک گھنٹے کے بعد اس میں مکھن ڈال کر خوب مکس کریں۔ لمبے لمبے سیخ کباب بنا کر سیخوں پر بھون لیں۔ نان اور رائتہ کے ساتھ پیش کریں۔ مزیدار مٹن کباب مکھنی تیار ہیں۔

فرائی چاٹ

اجزا :

سفید چھولے	1پاؤ
چاٹ مسالا	1کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	2عدد
پیاز	1عدد
آلو	2عدد
میٹھا سوڈا	1چٹکی
ہرا دھنیا	تھوڑا سا
املی کا گودا	4چائے کے چمچے
کری پتے	چند پتے
نمک	حسبِ ذائقہ
تیل	3کھانے کے چمچے

ترکیب :

چھولوں کو دھولیں اور میٹھا سوڈا ڈال کر چھ گھنٹے کے لیے بھگو دیں پھر نمک ڈال کر ابال لیں۔ ساتھ ہی آلو بھی ابال لیں۔ املی کے گودے میں چاٹ مسالا ملا لیں۔ ابلے ہوئے چھولوں میں (اس کے پانی سمیت) آلو اور ٹماٹر چوکور کاٹ کر ڈال دیں۔ املی کا پانی بھی ملا دیں۔ تیل گرم کر کے کری پتے کڑکڑائیں پھر چھولے ڈال کر پانچ منٹ تک فرائی کریں۔ ڈش میں نکال کر باریک، چوکور کٹی ہوئی پیاز اور ہرے دھنیے سے سجاوٹ کر کے پیش کریں۔

خبریں وبریں

تبصیر نشاط

گھر داماد

گئے دنوں کی بات ہے کہ شعیب منصور نے اپنی فلم "خدا کے لیے" میں گلوکار علی ظفر کو کاسٹ کرنا چاہا تھا، تاہم علی ظفر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر اس میں کام نہیں کر پائے تھے۔ علی ظفر ان دنوں بالی وڈ میں کام کر رہے ہیں اور خوب جم کے کر رہے ہیں۔ علی کو وہاں بہت پسند کیا جا رہا ہے۔ فلمی حلقے انہیں کشور کمار سے مشابہہ قرار دے رہے ہیں۔ جب علی ظفر نے گانا "چل دل میرے چھوڑ یہ پھیرے" گایا تھا تو اس وقت یہاں بھی انہیں پاکستانی کشور کمار کہا گیا تھا۔

بالی وڈ میں علی ظفر کی پذیرائی کا سلسلہ ان کی پہلی فلم سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ جب "تیرے بن لادن" ریلیز ہوئی تو سلمان خان نے "ٹوئٹر" پر اپنے مداحوں کو یہ فلم دیکھنے کی بطور خاص تاکید کی تھی۔ فلم "میرے برادر کی دلہن" کے لیے علی ظفر کے کردار کے لیے پہلے رتیش دیش مکھ کو پیشکش کی گئی تھی۔ اس وقت یہ محض ایک سپورٹنگ رول (معاون کردار) تھا، لیکن جب یہ کردار علی کے سپرد کیا گیا تو اسکرپٹ میں تبدیلیاں کر کے اس کردار کو "کلر فل" کر دیا گیا۔

اور ایسا کیوں نہ کیا جاتا کہ علی ظفر بھارت کے داماد جو ہیں اور داماد کی آؤ بھگت مشرقی روایات کا حصہ ٹھہری۔

جی ہاں! اکثر لوگ اس بات سے لاعلم ہیں کہ علی ظفر کی بیگم عائشہ ظفر معروف بھارتی اداکار عامر خان کی رشتے کی کزن ہیں، تاہم علی ظفر کا کہنا ہے کہ وہ بھارتی فلموں میں اپنے سسرالی رشتے داروں کو سیڑھی بنائے بغیر اوپر جانا چاہتے ہیں۔

علی! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، تاہم یاد رکھیے گا کہ داماد اس وقت تک ہی پیارا رہتا ہے۔ جب تک وہ دور رہتا ہے۔ گھر میں ڈیرے ڈال لینے والے داماد کی وہ قدر نہیں رہتی کہ گھر جنوائی نہ تو گھر کا رہتا ہے اور نہ ہی سسرال کا۔

وینا کی واپسی

جی ہاں! وینا ملک کی واپسی ہو گئی ہے، مگر جناب! یہ

واپسی ان کی ملک میں نہیں ہوئی بلکہ "خبروں" میں ہو گئی ہے کہ ہر وقت خبروں میں رہنے کے جنون میں مبتلا وینا نے کچھ عرصہ خاموش رہنے کے بعد بالآخر ایسی حرکت کر ہی ڈالی کہ وہ خبروں میں دوبارہ جگہ حاصل کر سکیں۔

بمبئی سے آنے والی اطلاعات کے مطابق فلم "ممبئی 125 کلومیٹر" کی شوٹنگ کے دوران وینا نے ساتھی اداکارہ ودیتا پرتاپ کو زخمی کر دیا۔ سین میں وینا کو ودیتا پرتاپ پر لوہے کی سلاخ سے حملہ کرنا تھا۔ وینا نے ان پر سچ مچ ہی حملہ کر ڈالا۔ ودیتا کا کہنا ہے کہ وینا نے جان بوجھ کر انہیں زخمی کیا ہے جبکہ وینا کا کہنا ہے کہ وہ اداکاری میں اتنی مگن ہوئیں کہ انہوں نے یہ سب کچھ واقعی کر ڈالا۔ (ہائے کاش! کوئی بھارتی فلم ساز وینا کو سونیا گاندھی کا رول بھی دے دے تاکہ ہماری وینا کانگریس پر سچ مچ قبضہ ہی کر ڈالے۔)

داغ

بھارت کو تجارت کے لیے پسندیدہ ملک قرار دینے کا فیصلہ زیادہ پرانا نہیں، لیکن جناب! کام کرنے کے لیے بھارت ہمارے فنکاروں کا غالباً "ہمیشہ سے پسندیدہ ملک رہا ہے کہ اکثر فنکار وہاں کسی پروگرام میں شمولیت کو اپنی فنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔

نئی نسل کی ابھرتی ہوئی اداکارہ کرن حق آج کل بہت خوش ہیں اور کیوں نہ ہوں کہ انہیں بھارتی پروگرام "بگ باس' سیزن 6" میں شرکت کی دعوت ملی ہے۔ پروگرام کے پروڈیوسر نے خود فون کر کے کرن کو یہ پیش کش کی ہے سو وہ ان دنوں ہواؤں میں اڑ رہی ہیں۔ (ہاں جی! بھلا اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے کہ یہ ایک بدنام زمانہ پروگرام ہے۔) کرن حق سے قبل اس پروگرام میں پاکستان سے وینا ملک اور علی سلیم (بیگم نوازش علی) بھی شرکت کر چکے ہیں۔

کرن نے ایک انٹرویو میں دعوا کیا ہے کہ "وینا کی چیپ پبلسٹی (سستی شہرت) کے بعد میں جاؤں گی تو پاکستان کے اوپر سے وہ داغ دھو کر آؤں گی (ڈرائی کلیننگ کی کوئی خصوصی تربیت حاصل کی ہے کیا؟)

کرن حق کا دعوا اپنی جگہ، مگر ہم تو اس بات پر حیران ہیں کہ ایک ایسی اداکارہ، جن کے کریڈٹ پر ابھی کوئی قابل ذکر ڈراما بھی نہیں اور جو ابھی اپنے ملک میں واضح شناخت حاصل کرنے کی تگ و دو ہی میں ہیں، ان کی شہرت دُور پار تک کیسے پہنچی اور کئی نامور فنکاروں کو نظر انداز کر کے انہیں شرکت کی دعوت دینا اس سے بھی زیادہ حیران کن ہے۔

کرن جی! آپ اس پروگرام کی وجہ شہرت تو جانتی ہی ہوں گی کہ اس پروگرام میں بدنامی کے داغ دھونے والوں کو نہیں، بلکہ اس کی گود میں کھیلنے والے لوگوں کو ہی مدعو کیا جاتا ہے۔

مجموعہ کلام

ادب کی تمام اصناف میں سے شاعری غالباً "سب سے مظلوم صنف ہے کہ جسے دیکھو' اس پر طبع آزمائی کرتا نظر آتا ہے۔ مرزا غالب اس زمانے میں ہوتے تو یقیناً "وہ یہی کہتے کہ۔

"شاعروں" کی کمی نہیں غالب
ایک ڈھونڈو' ہزار ملتے ہیں

اور جناب! اب تو ڈھونڈنے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑتی کہ شاعر حضرات (خواتین بھی) خود ہی جوق در جوق امڈے پڑتے ہیں اور مُصر بھی ہوتے ہیں کہ ان کے اوٹ پٹانگ خیالات کو شاعری ہی سمجھا جائے۔ شاعری کی وہ ٹانگ توڑی جاتی ہے کہ الاماں۔ ایک مستند شاعر نے تو جل کر یہاں تک کہہ دیا کہ شاعری کو گھاس سمجھ کر گدھے چرنے لگے۔

گدھوں کی تو خیر گدھے ہی جانیں، ہم تو آپ کو یہ بتانے لگے ہیں کہ شوبز کی دنیا سے اُڑتی اُڑتی خبر آئی ہے کہ ہماری معروف اداکارہ نور بھی خیر سے شاعرہ ہو گئی ہیں اور ان دنوں وہ اپنا مجموعہ کلام ترتیب دے رہی ہیں۔ (دل پر اتنی "چوٹیں" پڑیں تو شاعری ہو ہی جاتی ہے نا) دیکھیں! ان کا مجموعہ کلام کب منظر عام پر آتا ہے۔

شادی

اداکارہ میرا' ریما کی شادی میں شرکت کرنے امریکا گئیں تو انہوں نے وہاں ڈیرہ ہی ڈال لیا۔ (غالباً" وہ وہاں سے خالی ہاتھ لوٹنا نہیں چاہتی ہوں گی) کچھ عرصہ وہاں قیام کے بعد میرا وطن واپس آئیں تو اپنے ہمراہ ایک خوشخبری بھی لائی ہیں۔

اداکارہ میرا نے بتایا ہے کہ امریکی ایرلائن کے ایک پائلٹ نوید پرویز نے ان سے شادی کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ (امریکی پائلٹوں کا دماغ نہیں ہوتا کیا؟) میرا کے والدین ابھی اس رشتے پر غور کر رہے ہیں' (ہائے رے نخرے) تاہم میرا کی منگنی جلد ہی متوقع ہے۔

نوید پرویز پاکستانی نژاد امریکی شہری ہیں۔ ان کی ساری تعلیم و تربیت امریکا ہی میں ہوئی ہے۔ (پھر تو وہ صرف انگلش ہی جانتے ہوں گے۔۔۔۔ میرا ان سے کس زبان میں بات کرتی ہوں گی۔)

میرا سے قبل اداکارہ ریما بھی امریکی ڈاکٹر سے شادی کر چکی ہیں اور شادی کے بعد امریکا ہی میں مقیم ہیں۔ توقع ہے کہ میرا بھی شادی کے بعد امریکا ہی میں رہائش اختیار کریں گی۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

○ ہر حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا ہے لیکن سینٹ کے اجلاس میں وزیراعظم اور وفاقی وزیر نہیں آتے ہیں۔ وینا ملک کو سینیٹ کا ڈپٹی چیئرمین بنا دیا جائے۔ ان کے سینٹ میں آجانے سے شاید تمام وزرا اجلاس میں آجائیں۔

(سینیٹر مشاہد اللہ خان)

○ بھارت میں اچھوت ایک ایسی اقلیت ہیں جن کے مطابق انہیں گزشتہ 3 ہزار سالوں سے اپنے ہی مذہب میں کوئی قابل ذکر مقام نہیں مل سکا۔ ان کی تعداد 25 کروڑ سے زیادہ ہے۔

(عالمی اداروں کی رپورٹ)

○ پاکستان میں نئے صوبے بنانے کی ایم کیو ایم کی قرارداد پر گیلپ انٹرنیشنل سروے کے مطابق 59 فیصد پاکستانی عوام نئے صوبوں کے مخالف ہیں۔ صرف 29 فیصد کا کہنا ہے' نئے صوبے بنانے چاہئیں جبکہ 12 فیصد افراد نے کسی رائے کا اظہار نہیں کیا۔

(گیلپ انٹرنیشنل کی رپورٹ)

انسان زندگی میں بعض اوقات ایسے حادثات و واقعات سے دوچار ہوتا ہے جہاں وہ ڈر' وہم اور وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے یا پھر بعض باتیں اس کے لاشعور میں رہ کر اسے بے چین و بے کل رکھتی ہیں اور اگر وہ باتیں انسان کے لاشعور سے شعور میں آجائیں تو مریض خود بخود تندرست ہو جاتا ہے۔

مشہور ماہر نفسیات فرائیڈ اور ڈاکٹر بروئیر کہتے ہیں۔

"کہ ہر نفسیاتی مرض کا تعلق مریض کی گزشتہ زندگی کے ساتھ گہرا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر اس تعلق کو دریافت کر کے مریض کو سمجھا دیا جائے تو وہ تندرست ہو سکتا ہے۔"

وہم کے مرض میں مریض کا دماغ کچھ ایسے متضاد خیالات کا اکھاڑہ بنا رہتا ہے' جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں بعض اوقات ایسے خیالات و جذبات پیدا ہوتے ہیں جو صرف اجنبی ہی نہیں ہوتے بلکہ خوف و ہراس کا باعث بھی بنتے ہیں۔ وہ ہر وقت اس بات سے ڈرتا ہے کہ کہیں کوئی نامناسب حرکت نہ کر بیٹھے۔ کئی بار وہ ایسی حرکات کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور نہ ہی ان سے کسی قسم کی تسکین ہوتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ایک بے اختیار تقاضا ہوتا ہے' جسے پورا کرنا اس کے لیے اشد ضروری بن جاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے مریض اس تقاضے کو پورا نہ کر سکے تو سخت بے چینی' اضطراب' گھبراہٹ اور وحشت محسوس کرتا ہے۔ اور پھر اس تقاضے کو دبانا شدید تکلیف کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے اس جذباتی ہیجان سے بچنے کے لیے مریض اپنے اس جنون کو قائم رکھتا ہے۔

ایسے مریضوں کا علاج تجزیہ نفس (Psychoanalysis) ہے۔ صرف اسی طریقہ علاج سے مریض ہمیشہ کے لیے اس موذی مرض سے چھٹکارہ پا سکتا ہے۔

تجزیہ نفس کے کئی طریقے ہیں۔ ان میں سے ایک طریقہ یہ ہے کہ مریض کو بولنے دیں۔ بولنے سے اس کا ذہن ہلکا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو تندرست محسوس کرتا ہے۔

وہم ڈر اور وسوسوں کے مریض کے لاشعور سے یہ ڈر نکال دیا جائے مریض کلی طور پر تندرست ہو جاتا ہے۔

ایم اے خان

میں ایسے گھرانے میں رہتی ہوں جہاں عورتوں کو مکمل آزادی دی جاتی ہے مگر میری امی کو گھر میں وہ حیثیت نہ مل سکی جو انہیں ملنی چاہیے تھی۔ ہر وقت کی روک ٹوک ماں کی طرف سے توجہ نہ ملنے کی وجہ سے ہم تعلیم میں نمایاں کارکردگی نہ دکھا سکے حد تو یہ ہوئی کہ ایک دو بار — کسی نے کھانے میں کچھ ملا دیا کہ ہم سب گھر والے بہن بھائی اور امی بے ہوش ہو گئے اور اتنی الٹیاں ہوئیں کہ مرتے مرتے بچے۔ اکثر راتیں ہم بھوکے سو جاتے'

اب ہم علیحدہ گھر میں رہتے ہیں' ابو کی تنخواہ میں مشکل سے گھر چلتا ہے باقی سارے کافی امیر ہیں۔ زمین کا تنازعہ چل رہا ہے۔ سب کی زمینیں مشترک ہیں۔ وہ باہر ہیں' ابو ہی مقدمہ لڑ رہے ہیں — اب امی ابو کو بہنوں کے رشتہ کی فکر ہے کہ خاندان میں بھی کوئی رشتہ نہیں۔ باہر سے بھی کوئی رشتہ نہیں آیا۔ بھائی کو بھی جاب نہیں ملتی۔ ہم نے بھی اپنی تعلیم چھوڑ دی۔ ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر کوئی کام ہی نہیں ملتا۔ ایف اے تک تو سب نے تعلیم حاصل کر لی ہے صرف ابو کی تنخواہ پر گزارہ ہو رہا ہے۔ مشکل سے مہینے کی 15 تاریخ تک رہتی ہے' باقی ماہ ادھار پر گزارہ ہوتا ہے۔ اب ہماری چچی نے ہمارے بارے میں غلط باتیں مشہور کر دی ہیں جس کی وجہ سے کوئی ہمارے گھر نہیں آتا۔ دل کرتا ہے کہ یا گھر سے بھاگ جائیں یا خودکشی کر لیں۔

ج اچھی بہن! آپ کے حالات پریشان کن ضرور ہیں لیکن اس حد تک خراب نہیں کہ آپ مرنے کے بارے میں سوچیں۔ ویسے بھی حالات خواہ کتنے ہی خراب ہوں' خودکشی کے بارے میں سوچنا گناہ ہے۔ انسان کو کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے' وہ حالات بدل سکتا ہے۔

بچپن جیسا بھی گزرا' گزر گیا' ماضی کو دہرانا' اس کے بارے میں سوچ سوچ کر اپنے آپ کو تکلیف دینا بے وقوفی ہے۔ اگر آپ کے ددھیال والوں کا سلوک بچپن میں آپ کے ساتھ اچھا نہیں تھا تو بھی اب اس کے بارے میں سوچنا فضول ہے۔

اگر آپ غور کریں تو اب بھی آپ کے حالات بہت سارے لوگوں سے بہتر ہیں۔ آپ کے والد کماتے ہیں' ان کی تنخواہ معقول ہے اتنی کم نہیں کہ صرف 15 تک ساتھ دے۔ جتنا آپ کے والد کماتے ہیں' ہمارے ملک میں آدھی آبادی اس کا چوتھائی بھی نہیں کماتی۔ جہاں تک بھائی کو جاب نہ ملنے کا اور رشتوں کا مسئلہ ہے تو یہ کم و بیش ہر گھر کا مسئلہ ہے۔ بھائی کو جب تک جاب نہیں ملتی' وہ کوئی اور کورس کرے تاکہ اس کی استعداد بڑھ جائے۔ یہ بھی خوش نصیبی ہے کہ آپ نے ایف اے تک تعلیم حاصل کی ہے۔ اب رشتوں کے انتظار میں بے کار نہ بیٹھیں۔ تعلیم کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیں۔ کوئی کمپیوٹر کورس کر لیں۔ مقررہ وقت پر رشتے بھی آجائیں گے اور شادی بھی ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کا جوڑا اتارا ہے۔ بس اللہ سے دعا کرتی رہیں' ویسے بھی مصروفیت بہت سی پریشانیوں کا حل ہے۔ مصروف رہیں گی تو حالات کا سوچ سوچ کر پریشان نہیں ہوں گی۔

الف۔ پنجاب

آپ کی والدہ چار بچوں کی ماں ہیں۔ شوہر پڑھا لکھا خوب صورت ہے۔ کہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ایک نامحرم شخص سے موبائل پر گھنٹوں باتیں کرنا' تصاویر کا تبادلہ ——— ذہنی آوارگی ہی کہا جا سکتا ہے۔

یہ مسئلہ بہت نازک ہے۔ اولاد کی حیثیت سے آپ کے لیے کچھ کہنا مشکل بھی ہے نامناسب بھی' اس سلسلے میں کسی کو رازدار بھی نہیں بنایا جا سکتا۔ کچھ وقت انتظار کر لیں' ہو سکتا ہے وقت کے ساتھ یہ سلسلہ خود ہی ختم ہو جائے۔ کیونکہ اس طرح کے سلسلے زیادہ دیر نہیں چلتے۔

امت الصبور

سارو کی...... گجرات

س : میرے چہرے پر کالے کالے تل بہت زیادہ ہیں اور میرا خیال ہے کہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو تا جا رہا ہے۔ میری جلد نارمل ہے آپ برائے مہربانی کوئی ایسا نسخہ بتائیں جن سے یہ کالے تل ختم ہو جائیں۔ اس کے علاوہ میری بہن کے بال بہت زیادہ گھنگھریالے ہیں اور جب سردی ہوتی ہے تو وہ اوپر کی طرف اٹھ جاتے ہیں اور خشک یعنی روکھے ہوتے ہیں۔ اسے یہ بال بالکل اچھے نہیں لگتے اگر ان کو سیدھا کرنے کا کوئی طریقہ ہے تو پلیز وہ بھی بتا دیں۔

ج چہرے کے تل عموماً" ہارمونز کی خرابی سے ہوتے ہیں۔ کوئی ماہر ڈاکٹر ان کا خاطر خواہ علاج کر سکتا ہے۔

آپ اپنے چہرے کو دھوپ سے بچائیں۔ دھوپ سے ان میں اضافہ ہوتا ہے۔ بال کسی بھی بیوٹی پارلر میں سیدھے کرائے جا سکتے ہیں۔ ان کے لیے کریموں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کریمیں بالوں کے لیے مضر ہوتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ کی بہن بالوں کی خوب صورتی پر توجہ دیں۔ نرم چمک دار بال خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔

روزانہ ناشتے میں کینو اور سیب کا جوس استعمال کریں' دوپہر کو سیب چھلکوں سمیت کھائیں۔

رات کو سر میں بادام کے تیل کی مالش کریں۔ ہفتے میں ایک بار دہی میں لیموں کا رس ملا کر لگائیں۔ آدھا گھنٹہ لگا رہنے دیں پھر دھولیں۔ بال نرم اور چمک دار ہو جائیں گے۔

جویریہ ناصر...... مردان

س : مجھے ہونٹ کاٹنے کی عادت ہے۔ اس کی وجہ سے ہونٹ پھٹ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ میرے ہونٹوں پر جھریاں بھی ہیں۔ کوئی علاج بتائیں؟

ج آپ ہونٹ کاٹنے کی عادت ترک کر دیں ورنہ ہونٹوں کی خوب صورتی ماند پڑ جائے گی۔ پھٹے ہوئے ہونٹوں کے لیے ایک نسخہ لکھ رہی ہوں جو انتہائی موثر ثابت ہوا ہے۔

تازہ گلاب کی پتیاں پیس کر تھوڑے سے مکھن میں حل کر لیں۔ رات کو سوتے وقت ہونٹوں پر اچھی طرح مل لیں۔ اس عمل سے آپ کے ہونٹ ملائم رہیں گے۔

ہونٹوں کی جھریاں دور کرنے کے لیے سیب کے بیج پیس کر لگائیں۔

فرخندہ......لاہور

س : میرے چہرے کا رنگ گندمی ہے لیکن گردن کا رنگ اس قدر سیاہ ہے کہ نمایاں طور پر محسوس ہوتا ہے۔ اس وجہ سے میں سخت پریشان ہوں' مہربانی فرما کر کوئی ایسا نسخہ بتائیں کہ میری گردن کا رنگ بھی چہرے کی طرح گندمی ہو جائے۔

ج اگر آپ کی گردن چہرے کی نسبت سیاہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنی گردن کی صفائی کا خیال نہیں رکھتیں یا یہ کہ دھوپ کے اثرات سے آپ کی گردن کا رنگ جھلس گیا ہے۔ چہرے کا تو ہر کوئی خیال کر لیتا ہے مگر گردن کو عموماً" نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس وجہ سے گردن چہرے سے مختلف نظر آتی ہے۔

آپ دودھ اور اصلی شہد ہم وزن باہم ملا لیں اور روزانہ اپنی گردن پر لگا کر دس منٹ تک لگا رہنے دیں۔ پھر ٹھنڈے پانی سے دھولیں۔ دو تین ہفتوں میں آپ کو نمایاں فرق محسوس ہو گا۔ اس کے علاوہ گردن پر روزانہ کولڈ کریم بھی لگائیں۔

☼